عِصمت چغتائی
شخصیّت اور فن
جگدیش چندر ودھاون

عصمت چغتائی
شخصیت اور فن

عصمت چغتائی

○ پیدائش: ۲۱ راگست ۱۹۱۵ء ○ وفات: ۲۴ راکتوبر ۱۹۹۱ء

عصمت چغتائی

شخصیت اور فن

جگدیش چندر ودھاون

○

انیس سو چھیانوے عیسوی

○

خوش نویس: ایم۔ عمران اعظمی
حسن کار: ریاض آرٹسٹ، دریا گنج، نئی دہلی

○

طباعت: مہرہ آفسیٹ پریس، دریا گنج، نئی دہلی

○

ناشر:
جگدیش چندر ودھاون ایم۔ اے۔
۱۶۲۔ مکرجی نگر ایسٹ، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۹

○

قیمت:

دو سو پچاس روپے

○

"ISMAT CHUGHTAI
SHAKHSIAT AUR FUN"
BY
JAGDISH CHANDER WADHAWAN
162, MUKHERJI NAGAR, DELHI-110009

اسلم پرویز کے نام

جنھیں اِس مکروریا کی دنیا میں بہت پُرخلوص اور بے لوث پایا

فہرست

○

فن

شخصیّت

اپنی بات

"منٹو نامہ" اور "کرشن چندر، شخصیت اور فن" کے بعد میری یہ تیسری کتاب "عصمت چغتائی، شخصیت اور فن" قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ مَیں اُمید کرتا ہُوں کہ قارئین کی جانب سے میری اِس کاوش کو بھی وہی شرفِ قبولیت حاصل ہوگا، جو اِس سے پہلے میری دو کتابوں کو ہُوا ہے۔

یہ بات میرے لئے باعثِ مسرّت ہے کہ "منٹو نامہ"، جس پر چار اکادمی ایوارڈ ملے تھے، اب انگریزی اور ہندی میں بھی منتقل ہو رہی ہے۔ اور یہ دونوں ایڈیشن جلد ہی مارکیٹ میں دستیاب ہوں گے ——— اسی طرح "کرشن چندر، شخصیت اور فن" بھی، جس پر تین اکادمی ایوارڈ ملے تھے، اب عنقریب ہندی میں شائع ہو رہی ہے۔ اِس حصولیابی پر ادب کے قدردانوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا نہ کرنا، ناشکراپن ہوگا۔

اِس کتاب کی تکمیل میں جو چیز پریشان کُن حد تک رُکاوٹ ثابت ہُوئی، وہ عصمت کی تصانیف کا مارکیٹ میں دستیاب نہ ہونا ہے۔ جب بہت تگ و دو کے بعد بھی کتابیں ہاتھ نہ لگیں تو خاص ذرائع سے اُنھیں پاکستان سے منگوانا پڑا، جہاں عصمت کی تمام کتابیں بآسانی دستیاب ہیں۔ یہ ہماری اپنے ادیبوں اور ادب کے تئیں تغافل پسندی کا بیّن ثبوت ہے۔

عصمت ایک متنازعہ شخصیت تھیں۔ اسی لئے میری یہ کوشش رہی کہ جذباتیت سے بچ کر معاملات کو عقلی اور منطقی طور پر پیش کیا جائے۔ ہر بات کی سند پیش کی جائے تاکہ کسی کو انگشت نمائی کا موقع ہی نہ ملے ——— یُوں تمام کتاب خود عصمت کی تحریروں، بیانات اور انٹرویوز پر مبنی ہے، اس لئے مُستند ہونے کے تعلّق سے اس پر عصمت کی مہرِ تصدیق ثبت ہے۔

آج اُردو زبان کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ اچھّی سے اچھّی کتاب کو بھی قارئین نہیں ملتے۔ مصنّف برسوں کی تحقیق اور عرق ریزی کے بعد لکھتا ہے اور زرِ خطیر صرف کر کے اُسے چھپواتا ہے۔ مگر مارکیٹ میں ادب کے پرستار اُسے دُور سے سُونگھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک تو اس بدنصیب زبان کے پڑھنے والے ہی کم ہیں اور جو ہیں بھی، وہ "مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے" کے مقولے کے قائل معلوم ہوتے ہیں ——— مصنّف کسی باطنی جذبے کی

انگیخت پر لکھتا ہے اور لکھ کر اُسے قلبی سکون ملتا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وُہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اُسے پڑھا جائے۔ اگر کتاب قدرِ اوّل کی تسلیم کئے جانے کے باوصف اس کے سینے پر بوجھ بن کر پڑی رہے تو اُس کا دل شکستہ ہو جانا قدرتی بات ہے۔

میں نے آج سے آٹھ سال قبل ستر سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا تھا۔ کیونکہ میرے سامنے وقت بہت کم تھا۔ میرا یہ نصب العین رہا کہ شبانہ روز محنت سے کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لکھوں۔ یہ اُسی منصوبہ بند کوشش کا نتیجہ ہے کہ اس قلیل سی مدّت میں مَیں تین بھر پُور کتابیں لکھ سکا ہوں ـــــ اب میری صحت الگ بھگ جواب دے چکی ہے اور یہ محنت طلب تحقیقی کام کی زیادہ متحمّل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے شاید یہ میری آخری کتاب ہو۔ ہاں اگر عمر اور صحت نے وفا کی اور آپ کی دُعائیں شاملِ حال رہیں، تو میں چاہوں گا کہ میری اگلی کتاب راجندر سنگھ بیدی پر ہو تاکہ جدید اُردو فکشن کے قافلہ سالاروں کی چوپائی پر کام مکمّل ہو جائے۔

جگدیش چندر ودھاون

۱۴۲۔ مکرجی نگر الیسٹ
دہلی۔ ۹۔۱۱۰۰۰

جنوری ۱۹۹۶ء

اسلاف

انسان کی زندگی بڑی تہہ دار ہوتی ہے۔ کئی پرتیں اور اپنی جگہ ہر پرت ایک مخصوص پہلو کی آئینہ دار۔ آپ پرت پرت اُتارتے جائیے اس کی شخصیت کی رنگا رنگی اور گونا گونی عیاں ہوتی جاتی ہے ـــــ یوں کسی کو جاننا چنداں آسان نہیں کہ ہر انسان کے وجود میں ایک جہاں آباد ہے۔ جب عمر بھر کی ہمدمی اور ہم نشینی کے باوصف انسان اپنی ہی ہستی کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہے تو اوروں کی شخصیت کے نہاں خانوں میں اُتر کر ان کے اسرار و رموز کو کیوں کر جان سکتا ہے۔ بایں ہمہ اگر دیکھنے والا باشعور اور ژرف نگاہی کا حامل ہو تو حقیقت کو پا لینا ایسا مشکل بھی نہیں۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ انسان واقعات، تجربات، مُشاہدات اور مُطالعات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔

عصمت چغتائی کے دادا کا نام مرزا کریم بیگ چغتائی تھا۔ اُن کے آباو اجداد کا سلسلۂ نسب چغتائی خان بن چنگیز خاں سے ملتا ہے۔ چنگیز خاں کے دو بیٹے تھے۔ ہلاکو خان اور چغتائی خان۔ ہلاکو خان تلوار کا دھنی تھا لیکن چغتائی اپنے بھائی کے برعکس علم و ادب کا دلدادہ۔ یہی وجہ ہے کہ چغتائیوں میں علمی و ادبی رجحان بدستور چلا آرہا ہے۔ عصمت چغتائی کے دادا مرزا کریم بیگ چغتائی نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد انھوں نے عصمت چغتائی کی دادی سے دُوسری شادی کی۔ پہلی بیوی کے بطن سے ایک بیٹا مرزا نعیم بیگ اور ایک بیٹی اُمراؤ خانم تھیں۔ مرزا نعیم بیگ ایک زمانے میں گوالیار کے گورنر تھے۔ ان کے بیٹے میرزا اعلیٰ اللہ بیگ فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ لیکن وہ عیش پسند اور رنگین مزاج تھے۔ اس حد تک کہ اُن کے والد نے انھیں عاق کر دیا۔ عصمت چغتائی کی دادی کے بطن سے تین بیٹے مرزا ابراہیم بیگ چغتائی (جنھیں عصمت چغتائی "بڑے ابا" کہا کرتی تھیں) عصمت چغتائی کے والد مرزا قسیم بیگ چغتائی، چھوٹے چچا مرزا مُستقیم بیگ چغتائی اور ایک پھوپھی بادشاہی خانم عرف بچھو پھوپھی پیدا ہوئیں ـــــ مرزا ابراہیم بیگ چغتائی ایک مُتقی، پرہیزگار اور عبادت گذار شخص تھے۔ شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ لیکن مزاج کے اعتبار سے پکے مغل تھے۔ ان سے متعلق ایک واقعہ کے بارے میں عصمت چغتائی لکھتی ہیں:

"بڑے ابا مصطفیٰ کمال پاشا کے پرستاروں میں سے تھے۔ کسی زمانے میں جب اُنھوں نے ترکی میں انقلاب برپا کیا تھا اُنھیں پُوجنے لگے تھے اور ہر سانس میں خُدا کے بعد اُن کا نام لیتے تھے۔ کچھ اتاترک کے بارے میں پھُوپا میاں کو حیرت انگیز بات سُنا رہے تھے۔

"کیا نام وہ کون مُصطفیٰ کمال پاشا" اُنھوں نے سہم کر پُوچھا۔

"تم اتاترک کو نہیں جانتے" بڑے ابا چت ہو گئے۔

"کیا نام۔ نہیں تو۔۔"

"تو میں تمھیں نہیں جانتا" بڑے ابا مُنہ پھیر کر چل دیئے اور پھر اُن کی صُورت نہیں دیکھی۔

پھُوپا میاں بھوچکے رہ گئے"[1]

یہ ہے چغتائی مزاج جس کا تیور عبادت اور ریاضت سے بھی قابو میں نہیں آسکا تھا۔ وہ خود کے مُغل ہونے پر نہ صرف فخر محسوس کرتے تھے بلکہ اُن کا خیال تھا کہ مُغل سے برتر، بہادر، انصاف پسند، عالم، منکسر المزاج اور دریا دل قوم دُنیا کے پردے پر نہیں۔

ابا میاں

عصمت کے والد کا نام مرزا قسیم بیگ چغتائی تھا۔ وُہ بارُعب اور پُر وقار شخصیت کے حامل تھے۔ درمیانہ قد، سڈول کسرتی جسم، موٹی موٹی روشن غلافی آنکھیں، مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ وُہ انگریزی حکومت میں ڈپٹی کلکٹر کے کلیدی عہدے پر یوپی اور راجستھان کے مختلف مقامات پر فائز رہے۔ وُہ حکومت کے معتمد، معتبر اور بارُسوخ افسر تھے اور انھیں ۱۹۱۱ء میں اُن کی خدمات کے صلے میں "خان بہادر" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

ابا میاں شوقین مزاج تھے۔ وُہ باغبانی کرتے، گھوڑا سرپٹ دوڑاتے، اعلیٰ نسل کے کُتّے پالتے، شکار کھیلتے۔ اُنھیں گانے سے خاص رغبت تھی۔ کبھی کبھی جب طبع رسا ہوتی تو شعر بھی کہتے تھے، مگر کسی کو سُنانے سے گریز کرتے تھے۔ جب اُن کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا ——— اور اُن کے دس بچے ہوئے ——— تو دُور دُور سے مہمان آتے، طوائفیں بُلائی جاتیں۔ رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتیں۔ دو تین دن خوب رونق رہتی ——— گویا ابا میاں ایک طرح سے بھرپُور شخصیّت کے مالک تھے۔ تنومند، باذوق اور زندگی کی پُر لُطف چیزوں سے دِلی لگاؤ رکھنے والے۔ اُنھوں نے زندگی کو جینے کی طرح جیا ——— یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ گو اُس دَور میں اُمرا، رؤسا، جاگیردار، تعلقہ دار طوائفوں سے تعلق رکھنا باعثِ افتخار و وقار سمجھتے تھے۔ ابا میاں اِس بدعت سے دُور ہی رہے۔ یہی

---

[1] عصمت چغتائی: "ادھوری عورت" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل"، نئی دہلی (جولائی ۱۹۷۹ء) ص ۲۲

نہیں مذہب کی رُو سے اگرچہ اُنھیں چار نکاحوں کی اجازت تھی، مگر وہ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دُوسری شادی کے بھی قائل نہ تھے اور وہ اس موقف پر سختی سے قائم رہنے کو ایک سعادت سمجھتے تھے۔

آیئے ذرا ابّامیاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالیں:

○ تحریکِ آزادی زوروں پر تھی۔ کانگریس کا ڈنکا چہار سُو گونج رہا تھا۔ لیکن والیانِ ریاست کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ حسبِ معمول آنکھیں مُوندے اپنی اُسی ڈگر پر رواں تھے جہاں عوام کی فلاح و بہبود سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ نواب اور راجے مہاراجے اپنے تعیّش اور خود پرستی کے خول میں بند، مُلک کے تغیّر پذیر حالات اور معاشرے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے بیگانہ تھے۔ ان کی دُنیا رقص و سرود اور رامش و رنگ کی دُنیا تھی۔ عوام کی غُربت اور خستہ حالی ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی ——— ریاست جودھپور میں راج کنور کی سالگرہ بڑی دھُوم دھام اور تزک و احتشام سے منائی گئی۔ ابّامیاں اُن دِنوں جودھپور میں جج کے عہدہ پر تعینات تھے۔ حکومت کی جانب سے اُنھوں نے جشن اور چراغاں کا اہتمام کیا۔ رات بھر طوائفوں، نقالوں اور بھانڈوں سے محفل گرم رہی۔ عصمت اور اُن کے گھر کے سب افراد اپنی کوٹھی کی چھت سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

ابّامیاں کو یہ جشن بہت ناگوار گذرا کہ اس پر روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا جبکہ ریاست میں بلا کی غُربت تھی۔ دیہی علاقوں میں خاص طور پر لوگ تہی شکم اور برہنہ پا تھے اور اُن کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ کوئی ڈھنگ کا ہسپتال بھی نہیں تھا جہاں رعایا علاج مُعالجے کے لئے رجوع کرے اور نہ ہی کوئی اسکول تھا جہاں بچّے حصُولِ تعلیم کے لئے جائیں۔ ریاست بھر سے امیر کبیر لوگ بیماری کی صورت میں جودھپور کا رُخ کرتے تھے یا معالجوں کو اپنے دولت کدوں پر بُلوا لیتے تھے جبکہ غریب نادار لوگ بغیر تشخیص اور علاج مُعالجے کے ہی دَم توڑ دیتے تھے۔ ابّامیاں کو جو فطرتاً رحم دل، خُداترس اور انسان دوست واقع ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال سے بہت دُکھ ہوتا۔ وہ دل ہی دل میں کُڑھتے سُلگتے لیکن اُن کے لب بند تھے کیونکہ روزی روٹی کے لئے وہ ایک مُطلق العنان راجہ کے رحم و کرم پر تھے ——— چیچک کی وبا پھیلی تو گو محکمۂ صحت اُن کے تحت نہیں تھا اُنھوں نے مُجاہدانہ جوش و خروش کے ساتھ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر چیچک کے ٹیکے لگوانے شروع کئے۔ ناخواندہ، قدامت پسند لوگ سیتلا مائی کے چمتکار کے قائل تھے جو ابّامیاں کی نظروں میں محض توہّم پرستی تھی جس کا کوئی عقلی یا منطقی جواز نہ تھا۔ چاروں طرف ہنگامہ برپا ہو گیا اور ناسمجھ، بے شعور لوگوں نے ابّامیاں کی سرگرمیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور حکامِ بالا سے دادرسی چاہی۔ لیکن ابّامیاں اسی جوش و خروش کے ساتھ لوگوں کو ٹیکے لگوانے کا کام کرتے رہے کیونکہ اُن کے نزدیک چیچک کی وبا کی روک تھام کا یہی ایک علاج تھا۔ وہ جدید سائنسی اور طبّی ایجادات پر ایمان رکھتے تھے اور ان کی افادیت کے قائل تھے۔ اُنھوں نے عصمت کے ماموں کی پہلی بچّی کو حفظِ ماتقدّم کے طور پر چُپکے سے چیچک کا ٹیکہ لگوا دیا تھا تو اس پر گھر میں بہت طوفان

مچا تھا۔ عصمت کی ممانی روتی دھوتی، ہائے توبہ مچاتی اپنے میکے چلی گئی گویا کوئی بہت سنگین حادثہ ہوگیا ہو۔ اس کے بعد ان کے تین لڑکیاں ہوئیں اور تینوں کو چیچک ہوگئی اور سب بدشکل ہوگئیں۔ پھر بھی وہ لوگ فرسودہ رسوم وقیود کے پابند چیچک کے ٹیکے کے نام سے ہی کانپ جاتے تھے ـــــ توہمات کا کوئی عقلی اور منطقی جواز نہیں ہوتا مگر ان کی جڑیں اتنی گہری اور پھیلی ہوئی ہوتی ہیں کہ انسانی ذہن کا ان سے چھٹکارہ پانا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہوتا ہے۔

اّبامیاں نے اپنے سارے عملے کو ٹیکے لگوائے۔ حتیٰ کہ اپنے چپراسیوں تک کو نہ چھوڑا۔ ایک ہوشیار کلرک نے اُن سے کہا۔ "سرکار اُن میں قتل کے مجرم ہیں۔ انھیں کیا ضرورت ہے ٹیکے کی۔" اُنھوں نے جواب دیا۔ "اگر اسے چیچک ہوئی تو اوروں کو بھی سمیٹ لے گا۔ اور اگر بچ گیا چیچک سے اور گھناؤنی صورت لے کر اللہ میاں کے دربار میں پہنچا تو بغیر اعمال دیکھے ہی دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔" ـــــ ٹیکوں کے بارے میں جو شور برپا ہوا، اُس کی شکایت جودھپور دربار تک پہنچی۔ بڑی اُونچی سطح پر سخت تفتیش ہوئی۔ اّبامیاں سے جواب طلبی ہوئی۔ مگر اُن کے جواب پر معاملہ فرو ہوگیا کیونکہ وہ برٹش حکومت سے وابستہ رہ چکے تھے اور قانون کی پیچیدگیوں سے واقف تھے۔ اُنھوں نے اُوپر حکامِ بالا تک پہنچنے کی دھمکی دی۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنا استعفیٰ بھی داغ دیا ـــــ حکومت نے اُن کا استعفیٰ نامنظور کردیا اور ساتھ ہی اُن کے فرائضِ منصبی میں محکمۂ صحت کی نگرانی بھی شامل کردی جو اُنھوں نے خوشی سے منظور کرلی ـــــ چیچک کے ہنگامے کی نسبت سے ان کا نام ہی "چیچک والا ڈاکٹر" پڑ گیا۔

اس واقعہ سے اّبامیاں کی جو تصویر اُبھرتی ہے وہ ایک روشن خیال، دردمند، انسان دوست، اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل انسان کی ہے۔ حُسن وخوبی فرائضِ منصبی کی ادائیگی ایک بات ہے۔ مگر اُن سے گذر کر ستائش کی تمنّا اور صلے کی پروا کئے بغیر غربت زدہ، توہم پرستی کی دَلدَل میں پھنسے عوام کی مدد کے لئے میدان میں اُترنا اور انھیں چیچک جیسی موذی اور جان لیوا بیماری سے بچانے کی سعی کرنا ایک فرض شناس، فرشتہ سیرت انسان کا کردار ہے۔ خال خال انسان ہی BEYOND THE CALL OF DUTY کے موقف پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ پوری انسانیت کا سرمایہ ہوتے ہیں اور ان کی قدر وقیمت کو پہچاننا ہمارا فرض ہے۔

○ اّبامیاں کی شخصیت کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو۔

وہ کانپور میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ وہ دہریے تھے اور ہندو مُسلم اتحاد کے قائل تھے ـــــ افسران اور مقامی اُمرا اور رُوسا سے ان کے بڑے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ہر جمعہ کو وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ عُلما سے فقہ اور حدیث پر تبادلۂ خیالات کرتے۔ خُدا کی ہستی سے منکر ہوتے ہوئے بھی مختلف مذاہب پر مواد پڑھتے تاکہ مذہب کے تعلق سے ان کا علم تازہ رہے۔ ہندوؤں سے وہ بہت جلد مراسم پیدا کرلیتے تھے کیوں کہ وہ

انھیں ناستک سمجھ کر بلا جھجک اُن کے قریب آجاتے تھے۔ ان کے ساتھ ابا میاں کی دوستی کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن سے بے تکلف گھریلو تعلقات قائم ہو جاتے تھے۔ بیویاں لڑکے لڑکیاں سب گھُل مِل جاتے تھے۔ گھر پر انھیں دعوت دیتے تو ان کے مذہبی جذبات اور احساسات کو سختی سے ملحوظ رکھا جاتا تھا اور مذہبی تعصب کی بُو اور تنگ نظری کا نام و نشان نہیں ملتا تھا ـــــ اس طرح منصبی دائرۂ کار کی طرح ان کا سماجی اور معاشرتی اثر و رسُوخ بھی بہت وسیع تھا اور وُہ بہت مقبول، غیر جانبدار اور غیر متنازعہ افسر تھے۔

کانپور میں فرقہ وارانہ تناؤ زوروں پر تھا۔ محرم قریب آرہا تھا۔ اور یہ خبر گرم تھی کہ اب کے فسادات پر بہت خوُن خرابہ ہوگا۔ دونوں طرف سے تفرقہ پرداز عناصر زور شور سے تیاریاں کر رہے تھے۔ نواحی علاقوں سے پیشہ ور ہتھیار بند غنڈے منگوائے گئے تھے۔ ابا میاں کو سرکاری اور اپنے ذاتی ذرائع سے پل پل کی خبر مل رہی تھی۔ اور وہ ہونے والے امکانی واقعات سے پریشان دکھائی دیتے تھے۔ وُہ حفظِ ماتقدم کے طور پر پیش بندیاں کرنا چاہتے تھے تاکہ صورتِ حال کے بے قابو ہونے سے پیشتر ہی اس پر قابو پالیا جائے۔ اُنھوں نے اس بارے میں کلکٹر سے، جو ایک انگریز تھا تبادلۂ خیالات کیا تو اس نے بلا توقف ان کی رائے کو مُسترد کر دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ فسادات نہ صرف بعید از قیاس ہیں بلکہ اس قسم کے خیالات کو مشتہر کرنا فسادات کو دعوت دینا ہے ـــــ لیکن ابا میاں کی اطلاعات مُعتبر تھیں۔ بدیں وجہ اُنھوں نے خاموشی سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں کہ وہ ہر حالت میں فسادات کو روکنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔

شر پسندوں کا منصُوبہ یہ تھا کہ اب کے تعزیہ معمُول سے ڈیڑھ فٹ اُونچا رکھا جائے تاکہ جب وہ سڑک سے گذرے تو سرِراہ اُگے پُرانے پیپل کی ٹہنیاں آڑے آجائیں۔ دستور کے مُطابق تعزیہ نیچا نہیں ہو سکتا تھا کہ جھُکنے سے اس کی بے حُرمتی ہوتی تھی۔ اب کندہ کاٹنا ناگزیر ہو جائے گا تاکہ تعزیہ گذر جائے۔ لیکن یہ قدم ایک فرقے کے جذبات کو مجرُوح کرنے کے مُترادف تھا۔ اس طرح فساد اپنی بھیانک صُورت میں دکھائی دے رہا تھا ـــــ لیکن انگریز کلکٹر اپنی روایتی سہل انگاری اور تغافل پسندی میں پیش بندیوں کی مزاحمت کر رہا تھا۔ حق بات یہ تھی کہ ہندو مُسلم فساد سے اس کی نیند حرام نہیں ہوتی تھی۔

ابا میاں حکومت کے مُعتبر، مُعتمد اور اطاعت شعار افسر سمجھے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک بہت اہم اور ذمّہ دار عہدہ پر فائز تھے اور خان بہادر کے گرانقدر خطاب سے بھی نوازے گئے تھے۔ لیکن وہ اوّل و آخر ہندوستانی تھے۔ اُن کے سینے میں ایک وطن پرست، انسان دوست کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ہندو مُسلم اتحّاد اور صلح و آشتی کے خواہاں تھے ـــــ پھر اُن کے پُرخلوص اور بے لوث احباب میں دونوں فرقوں کے لوگ تھے۔ اُنھوں نے اُن سے رازدارانہ طور پر مشورہ کیا تو طے پایا کہ انگریزی حکومت فسادات کی روک تھام میں

سنجیدہ نہیں۔اس لئے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ مناسب پیش بندیاں کی جائیں تاکہ فسادات سر نہ اُٹھا پائیں ـــــ ابا میاں نے اپنے چند زمین دار دوستوں سے بات کی تو اُنھوں نے بڑے فخر سے اپنے لٹھیت بھیج دیئے ـــــ یہ بھی انتظام کیا گیا کہ مالی، دھوبی، مہتر، کوچوان، گھوسی اور نوکر چاکر ہندوؤں کے ساتھ پیڑ کے آس پاس گھومتے رہیں۔ اُنھوں نے اپنے بیٹوں اور اُن کے دوست احباب کو بھی تعزیے کے ساتھ رہنے کی تلقین کی تاکہ شرارت پسند عناصر کو مفسدہ پردازی کا موقع نہ ملے اور اگر وہ سر اُٹھائیں تو فوراً اُن کی سرکوبی کر دی جائے۔

تعزیہ نکلا۔ بے پناہ اژدہام تھا۔ سپاہیوں کی قطاریں دورویہ چل رہی تھیں۔ اتنے بڑے ہجوم کی نگہداشت کے لئے لے دے کے بارہ لاٹھی بند سپاہی تھے۔ انسپکٹر ہندو تھا اور کانسٹیبل سب مسلمان تھے۔ انگریز سپرنٹنڈنٹ بھی ساتھ چل رہا تھا۔ جلوس حسبِ توقع پیپل کے پیڑ پر آکر رُک گیا۔ وہ شاخ سے کوئی چھ سات انچ لمبا تھا۔ ایک منچلا لپک کر پیپل پر چڑھ گیا تاکہ کندہ کاٹ ڈالے۔ ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ ابا میاں اپنی زوردار، بارعب آواز میں گرجے،

"اگر کندہ نہ کاٹا جائے" ـــــ "تعزیہ نہیں نکل سکتا"

"اگر . . . " ـــــ "تعزیہ جھکے گا نہیں، بے حُرمتی ہو گی"

"نہیں، تعزیہ جھکے گا نہیں مگر نکل جائے گا" ـــــ "وہ کیسے؟"

ایک دَم تین چار آدمی پھاوڑے لے کر بھیڑ میں سے نکلے۔

"ہم سڑک کھود ڈالیں گے" ـــــ "مگر سڑک . . . . نئی سڑک"

"پھر بن جائے گی۔ کنکر ہی تو کُٹے ہیں" ابا پھاوڑا چلانے لگے۔

جلدی سے کسی نے اُن کے ہاتھ سے پھاوڑا چھین لیا۔ اور جُٹ گیا۔ ابا میاں نے دیکھا کہ آس پاس اُن کے کئی پیارے دوست اور خدمت گار موجود تھے۔

"وٹ از دس نان سینس۔ سپوائیلنگ دی نیو روڈ" سپرنٹنڈنٹ بولا۔ اُسے سخت غصّہ آرہا تھا[1]

مگر چشم زدن میں ڈیڑھ فٹ لمبی چوڑی اور فٹ بھر گہری قبر سی کھُد گئی۔ ابا میاں نے لپک کر تعزیے کو کندھا دیا۔ دُوسری طرف سے بہشتی نے لپک لیا۔ دو چار اور آگے بڑھے اور تعزیہ بخیر و عافیت گذر گیا ـــــ اور فساد اپنی مَوت آپ مر گیا۔

---

[1] عصمت چغتائی، "جہنم" (مضمون) کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اپریل۔ ۱۹۸۰ء) ص ۱۸

شہر بھر میں مسرت کی راحت بخش اور پُر سکون لہر دوڑ گئی۔ امن پسندی شر پسندی پر غالب آئی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس جس کے لئے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا، اپنا سا مُنہ لے کر رہ گیا۔ ابا میاں کی ہوشیاری، سُوجھ بُوجھ اور معاملہ شناسی کا چھار سُو چرچا ہونے لگا۔ یہ عام خیال تھا کہ اب اُن کی خدمات کے اعتراف میں حکُومت اُنھیں ترقی دے کر کلکٹر کا عُہدہ عطا کرے گی لیکن خلافِ توقع سرکار دولت مدار نے نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر تحقیقاتی کمیٹی بٹھا دی اور اُنھیں معطّل کر دیا گیا۔ سب دنگ رہ گئے۔

"آپ کو معلوم تھا کہ فساد ہوگا" ——— "جی ہاں"۔ ابا میاں نے جواب دیا۔

"کیا اس میں شریک تھے" ——— "نہیں"

"تو پھر اتنی پکّی خبر کیسے ملی" ——— "میرا رسُوخ ہے، شہر کے دونوں فرقوں کے لوگوں سے میرا گہرا تعلق ہے۔ مَیں کان کھُلے رکھتا ہُوں اور دماغ حاضر۔ مَیں نے جو کچھ بھی کیا اس کے نتیجے میں فساد ٹل گیا۔ اور تمام وُہ فسادات جو بڑے بڑے شہروں میں یہاں کی خبر سے ہونے والے تھے، ماند پڑ گئے۔ ہُوئے ہی نہیں یا ہُوئے تو بہت کمزور۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر تم نے سڑک کھودنے کی اجازت نہیں لی تھی اور جو بھی پلان بنایا، اسے ہمارے سامنے پیش کرکے عمل پیرا ہونے کی اجازت نہیں طلب کی۔ اس سے تمھاری باغیانہ طبیعت کا اظہار ہوتا ہے جو حکُومت کے لئے بڑا خطرہ بن سکتی ہے۔"

یہ محض حکومت کی کج بحثی تھی، حجّت بازی تھی اور ایک فرض شناس افسرِ اعلیٰ کی بلاوجہ تحقیر و تذلیل۔ حکُومت کو ابا میاں کا ایک پیچیدہ اور پُرخطر معاملے کو خود ہی خوش اسلوبی سے سُلجھا دینا نہ بھایا اور اب وُہ انھیں خفیف کرنے کی غرض سے الزام تراشیوں اور مُوشگافیوں کی پست سطح پر اُتر آئی ——— ابا میاں کے وکیل مشرا جی نے کہا کہ "ایک شہری کی حیثیت سے میرے مُوکّل نے جو قدم اپنی ذمّہ داری پر اُٹھایا وُہ درست ثابت ہُوا۔ صرف سڑک کھودنے پر میونسپلٹی بازپُرس کر سکتی ہے اور جُرمانہ ہو سکتا ہے" ——— لیکن حکُومت کی طرف سے جواب دیا گیا کہ "سرکاری افسر کو شہریت کے سوال کو بعد میں لانا ہوگا۔ پہلا سوال ڈیوٹی اور پروٹوکول کا ہے۔ ہر بات قاعدے سے ہونی چاہیئے۔ اصُول توڑنا بغاوت کی نشاندہی کرتا ہے ——— اور ابا میاں کو انگریزی کی نظم CHARGE OF THE LIGHT BRIGADE یاد آ گئی:

THEY'RE NOT TO QUESTION WHY
THEY'RE BUT TO DO AND DIE

ابا میاں کے وکیل نے جو بڑے کٹّر ہندو تھے، یہ نظم دھیمی آواز میں دُہرائی تو کمیٹی کے ارکان بے حد افروختہ ہُوئے۔

---

[1] عصمت چغتائی "جہنم" "مضمون" کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اپریل ۱۹۸۰ء) ص ۱۹

آمرانہ خصلت کے حکمرانوں کو بھلا یہ سننے کی تاب و توان کہاں تھی۔ مگر ابّا میاں خاموش متحمل اور بُردبار رہے۔ مشرا جی نے دھمکی آمیز انداز میں یہ بات واضح کردی تھی کہ اگر لندن تک جانے کی نوبت آئی تو بھی اُن کا مؤکل گریز نہیں کرے گا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ابّا میاں کی معطلی کا حکم منسوخ کردیا گیا اوران کی ملازمت بحال ہوگئی، مگر اُن کا تبادلہ لکھنؤ کردیا گیا جہاں وہ پہلے بھی متعین رہ چکے تھے۔

یہ واقعہ ابّا میاں کی شخصیت کے کئی اہم پہلوؤں کو آشکار کرتا ہے اوران کی شخصیت اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ اُجاگر ہوجاتی ہے۔ وہ انگریزی حکومت کے نمک خوار تھے اوراس کی وفاداری کا دَم بھرتے تھے اورانھیں اپنے افسران کا اعتماد اور اعتبار حاصل تھا لیکن وہ وطن پرست بھی تھے اوران کے سینے میں ایک سچے ہندوستانی کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد اور صُلح و آشتی کے متمنی تھے۔ اُنھوں نے اپنی ملازمت کو خطرہ میں ڈال کر بھی دُوراندیشی، موقع شناسی، بہادری اوراعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا عملی ثبوت دیا اور بہت تحمل و بُردباری سے اپنے فرائضِ منصبی کو نبھایا اور شہر کو امکانی فساد کی تباہ کاریوں سے بچالیا ـــــ وہ نہایت خوش خلق، ملنسار اور غیر متعصب انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں دونوں فرقوں کے بارسوخ اور معزز لوگوں کا اعتماد ہی نہیں بلکہ اُن کی رفاقت، ہمدمی اور ہم نشینی بھی حاصل تھی۔ یہ اُن کے روادار اور پُرخلوص ہونے کا بیّن ثبوت تھا ـــــ اور جب اربابِ بست و کشاد نے اُن کی قابلِ تحسین کارگذاری پر انعام و اعزاز دینے کی بجائے، کچھ اَنجانی مصلحتوں کے پیشِ نظر انھیں معطّل کردیا تو بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور اُنھوں نے کمال جیداری اور حوصلہ مندی سے اپنا مقدمہ کامیابی سے لڑا ـــــ وہ موقع شناس اور دقیقہ سنج تھے۔ اُنھوں نے روزمرّہ کے بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ تناؤ اور فسادات کے اُمڈتے ہوئے بھیانک خطرے سے دیدہ دانستہ اپنے بیوی بچوّں تک کو بے خبر رکھا تاکہ گھر کا سُکھ چین برباد نہ ہو اور اُنھوں نے صُورتِ حال کا ذکر ان سے تب کیا جب وُہ دن آن پہنچا جس کا دھڑکا لگا ہُوا تھا۔ یہ ان کی معاملہ فہمی اور دُوراندیشی کا ثبوت تھا ـــــ ابّا میاں لامذہب تھے۔ نماز روزے کے پابند نہیں تھے مگران کا قول تھا کہ ہرانسان اپنے اچھے بُرے اعمال کے مُطابق سزا و جزا کا مُستوجب ہُوگا۔ مذہب سے لاتعلقی کے باوجُود وہ مختلف مذاہب کے بُنیادی عقائد اور رُسوم و قیود سے پُوری طرح آگاہ تھے۔ اُن کے نزدیک کسی مخصُوص مذہب کا پیرو ہونا اتنا ضروری نہیں تھا جتنا کہ اخلاقی اور رُوحانی اقدار کا حامل اور عامل ہونا، جو کہ وہ تھے۔ کُشادہ دلی، وسیع النظری، تحمل و بُردباری ان کی شخصیّت کے اساسی عناصر تھے ـــــ گویا ابّا میاں ایک قابلِ قدر شخصیّت تھے۔

○ ان کی شخصیّت کا ایک اور پہلو پیش ہے جو بڑا دلچسپ اور رنگین ہونے کی وجہ سے ہماری خصُوصی توجّہ کا مُستحق ہے۔

اُن دِنوں ابا میاں آگرہ میں رہ کر اپنا مکان بنوا رہے تھے، جس کا ایک حصہ بن چکا تھا، جس میں وہ مقیم تھے اور دُوسرا حصہ زیرِ تعمیر تھا ——— بعدازاں پتہ چلا کہ مکان بنوانے کا تو محض بہانہ تھا۔ درحقیقت وہ راحت خالہ (عصمت کے تایا کی چھوٹی سالی) کے عشق میں مبتلا تھے، جو کم سنی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کے میاں بہت پس انداز چھوڑ گئے تھے۔ انھیں اُردو فارسی پر خاصی دسترس حاصل تھی شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ گلے میں نور تھا، ترنم سے پڑھتیں تو سامعین جھوم اُٹھتے۔ شکل و صورت کے اعتبار سے بھی خوب نہیں خوب تر تھیں۔ یہ لمبے سیاہ ریشم سے ملائم بال، یہ لانبا قد، یہ دُبلا پتلا صحت مند جسم، وہ حزن و ملال کی مُنہ بولتی تصویر تھیں ——— ابا میاں بھی گاہے گاہے شعر کہتے تھے۔ راحت خالہ کی رنگین صحبت میں اُن کی خوابیدہ رگِ شاعری بھی پھڑک اُٹھی۔ پھر نئے نئے تعمیر کردہ مکان کا پُرسکون رُوحانی سناٹا تھا ——— اُدھر راحت خالہ کو دھن دولت سے غرض نہیں تھی۔ جوانی کی اُداس تنہائی میں انھیں رفاقت کی ضرورت تھی اور چند میٹھے بولوں کی بھی، جو تسکینِ جان ہوں۔ اور چند مہکتے دہکتے شعروں کی جو دل و دماغ معطر کر دیں ——— ایسے میں فرشتہ بھی ہوتا تو بہک جاتا۔ ——— ابا میاں اور راحت خالہ دونوں ایک دُوسرے پر فدا ہو گئے۔

اماں کو اُڑتی اُڑتی خبر ملی تو ایک دن چپ چاپ کانپور سے آگرہ آ گئیں ——— میز پر کھانا لگ رہا تھا۔ ابا میاں شکایت کر رہے تھے کہ اماں نے نہ جانے کیوں اتنی دیر کر دی۔ اماں بھری پڑی تھیں کہ انھوں نے آتے ہی سارے معاملے کی تصدیق کر لی تھی۔ اُنھوں نے غصہ میں ہاتھ مار کر قابیں اُچھال دیں۔ ابا میاں نے اماں کا یہ رُوپ پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ معاملہ فہم تھے فوراً تاڑ گئے کہ بات کیا ہے۔ کیا دھرا سامنے آتا دکھائی دینے لگا۔

اماں کھانا اُلٹ کر زار و قطار رونے لگیں ——— ابا میاں شرم کے مارے سر جُھکائے بیٹھے رہے، پھر کہنے لگے:

"بیگم ہم تمھارے مجرم ہیں۔ ہم سے غلطی ہو گئی۔ ہم نے نکاح کر لیا" ——— "مجھے معلوم ہے"۔

"تم جو سزا دو ہمیں منظور ہے"۔ ——— "میرے بچے بُلوا دو میں آگرہ میں رہوں گی"۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو بیگم۔ ہم تمھارے اور بچوں کے بغیر کیسے جئیں گے"۔ ——— "تمھاری لاڈلی"۔

"تم ہو ہماری لاڈلی۔ ہماری زندگی۔ ہمارا ماضی اور مستقبل!" ——— "مگر نکاح کرتے وقت۔۔۔" اماں کا گلا بند ہونے لگا۔ "سات بچوں کے باپ۔۔۔"

"ہمیں خبر نہیں ہم اس وقت کہاں تھے۔ جب ہمیں ہوش آیا اور نکاح نامہ پر ہم نے دستخط

"دیکھے تو ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ ہم اُسی وقت وہاں سے اُٹھ کر چلے آئے۔"

"پھوپھی بادشاہی کے ہاں ہوا نکاح ؟" ——— "ہاں۔"

"ہوں، تو اُن کے دل کی تمنا پوری ہو ہی گئی۔ میری مانگ اُجاڑ کر چین آیا" ——— "ابھی

تو ہم زندہ ہیں بیگم۔ کاش مر جاتے۔ نہیں ہمیں مرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم جینا چاہتے ہیں۔"

"مجھے طلاق تو نہیں دوگے۔" اماں نے ننھی سی آواز میں پوچھا ——— "طلاق ! بیگم۔"

"میرے بچے طلاق کے بچے کہلائیں گے۔ کوئی میری بیٹیوں کو .... نہیں کرے جیسی ماں

ویسی بیٹی۔ کوئی تو کھوٹ ہوگا کہ قسیم بیگ چغتائی (ابامیاں) کو ——— اچھا میرے سر پر ہاتھ

رکھ کر قسم کھاؤ کہ مجھے طلاق نہیں دوگے۔" اُنھوں نے اباّمیاں کا ہاتھ اُٹھا کر سر پر رکھ لیا۔

"ہم نے اُسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اور ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم اسے ہاتھ لگائیں تو ہم کریم بیگ چغتائی

کے نطفہ سے نہیں۔"

"ہے ہے نہیں، یہ گناہ ہوگا" ——— "ہمارا ضمیر جس بات کو گناہ سمجھتا ہے وہ گناہ ہے۔"

"سرکار،" اماں تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں ——— "ہاں بیگم۔"

"اب تم ہزار شادیاں بھی کر لو مجھے پرواہ نہیں" ——— "کیوں کیا اب تمھیں ہم سے محبت

نہیں رہی۔"

"یہ بات نہیں شریف بیویاں محبت نہیں کرتیں۔ اپنے خدائے مجازی کی پرستش کرتی ہیں۔"

"بیگم پرستش پتھروں کی کی جاتی ہے، ہم انسان ہیں، تمھارے اپنے۔"

"تو بس آج ہی چلو خاک ڈالو اس کو بھی کو بننا ہوگا بن جائے گی۔"

اماں اسی دن اباّمیاں کو لے کر آگرے سے کانپور روانہ ہوگئیں۔[1]

عصمت نے اِس ناقابلِ یقین واقعہ کو دیکھا تو سر تا پا کانپ اُٹھیں اور اسے قلم بند کرتے ہوئے اُن کا توانا قلم بھی متزلزل ہو گیا۔ انھیں اپنے والدِ محترم سے جنھیں وہ خدا اور رسولؐ کے بعد سب سے قابلِ احترام ہستی تسلیم کرتی تھیں، یہ ہرگز امید نہ تھی کہ وہ اِس نوع کی لغزش کے مرتکب ہوسکتے ہیں۔ وہ تمام عمر سختی سے اپنے عقائد پر قائم رہے تھے اور اُن سے سرِ مو منحرف نہ ہوئے، لیکن اب ان کی صاف شفاف اُجلی اُجلی شخصیت دُھندلا سی گئی تھی، وقتی طور پر ہی سہی ——— "وقتی طور" پر اس لئے کہ اُنھوں نے منفعل ہو کر اعترافِ گناہ کر کے اس کی آلائش کو دھو دیا تھا۔ جب انسان اپنے کئے پر نادم و خجل ہوتا ہے، جب

---

[1] عصمت چغتائی "جہنم" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اپریل ۱۹۸۰ء) ص ۱۶-۱۷

اشکِ ہائے ندامت اس کی آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں تو فضلِ ربّانی اسے اپنی پُرعافیت آغوش میں لے کر اس کے آنسو پونچھ دیتا ہے اور اس کی تقصیر کو اپنے رحم و کرم سے معاف کر دیتا ہے۔

ابّا میاں بصد عجز و نیاز اپنی اہلیہ سے عفو کے طالب تھے۔ اُنھوں نے ایک لغزش کھائی۔ سنبھلے اور توبہ کرلی۔ کوئی کمزور انسان ہوتا تو شاید پھر بھٹک جاتا اور توبہ سے توبہ کر لیتا۔ لیکن وہ مضبوط قوتِ ارادی کے مالک تھے ایک بار پھر خطِ مستقیم پر رواں ہو گئے اور کبھی مُڑ کر نہ دیکھا ـــــــ اماں جہاندیدہ اور فہمیدہ تھیں۔ اُنھوں نے صورتِ حال کو پہچانا، نامکمل مکان بیچ میں ہی چھوڑا اور ابّا میاں کو "ثابت و سالم" لے کر کانپور روانہ ہو گئیں ـــــــ اب اُن کا ابّا میاں پر پھر سے بلا شرکتِ غیرے قبضہ ہو گیا۔

ابّا میاں اس واقعہ سے ہماری نظروں میں سربلند ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ فرشتہ نہیں انسان تھے۔ خیر و شر کا امتزاج۔ لیکن اصلاً وہ نیک سیرت تھے۔ ان سے سہو ہوا تو نادم ہو کر اپنے کھونٹے پر واپس لوٹ آئے۔ یہ سعادت ہر گناہگار کا مقدر نہیں ہوتی۔ یہ ابّا میاں کی ذات کا بڑا تابناک پہلو ہے، جو بے اختیار متاثر کرتا ہے۔

○ ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو:

ابّا میاں خاندان کے رُوحِ رواں تو تھے ہی، اُنھوں نے پورے خاندان کو باہم جوڑے رکھنے کی بھی بھرپُور کوشش کی تاکہ ان کے حینِ حیات اس کی سالمیت اور یک جہتی برقرار رہے اور وہ عام خاندانوں کی طرح انتشار اور بکھراؤ کا شکار نہ ہو جائے۔ یہ بھی ان کی شخصیت کا ایک قابلِ تعریف پہلو تھا۔ گرمیوں کی تعطیلات کے موقع پر وہ سب کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتے اور دعوت نامہ اس قدر دلچسپ ہوتا کہ کسی کو جراتِ انکار نہ ہوتی بلکہ سب خوشی خوشی اُمڈ گھمڈ کر آتے اور گھر میں جشن کا سماں بندھ جاتا۔ عصمت اس بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ سارا خاندان آچکا تھا یا آنے والا تھا۔ ابّا میاں نے سب کو لکھ دیا تھا کہ جو آئے گا اُسے دونوں طرف کا کرایہ، مناسب جیب خرچ، دو دو سادہ جوڑے اور ایک عدد جُوتا دیا جائے گا۔ ـــــــ بھلا کون تھا جو سر کے بَل نہ چلا آتا۔ پھر ابّا میاں کا حکم تو یوں بھی "حکمِ حاکم" تھا جس سے رُوگردانی ممکن نہ تھی۔ ایسے موقع پر شامل ہونا تو سب باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ قبل از وقت ہی خالص گھی کے کنستر منگوا لیے جاتے۔ بکریاں خرید لی جاتیں۔ انواع و اقسام کے پکوانوں کی فہرست مرتّب کر لی جاتی۔ خوب ہنسی مذاق ہوتا۔ دھوم دھڑکا ہوتا۔ زندگی ناچ اُٹھتی۔ یہ بھی ابّا میاں کی پُرکشش شخصیت کا بڑا دلکش پہلو تھا۔ جب تک ابّا میاں ملازمت میں رہے یہ سلسلہ جاری رہا۔

○ اور اب یہ آخری پہلو:

ابّا میاں بچّوں پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کے بارے میں جو کچھ ممکن تھا اُنھوں نے کیا۔ اور کسی اعتبار سے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ہاں اگر انھیں کبھی فکر ستاتی تو وہ شمیم (جو ان کا عصمت سے بڑا لڑکا تھا) کے مستقبل کے بارے میں تھی، جو یُوں تو اپنی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا تھا، مگر عصمت کے الفاظ میں "بے حد بدذات"

تھا۔ نہایت چالاک، چرب زبان، دروغ گو اور بکارِ خویش ہوشیار قسم کا انسان تھا۔ مطلب برآری اور ہیرا پھیری میں ماہر تھا لیکن پڑھنے لکھنے میں صفر تھا۔ یکے بعد دیگرے چار بار میٹرک میں فیل ہُوا۔ آخری بار فیل ہُوا تو گھر میں حُزن و ملال چھا گیا۔ اَبا میاں بھی جو فطرتاً رجائی واقع ہوئے تھے، رنج و غم میں ڈوب گئے۔ بولے: "اس پاجی کا مُستقبل کیا ہوگا" اَبا فکرمند مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ محفل کو جو قہقہہ زار بنی ہوئی تھی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ "اس کھلنڈرے ڈھولچی کا کیا بنے گا" ــــــ "سرکار فکر نہ کیجئے۔ اس سال میرے پاس جودھپور بھیج دیجئے۔ میں موٹر کو پیل ڈالوں گا۔ ضرور پاس ہو جائے گا" عظیم بھائی بولے۔ ــــــ اَبا بولے "یہ پاس ہونے والی آسامی نہیں" شمیم اَبا میاں کے لئے مُستقل دردِ سر بن گیا۔ جب کوئی چارہ نظر نہ آیا تو اسے جودھپور کلرک بھرتی کرا دیا گیا ــــــ اَبا میاں ایک شفیق اور دردمند باپ تھے۔ شمیم کا مُستقبل مشکوک دیکھ کر تلملا اُٹھے۔ ایک نالائق اور غیر ذمّہ دار بیٹے نے اُن کی نیند حرام کر دی تھی۔ اور ان کی مضطرب رُوح کو تب تک چین نہ آیا جب تک کہ اس کی روزی روٹی کا بُرا بھلا وسیلہ نہ بن گیا۔

اب جب اَبا میاں کی شخصیت کے تمام نمایاں پہلو ہمارے پیشِ نظر ہیں تو ان کی بھرپور اور جاندار شخصیت کا دوسرے ہمہ پہلو جائزہ لینا آسان ہو جاتا ہے ــــــ وہ ایک بہت بڑے خاندان کے سربراہ تھے۔ اس خاندان کو انھوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ اس کی نمو و نمو اُن کی مرہونِ منّت تھی۔ دس بچّوں کی دیکھ بھال، پالنا پوسنا، تعلیم و تربیت چنداں آسان کام نہ تھا لیکن یہ فریضہ انھوں نے بحُسن و خوبی نبھایا اور پدرانہ ذمّہ داریوں کو بطریقِ احسن ادا کیا۔ وہ ایک شفیق اور غم خوار باپ تھے ــــــ وُہ ایک مخلص اور دردمند شوہر بھی تھے۔ اُنھوں نے اپنی بیوی کو اپنا معتمد، صلاح کار اور رفیقِ حیات جانا اور ان کی ناز برداری بھی کی۔ اور شوہرانہ رُعب و تحکّم کو نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ راہ سے بے راہ ہوئے تو بیوی کے سامنے دوزانو ہونے میں اپنی اَنا کو سدّرِ راہ نہ ہونے دیا۔ اور بلا حیل و حجّت اعترافِ گناہ کرتے ہُوئے معافی مانگ لی۔ یہ ایک مثالی شوہر کا کردار تھا ــــــ وہ یاروں کے یار تھے۔ بےغرض، بے ریا، بے لوث ــــــ وہ ایک بہت اچھے افسر تھے۔ ذمّہ دار، فرض شناس، وفادار ــــــ وہ ایک بلند اخلاق انسان تھے اور دہریہ ہوتے ہوئے بھی رُوحانی اقدار کے قائل تھے۔ ان کا قول تھا کہ ہر انسان اپنے نیک و بد افعال کے مُطابق سزا و جزا کا مستوجب ہوگا۔ ــــــ سب سے بڑی بات یہ کہ اُن میں خود احتسابی کا مادہ تھا۔ دروں بینی اُن کا خاصہ تھا۔ گویا وہ اپنے کردار کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک نادر اور مُنفرد پہلو تھا ــــــ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ بحیثیتِ مجمُوعی وُہ ایک آئیڈیل انسان تھے۔

اماں

عصمت چغتائی کی والدہ کا نام نصرت خانم عرف نچھو تھا ــــــ عصمت نے اپنی والدہ کی شکل و صُورت کا نقشہ یُوں کھینچا ہے:

"گول مٹول، پیاری رنگت، سنہرے گھنگھریالے بال، شربتی آنکھیں، پھیلا ہُوا نقشہ ہے"[1]

اماں کی شخصیت سے روشناس ہونا ہو تو گھر کے مختلف افراد کے تعلق سے ان کے کردار کا جائزہ لینا ہوگا تاکہ ان کے خدوخال پوری طرح نمایاں ہو جائیں۔ ہمارے معاشرے کے متوسط اور نچلے طبقوں میں عورت عام طور پر محکوما نہ زندگی بسر کرتی ہے۔ گھر کے اہم معاملات میں آخری فیصلہ روزی روٹی کا وسیلہ جٹانے والے مرد ہی کا ہوتا ہے۔ عورت فقط گھر کے کام کاج کی چکی میں پسنے اور مرد کی ہاں میں ہاں ملا دینے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی۔ اس کی بڑی وجہ عورت کی ناخواندگی یا کم پڑھا لکھا ہونا اور اقتصادی طور پر مرد کا دستِ نگر ہونا ہے۔ وہ بیچاری زبان کھولنے تو کس برتے پر اور اگر کھولے بھی تو اُس کی آواز صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے۔ اُس کی شنی اَن سُنی کردی جاتی ہے کہ ہم اپنے بلند بانگ دعاوی کے باوصف عورت کو سماج میں وہ منصب و مقام نہیں دیتے جس کی کہ وہ حق دار ہے۔ لیکن اماں کا معاملہ ان تمام عورتوں سے قدرے مختلف تھا۔ تمام بچے اُن سے عزت و تعظیم سے پیش آتے تھے۔ ابامیاں بھی انھیں سرآنکھوں پر بٹھاتے تھے اور ان کی رائے کی قدر کرتے تھے۔ مگر کسی بات پر جب تناؤ پیدا ہوتا یا تصادم کا خدشہ دکھائی دیتا تو وہ دانش مندی اور حکمتِ عملی سے معاملہ نپٹا دیتے تھے۔ کتنا ہی شدید اختلاف کیوں نہ ہو، دوبدو تو تُو مَیں مَیں کی نوبت نہیں آتی تھی۔ ایسا بھی اکثر ہُوا کہ ابامیاں نے ہوشیاری اور عقل مندی سے اُن کے پس پُشت خاموشی سے معاملہ سُلجھا دیا ـــــ اماں بول چال میں بہت تیز اور طرار تھیں۔ بات بے بات اُن کا ہاتھ بھی اُٹھ جاتا تھا۔ کبھی کبھی غم و غصّے میں معاملہ کی تہہ تک پہنچنے میں قاصر رہتیں تو ابامیاں بڑی نرمی اور ملائمت سے سمجھا بجھا کر انھیں راہ پر لے آتے تھے۔ دو ایک مثالیں مُشتِ نمونہ از خروارے کے طور پر پیش ہیں۔ اُن کے بڑے لڑکے عظیم بیگ نے ان کی مخالفت کو نظر انداز کرکے اپنی بیوی کا پردہ ہٹوا دیا تو گھر میں طوفان برپا ہوگیا۔ اماں مصر تھیں کہ اس گستاخی اور دیدہ دلیری کی سزا اُسے ضرور ملنی چاہیئے اور اگر وُہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو بھلے ہی چلا جائے مگر اس کی گوشمالی ضرور ہونی چاہیئے تاکہ اوروں کو عبرت ہو۔ ابامیاں نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے معاملے کو طول دینے کی بجائے نہایت دانش مندی اور بُردباری سے، باتوں ہی باتوں میں نپٹا دیا ورنہ گھر بکھر جاتا۔ اماں میں فراست اور سُوجھ بُوجھ کی کمی تھی، جو نازک اور پیچیدہ معاملات کو حل کرنے کی راہ میں حائل ہوتی تھی ــــ دوئم، عصمت تعلیم جاری رکھنے پر بضد ہوئیں اور اُنھوں نے گھر سے بھاگ کر عیسائی مذہب اختیار کرنے اور کسی مشن اسکول میں داخلہ لینے کی دھمکی دی تو ایسا دکھائی دیتا تھا کہ معاملہ سنگین صُورت اختیار کرجائے گا اور عصمت اپنی دُھن کی پکّی اور سچّی گھر چھوڑ دیں گی۔ اماں حسبِ معمول بہت بگڑ گئیں۔ اُنھوں نے طعن و تشنیع سے بھی کام لیا اور ان کی طرف جوتی بھی کھینچ کر ماری لیکن ابامیاں نے نہ تو تاؤ کھایا اور نہ انھیں بُرا بھلا کہا۔ سارے معاملے پر دو دن ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و خوض کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عصمت

---

[1] عصمت چغتائی، "جہنّم"، (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (اپریل۔ ۱۹۸۰ء) ص ۱۵

کے حصولِ تعلیم کے بے پایاں اشتیاق کو مدِّنظر رکھتے ہُوئے، اس کی راہ میں کھڑا ہونا، اُسے گھر چھوڑنے پر مجبور کرنا ہے۔ اور اُنھوں نے بہت پیار اور شفقت سے نہ صرف عصمت کو علی گڑھ میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی بلکہ چھ ہزار روپیہ بھی مرحمت فرمایا اور آگرہ کا مکان بھی ا ا، کے نام کر دیا۔ یہ گرانقدر رقم (اس زمانے کے لحاظ سے) نہ صرف عصمت کی تعلیم کی کفالت کے لئے تھی، بلکہ ان کی شادی بیاہ، راجات کے لئے بھی۔ یہ ایک فراخ دل، دُور اندیش باپ کا اپنی بیٹی کو عطیہ تھا۔ اور لطف یہ کہ اماں کو خبر تک نہ ہُوئی کہ پسِ پردہ کیا ہُوا ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اماں کی برہمی، ناراضگی اور ترُش کلامی کا مداوا ابا میاں یوُں خاموشی اور دانش مندی سے کرتے تھے کہ ٹکراؤ اور تناؤ ٹل جاتا تھا اور گھر کی سالمیّت اور یک جہتی برقرار رہتی تھی۔ غیر شعوری طور پر اماں کا کردار اکثر اوقات تخریبی اور منفی ہوتا تھا اور ابا میاں کا شعوری طور پر تعمیری اور مثبت۔ اسے اماں کی خوش بختی کہئے کہ عقدہ کُشائی کا کریڈٹ میاں بیوی کو جاتا تھا نہ کہ فقط ابا میاں کو ——— سوئم، یہی بات عصمت کے پردہ ترک کرنے کے سلسلے میں بھی ہوئی۔ اماں واہی تباہی بکتی رہیں۔ پیچ و تاب کھاتی رہیں۔ اُنھوں نے سب اعزا و اقارب کی موجُودگی میں معمُول کے مطابق ان کی طرف جُوتی اُتار کر بھی پھینکی لیکن ابا میاں وقت کی آواز کو پہچانتے ہوئے نہ صرف خاموش رہے بلکہ در پردہ عصمت کو شہ دیتے رہے۔ نتیجہ یہ کہ بغیر کچھ کرے دھرے بات یوُں سُلجھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو ——— اماں اتنی معاملہ فہم ضرُور تھیں کہ ابا میاں جب اپنا فیصلہ صادر کر دیتے تو وُہ خوش دلی سے صاد کرتیں کیونکہ اُن کے سامنے کوئی متبادل نہ تھا اور نہ ہی اُن میں رُوگردانی کی تاب تھی۔

اماں نہ صرف زبان کی تیز تھیں بلکہ جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے غصّے کی حالت میں اُن کا ہاتھ بھی اُٹھ جاتا تھا۔ بیٹوں پر کم بیٹیوں پر زیادہ۔ عصمت کو جب وہ طفلی کی حُدود سے گذر چکی تھیں تب بھی پیٹ دیا کرتی تھیں۔ چنانچہ وہ اس بارے میں لکھتی ہیں:

> "بقول اماں کے شرم و حیا بیچ کھائی تھی میں نے۔ ہاتھ آجاتی تھی تو بلا کسی خطا کے مارنے لگتی تھیں۔ مگر میں دو تین دھول کھا کر بھاگ جاتی تھی۔"[1]

عصمت ضدی اور ہٹیلی ہونے کی وجہ سے اپنے فطری رُجحان اور میلان کے مُطابق کام کرنے کی عادی تھیں۔ اس لئے انھیں اماں کے غم و غصّہ کا کچھ زیادہ ہی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پھر عصمت چونکہ بڑے بھائیوں کی صحبت میں پلی بڑھی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی اُنھوں نے کھیل کود میں حصّہ لیا تھا۔ ان کے ساتھ ہی وُہ لڑی جھگڑی بھی تھیں۔ اس لئے وہ اپنی بڑی بہنوں سے مزاج اور رویّے میں مختلف تھیں۔ اماں کو اُنھیں مَردوں کے لئے مخصُوص کھیل کھیلنا بہت ناگوار گذرتا تھا کیونکہ وہ اُنھیں نسوانی وقار کے خلاف لگتا تھا۔ پھر عصمت کا بیباک اور مُنہ پھٹ ہونا بھی اُنھیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اسی وجہ سے اماں

---

[1] عصمت چغتائی، "باتیں عصمت آپا سے"، انٹرویو از ڈاکٹر شمع افروز زیدی۔ ماہنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی، سالنامہ جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۲۳

ان کے مستقبل کے بارے میں ہمیشہ تشویش رہی اور وہ انھیں اپنے طعن وتشنیع کا نشانہ بناتی رہیں۔ اماں کا یہ رویّہ عصمت کی دل آزاری کا سبب تو تھا ہی اماں کی ناسمجھی، ناعاقبت اندیشی اور حقیقت ناشناسی کا مظہر بھی تھا کیونکہ وُہ تعلیم سے قریب قریب بے بہرہ تھیں اس لئے معاشرے کے تیزی سے بدلتے ہوئے تقاضوں سے بھی نابلد تھیں۔

اماں کو اس بات کا سخت رنج تھا کہ ان کا بیٹا شمیم چار بار میٹرک میں فیل ہو کر تعلیم سے دست بردار ہو گیا، جبکہ عصمت سب کی مخالفت کے باوجود پہلی ہی کوشش میں اپنے بوتے پر سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کر گئیں۔ وہ دل سے چاہتی تھیں کہ کاش عصمت فیل ہو جاتی اور اس کی جگہ شمیم پاس ہو جاتا۔

وہ نتیجہ سُن کر اپنا ردِّعمل ضبط نہ کر سکیں اور بول اٹھیں:

"اے غارت ہو اس کمبخت کا پاس ہونا کس کام کا۔ بلا سے فیل ہو جاتی شمیم پاس ہو جاتا۔"

"ارے واہ! کیوں؟" میں (عصمت) لڑ پڑی۔

"ا نہہ لڑکی ذات کو کونسی ڈگریاں لینا ہے۔ مرد ذات کی تو زندگی خراب ہو گئی۔"[1]

عصمت نے دوٹوک حقیقت بیان کر دی:

"(شمیم) فیل نہ ہوتا۔ دن رات ہُوحق، ناچ گانے، جادرے کے نواب زادوں کی مصاحبت۔ آگرے میں مجرے۔"[2]

یہ سُن کر شمیم کے چہرے پر شرم وندامت کا سایہ تک نہ لہرایا۔ وُہ کھڑا بیشرمی اور ڈھٹائی سے مُسکراتا رہا۔

اماں کا ردِّعمل ایک ناخواندہ اور کم سمجھ ماں کا ردِّعمل تھا۔ ان کے نزدیک لڑکیوں کی تعلیم بے مقصد، بے معنی اور محض تضیع اوقات تھی۔ جبکہ لڑکوں کا گھر کا "اَن داتا"، "بریڈ وِنر" ہونے کے ناتے اپنی روزی روٹی کے لئے، گزربسر کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری تھا۔ یہ نہ صرف عصمت کے تئیں زیادتی اور ناانصافی تھی۔ بلکہ شمیم کی کم عقلی، تن آسانی اور غیر ذمّہ داری سے چشم پوشی بھی۔ اماں اس احساس سے قطعی بیگانہ تھیں کہ عصمت نے محض اپنے ذوق وشوق اور محنت مشقّت کے سہارے، ہر مزاحمت کو دُور کرتے ہوئے، اپنے مقصد کو پالیا، جو تمام خاندان کے لئے باعثِ صد افتخار تھا۔

اماں سے متعلق یہاں اِن واقعات کو نمایاں کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اِن سے اماں کے ابّا میاں، اپنے بیٹوں اور عصمت کے تعلق سے شخصیت کے مختلف پہلو آشکار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اماں کی شخصیت کی اَدھوری تصویر ہے۔ اماں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھیں۔

اماں کو ابّا سے بے پناہ محبت تھی۔ دونوں نے ساری زندگی ایک دوسرے کی باہوں میں جھُولتے گذار دی۔ اماں

---

[1]، [2] عصمت چغتائی: "سوچت" (مضمون) کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی، نومبر ۱۹۷۹ء۔ ص ۲۳

نے اُوپر تلے دس بچّوں کو جنم دیا۔ چھ لڑکے اور چار لڑکیاں۔ جو ان کی کوکھ کو روندتے ہوئے چلے آئے کہ اس پر انھیں اختیار نہ تھا۔ ان ڈھیر سارے بچّوں کے "جمِ غفیر" کو وہ مادرانہ شفقت و محبّت، پیار و دُلار نہ دے پائیں جو اُن کا فرض اور بچّوں کا حق تھا۔ کثرتِ اولاد نے اُن کی مادری شفقت کو تحلیل کر دیا —— بایں ہمہ اُنھوں نے اپنے کئی رشتہ داروں کے بچّوں کو بھی پالا پوسا۔ اُن کی یہ کُنبہ پروری قابلِ تحسین تھی۔ عصمت کے الفاظ میں :

"اُنھوں نے بڑے ابّا (عصمت کے تایا) اور ان کے بچّوں کو پالا۔ اپنی نند کے تین بچّے پالے۔ اور تو اور غیروں کے بچّے پالے۔ چچا میاں کی کتنی خاطر کرتی ہیں۔ سارا کُنبہ ان کی تعریف کرتا ہے۔ ابّا اور اُن کی جیسی نبھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے"[1]

امّاں کا یہ کردار ان کی فرض شناسی، کُنبہ پروری اور فراخدلی کا آئینہ دار ہے۔ کثرتِ اولاد کے باوجود اُنھوں نے اپنے فرائض کی حدُود سے گذر کر اعزا و اقارب اور ان کے بچّوں کی دیکھ بھال اور خاطر تواضع میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ یہ ان کی شخصیت کا بڑا روشن پہلو ہے، جو ان کی کئی کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔

امّاں "دوست نواز" بھی تھیں۔ اقبال اُن کی بچپن کی سہیلی اور مُنہ بولی بہن تھی۔ وُہ بہت ہوشیار اور دانشمند تھی۔ امّاں نے زندگی کے اسرار و رموز، داؤ پیچ اور اُونچ نیچ کی باتیں سب اُسی سے سیکھی تھیں اور امّاں اِس اعتبار سے اُس کی احسانمند اور شکر گذار تھیں —— اقبال مفلوک الحال تھی۔ اُس کے میاں جو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے، دفتر میں چپراسی تھے۔ اس کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹیاں ایک ایک کر کے جوں توں جہاں تہاں بیاہ دی گئیں۔ جب گذر بسر کا معقول وسیلہ نہ تھا تو لڑکیوں کے لئے جیسے بھی بَر ملے غنیمت تھے۔ اقبال نے جوڑ توڑ کر کے ان سب کی شادی کا بندوبست کر دیا اور اپنی ذمہ داریوں سے سُرخرو ہو گئی —— لڑکا نکمّا نکلا اور تعلیم سے بے بہرہ رہ گیا —— امّاں نے تمام عمر اس سہیلی کا ہاتھ تھامے رکھا اور جہاں تک ہو سکا اُسے محرومی اور نامرادی کا احساس نہ ہونے دیا۔ —— امّاں کے نجی گھر میں اُن کے دو بھائیوں کا بھی حصّہ تھا۔ کرایہ کچھ نہیں ملتا تھا۔ امّاں نے بھائیوں سے منت سماجت کی کہ وہ مکان اُسے دے دیں۔ مکان ملا تو اُنھوں نے اُسے اقبال کو دے دیا تاکہ وہ بے گھر، بے در، دَر دَر کی ٹھوکریں نہ کھاتی پھرے —— وہ سال میں دو دفعہ امّاں کے پاس آتی۔ جڑاول بنواتی۔ گرمیوں کے جوڑے بنواتی۔ بیٹیوں کی شادی کے لئے اُس نے پُورے پُورے جہیز بنوائے۔ یہ سب اُن کی مہربان سہیلی امّاں کی دین تھی۔ عصمت کو یہ سب باتیں اُن کی پھوپھی نے، جو رازہائے درونِ خانہ سے واقف تھیں، بتائیں۔ لیکن امّاں کی بلند اخلاقی ملاحظہ ہو کہ استفسار پر بھی وُہ یہی کہتی رہیں کہ یہ سب جھُوٹ ہے افترا ہے۔ اور تو اور ابّاں میاں نے

---

[1] عصمت چغتائی "تصادم" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (جون ۱۹۷۹ء) ص ۷

بھی پوچھا تو صاف مکر گئیں ـــــ نیکی کر اور دریا میں ڈال کی اس سے بہتر مثال کم ہی ملے گی۔ عصمت لکھتی ہیں:

"یہ باتیں سن کر میرے دل میں اپنی اماں کی اور عزت بڑھ گئی۔ وہ بڑی دل والی تھیں"[1]

اماں مذہب کے معاملہ میں اپنے وقت کی عام عورتوں کے برعکس متعصب اور تنگ نظر نہ تھیں۔ وہ مذہبی بھائی چارہ اور رواداری میں یقین رکھتی تھیں۔ کئی ہندو خواتین کے ساتھ اُن کے گہرے گھریلو مراسم تھے۔ ایک دوسرے کے ہاں بے تکلف آنا جانا تھا۔ انھیں کھانے پر بھی اپنے ہاں مدعو کرتی رہتی تھیں ـــــ پنڈت جی کو ستیہ نارائن کی کتھا کے لئے ایک روپیہ دیتی تھیں۔ ابا میاں بیمار ہوئے تو اُنھوں نے جہاں اُن کی درازیٔ عمر کے لئے اجمیر شریف میں چادر چڑھائی۔ وہیں پنڈت جی سے ستیہ نارائن کی کتھا بھی کروائی اور اُنھیں دھوتی اور دوشالہ بھی بھینٹ کیا۔ ـــــ عصمت پڑوس میں کرشن جنم اشٹمی کے موقع پر اپنی سہیلی کے ہاں جاتیں تو وہ کبھی سدِراہ نہ ہوتیں۔ بلکہ ان کی شرکت کو بنظرِ تحسین دیکھتیں ـــــ اماں اپنے مذہب کی اتنی ہی پابند تھیں جتنا کہ کوئی متقی اور پرہیزگار مسلمان ہو سکتا ہے لیکن اُن کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی نہیں بندھی تھی۔

اماں نے اپنی زندگی کے آخری ایام کسمپرسی اور بے کسی کی حالت میں گذارے۔ عصمت جودھپور انھیں ملنے گئیں تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ اماں جس نے خاندان کو دس گلگوتھنے بچے دیئے تھے وہ یکہ و تنہا حزن و ملال کی تصویر بنی جیسے تیسے دن گذار رہی تھیں۔ ابا میاں اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ بیٹیاں کبھی کی اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں اور اپنے خاندانوں میں پُرمسرت زندگی گذار رہی تھیں۔ بیٹے اپنے اپنے ٹھکانوں پر اپنے کنبوں کے ساتھ تھے اور اتنے بیٹے بیٹیوں میں اماں کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ شاید اُن سب کی نظروں میں آج وہ مدِ فضول بن کر رہ گئی تھیں۔ بے کار، بے مصرف۔ اتنے بڑے بھائیں بھائیں کرتے گھر میں وہ اکیلی تھیں۔ وہ گھر جس میں کسی وقت چہل پہل اور گہما گہمی رہتی تھی جس کے در و دیوار اور سقف و بام برملا قہقہوں سے گونج اُٹھتے تھے، آج اُداس اُداس اپنے مکینوں کی یاد میں گم سُم دکھائی دیتا تھا۔ یہ نیرنگیٔ زمانہ ہے۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ میں "چڑھاؤ" کی گھڑیاں دیکھتے ہی دیکھتے گذر جاتی ہیں جبکہ "اُتار" کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں ـــــ بڑھاپے کی اُداس اُداس تنہائی کا پل پل انسان پر بھاری ہو جاتا ہے۔ اماں اس کلیے سے مستثنیٰ نہ تھیں۔

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی اماں نے ابا میاں کے گھنے سائے اور بچوں کی ریل پیل اور چہل پہل میں ایک بھرپور زندگی گذاری۔ اور وہ سب مسرتیں اور شادمانیاں دیکھیں جس کی کہ ایک عام عورت تمنا کرتی ہے۔ خُدا کے فضل سے انھیں ناز برداری کرنے والا شوہر اور فرمانبرداری کرنے والے بیٹے بیٹیاں ملیں۔ پھر گھر میں کسی شے

---

[1] عصمت چغتائی "تصادم" (مضمون) کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (جون ۱۹۷۹ء) ص ۷

کی کمی نہ تھی اور انھیں زندگی کی سب نعمتیں اور آسائشیں بہ افراط مہیا تھیں۔ انھوں نے بہ رضا و رغبت جس کو جو چاہا دیا مگر کسی کے سامنے دستِ طلب دراز کرنے کی نوبت نہ آئی —— یہ توفیق ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتی۔

● عصمت چغتائی

عصمت چغتائی کی پیدائش ۲۱ اگست ۱۹۱۵ء کو بمقام بدایوں (یوپی) ہوئی (وہ اپنے خاندان کے دس بچوں میں نویں اولاد تھیں (اُن کے بھائی بہنوں کی ترتیب کچھ یوں ہے:

رفعت خانم، نسیم بیگ چغتائی، عظیم بیگ چغتائی، فرحت خانم، عظمت خانم، وسیم بیگ چغتائی، حسیم بیگ چغتائی، شمیم بیگ چغتائی، عصمت خانم اور عصیم بیگ چغتائی۔

گویا عصمت چغتائی تین بڑی بہنوں اور پانچ بڑے بھائیوں کے بعد پیدا ہوئیں) —— عصمت کی والدہ کا اتنے بچوں کو جنم دینا شاید اتنا مشکل نہ تھا جتنا کہ انھیں موزوں و مناسب طور پر پالنا پوسنا۔ چنانچہ کثرتِ اولاد کے باعث عصمت کے پیدا ہوتے ہوتے بچوں میں ان کی دل چسپی قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ عصمت اس بارے میں لکھتی ہیں:

> "اتنے سارے بچے تھے کہ ہماری اماں کو ہماری صورت سے قے آتی تھی۔ ایک کے بعد ایک ہم ان کی کوکھ کو روندتے کُلیلتے چلے آئے تھے۔ اُلٹیاں اور درد سہہ سہہ کر وہ ہمیں ایک سزا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں"[1]

گویا عصمت شفقتِ مادری سے محروم رہ گئیں اور انھیں بچوں کی ریل پیل میں وہ لاڈ چاؤ اور پیار دُلار نہ ملا، جو ہر بچے کا پیدائشی حق ہے اور جس سے محرومی کا احساس ایک حساس بچے کے قلب و ذہن کو تمام عمر کریدتا رہتا ہے۔ اور اس کے دل میں اپنی والدہ کے تئیں عزت اور عقیدت کا فطری جذبہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اُبھرنے سے قاصر رہتا ہے۔ چنانچہ عصمت اپنی اس محرومی کا ذکر یوں کرتی ہیں:

> "بکر بکر بچوں کے جمِ غفیر میں ایک پا پیادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی۔ نہ لاڈ چاؤ، نہ نخرے نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اُتاری گئی۔ نہ خود کو کبھی کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا"[2]

(یہ عصمت کے بچپن کی بے بسی اور کسمپرسی اور اُن کے تئیں اُن کی والدہ کی بے توجہی اور بے اعتنائی کی بڑی واضح تصویر ہے —— (عصمت سے یہ ناروا سلوک اس وجہ سے بھی تھا کہ وہ ایک لڑکی تھیں جو ہمارے معاشرے میں والدین پر بارِ گراں سمجھی جاتی ہے اور جو بلا وجہ طعن و تشنیع کا ہدف بنتی ہے اور جسے بھائیوں کے مقابلے کمتر اور

---

[1] عصمت چغتائی: "غبارِ کارواں" (مضمون) ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (نومبر ۱۹۷۰ء) ص ۶

[2] عصمت چغتائی: "بچپن اور خاندانی ماحول" (مضمون) اُردو ماہنامہ "مکالمات" "عصمت چغتائی نمبر" دسمبر ۱۹۹۱ء) دہلی۔ ص ۳۹

کہتر گردانا جاتا ہے۔

(عصمت کی دیکھ بھال یا تو انا کرتی یا اُن کی باجی۔ عصمت کو اپنی ماں کا دُودھ پینا نصیب نہ ہوا۔ عصمت اِس بارے میں کہتی ہیں:

"میری اماں نے کسی بچّے کو دُودھ نہیں پلایا۔ ان کے دُودھ میں کچھ خرابی تھی عظیم بیگ کو پلایا جنھیں ٹی۔بی ہوگئی۔ سب سے چھوٹے دسویں بچّے کو دُودھ پلایا، اُسے بھی ٹی بی ہوگئی۔ ڈاکٹر نے ٹیسٹ کرکے بتایا کہ اماں کا دُودھ خراب ہے۔ اُسے نکال کر ایک کُتے کے بچّے کو پلایا جاتا تھا۔ وہ پاگل ہوگیا۔ سب بچّوں نے اناؤں کا ہی دُودھ پیا۔"[1]

لیکن انا دو تین سال بعد چلی گئی اور جب وہ چار برس کی تھیں تو باجی کی شادی ہوگئی اور وہ اپنی سُسرال چلی گئیں۔ ایسے میں عصمت کا بھرے پُرے گھر میں تنہا تنہا اور کھویا کھویا محسوس کرنا اور خود کو بے یار و مددگار پانا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ ملاحظہ ہو:

"اُن دنوں کبھی کبھی خوابوں میں مجھے اندھیری خالی سڑک پر روتی ہوئی دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ایک چھوٹی لڑکی دکھائی دیا کرتی تھی۔ "وہ میں ہوتی تھی۔"[2]

کڑوے کسیلے، تلخ و ترش بچپن کے یہ تاثرات عصمت کے قلب و ذہن پر مرتسم ہوگئے اور انھوں نے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ اور کئی نفسیاتی اُلجھنوں کی نمود بھی کی۔)

عصمت نے جب ہوش سنبھالا تو ان کی تینوں بڑی بہنوں کی شادی ہو چکی تھی اور وُہ اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ اب عصمت پانچ بڑے بھائیوں میں اکیلی بہن تھیں۔ جب بھائیوں کے مقابل کسی معاملے میں اُن کی حق تلفی ہونے لگتی تو وہ سیدھی اپنے والد سے دادرسی کے لئے رُجوع کرتیں اور انھیں انصاف ملتا۔ والد کی پُشت پناہی اُن کے لئے بڑا سہارا تھی کہ وہ بیٹوں کے حق میں کبھی تخصیص روا نہیں رکھتے تھے ــــــ عصمت کی بڑی بہنیں امُورِ خانہ داری میں سگھڑ سیانی تھیں۔ گھر کے رکھ رکھاؤ، بُنائی، سلائی، کشیدہ کاری اور کھانے پکانے میں ماہر تھیں۔ اُردو فارسی اور قرآن شریف اُنھوں نے گھر پر ہی پڑھے تھے ــــــ مُقابلتاً عصمت پھوہڑ بے سلیقہ اور محنت مشقت سے گریز کرنے والی لڑکی تھیں۔ بھائی ان کی ضد اور ڈھٹائی سے نالاں تھے ــــــ ان کی بڑی بہنیں شادی سے پہلے گھر کی مختارِ کُل ڈھٹائی سے تھیں۔ اور ان کا کہا بھائیوں کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ بھائیوں کے کپڑے تک وہی سیتی تھیں۔ بدیں وجہ بھائی اُن میں برائیں

---

[1] عصمت چغتائی: "باتیں عصمت آپا سے"۔ انٹرویو از شمع افروز زیدی۔ ماہنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی، سالنامہ (جنوری ۱۹۹۲ء) ص ۲۴

[2] عصمت چغتائی: "میری آپ بیتی" مجموعہ "آدھی عورت آدھا خواب"۔ بیسویں صدی پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ نئی دہلی۔ ص ۹-۱۰

کے ممنون اور احسان مند رہتے تھے۔ لیکن ان کی نسبت عصمت بھائیوں کے لیے دردِ سر تھیں۔ اس وجہ سے اُنھوں نے ہمیشہ اُنھیں دھتکارا، پھٹکارا اور لتاڑا اور اُن کے ساتھ ذلّت آمیز سلوک کیا۔ عصمت اس بارے میں لکھتی ہیں:

"مہترانی جھاڑو دے رہی تھی کہ میں بغیر کسی اطلاع کے ایک دم پیدا ہوگئی۔ یوں تو اوز بچوں کی پیدائش پر میم آیا کرتی تھی مگر مجھے مہترانی نے سنبھالا اور اُسی نے نال کاٹا۔ اس لئے میرے بھائی بہن مجھے 'بھنگن کی لونڈیا' کہہ کر چڑایا کرتے تھے ـــــ میں نہایت ضدّی اور خودسر بن گئی تھی اس لئے میرا نام 'بھتنی' رکھ دیا میرے شریر بھائیوں نے"[1]

عصمت اپنے بھائیوں کی بدسلوکی اور بے حسی کو کبھی فراموش نہ کر پائیں۔

بہنوں کی غیر موجودگی میں عصمت بھائیوں کی صحبت میں پلی بڑھیں اور ان کے ساتھ ہی اُنھوں نے کھیل کود میں حصّہ لیا۔ اس بارے میں وہ لکھتی ہیں:

"میں اپنے بھائیوں کے ساتھ وہ سبھی کھیل کھیلتی جو لڑکے کھیلتے ہیں۔ گلی ڈنڈا، پتنگ بازی، فٹ بال کھیلتے کھیلتے میں بارہ برس کی ہوگئی"[2]

ان کھیلوں کے علاوہ عصمت اپنے بھائیوں کی ٹکّر پر پیڑوں پر چڑھتیں، سائیکل دوڑاتیں اور گھوڑے کی سواری کرتیں۔ وہ اپنے والد کی دریردہ شہہ پر ان سے ٹکّر لیتیں اور مات کھاتیں اور بھائی ان کا تمسخر اُڑاتے ـــــ وہ ان کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتیں تو پدتے پدتے کچومر نکل جاتا، فٹ بال کھیلتیں تو سب لّک ان کی چاند پر پڑتے۔ لیکن وہ کبھی احساسِ کمتری سے مغلوب نہ ہوتیں ـــــ بھائیوں کی صحبت میں عصمت کو کھلا اور آزاد ماحول ملا۔ گھر کے بیشتر افراد وسیع النظر اور تعلیم یافتہ تھے۔ لہٰذا ان میں خواہ مخواہ کی بناوٹ اور تصنّع نہیں تھا۔ سب ایک دوسرے سے بہت بے تکلّف تھے۔ آپس میں ہر موضوع پر بلا تکلّف گفتگو ہوتی۔ خواہ مخواہ کی شرم وحیا اُن کے مانع نہ تھی۔ اس آزاد اور کھلی فضا میں عصمت کو اپنے بھائیوں کی طرح آزادی سے سوچنے، اپنی راہ خواہ تراشنے اور اپنے فیصلے خود کرنے کی عادت پڑ گئی۔ عصمت لکھتی ہیں:

"سچ پوچھئے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے جن کی صحبت نے مجھے ان ہی کی طرح آزادی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم وحیا جو عام طور پر درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے، پنپ نہ سکی چھوٹی سی عمر سے دوپٹا اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر

---

[1] عصمت چغتائی: "باتیں عصمت آپا سے" انٹرویو از ڈاکٹر شمع افروز زیدی۔ ماہنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی سالنامہ (جنوری ۱۹۹۲ء) ص ۲۴

[2] بدماش جدید۔ مرغوب علی: "عصمت چغتائی کی آپ بیتی" دستاویز۔ راولپنڈی

شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھاڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔ سوائے عظیم بھائی کے سبھی گھر میں
چاق و چوبند تھے، کنبہ کا کنبہ حد درجہ بامذاق اور باتونی، آپس میں چھڑپیں چلتیں، نئے نئے جملے
تراشے جاتے۔ ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں۔ بچے بچے کی زبان پر سان رکھ جاتی ہے[1]

گھر کے اس ماحول اور اُن کی تربیت کے اس انداز نے عصمت کی فطرت میں بچپن ہی سے بے باکی، بے تکلّفی، یہاں تک کہ خودسری ضد اور باغیانہ رویّے کو فروغ دیا۔ اور وہ ایک مخصوص سانچے میں ڈھل گئیں جو ان کی پہچان بن گیا —— اس باغیانہ رویّے نے ان میں انسانی حقوق اور بالخصوص نسوانی حقوق کا احساس بیدار کیا، جس کی شدت و حدت وقت کے ساتھ ساتھ فزوں تر ہوتی چلی گئی اور جس کا اظہار وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اپنی تحریر و تقریر میں برملا کرتی رہیں —— اس نوع کی دو ایک مثالیں جن کا تعلق ان کی طفلی سے ہے پیش ہیں:

○ ان کے ہاں ایک سفید گھوڑی تھی جس پر سب بھائی باری باری سیر کیا کرتے۔ سائیس انھیں گھما پھرا کر لاتا۔ عصمت دور کھڑی انھیں للچائی نظروں سے دیکھتیں مگر دم نہ مار سکتیں کہ ان کی والدہ کا حکم تھا کہ گھوڑی پر چڑھی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔ ان کے نزدیک گھڑسواری لڑکوں کو ہی زیب دیتی تھی مگر عصمت گھوڑی پر چڑھنے کی ضد کرتی رہیں کہ اپنی دانست میں وہ کسی طور لڑکوں سے کم نہ تھیں۔ وہ جب اپنے کسی بھائی کو رعب سے گھوڑی پر سوار دیکھتیں تو مچل اٹھتیں مگر ماں کا حکم، جو مرگِ مفاجات سے کم نہ تھا آڑے آتا۔ ایک بار وہ گھوڑی کے پیچھے روتی ہوئی جا رہی تھیں اور بھائی شان سے گھوڑی پر بیٹھا تھا کہ اُن کے والد کچہری سے لوٹے۔ سائیس سے انھوں نے پوچھا:

"یہ کیوں رو رہی ہے؟"

اس نے بتایا۔

"گھوڑی پر بیٹھنا چاہتی ہیں۔"

ابّا نے کہا "تو بٹھاتے کیوں نہیں؟"

"جی بیگم صاحبہ کی اجازت نہیں ہے۔"

ابّا نے کہا "بٹھاؤ۔"

تب سے میں بھی روز سفید گھوڑی پر بیٹھنے لگی۔ گھوڑی پر بیٹھ کر مجھے اپنی فتح مندی کا بے پناہ احساس ہوا۔ باغی عصمت کی یہ پہلی فتح تھی۔ اس کے بعد تو والد جب بھائیوں سے نشانہ لگواتے تو میرے ہاتھ میں بھی کارتوس تھما دیتے اور نشانہ لگانا سکھاتے۔[2]

---

[1] عصمت چغتائی "بچپن اور خاندانی ماحول" اردو ماہنامہ "مکالمات"، نئی دہلی (عصمت چغتائی نمبر۔ دسمبر ۱۹۹۱ء) ص ۳۹

[2] عصمت چغتائی "میری آپ بیتی" (مجموعہ) "آدھی عورت آدھا خواب" بیسویں صدی پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ نئی دہلی ص ۸

فی الواقع یہ "باغی عصمت کی پہلی فتح تھی"۔۔۔۔۔۔ عصمت کے اندر پیدا ہونے والے اس شعور میں ان کے گھر کے ماحول کے ساتھ گردوپیش کے سماجی حالات اور واقعات کا بھی حصہ تھا جہاں ایک طرف ان کے گھر کا تعلیمی، روشن خیال اور آزادانہ ماحول ان کے بچپن پر براہ راست گہرے اثرات مرتب کر رہا تھا۔ وہیں دوسری طرف عصمت کا حساس اور بیدار بچپن اپنے معاشرے اور گردوپیش کے حالات و واقعات سے بھی بیگانہ و بے نیاز نہ تھا۔ سماج میں موجود عدم مساوات، ناانصافی اور خصوصاً عورتوں کے ساتھ ہونے والا ناروا سلوک بھی اس عہد کی ایک سنگین حقیقت تھی جس سے ان کا بچپن اثر قبول کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ مثال کے طور پر جب عصمت کے ابا ملازمت سے سبکدوش ہو کر آگرہ کے موروثی مکان میں رہنے لگے تو عصمت کو کھلی فضا میں رہنے کے بعد تنگ گلیوں کے بوسیدہ ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا۔ کہاں فٹ بال اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ کے محلہ پنجہ شاہی کی غلیظ گلیاں۔ اور ان گلیوں میں رہنے والی جھکی جھکی، سہمی سہمی نیم مدقوق لڑکیاں، جو اپنے دل کی دھڑکن سے ہی سہم جائیں۔ عصمت کی اُن سے بالکل نہ بنی اور ان بڑی بوڑھیوں سے بھی ٹھن گئی جو انھیں چھتوں پر قلانچیں بھرتا دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتیں "نوج بوا، بچھّو کی لونڈیا ہے کہ مُوا ابجار، توبہ، توبہ"۔ اور ان کی والدہ جنھیں لوگ پیار سے "بچھّو" کہتے تھے شرم سے پانی پانی ہو جاتیں۔۔۔۔۔۔ عصمت نے اپنے اردگرد دیکھا کہ عورتیں آئے دن بلاوجہ مردوں سے پٹتی ہیں اور دم نہیں مار سکتیں۔ وہ خاموشی سے ظلم سہتی ہیں اور شب و روز گھر کی چکّی میں پستی چلی جاتی ہیں گویا وہ گوشت پوست کی انسان نہ ہوں، بے زبان حیوان ہوں۔ عورتوں کی اس تذلیل نے عصمت کو بُری طرح جھنجھوڑ دیا۔ چنانچہ عصمت لکھتی ہیں :

> "میں خدا سے گڑگڑا کر دُعا مانگتی۔ اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنا دے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اُڑانے پر نہ پٹوں۔ گلیوں میں کبڈّی کھیل سکوں اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں"[1]

مختصراً اگر پرورش و پرداخت میں بے توجہی اور تغافل برتے جانے پر عصمت کے ہاں ایک نفسیاتی اُلجھن بچپن ہی سے پیدا ہو گئی تھی تو دوسری طرف گھر کے آزادانہ اور کھلے ماحول نے اُن میں جرأت و جسارت، بے باکی، خود سری اور خود اعتمادی پیدا کی۔ آگے چل کر سماجی کمزوریوں اور نابرابری کے ذاتی مشاہدات نے ان کی فطرت میں موجود عناصر کو ایک باغیانہ اور ضدّی رجحان میں بدل دیا۔

عصمت کی والدہ کو ان کی عادات ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ ان کو ہمیشہ ان کے "انجام" کی فکر ستاتی رہتی تھی۔ ان کی رائے میں یہ "مردمار باتیں عورتوں کو زیب نہیں دیتیں"۔ وہ چاہتی تھیں کہ عصمت اپنی بڑی بہنوں کی طرح اپنے آپ کو عورتوں کے محدود روایتی دائرے تک ہی پابند رکھیں، اور بس۔ مگر عصمت تو کسی اور ہی آب و گِل سے بنی تھیں۔ اُنھوں نے اپنی سُوجھ بُوجھ کے مُطابق چلنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اپنی پیش رفت میں وہ ہر رکاوٹ روند کر گذر جاتا

---

[1] عصمت چغتائی: "بچپن اور خاندانی ماحول"، اُردو ماہنامہ "مکالمات" (عصمت چغتائی نمبر۔ دسمبر ۱۹۹۱ء) نئی دہلی۔ ص ۳۴

چاہتی تھیں کہ وہ دُھن کی پکّی تھیں۔ اُنھوں نے بھائیوں کے حلقہ میں پرورش پائی تھی اور اُن پر فوقیت حاصل کرنے کی قسم کھائی تھی۔

"یہ نسوانیت مجھے ڈھونگ لگتی تھی۔ مصلحت مجھے جھوٹ معلوم ہوتی تھی۔ صبر بُزدلی، اور شکر مکاری۔ مَیں نے ہاتھ گھما کر کبھی ناک نہیں پکڑی۔ یہاں تک کہ بننا سنورنا، سنگھار کرنا اور بھڑکیلے کپڑے پہننا بھی مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں اپنے عیب چھپا کر دھوکا دے رہی ہُوں"[1]

عصمت کی ہوشیار، زمانہ ساز اور تجربہ کار سہیلیوں نے اُنھیں سمجھایا کہ "کوئی لڑکا ایسی لڑکی پر جان نہیں دے گا" عصمت کو ان کی بات میں سچّائی کی جھلک دکھائی دی۔ اور اُنھوں نے کچھ بدلنے کی کوشش کی لیکن اُن کے نامراد بھائیوں کی انگلی فوراً اُٹھ گئی کہ یہ سب مدِّمقابل کو پھانسنے کے حربے ہیں۔ اب بھلا عصمت کی کیا مجال کہ وہ آرائش و زیبائش کے لئے مصنوعات کا استعمال کرتیں ـــــ اور تجربہ نے عصمت کو بتایا کہ بناؤ سنگھار قطعاً ضروری نہیں۔

"مجھے دوستوں کی کبھی کمی محسوس نہ ہوئی۔ یہی دوستیاں اکثر عشق کی حدوں کو چھو گئیں"[2]

رُوس میں عصمت کو ایسی لڑکیوں سے ملنے کا اتّفاق ہوا جنھیں بناؤ سنگھار میں قطعاً دلچسپی نہ تھی، اور جو نہایت سادہ کام چلاؤ کپڑے پہنتی تھیں۔ اُنھوں نے ایک لڑکی سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس نے جواب دیا:

"ضرورت محسوس نہیں کی۔ کیوں کیا میں بُری لگتی ہُوں؟"

"نہیں، مگر اور زیادہ اچھّی لگوگی"

"مَیں کھر امال پیش کرنے کی قائل ہُوں۔ میری اپنی جِلد، اپنے ہونٹ، میری نسوانیت ہی کافی ہے" اُس نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔[3]

عصمت نے بچپن ہی سے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر عورت کی پسماندگی، بے بسی اور لاچاری دیکھی، اس نے انھیں بُری طرح متاثر کیا اور وہ اپنے فن کے توسّط سے اس کے حق میں مجاہدانہ جوش و خروش کے ساتھ آواز بلند کرنے لگیں۔ اور ان کی بلند بانگ صدائے حق آخری دَم تک رہ رہ کر اُبھرتی رہی۔ ان کے سارے فن میں آپ کو متوسط طبقے کی مُسلمان خاتون کی زندگی کے ہر پہلو کی محرومیوں کا بڑا مؤثر ذکر ملے گا۔ اور لطف یہ کہ ان کے فن میں تبلیغ کا شائبہ نہیں ملتا۔ انھوں نے تبلیغ بھی کی تو اس حُسن و خوبی سے کہ فن پر آنچ نہ آنے دی۔ وُہ کہیں مصلح اور مبلّغ کے طور پر بھُولے سے بھی سامنے نہیں آتیں ـــــ انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہمارے معاشرے میں عورت کی بدحالی کا بنیادی سبب اس کی اقتصادی غلامی ہے اور اِس سے اُسے تبھی نجات

۱، ۲، ۳ عصمت چغتائی "غبارِ کارواں" ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (نومبر ۱۹۷۰ء) ص ۱۰

مل سکتی ہے جب وہ پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ چار دیواری میں محبوس ناخواندہ عورت روزی روٹی کی خاطر اپنے شوہر سے، بھلے وہ کتنا ہی نکما اور نااہل ہو، چمٹے رہنے کو ہی قرینِ مصلحت سمجھتی ہے۔ چنانچہ عصمت اس بارے میں لکھتی ہیں:

"ایک لڑکی اگر اپنے وارثوں کا صرف اس لئے حکم مانتی ہے کہ اقتصادی طور پر مجبور ہے تو وہ فرمانبردار نہیں ڈھوکا باز مزدور ہوسکتی ہے۔ ایک بیوی شوہر سے صرف اس لئے چپکی رہتی ہے کہ روٹی کپڑے کا سہارا ہے تو وہ طوائف سے کم مجبور نہیں۔ اسی مجبور عورت کی کوکھ سے مجبور اور محکوم ذہنیت انسان ہی جنم لے سکیں گے۔۔۔ جب تک ہمارے ملک کی عورت مجبوراً چار ظلم سہتی رہے گی ہم اقتصادی اور سیاسی میدان میں احساسِ کمتری کا شکار رہتے رہیں گے۔"[1]

عصمت کو یہ لکھے ہوئے پچیس تیس سال گذر گئے۔ مگر اب حالات تیزی سے تغیر پذیر ہیں اور ہمارا معاشرہ بحیثیت مجموعی روبہ ترقی ہے۔

عصمت کے بچپن کے دو ایک واقعات پیش ہیں جنھوں نے انھیں حد درجہ متاثر کیا اور ان پر ایک مستقل چھاپ چھوڑی ان واقعات سے ان کی حساس، گداز اور نرم طبیعت پر روشنی پڑتی ہے۔

○ بچپن میں انھیں پہلی بار مرثیوں اور نوحوں کی صحیح نوعیت کا پتہ چلا۔ ایک مجلس میں ماتم منایا جارہا تھا جب علی اصغر کے حلق میں تیر پیوست ہونے کا ذکر آیا تو خوف کے مارے ان کی گھگی بندھ گئی اور انھوں نے بے تحاشا دھاڑنا شروع کر دیا۔ "کیوں مارا حلق میں تیر کیوں مارا" نوحہ خواں خواتین سمجھ نہ پائیں کہ عصمت کو کیا ہوا ہے۔ جب وہ زور زور سے روتی چلاتی عصمت کو چپ کرانے سے قاصر رہیں تو انھوں نے انھیں مجلس سے نکال باہر کیا۔ ان کے بھائیوں نے جو وہاں موجود تھے گھر پہنچ کر شکایت کی کہ عصمت نے بھری مجلسِ عزا میں بدتمیزی کی، شور و غل مچایا اور سب کے سمجھانے بجھانے پر بھی جب وہ خاموش نہ ہوئیں تو ان کے بھائیوں کو بھی چار و ناچار ان کا ساتھ دینا پڑا ــــــ لیکن عصمت تو گھر پہنچ کر بھی اُسی آہنگ اور انداز میں چلا چلا کر پوچھتی رہیں کہ "تیر کیوں مارا، ہاتھ میں مار دیا ہوتا۔ بیچارے کے حلق میں تیر کیوں مارا؟" اس سوال کا کسی نے جواب دینے کی زحمت ہی نہ اٹھائی اور اسے ایک سرپھری لڑکی کی بک بک سمجھ کر ڈانٹ ڈپٹ، گالی گلوچ حتیٰ کہ مار پیٹ سے چپ کرانے کی کوشش کی گئی لیکن بے سود۔ اب ان کا رونا چلانا مسلسل سسکیوں اور ہچکیوں میں بدل گیا۔ سب نے انھیں سو جانے کے لئے کہا مگر جب وہ آنکھیں بند کرتیں تو انھیں ایک معصوم بچے کے حلق میں پیوست تیر دکھائی دیتا اور وہ سو نہ پاتیں۔ بالآخر وہ شیخانی بوا (نوکرانی) کے پاس جا کر لیٹ گئیں کہ انھیں اکیلے سوتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

---

[1] عصمت چغتائی: غبارِ کارواں۔ (مضمون) ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (نومبر ۱۹۷۰ء) ص ۱۱

"کیوں مارا تیر؟" میں نے شیخانی بُوا کی بغل میں سِسک کر پُوچھا۔

"اوُ اُجید حرامی رہے۔" اُنھوں نے سمجھایا۔

"تو اس کے پاس بچّے کو کیوں لے گئے؟"

"بچّہ پیاسا رہے۔"

"تو اُسے دُودھ دیا ہوتا؟"

"دُودھ ماں کا کھسک ہوئی گوا رہے۔"

"تو پانی ہی دے دیا ہوتا۔"

"پانی کہاں رہے؟ نہر پہ تو اوُ کی بھوَج کا پہرہ رہے۔"

"کیوں؟"

"اب ای ہم کا جانیں۔ رہے کچھ گڑ بڑ۔"

"پھر؟"

"بچّہ کا پانی پیائے کھاتر نہر پہ لے گئے تو مار دیں تیر۔"

"حلق میں۔"

"ہاں۔"

اور میرے حلق میں بڑے بڑے کانٹوں دار گولے پھنسنے لگے۔

"تیر کی بچّی نہ سوتی ہے نہ سونے دیتی ہے"، میری اماں نے ایسے کس کس کے تھپّڑ اور گھونسے لگائے کہ سچ مچ میری کربلا کر دی۔[1]

گھر میں برسوں عصمت اس واقعہ کا موضوع بنی رہیں اور اسے کر ان کے بھائیوں نے ان کی تحقیر میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ ہر کس و ناکس سے وقت بےوقت چٹخارے لے لے کر اس کا ذکر کرتے اور انھیں چڑاتے، ستاتے، رُلاتے۔ زیبِ داستاں کے لئے وہ مرچ مصالحہ لگا کر یہ بھی بتاتے کہ اماں نے اُن کی خوب ٹھکائی کی تھی۔ عصمت شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں عصمت کی زندگی میں یہ پہلا المیہ تھا جس نے انھیں ذہنی طور پر ہلا کر رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی مجالس میں شرکت کرتے ان کا دَم نکلتا تھا کہ نہ جانے کب حلق میں تیر مارنے کا ذکر ہو، وہ رُویں چلائیں اور بیک بینی و دو گوش نکال باہر کی جائیں ـــــ اس نوع کے حادثات اور سانحات تاحیات کانٹے بن کر قلب و جگر میں چبھتے رہتے ہیں۔ اس واقعے

---

[1] عصمت چغتائی، "غبارِ کارواں" (مضمون)، ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (نومبر ۱۹۷۰ء) ص ۷

سے عصمت کی والدہ اور بھائیوں کی بڑی ناخوشگوار تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ ماں کو تو بچّوں کے بے لگام جھرمٹ میں کسی کو پچکارنے دُلارنے کی فرصت نہ تھی اور نہ ہی معاملے کی تہہ میں جا کر اُسے سمجھنے سُلجھانے یا اس کا مداوا ڈھونڈنے کی توفیق۔ اور بھائی عصمت کو مدِ فضول سمجھتے تھے۔ اپنے سے کمتر اور کہتر اور بدیں وجہ ناقابلِ اعتنا۔ اور اُن دِنوں بالعموم والدین یُوں بھی لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابل زیادہ قابلِ توجّہ نہ سمجھتے تھے ـــــــ یہ اور ایسے کئی دیگر واقعات نے عصمت کے قلب و ذہن پر اپنی مستقل چھاپ چھوڑی اور ان کی سائیکی کا حصّہ بن گئے۔

○ ایک اور واقعہ جس نے عصمت کو حد درجہ متاثر کیا پیش ہے ـــــــ عصمت کے والد روشن خیال اور وسیع النظر تھے۔ اُن کے بہت سے ہندو دوست احباب تھے جن سے ان کے گہرے گھریلو مراسم تھے۔ گو اس زمانے میں ایک خاص طبقے کے ہندو مُسلمان بہت سلیقے سے گھُلے ملے رہتے تھے اور ایک دُوسرے کے مذہبی احساسات کا فراخ دِلی اور بُرد باری سے پاس رکھتے تھے ـــــــ مگر جب یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ آخر وہ کسی نہ کسی اعتبار سے تو ایک دُوسرے سے مختلف ضرور ہیں، تو زبانی دوستی اور بھائی چارے کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی احتیاط بھی برتی جانے لگی ـــــــ اگر کوئی ہندو گھر میں کھانے پر مدعو ہوتا تو گوشت وونشت کا نام لینے سے بھی پرہیز برتا جاتا۔ ایک ہی میز پر اُن کے ساتھ کھانا کھاتے وقت بھی اس بات کی احتیاط برتی جاتی کہ ان کی کوئی چیز چھُو نہ جائے۔ سارا کھانا اُن کے گھر کے نوکر لگاتے۔ مگر ہندو مہانوں کا کھانا اُن کے پڑوس کا مہاراج لگاتا۔ برتن وغیرہ بھی وہیں سے منگوائے جاتے۔ اور عجیب گھٹن سی طاری ہو جاتی ـــــــ اُدھر بے حد روشن خیالی اور حبّ الوطنی کی باتیں ہوتیں۔ بڑے فخر سے ایک دُوسرے کی محبّت اور جاں نثاری کے تذکرے کئے جاتے اور انگریزی حکومت پر کھُل کر بغیر ذہنی محفوظات کے نکتہ چینی کی جاتی ـــــــ لیکن ساتھ ساتھ بُزرگ اس خدشے سے بھی لرزاں رہتے کہ کہیں بے عنان کھلنڈرے بچے کوئی ایسی نازیبا حرکت نہ کر بیٹھیں جس سے مہمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ ایسے میں عصمت کے گھر میں بچّوں اور بُزرگوں میں جو گفتگو ہوتی اس کا منظر پیش ہے:

> "کیا ہندو آرہے ہیں؟" پابندیاں لگتے دیکھ کر ہم لوگ بور ہو کر پُوچھتے۔
>
> "خبردار چاچاجی اور چاچی جی آرہے ہیں۔ بدتمیزی کی تو کھال کھینچ کر بھُوسہ بھر دیا جائے گا۔"
>
> اور ہم فوراً سمجھ جاتے کہ چاچا جان اور چچی جان نہیں آرہے ہیں جب وہ آتے ہیں تو سیخ کباب اور مُرغ مسلّم پکتا ہے۔ لوکی کا رائتہ اور دہی بڑے نہیں بنتے۔ یہ پکنے اور بننے کا فرق بھی بڑا دلچسپ ہے[1]

---

[1] عصمت چغتائی "غبارِ کارواں" (مضمون) ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (نومبر ۱۹۷۰ء) ص ۸

○ اور اب یہ آخری واقعہ پیش ہے جس نے عصمت پر اپنا دائمی تاثر چھوڑا۔

منگو اُن کے کوچوان کی بیٹی عصمت کی بڑی پیاری سہیلی تھی۔ عمر میں وہ ان سے کچھ ہی بڑی ہوگی تیرہ چودہ سال کی عمر میں ہی اُس کی شادی ہوگئی اور وُہ اپنے سُسرال چلی گئی جب وہ اپنی پہلوٹی کی بیٹی کو لے کر آئی تو اس کی طبعی شوخی اور شرارت اور ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ ناپید ہو چکی تھی اور وُہ مُرجھا سی گئی تھی۔ اس نے عصمت کو بتایا کہ بیٹی جننے کے جرم میں اس کی ساس اُسے بڑی بے رحمی سے مارتی پیٹتی ہے اور اُس کے میاں سے بھی پٹواتی ہے ـــــ منگو نے اُوپر تلے تین بیٹیوں کو جنم دیا تو اُس کے ہاں کہرام سا مچ گیا۔ ساس اس پر سوت لانے کے منصوبے بنانے لگی۔ منگو پر زندگی پہاڑ سا بھاری ہوگئی۔ منگو کے والدین، جو اس کی تین بچیوں کا بارِ گراں اُٹھانے سے قاصر تھے، آہیں بھرتے تھے ـــــ عصمت اپنی سہیلی کی تین روتی بسورتی ہنستی بچیوں کو بھاری دل سے دیکھتیں تو انھیں اس کی حالتِ زار پر رحم آنے لگتا کہ منگو عورت کی بے بسی اور بے چارگی کا بیّن ثبوت تھی۔ منگو کو دیکھ کر عصمت کو خیال آتا کہ خدائے رحیم و کریم نے انھیں (عصمت کو) عورت کیوں بنایا۔ اور وہ اندر ہی اندر خوفزدہ ہو جاتیں ـــــ عصمت نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی تو اُنھیں عورت کی بے بضاعتی اور بے وقعتی کا بڑا گھناؤنا اور لرزہ خیز منظر دکھائی دیا۔ ان کے پاس پڑوس کی بیشتر عورتیں مدقوق اور ستم رسیدہ تھیں۔ وہ خوشامد درآمد اور جی توڑ محنت مشقت کے بوتے پر سُسرال میں اپنی زندگی کے دن لشتم پشتم کاٹ رہی تھیں۔ وہ اپنے شوہروں، ساسوں اور نندوں کے رحم و کرم پر تھیں۔ یہ دیکھ کر عصمت کو اپنے عورت پن پر گھن آتی اور وُہ لرز لرز جاتیں ـــــ جب عصمت کے والد ملازمت سے سبکدوش ہو کر آگرہ آچکے تھے۔ انھیں عصمت کے توسط سے منگو کے معاملے کا پتہ چلا تو اُنھوں نے لکھنؤ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ذریعہ اس کے میاں پر دباؤ ڈالا کہ وُہ منگو پر سوت لانے سے باز رہے ورنہ اُسے قید و بند کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دھمکی کارگر ثابت ہوئی ـــــ کوئی سال بھر بعد منگو آگرہ آئی تو وہ پہچانی نہ جاتی تھی۔ اس کے ہاں لڑکا نہیں ہوا تھا پھر بھی وہ چکنی چپڑی دکھائی دیتی تھی اور اس کے رُوکھے سُوکھے، مُرجھائے ہوئے چہرے پر ہریالی اور شادابی تھی۔ استفسار پر اُس نے عصمت کو بتایا کہ اُس پر بھُوتوں کا سایہ ہو گیا تھا جو اس کے شوہر کے وُجود میں جاگزیں ہو کر اُسے ورغلاتے تھے اور وہ اپنی ساس کی ٹھکائی کرتی۔ یہاں تک کہ اُس نے ایک دن اپنے شوہر کی پنڈلی میں کاٹ کھایا۔ اِس سے سب پر اُس کی دہشت بیٹھ گئی ـــــ بھُوت اُتارنے والوں کو بُلایا گیا تو اُنھوں نے ساس کو منحوس قرار دیا اور کہا کہ اگر وہ ان کے ساتھ رہی تو منگو سات لڑکیوں کو جنم دے گی اور سارا خاندان برباد ہو جائے گا۔ ساس بیچاری کی شامت آگئی اور منگو کا میاں اُسے اپنے ساتھ اپنی نئی ملازمت پر ڈالی گنج لے گیا ـــــ عصمت اس معاملے پر اپنے ردِّ عمل کا اظہار بڑے مؤثر انداز میں یوں کرتی ہیں:

"تب مجھے معلوم ہُوا کہ منگو جاہل اور اَن پڑھ تھی۔ بالکل احمق نہ تھی۔ اپنی بساط بھر جو کچھ

کر سکتی تھی کر ڈالا۔ عورت کمزور ہو سکتی ہے، ناقص عقل ہونا ضروری نہیں۔ میرے دل سے کچھ احساسِ کمتری نکل گیا۔ لڑکا ہونا ضروری نہیں۔ لڑکوں جیسی عقل اور سوجھ بوجھ چاہیئے۔ پھر تو میں نے سینا پروتا اور سگھڑاپا دھرا طاق پر اور پڑھنے کی طرف متوجہ ہو گئی۔"[1]

عصمت نے یہ ایک سبق آموز اور بصیرت افروز واقعہ بیان کیا ہے جس نے انھیں عورت کے ایک ڈھکے چھپے پہلو سے روشناس کرایا اور ان کی نظر و فکر کو ایک نئی سمت عطا کی۔ انسان تجربات اور مشاہدات سے سبق سیکھتا ہے۔ اور ان کی روشنی میں اپنی راہ متعین کرتا ہے۔ تجربات سے قائم کردہ نظریات بڑے مستحکم اور مستقل ہوتے ہیں اور زندگی کے سفر میں خضرِ راہ بن کر ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ والدہ کی سخت گیری اور بھائیوں کی زور زبردستی اور حاسدانہ رویّہ سے دل برداشتہ عصمت نے اپنے والد کے ہمدردانہ اور مشفقانہ رویّے کے سہارے اپنی راہ خود تراشی اور اس پر پامردی اور ثابت قدمی سے رواں ہو گئیں۔

علی گڑھ

تعلیم کے معاملے میں عصمت کا گھرانہ اگرچہ بہت روشن خیال اور وسیع النظر تھا۔ لیکن یہ روشن خیالی اور وسیع النظری مردوں کی تعلیم تک محدود تھی۔ عورتوں کی تعلیم کے متعلق ان کے قلب و ذہن پر وہی پارینہ روایات اور فرسودہ و بوسیدہ نظریات مسلط تھے۔ گھر میں صرف عصمت کے والد مرزا قسیم بیگ اور بڑے بھائی عظیم بیگ قدرے آزاد خیال واقع ہوئے تھے مگر دیگر تمام افراد تعلیمِ نسواں کے متعلق حد درجہ دقیانوسیت کا شکار تھے۔ ان کی نظر میں لڑکیوں کی تعلیم نہ صرف معیوب تھی بلکہ مخرب الاخلاق اور غیر شریفانہ بھی ــــ عصمت کے خاندان کی زبان فارسی تھی۔ ان کے بڑے ابا (تایا) نے اپنے بیٹوں کو فقط فارسی میں تعلیم دی تھی اور وہ انگریزی سے یکسر نابلد رہے۔ وہ فارسی فر فر لکھتے، بولتے اور پڑھتے تھے۔ مگر انھیں بہت تگ و دو کے باوجود کہیں ملازمت نہ ملی اور بھوکوں مرے ــــ عصمت کے والد جو اپنے بڑے بھائی کی زبان پر صاد کر دیتے تھے۔ اس بات پر ڈٹ گئے اور انھوں نے برادرِ بزرگ کی مرضی کے خلاف اپنے بیٹوں کو انگریزی تعلیم دلانے کا فیصلہ کر لیا، مگر اپنی بیٹیوں کو فارسی تعلیم دلانے پر چنداں مزاحمت نہ کی۔ نتیجہ یہ کہ عصمت کی تین بڑی بہنیں فارسی کی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر شادی کے بعد اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں اور اب عصمت کے تختۂ مشق بننے کی باری تھی ــــ عصمت کے بھائیوں نے حاسدانہ جذبے کے تحت اپنے والد کے اس فیصلے پر بہت مسرت و شادمانی کا اظہار کیا اور اسے اپنی برتری گردانا۔ ان کی دانست میں عصمت کو ان کے مقابلے میں فضول گردانا گیا کہ جہاں ان پر انگریزی تعلیم کی راہیں کھل جائیں گی عصمت کو محض فارسی پر اکتفا کرنی

---

[1] عصمت چغتائی: "غبارِ کارواں" (مضمون) ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (نومبر ۱۹۷۰ء) ص ۱۱

ہوگی" "پڑھو فارسی بیچو تیل" کہ فارسی اب ایک متروک زبان تھی ــــــ عصمت کو بڑے ابّا نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ انھیں نماز پڑھنے اور عصمت کو فارسی پڑھانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا ــــــ عصمت نے بادلِ نخواستہ فارسی پڑھی اور موقع ملتے ہی اُسے ٹھکرا دیا۔ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کا حصول اور بھائیوں سے تعلیم میں فوقیت پانا ان کا نصب العین بن گیا اور وہ اپنے ارادے پر ہمت اور استقلال سے قائم رہیں ــــــ عصمت کا داخلہ چوتھی جماعت میں آگرہ کے دھن کوٹ اسکول میں کرا دیا گیا۔ اس بارے میں عصمت اپنے ابّا اور امّاں کے ساتھ ہوئی بحث کا ذکر بہت مؤثر اور فکر انگیز انداز میں یوں کرتی ہیں:

"امّاں نے کھانا بنانا سکھانا چاہا"

مَیں نے کہا: "مَیں تو نہ سیکھوں گی"

امّاں نے پوچھا: "کیوں نہ سیکھو گی؟"

مَیں نے کہا: "شہناز بھائی کیوں نہیں سیکھتے؟"

ماں نے کہا: "اس کی بیوی آئے گی وہ کھانا بنائے گی"

مَیں نے کہا: "اگر اُن کی بیوی مر گئی یا بھاگ گئی تو کون بنائے گا؟"

تبھی ابّا آ گئے۔ ساری بات سُن کر اُنھوں نے بڑے پیار سے مجھ سے کہا "کھانا تو عورتیں بناتی ہیں۔ سُسرال جا کر اُن کو کیا کھلاؤ گی؟"

مَیں نے جواب دیا "دولھا غریب ہوا تو کھچڑی بنا کر کھا لیں گے اور اگر امیر ہوا تو باورچی بنائے گا"

ابّا نے اُسی وقت سمجھ لیا۔ اِس بھتنی کا ہم کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

اُنھوں نے کہا "کیا کرو گی پھر تم؟"

میں نے کہا "سبھی بھائی پڑھتے ہیں میں بھی پڑھوں گی"

تب میرے ماموں مہینہ بھر تک مجھے گھر پڑھاتے رہے اور اس ایک مہینے میں صبح و شام میں نے اتنا پڑھا کہ اسکول میں چوتھی جماعت میں لے لی گئی۔ اُس کے بعد ڈبل پروموشن ملا اور میں چھٹی جماعت میں آ گئی"[1]

اس کے بعد عصمت کا خاندان آگرہ سے جلد ہی علی گڑھ منتقل ہو گیا اور وہیں سے انھوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ علی گڑھ سے ابّا میاں کا تبادلہ سانبھر ہو گیا۔ عصمت کو بھاری دل کے ساتھ علی گڑھ چھوڑنا پڑا اور اُن کے تعلیم جاری

---

[1] عصمت چغتائی "میری آپ بیتی" (مجموعہ) آدھی عورت آدھا خواب، بیسویں صدی پبلی کیشنز، نئی دہلی، ص ۱۱ ـ ۱۲

رکھنے کے منصوبے غیر متوقع طور پر ملتوی ہو گئے۔ انھوں نے گھر والوں کی بہت منت سماجت کی کہ انھیں بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا جائے لیکن انھوں نے سُنی اَن سُنی کر دی اور ان کا منہ یہ کہہ کر بند کر دیا کہ "بورڈنگ میں لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں"۔

—— درحقیقت ابا میاں نے یہ بات ایک ذاتی تلخ و ترش تجربے کی بنا پر کہی تھی جس کا عصمت کو پوری طرح علم نہیں تھا۔ اُنھوں نے عصمت کی دو بڑی بہنوں (دوسری اور تیسری بیٹیوں) کو کرامت حسین بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا تھا۔ عصمت چونکہ منجھلی بہن سے بہت مانوس تھیں، انھیں بھی ان دونوں کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس بھیج دیا گیا تاکہ اس کا جی لگا رہے۔ عصمت کو جو اس وقت بہت چھوٹی سی تھیں، اب بھی بخوبی یاد تھا کہ اس کی بڑی بہن باجی بورڈنگ سے اکثر غائب ہو جاتی تھی اور وہ نوکرانی کے پاس رو رو کر "باجی باجی" پکارا کرتی تھیں۔ پر نہ جانے کیوں ابا میاں نے کسی مصلحت کی بنا پر اُنھیں بورڈنگ سے واپس بلا لیا۔ عصمت نے ہوش سنبھالا اور اُنھوں نے ذرا کرید کر گھر والوں سے اس واقعہ کی تفصیل جاننا چاہی تو انھیں کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ انھیں فقط اتنا بتایا گیا کہ اُن کی سخت بدنامی ہوئی تھی اور ان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا تھا اور سارا خاندان اُن کی بہنوں کے تعلیم کے معاملے کو لے کر بغاوت پر آمادہ ہو گیا تھا کہ تم لڑکیوں کو عیسائی بنا رہے ہو۔ یہ شادیوں سے بھی محروم رہ جائیں گی اور تمام عمر گھر میں پڑی سڑتی رہیں گی —— اماں رو رو کر ہلکان ہو گئیں۔ ابا میاں نے بھی معاملہ ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر گھٹنے ٹیک دیئے۔ اُن کے اعزا و اقارب اور دوست احباب کی بھی رائے تھی کہ "لڑکیوں کو تعلیم دلوانا اُنھیں پیشہ کرانے سے بھی زیادہ ذلیل حرکت ہے"[1] —— یہی پست ذہنیت اور کج فہمی تھی جس نے مُسلم عورتوں کو عرصۂ دراز تک ناخواندہ رکھا۔ انھیں تعلیم دلوانا اخلاقی گراوٹ کا مظہر گردانا گیا۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنا اپنے مذہب سے منحرف ہونا اور عیسائی مذہب کو قبول کرنے کے مترادف سمجھا گیا۔ لیکن یہ مفروضہ زیادہ تھا اور حقیقت کم، جس میں زیادہ تر خام خیالی کو دخل تھا۔ یہ ایک بے بصیرت، فرسودہ اور بوسیدہ نظریہ تھا جس نے تعلیمی اعتبار سے پوری مُسلم قوم کو مفلوج کر دیا تھا۔ یہی کھوکھلی اور پوچ منطق تھی جس نے سر سید احمد خان کی تحریک کو جنم دیا —— نتیجہ یہ ہوا کہ عصمت کی تینوں بڑی بہنیں تعلیم سے محرُوم رہ گئیں اور انھوں نے گھر پر ہی فارسی پڑھی، امُورِ خانہ داری سیکھے اور اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں —— حیرانی اس بات کی ہے کہ ابا میاں بھی جو روشن خیال، فہمیدہ اور جہاندیدہ تھے اپنی بڑی بیٹی کی بے راہ روی سے دل برداشتہ ہو کر اُسی رو میں بہہ گئے۔ وہ اس حقیقت سے بے نیاز رہے کہ قصُور ان کی بیٹی کا تھا نہ کہ طریقۂ تعلیم اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کا —— اُنھوں نے عصمت کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرانا "آوارگی" کو دعوت دینا سمجھا۔

عصمت کے ساتھ اُن کی بھانجی نیّر بھی سانبھر پہنچی اور جلد ہی دونوں تنہائی اور اُکتاہٹ سے دل برداشتہ

---

[1] عصمت چغتائی، "تصادم" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (جون ۱۹۷۹ء) ص ۸

ہوگئیں۔ شب و روز بیکار بیٹھے رہنے سے انھیں گھُن سا لگنے لگا۔ مگر نامساعد حالات عصمت کی توانا قوتِ ارادی اور ان کی تعلیم جاری رکھنے کی خواہش کو دبا نہ سکے۔ شاید انھیں اس گھپ اندھیرے میں بھی دُور کہیں روشنی کی کرن دکھائی دیتی تھی کہ وہ فطری طور پر رجائی تھیں۔ مایوسی اور ناامیدی کو انھوں نے کبھی نزدیک نہ پھٹکنے دیا تھا۔ حزن و ملال سے مغلوب ہو کر ہمت ہارنا اُن کا شیوہ نہ تھا — حسنِ اتفاق سے عصمت نے ایک صندوق سامان کی کوٹھری میں دیکھا۔ کھولا تو پتہ چلا کہ اس میں اُن کی بڑی بہن کی بڑی محنت اور شوق سے اکٹھی کی ہوئی کتابیں ہیں، جو وقت کی دست بُرد کے ہاتھوں بوسیدہ اور سیلن زدہ ہو گئی تھیں۔ اُن میں "تہذیبِ نسواں"، "سہیلی"، "عصمت" اور "مخزن" رسائل کی پُرانی کاپیاں تھیں — مولوی نذیر احمد اور راشد الخیری کی تصنیفات بھی تھیں۔ عصمت اور نیر فرطِ مسرت سے دیوانی ہو گئیں اور کتابوں پر پل پڑیں۔ — عصمت کا شوقِ کُتب بینی بیکراں تھا۔

عصمت رات کو بھی پڑھتی رہتیں۔ لالٹین کا تیل ختم ہو جاتا تو چھت پر جا کر چاند کی روشنی میں پڑھتیں۔ راجپوتانہ میں چاند بہت روشن ہوتا ہے کہ فضا میں نمی کی دُھند نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وُہ انتہائے شوق میں سب کتابیں چاٹ گئیں اور پھر پہلے کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ گئیں۔

عصمت کو اپنے والدین پر غصّہ نہیں رحم آتا تھا کہ وہ صُورتِ حال کا صحیح جائزہ لینے سے قاصر تھے۔ ان کی فکر و نظر کا دائرہ بہت محدُود تھا — اُن کی اَمّاں کو صرف ان کی شادی کی فکر تھی اور انھیں خدشہ تھا کہ مارواڑ میں موزوں بَر کا ملنا بڑا مشکل ہوگا۔ انھوں نے عصمت کی بڑی بہنوں کی شادی دھُوم دھام سے کی تھی اور جہیز بھی اپنی بساط سے بڑھ چڑھ کر دیا تھا۔ وہ عصمت کی شادی بھی ویسی ہی کرنا چاہتی تھیں — ابّا میاں اپنے گذشتہ تجربے کی بنا پر عصمت کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل نہیں کرانا چاہتے تھے تاکہ وُہ وہاں کی مسموم فضا سے محفوظ رہیں، گو ان کے اس نظریے کا کوئی عقلی یا منطقی جواز نہ تھا۔ ان کا اندازِ فکر جتنا حقیقت سے ماورا تھا اتنا ہی عصمت کے مفاد کے خلاف بھی تھا۔ اس معاملے میں عصمت کی فہم و تفہیم اُن سے کہیں زیادہ صاف اور مثبت تھی۔ چنانچہ عصمت استہزائیہ انداز میں لکھتی ہیں: "ذہنی طور پر وہ بچے ہیں۔ میں ان سے زیادہ بوڑھی ہوں۔"[1]

عصمت کا بھائی شمیم میٹرک کا امتحان بیچ میں چھوڑ کر گھر بھاگ آیا۔ معلوم ہوا کہ اسے گھر سے جو فیس ملتی تھی وہ اسے ڈکار جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وُہ امتحان کی فیس جمع کرانے سے قاصر رہا اور فیل ہو گیا۔ عصمت کے لیے یہ تصوّر ہی سوہانِ رُوح تھا کہ ان کا بھائی دیدہ دانستہ اپنی زندگی سے کھلواڑ کرتا ہُوا تعلیم کو لات مار دے جبکہ انھیں تعلیم کو جاری رکھنے کی اجازت نہ ملے۔ محض اس لئے کہ وہ لڑکی ہیں جن کے لئے حصُولِ تعلیم چنداں ضرُوری نہیں —

---

[1] عصمت چغتائی "پھر علی گڑھ چھوٹا" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اگست ۱۹۷۹ء) ص ۵۴

یہ تضاد اُن کی رُوح کو چاٹتا تھا۔ وہ لاکھ سر پٹکتیں لیکن راہِ نجات دکھائی نہ دیتی۔

اماں خاموشی سے عصمت کی شادی کی تیاریوں میں مصروف رہیں۔ انھوں نے اماں کو ایک روز یہ کہتے ہوئے سُن لیا کہ انھوں نے مقامی بزاز سے پتہ کرلیا ہے کہ جب حکم ہوگا سانجھ میں ہی ہر چیز دستیاب ہوجائے گی۔ زیورات بھی حسبِ خواہش بن جائیں گے ــــــ پھر ایک دن اماں نے انجان بن کر عصمت کو ایک خط دیا کہ ابا میاں کی میز پر رکھ دیں۔ خط میں عصمت کا پیغام تھا اور ساتھ ہی ایک خوبصورت چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے لڑکے کا فوٹو تھا۔ خط پڑھ کر عصمت کا خون کھول اُٹھا۔ انھیں یقین ہوگیا کہ ان کے ماں باپ ان کی جلد از جلد شادی کرنے پر تُلے ہوئے ہیں جبکہ ان کا نصب العین ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اور خود کفیل ہونا ہے۔ وہ مَن ہی مَن میں جوموسوموکے انداز میں تصادم پر کمربستہ ہوگئیں ــــــ انھوں نے اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ کو لکھا کہ وُہ دخل اندازی کریں اور جیسے بھی ہو شادی رکوائیں۔ عظیم بیگ نے جواب دیا کہ لڑکا جوان کے ایک عزیز دوست کا چھوٹا بھائی ہے، ڈپٹی کلکٹر ہے اور مراد آباد کے ایک معزز خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ تمھیں وُہ لوگ بچپن میں دیکھ چکے ہیں اور یہ پیغام میرے توسط سے ہی آیا ہے۔ ہاں اگر تم پڑھنے پر بضد ہو تو بعد ازاں پرائیویٹ طور پر امتحان دے سکتی ہو۔ اس دل شکن جواب نے عصمت کی قوتِ ارادی کو کمزور کرنے کی بجائے اُسے اور زیادہ استحکام اور استقلال عطا کیا۔ انسان جب کچھ کر گذرنے پر کمربستہ ہو جاتا ہے اور اپنے مقصد کے حصُول کے لئے ہر ممکن قُربانی دینے پر تُل جاتا ہے تو منزل خود اس کی قدم بوسی کے لئے آگے بڑھتی ہے۔

بہت غور و خوض کے بعد عصمت کو ایک بڑی کارگر اور تیر بہدف تدبیر سُوجھی۔ انھوں نے اپنے ماموں زاد بھائی جُگنو کو، جن کی قربت انھیں حاصل تھی لکھا کہ آپ اس مُصیبت کی گھڑی میں میرے کام آئیں اور میرے ابا اماں کو لکھیں کہ آپ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہیں اس پر میرے والدین عظیم بیگ کے مجوّزہ رشتے کو بالائے طاق رکھ کر آپ سے رُجوع کریں گے۔ ساتھ ہی عصمت نے انھیں صدقِ دلی سے یقین دلایا کہ وہ ہرگز ان سے شادی کے لئے مصر نہیں ہوں گی ــــــ عصمت کو یقین تھا کہ اس کے والدین اس تجویز کو بصد شوق قبُول کریں گے۔ کہ جُگنو نہ صرف سارے خاندان کا چہیتا اور لاڈلا تھا بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور اس کا مُستقبل بھی روشن تھا۔ عصمت کے الفاظ میں "مجھے معلوم تھا جگنو سونے کا لڈّو ہے۔ سارے خاندان کے بیٹیوں والے اس پر دانت لگائے بیٹھے ہیں۔ میرے تُرپ کے اِکّے کو کوئی نہیں کاٹ سکتا"[1] اندازہ صحیح نکلا اور تیر نشانے پر بیٹھا۔ عصمت نے کمال خاموشی سے یہ کام اس حسن و خوبی سے کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ پسِ پردہ کیا ہُوا ہے اور یہ ایک سربستہ راز ہی رہا۔

---

[1] عصمت چغتائی "پھر علی گڑھ چھوٹا" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اگست ۱۹۷۹ء) ص ۴۶

دھیان رہے کہ عصمت بہر طور تعلیم تو حاصل کرنا چاہتی ہی تھیں لیکن انھیں شادی سے بھی ایک گونہ خوف و ہراس لگتا تھا۔ بچپن ہی سے یہ خیال ان کے ذہن نشین کرا دیا گیا تھا کہ شادی ان کی بربادی کا باعث ہوگی کیونکہ اُن سی کم رو، زبان دراز، اکھڑ مزاج اور امورِ خانہ داری سے عاری لڑکی سے کسی کی بھی گذر ممکن نہیں۔ چند دن میں ہی میاں طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کریں گے۔ اس لئے وہ چاہتی تھیں کہ معاملے کو فی الحال بالائے طاق رکھ دیا جائے اور حصولِ تعلیم کو ہی اولین ترجیح دی جائے۔ اُنھیں یقین تھا کہ ان کے عزم بالجزم کے سامنے بالآخر ان کے والدین کی مزاحمت چرمرا جائے گی۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

> "ترپ کا اکّہ تو چیک گیا، مگر اب مجھے جوکر کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ مجھے پڑھنے کے لئے علی گڑھ جانا تھا۔ لوہے کے چنے تو اب چبانے کا وقت آرہا تھا۔"[1]

(امّاں کو اطمینان ہو گیا کہ اب عصمت کی جگنو سے شادی ایک طے شدہ امر ہے اور انھوں نے شادی کی تیّاریاں کچھ زیادہ ہی زور شور سے کر دیں۔ شادی کے کئی جوڑے بنوائے گئے۔ زیورات بھی تیّار ہو گئے اور وہ شادی کی ساعتِ سعید کا انتظار کرنے لگیں ــــــ اِدھر عصمت کو یقین تھا کہ شادی کا معاملہ تو رفت گذشت ہوا اب بورڈنگ ہاؤس کی تیّاری کا وقت سر پر ہے) اُنھوں نے امّاں کی نظروں سے اوجھل کچھ سادے جوڑے اور دیگر ضروری سامان تیار کر لئے ــــــ اسکول کھلنے کا وقت قریب آرہا تھا اور انھوں نے داخلہ فارم ابھی تک منگوائے نہیں تھے۔ وہ بے یقینی کی سولی پر ٹنگی تھیں مگر ظاہر ہے کہ یہ تذبذب کی حالت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ عصمت لکھتی ہیں: "پھر ایک دن ٹوٹے پھوٹے ہتھیار سنبھالے اور میدان میں اُتر گئی۔"

اتنے بڑے کنبے میں عصمت اپنے محاذ پر تن تنہا تھیں۔ ان کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ ~~ممد و معاون نہ تھا~~ ایک روز اُنھوں نے وضو کیا۔ فجر کی نماز پڑھی۔ خاموش دعائیں مانگیں۔ اُنھیں یوں لگا کہ نا امیدی میں بھی کوئی نامعلوم غیبی طاقت اُن کا ہاتھ تھامے اُن کی ہمّت بڑھا رہی تھی۔ وہ مونڈھے پر بیٹھی امّاں ابّا کو باری باری نگاہوں کی ترازو میں تول رہی تھیں۔ شاید ابّا میاں نے اُن پر مرکوز عصمت کی نگاہوں کی حدّت محسوس کی اور اُنھوں نے اُن پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی مگر دونوں کی آنکھیں ٹکرا گئیں۔ عصمت نے پلک تک نہ جھپکی۔ ورنہ ان میں اپنے والد کی بڑی بڑی روشن اور بارعب آنکھوں کی تاب لانے کا دم نہ تھا (وہ جانتی تھیں کہ ان کے والد جس عادی مجرم کی طرف بھی نظر بھر کر دیکھتے وہ پانی پانی ہو جاتا اور اسے اعترافِ جرم کئے ہی بنتی)

> "میں پڑھنے کے لئے علی گڑھ جانا چاہتی ہوں۔" میں نے کہہ ہی دیا اور میری آواز میں

---

[1] عصمت چغتائی۔ "پھر علی گڑھ چھوٹا" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اگست ۱۹۷۹ء) ص ۴۶

کوئی لرزش نہ تھی ـــــ "پڑھتی تو ہو اپنے بڑے ابا (تایا) سے۔"

"مَیں میٹرک کا امتحان دینا چاہتی ہوں۔" ـــــ "کس کام آئے گا۔ دو سال رہ گئے ہیں جگنو کے ... پھر ... بیکار ..."

"میں میٹرک کرنا چاہتی ہوں۔" ـــــ "مگر ذرا سوچو کیا فائدہ ہے۔ اس سے تو بہتر ہے تم کھانا پکانا اور سلائی وغیرہ سیکھو۔ تمھاری بہنوں بہنیں کتنی سلیقہ ور ہیں۔ اور تم۔ ۔"

"مجھے سلیقہ سے دلچسپی نہیں۔ میں پڑھنا چاہتی ہوں۔" ـــــ "نہیں بیکار ۔ ۔"

"تو مَیں چلی جاؤں گی۔" ـــــ "کہاں چلی جاؤ گی؟" ابا میاں نے اخبار رکھ دیا۔

"اسکول۔ ۔" ـــــ "اسکول؟ کون سے اسکول؟"

"کسی بھی اسکول میں۔ ۔" ـــــ "نہیں ہم تمھیں اسکول وغیرہ نہیں بھیجیں گے۔ کل سے تم متنجن کی ترکیب سیکھو اور حبشی حلوہ سوہن ۔ ۔"

"مجھے متنجن سے قے آتی ہے۔ میٹھے چاولوں میں گوشت اور حبشی حلوہ سوہن بھی پسند نہیں۔ میں اسکول جانا چاہتی ہوں۔ صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ علی گڑھ۔ ۔" ـــــ "ہم تمھیں علی گڑھ نہیں بھیج سکتے۔ شوکت (ننھے میاں کی بیوی عصمت کی بھاوج) بڑی لاپرواہ ہیں اور تم نہایت خودسر ہو۔ اس کا کہنا نہیں مانو گی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو خاندان کی بدنامی ہوگی۔"

"تو میں خود چلی جاؤں گی۔" میرے اوپر بھوت سوار ہوگیا۔

ان کی شعلہ بار آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ میں بھسم نہ ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا تاج محل کی مشرقی برجی سے لٹکی ہوئی ہوں۔ رسّی کمزور ہے۔ میری ہتھیلیاں خونم خون ہو رہی ہیں۔ کوئی دم میں رسّی چھوٹ جائے گی اور سنگ مرمر کے بے رحم فرش کی طرف میرا جسم لپکے گا اور میں پاش پاش ہو جاؤں گی۔"

"کہاں چلی جاؤ گی؟" ـــــ "کہیں بھی۔"

"بس یونہی چل دو گی۔" ـــــ "ہاں گھر سے نکل کر تانگہ لوں گی۔ وہاں سے اسٹیشن جا کر کسی ڈبّہ میں بیٹھ جاؤں گی۔"

"پھر؟" ـــــ "کسی بھی اسٹیشن پر اتر کر مشن اسکول کا پتہ پوچھتی پہنچ جاؤں گی۔ وہاں عیسائی ہو جاؤں گی۔ وہاں مجھے جتنا چاہوں گی پڑھنے کا موقع ملے گا۔" تھوڑی دیر سناٹا گونجتا رہا۔ اماں کا سر وتہ مفلوج ہوگیا۔

"سن رہی ہو بیگم۔ یہ کیا بک رہی ہے۔" ـــــ "خدا غارت کرے کمبخت کو خاندان کے منہ کو

کالکھ لگائے گی۔"

"مگر ٹانگہ تو سانجھ میں ہے ہی نہیں۔" ابا میاں کی آنکھوں میں شرارت چمک اٹھی۔ "اور ہماری رتھیں اور سرکاری اونٹ تمھیں ہماری اجازت کے بغیر نہیں ملیں گے۔"

ابا میاں کے رویّہ میں اندر ہی اندر تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ وہ پسیج رہے تھے۔ عصمت کے ارادے کی پختگی رنگ لانے لگی تھی۔

"میں پیدل چلی جاؤں گی۔" میں نے مشرقی مینار سے لٹکتی ہوئی رسّی کو اور مضبوطی سے تھام لیا۔

میری ہتھیلیوں میں سانجھ جھیل کا نمک ہولے ہولے جذب ہو رہا تھا۔

"غارت ہو کلموہی۔" امّاں نے جوتی کھینچ کے ماری جو دانہ کی متلاشی مرغی کے لگی۔ اور نہ جانے کیوں میں ہنسی دباتی بھاگی۔

مجاہد تو نرم خون سہی مگر جاں بازی سے مورچہ وقتی طور پر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔[1]

دو دن عصمت نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ اندر والے کمرے میں دروازہ کھٹ کی بند کیے پڑی رہیں۔ نوکرانی کھانے کے لئے بلانے آتی تو وہ سوتی بنی لیٹی رہتیں۔ امّاں کھسیانی ہو کر کہتیں "بھوک لگے گی کھالیں گے۔ شہزادی صاحبہ کے لئے خوان سجا کے لے جانے کی ضرورت نہیں" ــــــ لیکن عصمت بھوک ہڑتال کر کے گاندھیائی ستیہ گرہ کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔ رات جب بھوک شدید لگتی تو وہ چپکے سے اٹھتیں اور باورچی خانے میں ادھر ادھر بچی کھچی جو چیز بھی ملتی اس سے منہ مارتیں۔ کوفتوں کے لئے بھنے ہوئے چنے، سوکھی مری گاجریں، گوبھی کے ٹکڑے، گری پڑی روٹی، ڈبوں میں رکھے بادام کشمش۔ دو گلاس پانی غٹا غٹ حلق سے اتارتیں۔ سونے کی کوشش کرتیں تو نیند چکمہ دے جاتی ــــــ یہ خاموش احتجاج تھا جو شاید اس بات اعلان تھا کہ "جنگ ابھی بند نہیں ہوئی۔ فریقین پھر سے مورچے سنبھالنے والے ہیں۔

تیسرے روز عصمت کو ابا میاں نے اپنے کمرے میں بلایا۔

"مشن میں جانے کے بارے میں کیا فیصلہ ہے؟" ــــــ میں چپ رہی۔

"عیسائی ہو جاؤ گی؟" ابا میاں نے پوچھا ــــــ "ہاں۔"

ننھے اور شوکت

"بیوقوف ایسی الٹی سیدھی باتیں سوچنا بھی نہیں چاہئیں۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تمھیں پڑھنے کا اتنا شوق ہے۔ تم ننھے اور شوکت (بھائی اور بھاوج جو ان دنوں علی گڑھ میں مقیم تھے) کے ساتھ رہ سکتی ہو۔"

پھر انھوں نے مجھے ایک کتاب دی۔

۱؎ عصمت چغتائی "لوہے کے چنے" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (ستمبر ۱۹۷۹ء) ص ۲۵-۲۶

"یہ پاس بُک ہے۔ اپنے دستخط سے تم پوسٹ آفس سے روپیہ نکلوا سکتی ہو۔ اس میں چھ ہزار روپے ہیں۔ اِسے تم جہیز سمجھو یا اپنا حق۔ ہم تمھاری ذمہ داری سے دست بردار ہوتے ہیں۔"

کتاب لے کر میں سکتہ میں رہ گئی۔

"اس کے علاوہ آگرہ کا ایک مکان ہم نے تمھارے نام کر دیا ہے۔ چاہے اسے بیچو یا کرائے پر اُٹھاؤ، تم جانو" ــــــ اُنھوں نے مجھے مکان کے کاغذات تھما دیئے۔

ایک دم میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جیسے ناؤ میں بٹھا کر، پتوار ہاتھ میں دے کر، مانجھی مجھے اکیلا چھوڑ گیا۔

"ارے بیوقوف روتی کیوں ہو۔ فوراً داخلے کا فارم منگواؤ اور تیاری کرو۔ ہاں بیوی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ کپڑوں اور کرائے کے لئے یہ پچاس روپیہ رکھو۔"[1]

اقتباس طویل سہی لیکن بے حد جاذب اور بصیرت افروز ہے۔ اس کے آئینے میں ہم عصمت اور ابا میاں دونوں کی شخصیتوں کو دیکھ سکتے ہیں ــــــ عصمت نے اپنے والد سے گفتگو کے دوران جس جرأت و جسارت، پامردی اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے، وہ بے اختیار متاثر کرتا ہے۔ والد کے سامنے تو ان کے بڑے بھائیوں کو بھی دم مارنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ لیکن وُہ اپنے حق کے حصول کے لئے پہاڑ آسا ڈٹ گئیں اور ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ وہ اپنے مقصد کو پالینے کے لئے جو ہو سو ہو کے موڈ میں تھیں۔ اپنے والدِ بزرگوار سے جو گھر کے مرکز و محور اور مختارِ کُل تھے یہ کہنے کے لئے دل گُردہ چاہیئے تھا کہ میرے لئے تعلیم کے دروازے کھول دیجئے، ورنہ مَیں خود کھول لوں گی ــــــ اگر گھر چھوٹنا بھی پڑا تو چھوڑ دوں گی۔ اگر تبدیلیٔ مذہب کی نوبت آئی تو اس سے بھی گریز نہیں کروں گی۔ اگر اعزا و اقارب سے ہمیشہ کے لئے مُنہ موڑنا پڑا تو بھی بخدا موڑ لوں گی ــــــ لیکن میں تعلیم ضرور حاصل کروں گی کیونکہ یہ میرا نصب العین ہے۔ میرے لئے جزوِ ایمان ہے۔ مجھے اپنی بڑی بہنوں کی طرح اُمورِ خانہ داری اور سگھڑپنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے عصمت کی رگوں میں اسپات تھا جس نے انھیں بے لچک بنا دیا تھا۔ انھیں ٹوٹنا گوارا تھا جھکنا قبول نہ تھا۔ اپنے والدِ محترم کے سامنے بھی، جو عصمت کے لفظوں میں "خدا اور رسولؐ" کے بعد انھیں سب سے زیادہ قابلِ احترام تھے ــــــ عصمت کا عقیدہ تھا کہ اگر عورت کو مرد کی غلامی سے نجات پانی ہے تو اس کا تعلیم یافتہ ہونا ازبس ضروری ہے تاکہ وُہ اس کے شانہ بشانہ کھڑی ہو سکے۔ پھر تعلیم اسے مرد کی اقتصادی غلامی سے بھی چھٹکارا دلا دے گی اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے اس سے نبرد آزما ہو سکے گی۔ ورنہ مرد تو اپنی فطری برتری کے

---

[1] عصمت چغتائی: "لوہے کے چنے" (مضمون)، "کاغذی ہے پیرہن"؛ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (ستمبر ۱۹۷۹ء) ص ۲۷-۲۸

زعم میں اُسے اپنے پاؤں تلے روندتا گذر جاتا ہے۔ عصمت کا کردار دیکھ کر نہ جانے یہ مصرع کیوں بے اختیار زبان پر آجاتا ہے ۔ خوب لڑی مردانی وہ تو (۔۔۔۔ اور داد دیجئے ابا میاں کی دور اندیشی اور مردم شناسی کی کہ انھوں نے فوراً ہی بھانپ لیا کہ عصمت اپنے عزم سے ٹلنے والی نہیں اور ان کی طرف سے مزید مزاحمت پر حالات بے قابو ہو جائیں گے اور پھر کچھ کئے دھرے نہیں بنے گا۔ انھیں بطور پدرِ شفیق یہ بھی احساس رہا ہوگا کہ گھر سے بھاگ کر یہ بے سہارا، بے یار و مددگار لڑکی نہ جانے کن حوادث کا شکار ہو جائے۔ انھوں نے رُخ بدلا اور کمال خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے اُسے چھ ہزار روپے، جو اُن دنوں بڑی معقول رقم تھی، دیئے تاکہ نہ صرف وہ عصمت کی تعلیم و تربیت بلکہ شادی کے فرائض سے بھی سُبکدوش ہو جائیں۔ اور غیر منقولہ جائیداد بھی مرحمت فرمائی تاکہ کرایہ سے اُن کی مستقل آمدنی کا بھی وسیلہ ہو جائے۔ یہ ایک بالبصیرت، جہاندیدہ، زمانہ کا سرد گرم چشیدہ باپ کا کردار تھا ــــــ غور فرمائیے کہ اس وقت عصمت کی عمر جو ڈیڑھ پندرہ سال سے اوپر نہیں رہی ہوگی اور ان کی تعلیم صرف آٹھویں درجہ تک تھی۔ اور ابھی انھیں گھر کی چار دیواری میں محفوظ بے رحم زمانے سے واسطہ بھی نہیں پڑا تھا لیکن ان کا عزم بڑے بڑوں کو شرماتا تھا۔ ایسے ہی لوگ وقت کے ریگ زار پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔)

(روانہ ہونے سے پیشتر ابا میاں نے پیار اور شفقت سے انھیں ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ "تمھارے دانت بہت صاف ہیں۔ پان مت کھانا نیم کی مسواک ضرور کرتی رہنا اور ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے نہانا"۔ ــــــ "اماں بولیں" اے ہے سردیوں میں بھی ــــــ "ہاں جاڑوں میں بھی تازہ پانی سے بلا ناغہ نہانا۔ اور کھیلوں میں برابر حصہ لینا۔ بہت موٹی ہو رہی ہو۔)

پراسپیکٹس اور فارم آگیا۔ اور عصمت نے بھر کر بھیج دیا۔ انھیں پیشتر ہی بتا دیا گیا کہ انھیں نویں جماعت میں داخلہ مل سکتا ہے نہ کہ دسویں میں ــــــ حسبِ توقع علی گڑھ میں اُن کی اپنی بھاوج سے نہ بنی اور وہ بورڈنگ ہاؤس جانے کے لئے تیار ہو رہی تھیں کہ اُن کے بھائی آگئے۔

"کہاں جا رہی تھیں؟" ــــــ "بورڈنگ!"

"نہیں بورڈنگ تم نہیں جاؤ گی" ــــــ "میں قطعی جاؤں گی"۔

"تمھیں ہم بورڈنگ نہیں جانے دیں گے" ــــــ مجھے ہنسی آئی۔ چاہا کہدوں آپ کے والدِ بزرگوار بھی یہی کہتے تھے"۔[1]

عصمت کے اس جملے کا کٹیلا اور زہریلا طنز ملاحظہ ہو!

عصمت اسکول کی نئی پرنسپل خاتون آپا کے سامنے پیش ہوئیں تو انھوں نے اصرار کیا کہ انھیں نویں کی بجائے

---

[1] عصمت چغتائی "لوہے کے چنے"، "(مضمون)" کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (ستمبر ۱۹۷۹ء) ص ۲۹

دسویں کلاس میں داخلہ دیا جائے۔ پرنسپل انھیں سمجھانے لگیں کہ ضد نہ کرو تم فیل ہو جاؤ گی تو اسکول کا نتیجہ خراب ہوگا ــــــ عصمت نے پورے اعتماد کے ساتھ پُرجوش لہجے میں کہا کہ میں کبھی فیل نہیں ہوں گی۔ میں سخت مُصیبتیں جھیل کر اور گھر والوں کی ناراضی مول لے کر یہاں آئی ہُوں۔ مجھے تو بہر حال پاس ہونا ہی ہے۔ میں سخت محنت کروں گی۔ ٹیوشن لوں گی اور پاس ہو جاؤں گی۔ اور پھر آپ نے میری اُردو کی پختگی نہیں آزمائی۔ آپ میری درخواست منظور کیجئے اور مجھے دسویں میں داخلہ دے دیجئے ــــــ قسمت مسکرائی اور عین اسی وقت اسکول اور بورڈنگ ہاؤس میں چکّر لگاتی اعلابی (بیگم شیخ عبداللہ بانی علی گڑھ گرلز کالج) فرشتۂ رحمت بن کر ادھر آنکلیں۔ انھوں نے عصمت کی بات سُنی تو ان کی بڑی پُرزور حمایت کی اور اپنے مخصُوص انداز میں خاتون آپا سے کہا:

"اے بی خاتون چولہے میں ڈالو اسکول کے نتیجے کو۔ بچّی محنت کرنے کو کہتی ہے۔ اسے موقع دو۔"

عصمت بولیں: "ورنہ پھر میں پرائیویٹ امتحان دُوں گی۔ مگر اس سال میٹرک کا امتحان ضرور دُوں گی۔"

"ہاں اور بیٹی تو میرے پاس رہنا۔ خاتون جہاں اِسے امتحان دینے سے تو نہ روک پاؤ گی، داخل کرلو۔ میں ذمّہ لیتی ہُوں اس کا۔"

مَیں داخلے کے بعد نکل رہی تھی تو وہ خاتون آپا سے کہہ رہی تھیں:

"غضب خُدا کا خاتون۔ ایک لڑکی کا ارادہ کم۔ ور کرنا چاہتی تھیں"[1]

اس طرح عصمت نے اپنی ہوشیاری، فراست اور مستحکم ارادے سے دسویں جماعت میں داخلہ حاصل کر لیا اور حصُولِ تعلیم میں اپنی عمر کا ایک قیمتی سال ضائع ہونے سے بچالیا ــــــ عصمت میں صغر سنی ہی سے حالات سے جوجھنے اور اپنی بات منوانے کا دَم تھا۔ مشکلات پر قابو پانے کا انھیں گُر آتا تھا۔ جس بات کا تہیہ کرلیتیں اسے کر کے چھوڑتیں۔ وہ نہ کبھی شکست یا ناکامی کے خوف سے بددل ہوتیں اور نہ کبھی کامیابی پر آپے سے باہر ہوتیں۔ وہ خود اعتمادی کا مجسّمہ تھیں۔

(بورڈنگ میں عصمت اور ان کی بھانجی نیّر ایک ہی کمرے میں رہنے لگیں۔ نیّر نہایت نمکین، تیکھے نقشے، نازک ہاتھ پیر، بے حد جامہ زیب ساتھ ساتھ نہایت شوخ، باتونی اور اپنی عمر سے زیادہ ہوشمند تھی۔ وہ بیحد سلیقہ مند، نفاست پسند اور ذہین تھی۔ عصمت اس کے مُقابل کہیں ٹھہرتی ہی نہ تھیں۔ اس کی منگنی اپنے ددھیال کے ایک بڑے ہونہار لڑکے سے ہو چکی تھی۔ اور وہ ایک مثالی مشرقی خاتون بننے کے خواب بُنا کرتی تھی۔ اُسے عصمت کی کوئی ادا پسند نہ تھی اور عصمت کو بھی اس کی زندگی کے پروگرام سے گھُٹن ہوتی تھی۔ پھر بھی دونوں میں گہری چھنتی تھی۔ عصمت اس کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

---

[1] عصمت چغتائی "لوہے کے چنے" (مضمُون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (ستمبر ۱۹۷۹ء) ص ۳۰

"بریلی کی سہیلیوں کی صحبت میں اُسے وہ باتیں معلوم ہو چکی تھیں جن سے میرے فرشتے بھی انجان تھے۔ ہر معاملے میں وُہ میری استاد تھی۔ میں ہاتھ پیر مار کر اُس سے ایک کلاس آگے ہو گئی تھی۔ مگر وہ مجھے بہت کچھ پڑھا سکتی تھی"[1] ——— ایسی ہمہ صفت بھاجی سے عصمت جیسی اکھڑ، ضدی اور لا اُبالی لڑکی نے بہت کچھ سیکھا۔

عصمت نے اپنے والدِ بزرگوار کی ہدایت کے مطابق اسکول کے کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور کسرت سے ان کا وزن آہستہ آہستہ معمول پر آ گیا۔ وہ اپنے بھائیوں کے درمیان کھیل کود کر پلی بڑھی تھیں۔ اس لئے وہ نئے نئے کھیلوں میں بھی جو انھوں نے پہلے کبھی نہ کھیلے تھے بِلا جھجک حصّہ لیتیں۔ تنومند تھیں اس لئے کھیل جلد ہی ان کی گرفت میں آجاتے تھے اور دیکھنے والے متاثر ہوتے تھے۔

عصمت بورڈنگ کی دل چسپیوں میں اس قدر غرق ہو گئیں کہ انھیں اس بات کا احساس ہی نہ رہا کہ میٹرک کا امتحان پاس کرنا ان کا نصب العین ہے ورنہ زندگی میں پیش رفت کرنے کے سب منصوبے خواب و خیال ہو جائیں گے ——— عصمت لکھتی ہیں کہ اُردو ان کا سب سے کمزور مضمون تھا کیونکہ سانبھر میں قیام کے دوران اُردو ان کی بے توجہی اور تغافل کا شکار ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنی تمام تر توجّہ انگریزی، حساب، جغرافیہ اور تاریخ پر مرکوز کر دی تھی۔ شاعری سے انھیں کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ پردے کے پیچھے بیٹھ کر اُردو ماسٹر مبارک علی سے پڑھا کرتی تھیں۔ اس لئے وہ ان کی کلاس میں مشکل مضامین رٹا کرتی تھیں اور استادِ محترم کو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ پسِ پردہ کیا ہو رہا ہے ——— عصمت کی کلاس میں کُل چھ لڑکیاں تھیں ——— سعادت، جو ان کی جگری سہیلی تھی، نے جب دیکھا کہ عصمت اپنی پڑھائی سے تغافل برت رہی ہیں، تو اس نے انھیں اپنے ساتھ پڑھنے پر مجبور کیا اور اس کی صحبت میں انھیں اس قدر محنت کرنی پڑی کہ بقول اُن کے "اس نے میرا تیل نکال دیا۔"

یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ نیر کی آمد سے پہلے ایک دوسری لڑکی عصمت کے کمرے میں کچھ دن رہی۔ وہ غریب، بیمار اور بدشکل سی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں اس حد تک بڑی بڑی تھیں کہ وہ بھیانک لگتی تھیں ——— شام کو جب عصمت پڑھائی میں مصروف ہوتیں تو وہ ان کا پلنگ گھسیٹ کر اپنے پلنگ کے ساتھ صحن میں بچھاتی، بستر کرتی اور تکیے پر بیلے کے پھول سجا دیتی۔ رات کو عصمت کی آنکھ کھلتی تو انھیں اس کی بڑی بڑی آنکھیں گھورتی دکھائی دیتیں۔ عصمت دہشت زدہ ہو کر اپنا پلنگ دُور کھینچ لیتیں۔ مگر پھر جب اُن کی آنکھ کھلتی تو انھیں اس کی انگلیاں اپنے جسم پر رینگتی محسوس ہوتیں۔ وہ دُبلی پتلی بیمار لڑکی اُن کو یوں گھور گھور کر دیکھا کرتی کہ عصمت بعض اوقات خوف زدہ ہو جاتیں ——— یہ امر حیران کُن ہے کہ اس بارے میں نہ عصمت اس سے کچھ بولتیں اور نہ ہی وہ لڑکی کچھ کہتی۔ اور نہ ہی عصمت نے اس امر کا ذکر اپنی کسی سہیلی سے کیا ——— امتحان شروع ہوئے تو لڑکیاں اپنی سہیلیوں کو امتحان کے کمرے میں جاتے وقت ان کے تئیں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے

---

[1] عصمت چغتائی "لوہے کے چنے" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (ستمبر ۱۹۷۹ء) ص۔ ۳۰

پھولوں کے ہار پیش کرتیں۔ عصمت کی رُوم میٹ اُنھیں ہر روز بازار سے گجرا منگا کر پیش کرتی ——— جس دن عصمت کا آخری پرچہ تھا اُنھیں یہ دیکھ کر خوشگوار حیرانی ہوئی کہ اُن کے تکیہ پر کوئی گجرا نہیں سجا ہوا تھا۔ انھوں نے اُس لڑکی کو غور سے دیکھا تو اس نے پلکیں نہیں جھپکیں۔ اس کی آنکھوں کے ڈیلے اُبل رہے تھے اور اس کا جسم نیلگوں ہو رہا تھا۔ مگر کیونکہ انھیں امتحان کے کمرے میں پہنچنے کی جلدی تھی، وہ رُکی نہیں۔ وُہ امتحان دے کر واپس آئیں تو یہ جان کر ششدر رہ گئیں کہ اس لڑکی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُنھیں ایسا محسُوس ہوا جیسے وُہ اس کی قاتل ہیں۔ انھیں بار بار یہ خیال ستاتا کہ اگر وہ صبح ہی امتحان کے لئے جانے سے پیشتر میٹرن کو اس کے بارے میں اطلاع کر دیتیں تو شاید وہ بچ جاتی۔ احساسِ گناہ نے عصمت کو بُری طرح ہلا دیا ——— درحقیقت وہ لڑکی کئی روز سے سینے کے درد سے تڑپ رہی تھی مگر وہ نرسنگ ہوم جانے پر رضا مند نہیں تھی کہ عصمت کو اکیلے کمرے میں وحشت ہو گی اور شاید اس کا ناموافق اثر اُن کے پرچوں پر بھی پڑے ——— اس افسوسناک واقعے کے بعد عصمت کو رات کو پھر وہی خواب آنے لگا جو انھیں بچپن سے ستایا کرتا تھا۔ وہ سوتے میں اُٹھ کر نہ جانے کس کو اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگتیں اور انھیں عورتوں کے بین کرنے کی آواز فضا کی پہنائیوں میں گونجتی معلوم ہوتی۔ اور اندھیرے میں دو بڑی بڑی آنکھیں اُنھیں اپنی طرف گھُورتی ہُوئی دکھائی دیتیں۔ ان کی سانس رُک جاتی اور وہ گھبرا کر جاگ پڑتیں۔

اس واقعے کی تفصیلات سے صاف ظاہر ہے کہ اس لڑکی کو ہم جنسیت LESBIANISM کی لَت تھی اور اس کا رویہ عصمت کے تئیں وُہی تھا جو ایک عاشق اپنے محبُوب سے فرطِ شوق میں رَوا رکھتا ہے۔ وہ اس کی ناز برداری اور دلداری کرتا ہے۔ اس کی ہر سہولت اور آسائش کا دھیان رکھتا ہے۔ گویا وہ اس پر جان چھڑکتا ہے ——— مگر اس لڑکی کو ذرا کھُل کر حرفِ مدعا زبان پر لانے کی جرأت و جسارت نہ ہوئی اور نہ ہی عصمت نے اس بارے میں لب وا کئے ——— یہ بات بھی عیاں ہے کہ گو عصمت خاموش رہیں مگر دل ہی دل میں انھیں اپنی روم میٹ سے کچھ تعلقِ خاطر بھی رہا۔ ورنہ ان کے سوتے میں رات کو اُٹھ اُٹھ کر کسی کو ڈھونڈنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اور پھر اس کے مرنے کے بعد بھی عصمت کو سوتے میں اس کی بڑی بڑی آنکھیں گھورتی کیوں دِکھائی دیتی رہیں ——— اسکول اور کالج کے ہوسٹلز میں جہاں ایک ہی صنف کے طلبا یا طالبات قیام پذیر ہوتے ہیں، ہم جنسیت کی لَت ایسی کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں۔

عصمت امتحان میں پاس ہو گئیں اور اُن کی محنت ٹھکانے لگی۔ ماں باپ بھائی بہنوں کے سامنے وہ سُرخرو ہُوئیں اور اعلیٰ تعلیم کے حصُول کے لئے ان کی راہ ہموار ہو گئی۔

میٹرک عصمت کے لئے ایک پڑاؤ تھا منزل نہ تھی ——— ایف اے کی کلاس میں کُل چھ لڑکیاں تھیں کہ مُسلمان عام طور پر تعلیمِ نسواں کے حق میں نہیں تھے۔ اس وقت علی گڑھ میں صرف ایف اے و سیکنڈ ایئر تک کا انتظام تھا۔ بی اے کے لئے لڑکیاں بالعموم آئی ٹی کالج لکھنؤ

میں داخلہ لیتی تھیں، جو ایک کرسچن مشنری ادارہ تھا۔

بورڈنگ کی زندگی شروع شروع میں بعض طلبہ کو گھٹی گھٹی سی لگتی ہے کہ وہ بظاہر چار دیواری تک محدود ہوتی ہے۔ مگر ایک زندہ دل طبیعت جلد ہی اس سے وابستگی پیدا کر لیتی ہے اور بورڈنگ کی زندگی کی بوریت اور یکسانیت کو اپنے آپ پر حاوی نہیں ہونے دیتی۔ درحقیقت یہ خود انسان پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کو کس طرح برتنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عصمت اس بارے میں لکھتی ہیں:

"بورڈنگ کی زندگی انتہائی محدود۔ مگر زندہ دل انسان کے لئے تو پتھر میں بھی پھول کھلنے لگتے ہیں۔ میں ہر ہنگامے میں انتہائی جوش و خروش سے حصّہ لیتی۔ بہت سی دوست تھیں تو بہتوں سے لڑائیاں بھی ہوتیں۔ گیمیں اب میرے قابو میں آچکے تھے اور ہر گیم میں حصّہ لیتی تھی۔"[1]

عصمت کا کالج کے ہر ہنگامے اور ہر گیم میں گرمجوشی سے شرکت کرنا اُن کی بورڈنگ ہاؤس کی زندگی میں دلچسپی اور رغبت کا مظہر ہے۔ انھوں نے اپنے کالج کے کئی شعبوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور کالج کے منتظمین اور طالبات کی نظروں میں اپنے لئے ایک مخصوص منصب و مقام بنالیا۔ ان میں ایک قائد یا لیڈر کی سبھی صفات موجود تھیں۔ وہ تیز طرّار اور چُست دُرست تھیں۔ ذہین اور فطین تھیں۔ دبنگ اور بیباک تھیں۔ ان کی گفتگو عقلی اور منطقی ہوتی تھی جو لوگوں کو بے اختیار متاثر کرتی تھی۔ بغیر لاگ لپیٹ کے دوٹوک بات کہنے کی عادی تھیں۔ پھر اُن کی شخصیت پُر رُعب اور باوقار تھی اور وُہ دبنا، جھکنا، مرعوب ہونا بالکل نہ جانتی تھیں۔

عصمت کی کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کی دو ایک جھلکیاں بطور نمونہ پیش ہیں جو ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہیں:

انتظامیہ عصمت کو ایک قابلِ اعتبار اور بھروسہ مند طالبہ سمجھتا تھا جو کسی ذمّہ داری کو حُسن و خوبی پُورا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ خاتون آپا کے آفس کی دیکھ بھال کا کام اُن کے سپُرد تھا۔ صبح جھاڑ پُونچھ کروانے کے لئے وہ آفس کو آدھ گھنٹہ پہلے جاکر کھول دیتی تھیں اور خاتون آپا سے اُن کی خاصی بے تکلّفی تھی ـــــ کالج کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی کی وُہ صدر تھیں، جس سے سب کی نظروں میں ان کے وقار اور قدوقامت میں اضافہ ہوگیا تھا ـــــ بورڈنگ کا کھانا اکثر رُوکھا پھیکا اور بدمزہ ہوتا تھا۔ ہر روز ایک ہی ذائقہ کا کھانا کھاتے کھاتے لڑکیوں کا دِل بولا جاتا تھا۔ کچن میں صفائی کا بھی معقول دھیان نہیں رکھا جاتا تھا۔ ایک دن روٹیوں میں مکھیاں چپکی ہوئی ملیں تو لڑکیاں احتجاج کے طور پر ڈائیننگ رُوم سے باہر نکل آئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہنگامہ بپا ہوگیا۔ لڑکیوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ کامن رُوم میں میٹنگ منعقد کی گئی جس میں بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کیا گیا اور اگلی پچھلی تمام شکایتیں بیک وقت پیش کر دی گئیں۔ رات کو بھی کسی نے کھانے کو ہاتھ نہ

---

[1] عصمت چغتائی "علی گڑھ" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"، ماہنامہ آج کل نئی دہلی (اکتوبر ۱۹۷۹ء) ص ۲۱

لگایا۔ خاتون آپا کئی اُستانیوں کے ساتھ لڑکیوں کو سمجھا بجھا کر راہ پر لانے کے لئے آئیں تو لڑکیاں فوراً اُٹھ کر نماز کے کمرے میں چلی گئیں اور مغرب کی نماز کے بعد اُنھوں نے نفلیں پڑھنا شروع کر دیں۔ عصمت بڑے فخریہ انداز میں لکھتی ہیں: "یہ ترکیب خاکسار نے نکالی اور کامیاب رہی۔ لیکن لڑکیاں بھوکی دبی تھیں۔ اُنھوں نے چوری چھپے مونگ پھلیاں، چنے، چھ سات ڈاگ بسکٹ کے پیکٹ، مرغن کھانوں کا ایک بڑا سا کٹوران باہر سے منگوا لئے تاکہ کچھ تو بھوک مٹے۔ مگر اُوپر والوں کا دانہ پانی حرام تھا کہ بچیاں بھوکی ہیں" ——— رات کو لڑکیوں نے سونے کی گھنٹی کا بھی بائیکاٹ کیا اور ٹینس کورٹ میں دریاں بچھا کر زور زور سے قوالیاں گائیں۔ اب گو وہ بھوک سے مر رہی تھیں ڈٹے رہنے کا تہیہ کئے ہوئے تھیں ——— اب کالج کے منتظمین کا وفد آیا۔ لڑکیوں نے عصمت کو ٹھوکے مار مار کر آگے کر دیا کہ وُہ ان کی طرف سے کیس پیش کریں۔

"ہم یہ غلیظ کھانا کھانے سے مَوت کو ترجیح دیتے ہیں۔" ڈرامائی انداز میں کہا۔

"کھانا اچھا خاصہ ہوتا ہے۔" ممتاز آپا بولیں۔

"آپ کھاتی ہی کتنا ہیں۔" میں نے اُن کے دُبلے پن پر چوٹ کی۔ وہ مجھ سے کافی عاجز تھیں۔ سُلگ کر رہ گئیں۔" اور پھر آپ کے ہاں تو اچار، چٹنی، مکھن، دُودھ، مَلائی، انڈے، پھل، میوے، مٹھائی بڑی سڑا کرتی ہیں۔"

لڑکیوں کی ہمّت بڑھ گئی۔[1]

وفد مایوس ہو کر غصہ میں واپس لَوٹ گیا۔ اب منتظمین کے پاس لڑکیوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کوئی چار بجے اعلا بی خود تشریف لائیں اور آتے ہی اُنھوں نے اپنے مخصُوص پیار بھرے انداز میں پُکارا: "اے لڑکیو اے کہاں مر گئیں"۔ وہ کالج کی سرپرست ہی نہیں، مادر مہربان بھی تھیں۔ لڑکیاں ان کے لئے حقیقی بیٹیوں پوتیوں کی سی حیثیت رکھتی تھیں۔ کالج تو ان کے سپنوں کی تعبیر تھا اور اُنھوں نے ردّے پر ردّا رکھ کر کھڑا کیا تھا۔ اُن کی مانوس آواز سُن کر کچھ لڑکیاں ٹوسُ ٹس رونے لگیں۔ کچھ ان کی موجودگی کی تاب نہ لا کر کمروں میں جا چھپیں۔ چھوٹی بچیاں اُنھیں گھیر کر کھڑی ہو گئیں۔ دَم بھر میں گودام کھول دیا گیا۔ چشم زدن میں پُوریوں کے لئے آٹا گُندھا۔ آلو چھلنے لگے۔ چٹنی پیسی جانے لگی۔ اعلا بی خود پُوریاں تلنے بیٹھ گئیں۔ روتی بسورتی فضا مُسکرانے لگی ——— "اری دیوانیوں، بیٹھا۔" اعلا بی چلائیں۔ لڑکیاں سناٹے میں رہ گئیں۔ "حامد میاں کی منگنی کے لڈّو لڑکیوں کے حصّے کے اماں نے بھیجے ہیں۔" چھوکرا لڈّوؤں کا ٹوکرا اُٹھائے اندر داخل ہوا ——— رشید جہاں بھی بغیر دوپٹے کے شلوار قمیض پہنے باب کٹ بالوں کے ساتھ آدھمکیں۔ چٹائیاں گھسیٹ کر سب بیٹھ گئے۔ تمام لڑکیاں نہ جانے کب سے بھوکی تھیں۔ سب نے بھر پیٹ کھانا کھایا اور بے انتہا لطف اُٹھایا۔ وہاں اس قسم کی انوکھی دعوتِ عام کسی

---

[1] عصمت چغتائی: "علی گڑھ" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اکتوبر ۱۹۷۹ء) ص ۲۳

نے دیکھی سُنی کہانی نہ تھی ــــــ کالج کے بانی شیخ عبداللہ (پاپا میاں) کو بھی بلا لیا گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو لڑکیوں نے تالیاں پیٹ کر انھیں "خوش آمدید" کہا۔

کھانے کے بعد کرسیوں پر اساتذہ، پاپا میاں اور اعلا بی بیٹھے ــــــ پاپا میاں بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے یُوں گویا ہوئے:

"بچّیو! ایک دن یہ سارا لمبا چوڑا میدان"، اُنھوں نے چھڑی گھما کر کہا، "ایک جنگل تھا۔ یہاں سیار گیدڑ چلاتے تھے۔ سانپ پھنکارتے تھے۔ میں مُنڈیر پر کھڑا ایک گلزار کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ آج اس جنگل میں پھُول کھلے ہیں!" ــــــ کالی کلوٹی لڑکیوں تک کے چہرے گلنار ہو گئے۔ دو چار عادی مجرم آنسو بہانے لگیں ــــــ "تمھیں اس کالج کی آن بان ہو۔ تُم سے اِس حقیر زمین کے ٹکڑے پر ایک درسگاہ قائم ہے۔ میری دُعا ہے کہ زندگی میں تم بھی کوئی حسین خواب دیکھو اور وہ حقیقت بن جائے۔"[1]

یہ ایک ایسے عزم صمیم کے مالک بلند ارادہ انسان کی آواز تھی جس نے نہ صرف خواب ہی بُنے تھے بلکہ انھیں حقیقت سے ہم کنار کرنے کے لئے اپنی اور اپنی رفیقۂ حیات کی زندگی بھی وقف کر دی تھی۔

پاپا میاں کی تجویز کے مطابق یہ طے پایا کہ ہر مہینے چار ذمّہ دار لڑکیوں کے ایک گروپ کو کھانے کے انتظام کی تمام ذمّہ داری سونپ دی جائے اور لڑکیوں کو مہینے کے آغاز سے پیشتر ہی تمام رسد مہیّا کر دی جائے تاکہ کام خوش اسلوبی سے چلتا رہے۔ لڑکیوں نے اس فیصلے کی تائید میں خوشی سے تالیاں بجائیں ــــــ عصمت پہلے گروپ میں شامل کر لی گئیں ــــــ اس اہم واقعے سے عصمت لڑکیوں کی مسلّمہ نمائندہ کے طور پر اُبھر کر سامنے آ گئیں اور اس حقیقت کو انتظامیہ نے بھی بن کہے تسلیم کر لیا۔

○ عصمت سے اُلجھنا گھاٹے کا سودا تھا کہ وُہ جھاڑ کے کانٹوں کی طرح دامن پکڑ کر چھوڑتی نہ تھیں۔ اور بعض اوقات مدِّ مقابل کے منصب و مقام کا بھی لحاظ نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی ٹیچر ممتاز آپا اور ہم جماعت محمُودہ ان سے خفا تھیں۔ خاتون آپا نے اِس معاملے کی چھان بین کرتے ہوئے عصمت سے ان کی خفگی کا سبب پُوچھا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ ایک دن ممتاز آپا نے مجھے ہسٹری کی کاپی کھو دینے پر ڈانٹ ڈپٹ کی۔ بعد میں وہ کاپی مس جرمی کے کمرے میں پڑی مل گئی جہاں غلطی سے ممتاز آپا خود رکھ کر بھُول گئی تھیں۔ کاپی کھونے پر ممتاز آپا نے مجھے سزا کے طور پر کلاس سے نکال دیا اور مَیں نے غم و غصّہ سے مغلوب ہو کر کہا: "ٹھہر جاؤ بس بھی ممتاز آپا کے سُسر سے شادی کر کے انھیں وُہ مزا چکھاؤں گی

---

[1] عصمت چغتائی۔ "علی گڑھ (مضمون)" کاغذی ہے پیرہن۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اکتوبر ۱۹۷۹ء) ص ۲۴

کہ یاد کریں گی"۔۔۔۔ یہ جواب سب کی تفننِ طبع کا باعث ہُوا۔ ملاحظہ ہو کہ اُنھوں نے اپنی ٹیچر کو بھی کھری کھوٹی سُنا کر اپنے سے ہُوئی بے انصافی کا بدلہ چُکا دیا۔

خاتون آپا نے محمُودہ سے پوُچھا کہ تمھارے اور عصمت کے درمیان رنجش کا سبب کیا ہے۔ پیشتر اس کے کہ محمُودہ جواب دے عصمت بیچ میں ہی بول پڑیں کہ اگر یہ نہیں بتاتی تو مَیں بتاتی ہُوں ۔۔۔۔ خاتون آپا خدا کی قسم میری نیّت صاف تھی۔ محمُودہ بہت خوبصُورت ہے۔ مَیں نے اس سے کہا کہ میں اپنے بیٹے کی شادی تمھاری بیٹی سے کروں گی۔ اس پر برہم ہو کر کہنے لگیں کہ میں اپنی بیٹی کی شادی ہرگز تمھارے بیٹے سے نہیں کروں گی۔ مَیں نے جواب دیا کہ پھر میں تمھاری بیٹی کو اغوا کرا لوں گی۔ اس پر سب لڑکیاں ہنس پڑیں اور محمُودہ رو پڑی۔ آپ ہی فرمائیے خاتون آپا کیا لڑکیاں آپس میں ایسی معصُوم رُومانی باتیں نہیں کرتیں ۔۔۔۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ کرتی تو ہیں ۔۔۔۔ عصمت بولیں تو پھر مَیں نے کونسا اتنا بڑا جُرم کیا ہے ۔۔۔۔ خاتوُن آپا نے محمُودہ کو افسُردہ دیکھ کر کہا۔

"محمُودہ تم بے فکر رہو۔ اگر خُدا نہ کرے تمھاری بیٹی کا دِل میرے بیٹے پر آ گیا تو میں اس کا گلا گھونٹ دُوں گی۔ میرا مطلب ہے اپنے بیٹے کا۔ بس اب تو تم خوش ہو؟"

ملاحظہ ہو کہ اپنی ہم جماعتوں اور دوستوں کو چڑانے کے لئے عصمت کیسی کیسی عجیب و غریب باتیں اختراع کیا کرتی تھیں۔ انھیں کسی کو پیار سے چڑا کر حظ ملتا اور کوئی جتنا زیادہ چڑتا اُنھیں اتنی زیادہ خوشی ہوتی تھی۔

ایک دن اعلا بی نے ان سے پوُچھا کہ مَیں نے سُنا ہے تمھیں شادی سے چڑ ہے۔ عصمت نے بیساختہ جواب دیا۔

"اعلیٰ بی کسی انسان کے حکم کا تابع بننا مجھ سے نہیں جھیلا جائے گا۔ مَیں نے زندگی بزرگوں کے جبر کے خلاف احتجاج کرکے گذاری ہے۔ مجھے اپنی راہ آپ بنانی ہے۔ مجھے پتی ورتا مشرقی سگھڑ بیوی بننے کے خیال سے ہی گھن آتی ہے۔"[1]

عصمت نے جب یہ الفاظ کہے اُن کی عمر بہ مشکل سترہ اٹھارہ برس ہوگی۔ بعدازاں وُہ وقت وقت پر اپنے اس نظریے کا اظہار بڑی بیباکی سے کرتی رہیں۔ انھیں شادی سے چڑ تھی کہ وہ بہت آزاد طبع تھیں اور انھیں کسی کی محکوُمی اور غلامی قبوُل نہ تھی (انھیں پتی ورتا سگھڑ مشرقی خاتوُن کے تصوّر سے اس لئے گھن آتی تھی کہ وُہ کسی کو اپنا خدُا نے مجازی سمجھ کر اس کی اطاعت شعاری اور خدمت گذاری سے قاصر تھیں۔ پھر اُنھیں کسی ایک کھونٹے سے تمام عمر بندھے رہنا گوارا نہ تھا۔ شاید وہ "فری لو" کی قائل تھیں۔ اُنھوں نے اپنے شوہر شاہد لطیف سے شادی سے پہلے ہی یہ بات بڑے واضح طور پر کہہ دی تھی کہ اِس امر کو ابھی سے ذہن نشین کر لو کہ مَیں "ایک گڑبڑ قسم کی لڑکی" ہُوں تاکہ بعدازاں تمھیں اس بارے

---

[1] عصمت چغتائی: "علی گڑھ" (مضموُن) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اکتوبر ۱۹۷۹ء) ص ۲۵

میں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو ـــــ ایک عام آدمی عصمت کی بے باک گفتگو اور آزاد خیالی پر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ انھیں صرف اپنے جذبات کا پاس تھا دوسروں کے ردِّ عمل سے وہ ہمیشہ بیگانہ اور بے نیاز رہیں۔

○ اُن دنوں لکھنؤ کے کچھ منچلے نوجوانوں نے "انگارے" شائع کی تو ایک طوفان برپا ہو گیا ـــــ ایک مُلّا جس کا نام شاہد احراری تھا گرلز کالج پر بِل پڑا۔ اس نے ایک چیتھڑا سا اخبار نکالا اور عبداللہ خاندان کو اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔ اس نے کہا کہ "گرلز کالج رنڈی خانہ ہے۔ اسے فوراً بند کر دینا چاہیئے" اور اس نے رشید جہاں اور دوسرے لکھنے والوں کے فحش کارٹون بھی چھاپے ـــــ عصمت کا تجسس جاگا اور انھیں "انگارے" پڑھنے کی خواہش ہوئی۔ آخر کتاب اُن کے ہاتھ لگ گئی اور اس خیال سے کہ روشنی کمرے کے باہر سے دکھائی نہ دے اُنھوں نے شیشوں پر لحاف لٹکا کر اُسے لالٹین کی روشنی میں راتوں رات پڑھ ڈالا۔ دوسری لڑکیوں نے بھی پڑھا اور سب بِل گئیں ـــــ اور دُبدا میں پڑ گئیں۔ اُنھوں نے خوردبین سے کتاب میں عریانی اور فحاشی تلاش کی مگر اس کا نام و نشان نہ ملا۔ مگر کسی کو یہ جرأت و جسارت نہ تھی کہ حق گوئی سے کام لیتے ہوئے اُسے فحش نہ کہتی کہ ایسا کرنے سے وُہ خود مطعُون و ملعُون ٹھہرائی جاتی۔ فضا ہی کچھ ایسی تھی کہ سچ کہنا مُصیبت کو دعوت دینا تھا اس لئے لڑکیوں نے دروغِ مصلحت آمیز کا سہارا لیا۔ مگر سب کی نظریں اپنی قائد عصمت پر مرکوز تھیں کہ دیکھئے وہ کیا کہتی ہیں۔ وہ بولیں :

"کتاب بے انتہا گندی ہے میرے تو ہاتھ سڑ گئے۔ دِل سڑ گیا۔ دماغ سڑ گیا۔ چلو نماز کے کمرے میں توبہ کریں۔ اللہ سے معافی مانگیں۔ اللہ کو یہ کتاب بہت ناگوار گذری ہو گی۔"

"ایسی باتوں کا مذاق نہیں بنانا چاہیئے۔"

"مذاق کون نامعقول بنا رہا ہے۔ شریف لوگ کہتے ہیں گندی ہے تو جھوٹ تو نہ بولتے ہوں گے۔"

"نان سنس"۔ جمیلہ حامد بولی۔ وہ اعلیٰ خاندان کی کانونٹ کی پڑھی لڑکی تھی۔ بے حد مُنہ پھٹ، دھڑلے سے بات کہدینے کی عادی۔ ظاہر ہے میری اس کی خوب پٹتی تھی۔

"توبہ جمیلہ"۔ لڑکیاں چلاّئیں۔

"تم نے "لیڈی چیٹرلیز لوَر" پڑھی ہے"۔

اگر اُنھوں نے "لیڈی چیٹرلیز لوَر" پڑھی ہوتی تو یقیناً "انگارے" کے بارے میں ان کا نظریہ بدل جاتا جمیلہ اُسے چوری چھپے پڑھ چکی تھی مگر کیونکہ وہ فحاشی کے جُرم میں "بین" ہو چکی تھی، بہ آسانی دستیاب نہ تھی ـــــ بہرحال لڑکیاں

---

[1] عصمت چغتائی "علی گڑھ" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اکتوبر ۱۹۷۹ء) ص ۲۷ - ۲۸

سر جوڑ کر بیٹھیں اور انھوں نے غور و خوض کے بعد کثرتِ رائے سے ڈرتے ڈرتے فیصلہ کیا کہ:

"کتاب گندی سہی، متاثر کرتی ہے اور سچائی سے لبریز ہے۔"

عصمت لکھتی ہیں کہ جب تک ایسی فحش کتاب انھوں نے نہیں پڑھی تھی کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایسے مواد فراہم نہیں ہوتے مگر زبانی اس سے زیادہ فحش باتیں انھوں نے پلنگ کے نیچے چھپ کر بڑی بوڑھیوں سے سُنی تھیں ــــ مگر اُن پر ہم جنسیّت کا اسرار ابھی تک وا نہیں ہوا تھا۔ چند لڑکیوں کے بارے میں رازدارانہ طور پر کہا جاتا تھا کہ وہ بعض لڑکیوں پر فدا ہیں اور اگر ایک کسی اور سے بات بھی کرے تو ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ بہرحال بالعموم اس موضوع پر کھلے طور پر بحث کرنے سے گریز کرنے ہی کو سنجیدگی اور شرافت کی علامت خیال کیا جاتا تھا ــــ عصمت نے ملّا شاہد احراری کا چیتھڑا پڑھا تو اُن کا خون کھولنے لگا اور انھوں نے جل بھُن کر ایک مضمون لکھا جس کا لبِ لباب یوں تھا:

"مسلمان لڑکیاں پہلے ہی محروم اور پچھڑی ہوئی ہیں اُوپر سے کٹر ملّا احراری جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ کالج بند کر دیا جائے مگر ہم ساری لڑکیوں کی یہاں سے بس لاشیں ہی جائیں گی۔ کون بند کرنے آئے گا۔ ہم اس سے نپٹ لیں گے اور یونیورسٹی میں ہمارے چھ ہزار بھائی ہیں۔ کیا وہ خاموشی سے ہماری لاشوں کو کچلتا دیکھیں گے۔ جب بھی ہمیں ملّا احراری کا خیال آتا ہے ہم اپنے چھ ہزار بھائیوں، بزرگ پروفیسروں، ٹیچروں کو یاد کر لیتے ہیں، تب ہماری ہمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ جب تک وہ سلامت ہیں کوئی مائی کا لال ہمارا بال بینکا نہیں کر سکتا۔ جھانسی کی رانی نے شہنشاہ ہمایوں کو راکھی بھیجی تھی۔ ہم کالج کی تمام لڑکیاں اپنے ہزاروں بھائیوں کی خدمت میں نیک خواہشات کے ساتھ احترام اور خلوص کی راکھی بھیجتی ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ وہ ہماری رکھوالی کے لئے کوئی قدم اُٹھائیں گے۔"[1]

اُنھوں نے مضمون جو خاصہ طویل اور جذباتی تھا بورڈنگ کی لڑکیوں کو سُنایا تو ایک ہلڑ مچ گیا۔ پاپا میاں کو خبر پہنچی تو وُہ تشریف لائے۔ اُنھوں نے مضمون پڑھا، صاد کیا اور اسی وقت "علی گڑھ گزٹ" کو برائے اشاعت بھیج دیا اور وہ اگلے روز چھپ گیا ــــ لڑکوں نے مضمون پڑھا تو مشتعل ہو کر اسی رات جا کر ملّا احراری کی پٹائی کر دی اور اس کا دفتر تحس نحس کر دیا۔ اور پھر ملّا ایسے غائب ہُوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ ــــ لڑکیوں نے اپنے ذرائع سے لڑکوں کی حمایت کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

یہ لڑکیوں کے لئے ایک غیر معمولی فتح تھی جس کا جشن اُنھوں نے والہانہ جوش و خروش سے منایا۔ فرطِ مسرت سے

---

[1] عصمت چغتائی "علی گڑھ" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اکتوبر ۱۹۷۹ء) ص ۲۸

خوب اُلٹے سیدھے گانے گائے گئے۔ ٹینس کورٹ پر خورشید عبداللہ نے رقص کیا۔ کالج سے شیروانیاں منگوا کر مشہور شعرا کے بھیس میں ان کا کلام پڑھا گیا۔ خورشید جہاں جو بھاری بھر کم اور سفید فام تھی جوش ملیح آبادی بنی۔ ممتا جو خوب سانولی تھی اور جس کے دانت بڑے سفید تھے، داڑھی لگا کر جگر مرادآبادی بنی۔ صفیہ سراج مجاز کی بہن تو اپنے بھائی کے کپڑے لے آئی۔ وہ جب مجاز بنی تو سب لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ فاخرہ ساغر نظامی بنی۔ مشاعرہ بیحد دلچسپ اور جاذب رہا۔ خاتون آپا نے دوسرے دن چھٹی کا اعلان کیا۔ اور ٹینس کورٹ رقص گاہ میں بدل گیا۔

اس فتح کے نشہ میں لڑکیاں مہینوں سرشار رہیں۔ رشید جہاں نے سب کی خوب پیٹھ ٹھونکی۔ یوں دیکھا جائے تو ایک طرح سے یہ ان کے نظریات کی بھی فتح تھی کہ "انگارے" کی تخلیق میں اُن کا نمایاں حصّہ تھا۔ خوش قسمتی سے انھیں عصمت میں ایک ہم خیال جرأت مند لڑکی ملی جس نے صغر سنی کے باوصف مُلّا شاہد احراری جیسے فتنہ پرداز اور بد اطوار سے بے محابہ ٹکر لی اور زک دی ــــــ پھر عصمت نے گرلز کالج کی طالبات اور یونیورسٹی کے طلبا میں ایک ایسا رشتہ استوار کیا جس نے دونوں کو ایک لڑی میں پرو کر، استحکام اور استقلال عطا کیا اور وقت پڑنے پر ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر مدِمقابل کا سامنا کرنے کی استعداد بخشی ــــــ اس اور دیگر واقعات نے ثابت کر دیا کہ عصمت کو قضا و قدر نے "لیڈر شپ" یا قیادت کی صلاحیتیں بڑی فراخ دلی سے ودیعت کی تھیں اور ہنگامی حالات میں فوراً آگے بڑھ کر متعلقہ معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیتی تھیں اور پھر تمام لڑکیاں اُن کے فیصلوں کے سامنے سر جھکاتے ہوئے اُن کا ساتھ دیتی تھیں۔ جوان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ثبوت بھی تھا ــــــ یہاں تک کہ کالج کے اربابِ بست و کشاد بھی ان کی انتھک لگن، خلوص اور انتظامی صلاحیتوں کے قائل تھے اور کسی مشکل کی صورت میں ان کی مدد اور معاونت کے طلب گار ہوتے تھے ــــــ پھر ان میں لڑکیوں کے موقف کو اساتذہ اور دیگر بزرگوں کے سامنے بے خوفی سے موثر انداز میں پیش کرنے کی جسارت تھی جو ہر ایک کے بس کا کام نہ تھا ــــــ عصمت کا کالج کی ڈبیٹنگ سوسائٹی کا صدر منتخب کیا جانا ایک طرح سے ان کی زبان و بیان پر گرفت اور ذہنی و قلبی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ غرضیکہ وہ کالج کے ہر شعبہ پر چھائی ہوئی تھیں ــــــ اور کالج اور بورڈنگ کی زندگی کی ہما ہمی میں وہ اپنے نصب العین کو نہیں بھولی تھیں کہ انھیں حصولِ تعلیم کی راہ میں ابھی کئی منازل طے کرنی تھیں اور بالآخر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا تھا۔ ان کی نظر ایک مشّاق نشانہ باز کی طرح برابر اپنے نشانے پر جمی رہی۔

عصمت نے ایف اے کا امتحان پاس کر لیا۔ ابھی ان کی پاس بُک میں اُن چھ ہزار روپیوں میں سے جو ان کے والد نے علی گڑھ آتے ہوئے انھیں دیئے تھے، کافی رقم باقی تھی۔ اور پھر جگنو جس سے ان کے والدین ان کی شادی کے منصوبے بنا رہے تھے، ابھی بمبئی سے تعلیم سے فارغ ہو کر واپس آنے میں بھی دو سال اور تھے۔ یوں بھی عصمت بی اے پاس کرنے کا پختہ عزم کر چکی تھیں، جس کا علی گڑھ میں کوئی انتظام نہ تھا۔ انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے آئی ٹی کالج لکھنؤ سے بی اے کرنے کی اجازت چاہی تو حسبِ توقع انھوں نے صاف انکار کر دیا اور پھر سے ان کی شادی کا ذکر شروع ہو گیا۔ تب

اور دیے

ابھی

عصمت نے بھوک ہڑتال کر دی۔ وہ لکھتی ہیں:

"چار دن تو والدین نے جھیل لیا۔ پھر میری اماں کی حلق سے نوالہ نہ اُترا اور میرے ابا بھی مجھے لکھنؤ بھیجنے پر راضی ہو گئے۔ تب میں اتنا روئی کہ میرے ابا بھی دنگ رہ گئے۔ پوچھا۔
"بھئی اب کیوں رو رہی ہو؟" میں نے کہا" خوشی کے مارے"[1]

لکھنؤ

ابا میاں سے عصمت کو جب آئی ٹی کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کرنے کی اجازت مل گئی تو جودھپور سے وہ علی گڑھ گئیں۔ پاپا میاں اور اعلا بی سے دُعائیں لیں اور ان کی نیک خواہشات کے ساتھ وہ اکیلی ہی لکھنؤ روانہ ہو گئیں۔

جب وہ لکھنؤ ریلوے پلیٹ فارم پر اُتریں تو وہ انھیں جودھپور اور علی گڑھ کے مقابلے پیرس لگا۔ وہاں کی سیمنٹ کی چوڑی، ہموار اور صاف ستھری سڑکیں دیکھ کر انھیں بڑی خوشگوار حیرت ہوئی ـــــ جب ان کا تانگہ آئی۔ ٹی کالج کے پورٹیکو کے سامنے رُکا تو اس کی عالیشان مرعوب کُن عمارت دیکھ کر وہ دنگ رہ گئیں۔ چند لمحات وہ ساکت کھڑی اُس کے بلند و بالا سُتونوں کا جائزہ لیتی رہیں۔ اُن دِنوں آئی۔ ٹی کالج ایشیا کا سب سے شاندار ومنسز کالج تھا ـــــ برسوں بعد آئی۔ ٹی کالج سے بھی شاندار یونیورسٹی اُنھوں نے ماسکو میں دیکھی تو اُن کی آنکھیں کھُل گئیں۔

عصمت نے جن مضامین کا انتخاب کیا وہ انگریزی، پالیٹکس (سیاسیات) اور اکنامکس (اقتصادیات) تھے۔

ـــــ کالج میں تین ہوسٹل تھے۔ نشاط، نوبہار اور تیر بھون۔ نشاط میں امیر اور انگریز لڑکیاں رہتی تھیں۔ یہ سب سے اچھا اور مہنگا ہوسٹل تھا۔ نوبہار میں درمیانہ حیثیت اور تیر بھون میں کم حیثیت لڑکیاں تھیں ـــــ عصمت کو نشاط ہوسٹل میں ڈبل رُوم میں سیٹ مل گئی ـــــ جہاں تک کھیلوں کا تعلق ہے اُنھوں نے قریب قریب ہر گیم میں اپنا نام درج کرایا۔

جس استانی نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ اسّی سالہ انگریزی کی پروفیسر ٹکر تھیں جو کیمرج، ہارورڈ اور کیلیفورنیا یونیورسٹیوں میں پڑھا چکی تھیں اور ایک طرح سے درس و تدریس سے سُبکدوش ہو چکی تھیں اور ازابیلا تھوبرن کالج میں آرام کرنے آئی تھیں۔ مگر عمر بھر پڑھانے کے بعد بیکار رہنے سے انھیں وحشت ہونے لگی اور اُنھوں نے وقت کٹی کے لئے پھر سے پڑھانا شروع کر دیا۔ اُن کا علم ایک بحرِ بیکراں تھا۔ شیکسپیئر تو انھیں ازبر تھا۔ پڑھانا شروع کرتیں تو کتاب کھول کر ورق اُلٹنے کی بھی انھیں حاجت نہ تھی اور یہی کیفیت برنارڈ شا اور تمام انگریزی شعراء کی تھی۔ وہ ڈائس پر ٹہل ٹہل کر اس قدر مسحور کُن انداز میں پڑھاتی تھیں کہ طالبات مدہوش ہو جاتیں۔ عصمت وہ دن کبھی نہ بھلا پائیں جب اُنھوں نے ورڈز ورتھ

---

[1] عصمت چغتائی: "باتیں عصمت آپا سے" انٹرویو از ڈاکٹر شمع افروز زیدی۔ ماہنامہ بیسویں صدی نئی دہلی۔ سالنامہ جنوری ۱۹۹۲ء ص ۲۵

کی نظمیں LITTLE MATCH GIRL اور WE ARE SEVEN کلاس میں پڑھائیں"۔ پہلے سناٹا چھا گیا پھر سسکیاں اور پھر بھوں بھوں شروع ہو گئی۔ خود ڈاکٹر ٹکر کا منہ سرخ چقندر ہو گیا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھر آئیں اور ان کے جھرّیاں پڑے ہوئے عمر رسیدہ ہاتھ کانپنے لگے۔ اُن کے انہماک اور جذب کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے مضمون میں ڈوب جاتیں اور کچھ یہی کیفیت ان کی طالبات پر بھی طاری ہو جاتی ——— کبھی کبھی سبزہ زار پر چہل قدمی کے لئے نکلتیں تو فرطِ شوق سے لڑکیاں انھیں گھیر لیتیں۔ وہ ہر موضوع پر اس قدر دلچسپ اور مؤثر انداز میں گفتگو کرتیں کہ لڑکیوں پر فکر و فہم کے دریچے کھلنے لگتے۔ اُن سے گفتگو کرنا گویا کچھ سیکھنا، کچھ پانا تھا اور اپنے علم و ہنر کی توسیع کرنا تھا ——— وہ بیحد ہنس مکھ اور خوش طبع بھی تھیں۔ اُن پر موڈ طاری ہوتا تو مضحکہ خیز کرداروں کی نقل اِس حُسن و خوبی سے کرتیں کہ جی باغ باغ ہو جاتا اور لڑکیوں کے قہقہے گونجنے لگتے۔ کبھی فالسٹاف بن جاتیں، کبھی ڈیوڈ کاپر فیلڈ کا مسٹر بارکس، کبھی شائیلاک، کبھی پورشیا، کبھی برنارڈ شا کی کینیڈا اور کبھی قلوپطرہ ——— بائبل کا بیشتر حصّہ انھیں ازبر تھا۔

برنارڈ شا اور شیکسپیئر کا ایک ایک ڈرامہ پڑھنا ہوتا تھا۔ حصّۂ نظم میں ورڈز ورتھ، میتھیو آرنلڈ، بائرن، کیٹس، شیلی اور ملٹن کے چنیدہ حصّے کورس میں شامل تھے۔

عصمت کی انگریزی علی گڑھ کے معیار سے بھی کمزور تھی کہ انھوں نے انگریزی بہت دیر میں اور بہت جلدی میں پڑھی تھی۔ نتیجہ یہ کہ اُن میں قوتِ اظہار کی کمی رہی۔ کہنے کو بہت کچھ ہوتا پھر بھی وہ اظہار سے قاصر رہتیں۔ یہ بات اُن کی تحریر اور تقریر دونوں پر منطبق ہوتی تھی۔ پہلے ان کے ذہن میں جملے اردو میں تشکیل پاتے۔ پھر وہ انھیں انگریزی میں منتقل کرتیں۔ یوں وُہ روانی اور بے ساختگی جو انگریزی میں درکار تھی مفقود ہو جاتی۔ عصمت نے محنت سے ڈکشنری اور "کنجیوں" کی مدد سے بہت حد تک اس کمی کو پُورا کر لیا اور اُن کا ذوق و شوق برقرار رہا۔

ڈاکٹر ٹکر ہمہ جہت پروفیسر تھیں۔ انھوں نے انھیں مغربی گانے سے بھی روشناس کرایا اور اس کے کیف و کم سے انھیں آگہی عطا کی۔ اب تک عصمت نے علی گڑھ میں" گوڈ سیو دی کنگ" ہی سُنا تھا جسے لڑکیاں بے سُرے انداز میں گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتی تھیں۔ عصمت کے گھر میں بھی کسی کو گانے سے رغبت نہیں تھی ——— کالج کے ہوسٹل میں ڈرائنگ روم میں پیانو رکھا رہتا تھا جس پر لڑکیاں ریاض کیا کرتی تھیں اور جسے کبھی کبھی پروفیسر بھی تفنّنِ طبع کے لئے بجایا کرتی تھیں۔

جب پروفیسر ٹکر نے انھیں شہرۂ آفاق حبشی مُغنّی پال روبسن کا شاہکار ریکارڈ سُنایا۔ اور گانے کے نازک اور باریک نکات کی حُسن و خوبی تشریح کی تو سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ——— انھوں نے انھیں امریکی نیگرو کے بارے میں پڑھنے کی ترغیب دی۔ تب عصمت نے UNCLE TOM'S CABIN پڑھی۔ اور پال روبسن کی عظمت کو پہچانا۔ روبسن

سیاسیات کے مضمون میں تاریخ کا مُطالعہ بھی شامل تھا۔ اس مضمون نے روزِ اوّل ہی سے عصمت کی توجّہ اپنی طرف مبذول کی۔ اس کی پروفیسر مس چا کو جنوبی ہندوستان سے تھیں وُہ نوجوان، بارُعب، پُر وقار اور بہت خوش پوش جیو لی

تھیں۔ حسین و جمیل اِس قدر کہ جو اُنھیں دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کئی شخصیتیں اپنی مقناطیسی کشش سے دیکھنے والے کو بے اختیار اپنی جانب راغب کر لیتی ہیں۔ مس چاکو اُن میں سے تھیں ــــ لیکچر اس قدر مؤثر ڈھنگ سے دیتی تھیں کہ اس کا لفظ لفظ نقش ہو جاتا تھا۔ اسی لئے لڑکیاں ان کی دلدادہ تھیں ــــ ان کی شخصیت بڑی پُراسرار اور سنجیدہ لگتی تھی کہ وُہ کم آمیز اور کم گو تھیں۔ ہنستی بھی بہت کم تھیں۔ کسی لڑکی کی خامی و کوتاہی پر ہنس پڑتی تھیں تو وہ لڑکی رو پڑتی تھی۔

ایک دن لیکچر دیتے ہوئے انھوں نے جُھک کر عصمت کی نوٹ بک دیکھی۔ گھبرا کر اور غصہ سے بولیں :

"یہ کیا لکھ رہی ہو؟"

"نوٹس۔" مَیں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"مگر یہ . . . یہ" انھوں نے کاپی اُٹھا کر کلاس کو دکھائی۔

"یہ تو اُردو ہے!" کشور بولی۔

"میری کلاس میں سنجیدگی سے کام ہوگا۔" مس چاکو نے کاپی پٹخ دی۔

"حرف اُردو کے ہیں، مگر الفاظ انگریزی کے ہیں۔" میں نے اُن کے دیئے ہوئے نوٹ پڑھ کر سُنائے۔

"مگر . . ."

"مس چاکو آپ بہت تیز بولتی ہیں۔ ہم اتنی تیزی سے لکھ نہیں پاتے۔ میں اُردو میں نوٹ لکھتی ہُوں۔ انگریزی میں آسانی سے منتقل کر لیتی ہُوں۔ اُردو بہت تیز لکھی جاتی ہے۔ یہ ایک طرح کی شارٹ ہینڈ ہے۔"

نوٹ سُن کر مس چاکو مطمئن ہو گئیں۔ لڑکیاں میرے نوٹ سے اپنے چھوٹے ہوئے الفاظ لکھا کرتی تھیں۔ اِس طرح لیکچر سُننے کا اچّھا موقع ملتا تھا۔"[1]

کالج کی بیشتر پروفیسر غیر شادی شدہ تھیں۔ ڈاکٹر ٹکر، ڈاکٹر شینن، مس پیرن، مس جونسن اُن میں تھیں۔ لڑکیوں نے ایک دن از راہِ تجسّس ڈاکٹر ٹکر سے اُن اسباب کے بارے میں پُوچھ ہی لیا جنھوں نے انھیں شادی سے باز رکھا۔ ڈاکٹر ٹکر نے بلا تکلّف بڑی صاف گوئی سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور کہا :

"مگر تم لوگ شادی ضرور کرنا"ــــ "کیوں؟"

---

[1] عصمت چغتائی "روشنی۔ روشنی۔ روشنی" (مضمون) کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ آج کل نئی دہلی (مئی ۱۹۸۰ء) ص ۱۸-۱۹

"تاکہ دُنیا کو اعلیٰ دماغ بچے دے سکو"۔ ۔ ایک مُلک کو ترقی کرنے کے لئے تعلیم یافتہ ماؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا تم کوئی ایسی مثال دے سکتی ہو کہ ماں گریجویٹ ہو اور اولاد جاہل رہ گئی ہو۔ جس خاندان کی عورت تعلیم پالے اُس کے مرد اعلیٰ تعلیم پاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ پھر ذہین ماں کا دودھ ذہانت بخش ہوتا ہے"[1]

ڈاکٹر ٹیگور نے بہت مختصر الفاظ میں بہت بڑی حقیقت کو بہت خوبی سے نمایاں کیا ہے۔

عصمت محبِّ وطن تھیں۔ اور مہاتما گاندھی کے تئیں بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔ کانگریس پارٹی کو وہ انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کا واحد ذریعہ سمجھتی تھیں۔ وہ مُلک کی سالمیت اور یک جہتی کی قائل اور ہندو مُسلم اتحاد کی علم بردار تھیں۔ تقسیمِ مُلک کو وہ ایک ناقابلِ عمل اور ناقابلِ یقین بات سمجھتی تھیں۔ ۔ کالج کے پہلے سال میں اُنھوں نے پہلی بار" مہاتما گاندھی کے درشن کئے " اور اسے اپنی خوش بختی سمجھا۔ اس زمانے میں تحریکِ آزادی اپنے شباب پر تھی۔ قوم بدیسی حکومت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنے کا عزم کئے ہوئے تھی اور" آزادی" کا نعرہ فضا میں گونج رہا تھا۔ عصمت بھی وطن پرستی کے جذبہ میں سرشار تھیں ۔۔۔ گاندھی جی لکھنؤ آئے تو عصمت کچھ لڑکیوں کے ہمراہ ان سے ملنے گئیں۔ اُنھوں نے آٹوگراف مانگا تو گاندھی جی نے کہا کہ تم سب کھدر پہن کر آؤ گی تو آٹوگراف دُوں گا۔ شام کو سب لڑکیوں نے کھدّر کی دھوتیاں خریدیں اور دُوسرے دن تیس لڑکیاں " بدبُودار کھُردری، کلف لگی" کھدّر کی دھوتیاں پہنے گاندھی جی کے ہاں حاضر ہو گئیں۔ گاندھی جی انھیں دیکھ کر اپنی پوپلی سی ہنسی ہنسے گویا کہہ رہے ہوں کہ دیکھو آج میں نے تیس لڑکیوں سے بدیسی کپڑا چھڑا دیا۔ پھر اُنھوں نے سب کو بڑے پیار سے پاس بٹھا کر آٹوگراف دیئے۔ اس دن کو عصمت کبھی بھُلا نہ پائیں۔

آئی۔ ٹی کالج میتھوڈسٹ چرچ سے وابستہ ایک امریکی ادارہ تھا، جہاں کی طالبات انگریزی حکومت کی استحصال پسندی اور جبر و تشدّد کی کھُل کر نکتہ چینی کر سکتی تھیں۔ امریکہ خود کبھی برطانیہ کی نو آبادی رہا تھا اور وہ انگریزی حکومت کی شاطرانہ حکمتِ عملیوں سے خوب آگاہ تھا۔ اِس لئے اُس کی ہمدردی ہندوستان کے ساتھ تھی جو انگریزی حکومت کی غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ کالج کی طرف سے حریت پسند لیڈروں کی تقاریر سُننے کے لئے لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی ۔۔۔ دھیان رہے کہ امریکہ اس وقت تک ایک بڑی سامراجی طاقت نہیں بنا تھا اور اُسے برطانوی نو آبادیات سے دِلی ہمدردی تھی۔ امریکی قوم وسیع الخیال اور پُرخلوص تھی اور توسیع پسندی کے جذبے سے مبرّا تھی۔ اس نے نہ تو ابھی اسلحہ بنانے اور بیچنے کا کاروبار اختیار کیا تھا۔ اور نہ اپنی تجارت کو دیگر

---

[1] عصمت چغتائی " روشنی۔ روشنی۔ روشنی" (مضمون) " کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ" آج کل" نئی دہلی (مئی ۱۹۸۰ء) ص ۲۰

ممالک تک پھیلا پایا تھا۔ وہ نہ صرف پیداوار کے معاملے میں خود کفیل تھا بلکہ خام مال کے بارے میں بھی کسی ملک کا دستِ نگر نہیں تھا ــــ ایسے میں کالج کے اربابِ بست وکشاد کا ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے ہمدردی رکھنا قابلِ فہم تھا۔

رُوس بھی اس وقت امریکہ کا اتنا بڑا حریف نہ تھا جتنا کہ بعدازاں ہُوا۔ کالج کی لڑکیوں نے اپنے پروفیسروں کے ایما پر رُوس کی مدد کے لئے کپڑے اور چندہ جمع کیا کہ ان دنوں سخت سردی پڑنے کے سبب رُوس بڑے کٹھن دَور سے گذر رہا تھا ــــ خالدہ ادیب خانم یونیورسٹی میں آئیں تو انھیں کالج میں بھی مدعو کیا گیا۔ لڑکیوں نے ان سے متعلق ضروری مواد پڑھا اور ان سے بحث مباحثے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ــــ معمول کے مُطابق یونیورسٹی میں جب کوئی اہم شخصیّت آتی تو لڑکیوں کو تقریب میں شمولیت کے لئے کھُلی اجازت دی جاتی۔ ایسی آزاد فضا میں لڑکیوں کی ذہنی نشوونما کی راہیں کھُل گئیں اور ان کی نظر و فکر کو فروغ ملا۔ چنانچہ عصمت اس بارے میں لکھتی ہیں:

"مجھے ہر بات میں دلچسپی تھی۔ مزا آتا۔ وہ آزادی اور روشنی جو اُس ماحول میں مل رہی تھی میرا دماغ تیزی سے جذب کرنے میں غرق تھا۔ نئے نئے دروازے اور کھڑکیاں دماغ میں کھل رہی تھیں۔ علم و دانش کے اس بے پناہ طوفان میں چند بوندیں بھی انسان سمیٹ لے تو راہیں روشن ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ مَیں نے فولادی دیواروں سے سر ٹکرایا تھا۔ اور اس میں کوئی دراڑ نہیں پڑی تھی۔ دن بدن مجھے اپنے شعور کا قد بلند ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور دُنیا بڑی پیاری لگ رہی تھی"[1]

لکھنؤ کی تعلیمی اور تہذیبی فضا کے کھُلے پن نے عصمت کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اُبھارا۔ بیدار صلاحیتوں کو نکھارا اور سنوارا۔ اور ان کے شعوُر کو نئی حقیقتوں سے ہمکنار کیا۔ اور یوُں عصمت کی شخصیّت کو جو پہلے ہی بہت قوی اور توانا تھی مزید استحکام اور استقلال ملا۔

لکھنؤ میں عصمت کو پہلی مرتبہ اپنے کالج کی لڑکیوں کے ہمراہ آزادی سے بازاروں میں گھُومنے پھرنے اور لڑکوں سے ملنے جُلنے کے مواقع ملے۔ علی گڑھ میں زندگی سہمی سہمی اور گھُٹی گھُٹی سی تھی اور دونوں صنفوں کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم تھی۔ دُور سے لڑکے ایک گنجلگ سا خواب لگتے تھے۔ لڑکی کے دل و دماغ میں جنس مخالف کے خلاف جو خوف و ہراس کا جذبہ بچپن ہی سے بٹھا دیا جاتا ہے۔ زندگی بھر اس سے چھٹکارہ پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن عصمت کی بات ہی الگ تھی کہ اُن کی پرداخت بڑے بھائیوں کی صحبت میں ہوئی تھی۔ اُنھوں نے رشتہ

---

[1] عصمت چغتائی "روشنی۔ روشنی۔ روشنی" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (مئی۔ ۱۹۸۰ء) ص ۲۱

کے بھائیوں کو بھی بھگتا تھا۔ پھر انھیں اپنے آزاد خیال والد کا قرب میسّر ہوا۔ اس لئے عام لڑکیوں کی طرح لڑکوں کی موجودگی میں وُہ خوف وہراس کا شکار نہ ہوتی تھیں۔ عصمت اس بارے میں لکھتی ہیں :

"عورت کا مرد پر سبقت لے جانا خلافِ قدرت نہیں ہے۔ اور پتا ہوا یقین کہ عورت مرد سے کمتر ہے فرد کی سطح پر آکر احمقانہ ثابت ہو سکتا ہے۔"[1]

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جنسِ مخالف کا وجود ایک دُوسرے کے لئے تلاطم خیز ہوتا ہے اور قلب و جگر میں ہلچل سی مچا دیتا ہے۔۔۔ یونیورسٹی ہال میں جب کوئی زوردار لیکچر ہوتا تو قریب قریب بیٹھے لڑکے لڑکیاں سُننے میں یوں ہمہ تن گوش ہو جاتے کہ احساس تک نہ ہوتا۔ ہاں اگر لیکچر پھُسپھُسا اور غیر دلچسپ ہوتا تو اُن کی توجّہ بٹ جاتی اور ذہن بھٹکنے لگتا اور " مانس گندھ کی فتنہ پردازیاں شروع ہو جاتیں ۔۔۔ " ہال سے نکل کر فضا میں بارُود کی بُو پھیل جاتی اور لڑکیاں گلّے کی صُورت میں الگ اور لڑکے بھیڑیوں کے غول کی طرح پیچھے پیچھے " ۔۔۔ ایک دفعہ ایک لڑکا عصمت کو کُہنی مار کر آگے چلنے لگا تو عصمت نے اُسے بیساختہ بڑھ کر پیٹھ پر دھموکا جڑ دیا۔ یہ ایک اضطراری فعل تھا جس سے وہ خود بوکھلا گئیں۔ اور لڑکوں نے قہقہے لگانا شروع کر دیئے اور وُہ کُہنی مار سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا ۔۔۔ بات پھیل گئی اور اساتذہ کے کانوں تک پہنچی لیکن انھوں نے عصمت سے باز پُرس نہ کی مگر اُن کی نظریں بتا رہی تھیں کہ انھیں عصمت کا فعل ناپسند ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس سے نسوانی وقار کو ٹھیس پہنچی تھی ۔۔۔ لیکن عصمت جب اِس معاملے پر غور کرتیں تو انھیں دل کی گہرائیوں سے آواز آتی کہ اُن سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی اور وُہ قطعاً بے قصُور ہیں ۔۔۔ ضمیر کی اس آواز کو ہزار مُخالفت کے باوصف انھوں نے کبھی مرنے نہ دیا۔

سال کے خاتمے پر کالج کی روایت کے مُطابق بہت شاندار تقریب ہوئی جس میں سینیئر لڑکیوں کو الوداعی دعوت دی گئی۔ اگلی صف کی لڑکیوں کے ہاتھ میں مٹّی کی ہانڈیوں میں رنگدار قندیلیں تھیں جن میں چراغ روشن تھے۔ کالج کے گانوں کے بعد آخر میں لڑکیوں نے وُہ قندیلیں جونیئر لڑکیوں کو سونپ دیں :

"یہ علم کی شمع جو ہمیں ہماری سینیئر بہنوں نے تھمائی تھی ہم تمھیں سونپتی ہیں۔ یہ بجھنے نہ پائے۔"
بے اختیار لڑکیاں پھُوٹ کر رو پڑیں۔ پروفیسروں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں ۔۔۔ ان قندیلوں کی روشنی آج تک دماغ میں محفوظ ہے۔[2]

عصمت نے اپنے فن کے توسط سے اتنی قندیلیں روشن کیں کہ ملک کے طول و عرض میں ہزاروں لاکھوں دِل و دماغ منوّر ہو گئے۔ کالج نے علم و دانش کے تعلق سے انھیں جو کچھ عطا کیا تھا انھوں نے اُس سے ہزار چند اُردو ادب کے پرستاروں میں بانٹ دیا ۔۔۔ کالج کی تعلیم نے انھیں خود اپنی سوچ سمجھ اور سُوجھ بُوجھ کے ذریعہ اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنے اور

---

[1]، [2] عصمت چغتائی "روشنی، روشنی، روشنی" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (مئی۔ ۱۹۸۰ء) ص ۲۱، ۲۲

اپنی راہ خود تراشنے کا درس دیا اور انھوں نے عمر بھر اُسے صحیفۂ آسمانی جان کر سینے سے لگائے رکھا اور جب ضرورت پڑی تو اندھیرے میں اپنی ہی باطنی توانائی اور فہم و تفہیم کا چراغ روشن کر کے قدم آگے بڑھایا۔ انھیں مانگے تانگے کی روشنی بھی گوارا نہ تھی عصمت شخصیت اور فن دونوں کے تعلق سے "خود اعتمادیت" کا کوہ گراں تھیں، جس کی مثال اُردو ادب میں کم ہی ملے گی۔

جاورہ

عصمت آئی۔ ٹی کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کر چکی تھیں کہ اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ کے بلاوے پر ریاست جاورہ، جہاں وہ جج کے عہدہ پر فائز تھے، چھٹیاں گذارنے گئیں۔ جاورہ ایک معمولی سی گمنام سی ریاست تھی۔ والیٔ ریاست نواب صاحب کی سالانہ آمدنی اٹھارہ لاکھ روپے تھی جس میں سے چودہ لاکھ نواب صاحب کے ذاتی مصارف پر اُٹھ جاتے تھے اور باقی ماندہ چار لاکھ پوری ریاست کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوتے تھے۔ سوائے محلوں اور شہزادوں کے بنگلوں کے باقی سب مکان کچے کھپریل یا چھپر کے تھے ـــ نواب صاحب کو "شاہ" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ ان کے محل کے تمام علاقے میں پختہ سڑکیں، بجلی، سوئمنگ پول اور جمنازیم خانہ تھا۔ انھیں کتوں کا بہت شوق تھا، جن کی دیکھ بھال کے لئے ایک انگریز ڈاکٹر اور ٹرینر مقرر تھے۔ پریڈ گراؤنڈ میں سالگرہ اور دوسرے جشنوں کے موقعوں پر فوج کے پرے جمتے تھے۔ نواب صاحب کے آنے جانے پر توپوں کی سلامی دی جاتی تھی ـــ وہ اپنی ریاست کے مطلق العنان بادشاہ تھے اور رعایا کے جان و مال کے واحد مالک تھے۔ ان کی رضا کے بغیر ریاست میں پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ اور ان کے حکم سے روگردانی جائیداد کی ضبطی اور ریاست بدری تھی۔

ڈاکٹر رشیدہ جہاں

عصمت کو یہ نوابی شان و شوکت، یہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور تزک و احتشام ایک آنکھ نہ بھایا۔ وہ رشید آپا کے زیر اثر اشتراکیت سے ناتا جوڑ چکی تھیں۔ اور ریاست میں امارت اور غربت کا تضاد دیکھ کر ان کا دل اندر ہی اندر سلگتا تھا۔ پھر وہ وطن پرست تھیں اور دل سے تحریکِ آزادی کی حامی اور مہاتما گاندھی کی پیرو تھیں۔ وہ انگریزی حکومت کی شاطرانہ حکمتِ عملیوں اور راجاؤں اور نوابوں کے ساتھ ناپاک گٹھ جوڑوں سے بھی آگاہ تھیں۔ نواب صاحب دیگر والیانِ ریاست کی طرح، ایک اپنی ہی پرستانی دُنیا میں رقص و سرود اور عیش و عشرت میں غلطاں تھے۔ اس مصنوعی اور بناوٹی دُنیا کا بھی شکم اور برہنہ پا عوام کی حقیقی دُنیا سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا (ریاستی حکام کے سلوک سے رعایا کے تئیں بے حسی اور بیگانگی ٹپکتی تھی جیسے وہ کسی اور ہی دُنیا کے باسی ہوں) لیکن رعایا کے مُنہ پر بھاری تالے پڑے تھے اور وہ حرفِ شکایت لب پر نہیں لا سکتی تھی۔ نحیف سی آواز بھی نکلتی تو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑتیں۔ جائیداد حقِ ریاست ضبط کر لی جاتی ـــ راتوں رات ریاست بدر کر دیا جاتا۔ یہی ریاست کا دستور، بے دستور تھا۔ یہی وہاں کا قانون، لاقانون تھا جس کے خلاف کوئی وکیل، اپیل اور دلیل نہ تھی۔ خوددار، انصاف پسند، انسان دوست شخص کے لئے وہاں کوئی جگہ نہ تھی۔

سب اہل کار، اُوپر سے لے کر نیچے تک خوشامدی اور جی حضورئیے تھے۔ ہاں میں ہاں ملانے والے بے حمیت، بے غیرت لوگ ـــــ عصمت کی دُور رس اور باریک بین نگاہوں نے جلد ہی بھانپ لیا کہ وہاں اُن کی گذر ممکن نہیں۔

عصمت جاورے پہنچیں تو ایک دُھوم سی مچ گئی۔ ایک گریجویٹ مُسلم لڑکی وہاں کم ہی دیکھنے میں آئی تھی عصمت کے الفاظ میں "ایسا جانور ریاست میں کبھی دکھائی نہیں پڑا تھا"ـــــ نواب صاحب نے فوراً انھیں سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس کا عہدہ عطا فرمایا۔ ایک پُرانے محل نما بنگلے میں لڑکوں کے اسکول سے کچھ بنچیں اور ڈیسک منگوا کر ڈلوا دیئے گئے۔ ایک بلیک بورڈ اور ہندوستان کا پُرانا نقشہ تیار کر دیا گیا ـــــ پچیس تیس مختلف عُمر کی لڑکیاں جو شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، جمع کر دی گئیں۔ اُنھیں بس انگریزی پڑھانا اور بولنا سکھانا تھا۔ بڑی "مسخری" کلاس تھی۔ بنی ٹھنی، سجی سنوری لڑکیاں بڑے ادب سے بیٹھتیں اور عصمت انھیں کچھ زبانی اور کچھ بلیک بورڈ کی مدد سے انگریزی لکھنا اور بولنا سکھاتیں۔ کسی لڑکی کا نام لے کر پُکارنا ممنوع تھا۔ بس ننھی بی، پیاری بی، گوری بی، اچھی بی، سچی بی۔ سب بیبیاں تھیں ـــــ چیف منسٹر کی بیٹیاں بڑی شوخ و شریر تھیں۔ عصمت کبھی اُن کے گھر چلی جاتیں تو بہت لُطف اندوز ہوتیں ـــــ ولی عہد کے چھوٹے بھائی منّی میاں کی دُلہن کو انگریزی پڑھنے کا شوق چرایا۔ ہر روز موٹر عصمت کو لینے آتی اور وہ رات کا کھانا اُن کے ساتھ کھا کر لوٹتیں۔ انگریزی کی مشق بس برائے نام ہوتی۔ زیادہ تر وقت لونڈیوں باندیوں کے ناچ گانوں، نقلوں، چہلوں، شرارتوں کی نذر ہو جاتا۔

○ عصمت کو عیش و عشرت کے اِس ماحول کو دیکھ کر حیرت ہُوئی کہ انسان کی بیقرار رُوح ایسے میں بھی تشنہ کام ہے۔ جب قلبی طمانیت مفقود ہو۔ ذہنی سکون ناپید ہو تو عیش و طرب اور رامش و رنگ کی محفلیں بے رنگ اور بے کیف ہو جاتی ہیں۔ یہ مائیگی حیات، بے مائیگی حیات میں بدل جاتی ہے۔ عصمت کے لئے یہ تجربہ بڑا گرانقدر، بصیرت افروز اور سبق آموز تھا۔

"ایک دن منّی میاں نے بڑی حسرت سے کہا:

"جی چاہتا ہے۔ ریاست سے باہر جاؤں۔ کوئی نوکری کروں"ـــــ "پھر کونسی چیز مانع ہے"، میں نے پوچھا۔

"کوئی چیز نہیں۔ باہر بھی یہی دُنیا ہے۔ برٹش سرکار کوئی عہدہ دے دی گی۔ کیا فرق پڑے گا"ـــــ "تو ولائت"

"ولائت میں بھی کوئی فرق نہ پڑا" وہ بڑی حسرت سے بولے ـــــ "آپ کو کس چیز کی کمی ہے؟"

"خدا کے فضل سے کسی چیز کی نہیں"ـــــ "پھر؟"

"بس یکسانیت، اُکتاہٹ ـــــ" "کبھی آپ نے ریاست کا دورہ کیا ہے؟"

"نہیں" ــــ "بس خول میں بند"

ننھی میاں کچھ کبیدہ خاطر ہوگئے" [1]

اُکتاہٹ آمیز یکسانیت زندگی کو گھُن کی طرح کھا جاتی ہے۔ دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ زندگی کا حُسن اور جاذبیت اس کے تنوع اور رنگارنگی سے ہے ـــــ شب و روز انواع و اقسام کی مرغن غذائیں کھاتے کھاتے بھی انسان اُوب جاتا ہے اور ایک آدھ بار مونگ کی دال اور لوکی، ٹنڈا کھا کر مُنہ کا ذائقہ بدلنا چاہتا ہے۔ تاکہ زندگی کی یک رنگی ٹوٹ جائے ـــــ خوبصورت عصمت مآب بیویوں سے چھُپ چھُپ کر ہزاروں شوہر محض "مزا" بدلنے کے لئے بازارِ حسن کی غلاظت میں مُنہ مارتے پھرتے ہیں ـــــ راقم السطور کے اُردو کے اُستاد شمس العلما مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم کا قول تھا کہ انسان کو کسی نہ کسی چیز سے ضرور عشق ہونا چاہیئے، بھلے ہی وہ پتنگ بازی یا بٹیر بازی کا عشق ہو، جس میں وہ اپنی کاروباری یا پیشہ ورانہ مصروفیتوں سے فراغت پاکر اپنے آپ کو منہمک کر سکے، جو اس کی توجہ کو پُورے طور پر مبذول کر کے اُسے قلبی اور رُوحانی تسکین عطا کرے۔ گویا جس سے زندگی کی اکتاہٹ آمیز یکسانیت دُور ہو جائے ـــــ کوئی مشغلہ، کوئی ہُنر، کوئی دُھن ضرور ہونی چاہیئے جو زندگی میں رنگ بھر دے ـــــ وقتی طور پر ہی سہی۔ اچھے دوستوں کی محفلیں اور اچھی کتابوں سے دوستی بھی اس اعتبار سے بہت کارآمد ہیں ـــــ جس انسان کو کسی شے سے دِلچسپی نہیں اُسے اپنے آپ سے بھی دِلچسپی نہیں۔ زندگی اُس کے لئے محض سانس لینے کا نام ہے۔

○ عصمت کے جاورے میں قیام کے دَوران ہی ایک اور واقعہ ہوا جسے وُہ بھُلا نہ پائیں۔ اُن کی موجودگی میں ہی نواب صاحب کی سالگرہ کا جشن منایا گیا۔

"نذر گذارنی ہوگی" مُنے بھائی (عظیم بیگ) نے کہا ـــــ "تو میں نہیں جانے کی" میں نے کہا۔

"کیوں؟" ـــــ "ارے واہ۔ اتنے مالدار کو اور مال دو۔ اور مہینے کا آخر ہے، میرے پاس تو پیسے بچتے ہی نہیں"

"مُنے بھائی نے ایک اشرفی اور گیارہ روپیہ دُلہن بھابی کو میری نذر کے لئے دیدیئے کہ عین وقت پر دے دیں" [2]

نواب صاحب لباسِ فاخرہ میں جھلمل کرتے ہار پہنے زربفت کی چوکی پر تشریف فرما تھے۔ عورتیں زیورات سے لدی پھندی یکے بعد دیگرے پہلے سلام کرتیں۔ پھر رومال پر روپیہ، اشرفیاں رکھ کر نذرانہ پیش کرتیں۔ وہ روپوں

---

[1]، [2] عصمت چغتائی "سوتے کا اُگالدان" (مضمون) کاغذی ہے پیرہن۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (دسمبر ۱۹۷۹ء) ص ۱۰-۱۱

کو ہاتھ لگاتے اور پاس کھڑا مصاحب نذر لپک لیتا ــــــ عصمت نے اپنی بھاوج کے دیئے ہوئے رومال کو ہاتھ بڑھا کر پیش کیا۔ نواب صاحب خاموش انھیں گھورتے رہے۔ عصمت ڈریں کہ کہیں وہ انھیں اپنے حرم ہی میں داخل نہ کرلیں۔ پھر انھوں نے اپنے دستِ مبارک سے چھوا اور مصاحب نے روپے اُچک لئے۔ اشرفی پڑی رہ گئی۔ عصمت نے چاہا کہ اشرفی دبا کر سرک جائیں لیکن چشم زدن میں مصاحب پھر جھپٹا اور اشرفی اڑا لے گیا۔ عصمت کھڑی دیکھتی رہ گئیں۔

جشنِ سالگرہ پر جہاں نواب صاحب کو اپنی آمرانہ اور شاہانہ شخصیت کا دل افروز احساس ہوتا ہوگا وہاں نذر گذارنے والوں کو بھی اپنی بے بضاعتی اور بے وقعتی کا احساس ستاتا ہوگا ــــــ نذر گذارنے کی رسم انسان کی غلامی اور اس کی تحقیر و تذلیل کی مظہر ہے۔ عصمت کے لئے جو برابری اور مساوات کی داعی تھیں، یہ رسم رُوح کو جھنجھوڑ دینے والی تھی۔ لیکن ریاستی ماحول میں اس سے مفر ممکن نہ تھا۔

○ ننھے بھائی (عظیم بیگ سے چھوٹے بھائی جو ریاست میں ہی ملازم تھے) نے اپنی ناعاقبت اندیشی اور کوتاہ بینی سے نواب صاحب کی ناراضی اور ناخوشی خواہ مخواہ مول لے لی تو گھر میں آگرہ واپس چلے جانے کے امکانات پر بحث ہونے لگی۔ عصمت نے جو پہلے ہی نوکری سے بیزار تھیں، اپنی پوزیشن یوں واضح کی:

> "بھئی میرے مستقبل کی فکر نہ کی جائے"، میں نے اکڑ دکھائی۔ "میں چھٹیوں میں جاؤں گی تو پھر نہیں واپس آؤں گی۔"
>
> "بیوقوف ہو کتنی خاطر ہوتی ہے تمھاری۔ کچھ نہیں کرنا پڑتا مفت کی تنخواہ ملتی ہے۔ آرام سے موٹر میں گھومتی ہو۔ صاحبزادیاں تمھاری گرویدہ ہیں۔ نواب صاحب فرشتہ ہیں۔ ناشکر گذار ہو۔"
>
> اور میں نے سوچا مفت بیٹھ کر تنخواہ لینی تھی تو کسی موٹی آسامی سے شادی میں زیادہ منافع رہتا۔ پھر لوگوں کو مجھ پر ترس بھی نہ آتا کہ بیچاری کی شادی نہیں ہوئی۔ خود نوکری کرتی ہے۔"[1]

یوں عصمت نے وہاں ایک سال سے بھی کم عرصہ ملازمت کی۔

○ پھر ایک ایسا پریشان کُن اور ناقابلِ یقین واقعہ ہوا جس نے عصمت کو ریاست چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ عظیم بیگ سخت بیمار تھے۔ رات کھانستے تڑپتے گذرتی۔ نواب صاحب نے از راہِ کرم اپنا ذاتی طبیب اُن کے علاج کے لئے مقرر کر دیا۔ لیکن "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی" کے مصداق ان کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ نقاہت اس قدر تھی کہ بات کرنا بھی اُن کے لئے دوبھر ہوگیا۔ ایسے میں ایک روز رات کے دو بجے اُن کے رشتے کے نانا آئے اور اُنھوں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ کھُلا تو وہ جلدی سے اندر آئے اور سرگوشی

---

[1] عصمت چغتائی "سونے کا انگالدان"۔ (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی۔ (دسمبر ۱۹۷۹ء) ص ۱۲

کے انداز میں کہا: "لالٹین بجھا دو" ــــــ تھوڑی دیر تاریکی میں بیٹھے رہے پھر آہستہ سے بولے:

"جو کہتا ہوں سنو اور سوال نہ پوچھو۔ صبح نواب صاحب سے اجازت لے کر دُلہن تم مُنّے کے ساتھ میرج کے سینی ٹوریم (اسپدق کا ہسپتال) چلی جاؤ۔"

"بچّے!" دُلہن بھابی بولیں ــــــ "یہ بیٹی دیکھ لے گی یعنی میں اور پھر خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بس۔"

"مُنّے بھائی آپ چلے جائیے۔ میں بچوّں کی دیکھ بھال کرلوں گی۔" میں نے سہم کر کہا۔

"مگر نانا رات کو چھُپ کر یہ بات کیوں کہنے آئے۔" دُلہن بھابی نے پوچھا۔

"نانا نے کہا تھا کچھ سوال نہ کر۔ بس چلے جاؤ۔" میں چکر میں پڑ گئی۔"[1]

اگلے روز نواب صاحب کی اجازت سے عظیم بیگ اپنی اہلیہ کے ہمراہ میرج روانہ ہو گئے ــــــ عصمت کو ایسا لگا جیسے اندر ہی اندر کچھ کھچڑی پک رہی ہے، جیسے کوئی اہم غیر متوقع بات ہونے والی ہے۔ انھیں فضا میں کسی سازش کی بُو آرہی تھی۔

اس سے اگلے دن وہی نانا پھر آئے۔ اُنھوں نے عصمت سے پوچھا کہ آیا بچے سو رہے ہیں کیونکہ اُنھیں کوئی ضروری بات کہنی ہے۔ عصمت اُن کے ساتھ بڑے کمرے میں آگئیں۔

"تم بڑی خوش نصیب ہو بیٹی۔ میں تمھارے لئے ایک خوش خبری لایا ہوں۔" نہ جانے میرا دل کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر میں نے بڑی سادگی سے پوچھا۔ "کیسی خوش خبری نانا؟"

"تمھیں نواب صاحب اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔" میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ ایسا ہی کچھ معاملہ ہوگا۔ مگر چپ رہی۔

"اُن کے صاحبزادے ولایت میں زیر تعلیم ہیں نواب صاحب شادی کے بعد تمھیں بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیج دیں گے۔ ولایت۔"

میں پھر بھی چُپ رہی کیوں کہ بولتی تو نانا کا مُنہ خشک ہو جاتا۔

"پرسوں جمعہ کا مبارک دن طے فرمایا ہے حضور نے۔"

"میری والدہ اور بھائیوں کو۔۔۔"

"انھیں تو رشتہ پر فخر ہوگا۔ نواب صاحب کہتے ہیں وہ تار سے اطلاع دیدیں گے تم فکر نہ کرو بیٹی

---

[1] عصمت چغتائی "سونے کا انڈا" (مضمون) کاغذی ہے پیرہن۔ ماہنامہ آج کل نئی دہلی (دسمبر ۱۹۷۹ء) ص ۱۲

ہم موجود ہیں۔ صاحبزادے آئے ہوئے ہیں۔ نکاح کے بعد۔۔"

میں دانت بھینچے خاموشی بیٹھی رہی۔

"ایک پنتھ دو کاج۔ ان کا خیال ہے نزہت بٹیا (عظیم بیگ کی بیٹی جو صرف گیارہ سال کی تھی) کا نکاح بھی اگر چھوٹے صاحبزادے شبّو میاں سے ساتھ ہی ہو جائے تو۔۔۔"

"مگر اس کے والدین؟"

"حضور ہمارے مائی باپ ہیں۔ انھیں رعایا کا نکاح پڑھانے کا حق ہے"[1]

اب نانا نے ذرا کھل کر عصمت کو تہِ دام لانے کے لئے انھیں سبز باغ دکھانے شروع کئے یا شاید ان کی باتوں میں کچھ حقیقت کی چاشنی بھی تھی ––– وہ بولے "نواب صاحب بہت دریا دل ہیں۔ وہ تم پر اپنی عنایات کی بارش کر دیں گے۔ تم پھوپھی بھتیجی راج کروگی (ننھے میاں عظیم بیگ سے چھوٹے بھائی جو ریاست کی ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے تھے) کو واپس بلا کر ان کی ملازمت بحال کر دی جائے گی) منّے (عظیم بیگ) کی تنخواہ بڑھا دی جائے گی اور انھیں محل میں رہائش کا موقع ملے گا ––– بیٹی جاورہ چھوٹی مگر بہت امیر ریاست ہے۔ نواب صاحب نے میری پوتی شاہ بانو کی شادی کمال لطف و کرم سے بالے صاحب سے کر دی تھی۔ تم اس کے چڑھاوے کے زیورات دیکھتیں تو دنگ رہ جاتیں۔ ریاست جاورہ کے جواہرات کا بڑی بڑی ریاستیں مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ایک ایک موتی کبوتر کے انڈے کے برابر ہے۔ تمہارے خاندان کو جاگیریں ملیں گی ––– تم خوش ہونا بیٹی"–––

"میں نے فرمانبردار بیٹی کی طرح سر جھکا دیا"

یہ ایک بہت سوچی سمجھی ناپاک سازش تھی جو نواب صاحب نے سیاہ کار نانا کے توسط سے رچی تھی۔ ننھے میاں کو پہلے ہی ریاست بدر کر دیا گیا تھا۔ عظیم بیگ اور ان کی اہلیہ کو سینی ٹوریم بھیج کر راستہ سے ہٹا دیا گیا تھا۔ درحقیقت حکیم صاحب نے نواب صاحب کی ہدایت کے بموجب عظیم بیگ کو الٹی سیدھی دوائیں دے کر ان کی حالت دیدہ دانستہ بگاڑ دی تھی ––– عصمت کی والدہ، بھائیوں، بہنوں اور دیگر اعزا و اقارب کو اطلاع دینے اور انھیں شادی میں شمولیت کے لئے مدعو کرنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی گئی تھی تاکہ شادی میں کوئی اڑچن پیدا نہ ہو جائے۔ اور تو اور عصمت سے واضح طور پر رضامندی حاصل کرنے سے بھی گریز کیا گیا۔ نانا نے محض اوپری لیپا پوتی پر ہی اکتفا کی تھی ––– عظیم بیگ کی معصوم گیارہ سالہ بچی نزہت باپ کی غیر موجودگی میں ریاستی درندوں کے رحم و کرم پر تھی ––– عصمت کو صرف دو دن کی مہلت دے کر نکاح کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور انھیں ہیرے جواہرات کی چکاچوند کی تصویر دکھا کر اور ولایت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا لالچ دے کر یہ کوشش کی گئی تھی کہ وہ پسیج جائیں اور ان کی ممکنہ مزاحمت ختم ہو جائے ––– عصمت نے بہت دانشمندی

بہر قیمت

---

[1] عصمت چغتائی ۔ "سونے کا انڈا" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آج کل" (دسمبر ۱۹۷۹ء) ص ۱۴

سے کام لیتے ہُوئے خاموشی کو ہی قرینِ مصلحت جانا۔ ورنہ اگر وہ برملا اپنے دلی جذبات کا اظہار کر دیتیں تو معاملہ بگڑ جاتا اور انھیں نواب صاحب کے عتاب کا سامنا کرنا پڑتا ـــــ پھر نواب مطلق العنان تھے۔ ریاست کے سیاہ و سفید کا مالک تھے۔ ان کے خوف سے ریاست کا ہر فردِ بشر کانپتا تھا۔ عصمت بھلا کس شمار و قطار میں تھیں۔

نانا چلے گئے تو عصمت جُوں کی توں بُت بنی بیٹھی رہیں ـــــ ان کی فکر نے اُڑان بھری تو انھیں شاہی محل میں سونے چاندی کے اُگالدان اور خاصدان نظر آئے۔ کبوتر کے انڈے برابر موتی فرش پر لڑھکتے دکھائی دیئے۔ جمعہ کے روز دھوم دھام، باجے گاجے کے ساتھ بارات چڑھی۔ وہ دُلہن بنیں اور اپنے بوسیدہ بنگلے سے عالیشان شاہی محل میں منتقل ہو گئیں۔ انھیں حریر و پرنیاں کے پردوں میں چھُپی گدگدا جمنی مسہریوں پر گہری میٹھی نیند آئی ـــــ دُولھا حجرۂ عروسی میں داخل ہُوا۔ اس کے پاؤں کی چاپ سُن کر ان کا دل دھڑکنے لگا ـــــ پھر دُولھا نے گھونگھٹ اُٹھایا ـــــ عصمت لکھتی ہیں کہ یہاں پہنچ کر وہ اُف۔ میرے حواسوں کی گھگی بندھ گئی۔" ازدواجی زندگی اُن کے لئے ایک اَن دیکھی دُنیا تھی۔ نہ ہی انھوں نے جنسیات پر کچھ پڑھا تھا۔ ان کی بھابی عظیم بیگ کے خطوط کبھی کبھی اُن سے پڑھوایا کرتی تھیں، جن سے عصمت کے پلّے کچھ نہیں پڑتا تھا۔ ہاں اکثر شرم و حیا سے بھابی کا چہرہ گُلنار ہو جاتا تھا۔ لیکن پُوچھنے پر وہ اُن کی تشریح گول کر جاتی تھیں۔ عصمت نے عورتوں کو کھُسر پھُسر کرتے ضرور سُنا تھا۔ "بس اُن کو تو گندی باتوں کے سوا کسی بات سے دِل چسپی نہیں۔ ہر وقت جان کو لگے رہتے ہیں۔" یہ بات وہ اپنے شوہر نامدار کی بابت کہہ رہی تھیں ـــــ پروازِ تخیّل ہی تو تھی بیٹھے بیٹھے شاہی محل کی اُونچی اُونچی دیواروں اور گھُٹی گھُٹی فضا میں عصمت کا دَم گھُٹنے لگا۔ نواب لوگ طلاق کے قائل نہیں تھے۔ اگر کوئی بیبی چیں چپڑ کرنے کی حماقت کرے تو اُسے زہر دلوا کر چھٹکارہ پا لیتے تھے ـــــ اور عصمت تو مزاج کے اعتبار سے بس بارُود کا ڈھیر تھیں۔ نہ جانے کب بھَٹ پڑیں۔ تیز طرار، مُنہ پھٹ۔ ان کی تو کسی سے ایک دن بھی نہ پٹتی تھی۔ پھر وہ کسی کو اپنا خدائے مجازی کیسے تسلیم کر لیں گی۔ اُنھوں نے تو برسوں ہوئے نماز تک پڑھنی چھوڑ دی تھی۔

ـــــ "ہائے خُدائے مجازی اور وہ بھی نواب زادہ، کیسے نگلا جائے گا" ـــــ اور پھر اُدھر نزہت تھی گیارہ برس کی معصُوم بچّی۔ دُنیا جہاں سے بے بہرہ ـــــ عصمت نے فیصلہ کر لیا کہ یہ شادی نہیں ہو گی۔ ہرگز نہیں ہو گی۔

اگلے روز صبح سویرے اُنھوں نے دو ٹرنکوں میں اپنا مختصر سا سامان ٹھونسا۔ نزہت سمیت تین بچّوں کو ساتھ لیا۔ دو چھوٹے بچّوں کو وہیں چھوڑا۔ ٹانگہ لیا اور اسٹیشن پہنچیں۔ اور ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ ان کے دل میں غضب کی دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی۔ کئی وسوسے اور خدشے سر اُٹھا رہے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ ـــــ گاڑی رتلام پہنچی تو اُنھوں نے راحت کی سانس لی۔ اب وُہ نواب کی دسترس سے باہر انگریزی علاقے میں تھیں۔ جاورہ ایک بُرے خواب کی طرح پیچھے رہ گیا۔

ریاست جاورہ میں عصمت ایک سال کے قریب اسکول ہیڈ مسٹریس کے طور پر ملازم رہیں اور انھوں نے

ریاستی نظام کو بڑی دُور رس اور باریک بین نگاہوں سے دیکھا۔ مندرجہ ذیل واقعات کا تعلق براہِ راست عصمت سے نہیں بلکہ ان کے بھائی ننھے میاں (عظیم بیگ سے چھوٹے بھائی) سے ہے جو جاورہ میں محکمۂ مال میں ایک ذمّہ دار افسر تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان میں عاقبت اندیشی اور سُوجھ بُوجھ کی کمی تھی لیکن اُن کے توسّط سے عصمت پر نواب صاحب اور اُن کے ولی عہد کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت، خود پسندی اور آمرانہ طبع آشکار ہو گئی۔ وہ چاہتے تھے کہ کھیلوں کے مُقابلوں میں بھی رعایا کا کوئی فرد یا ان کا کوئی ملازم، خواہ وہ کتنے ہی بڑے عہدہ پر فائز کیوں نہ ہو، ان پر سبقت لے جانے کی جسارت (حماقت) نہ کرے۔ ان واقعات نے عصمت کی سی حسّاس ادیبہ پر یہ بات واضح کر دی کہ مُطلق العنان حکمراں رعایا کو پرِکاہ کی بھی اہمیت نہیں دیتے۔ اور کہ ان کی ناراضی مول لینا اپنے مُستقبل سے کھلواڑ کرنا ہے ـــــ ایک مثال پیش ہے:

○ سالگرہ کے جشن کے سلسلے میں پولو میچ کا اہتمام کیا گیا۔ ننھے بھائی اس کھیل میں مشّاق تھے اور اُنھوں نے ولی عہد کو، جو کھیل میں شامل تھے، گیند نہیں لینے دیا اور خود ہی گول پر گول کرتے رہے۔ اُن کے بڑے بھائی عظیم بیگ اس صورتحال سے پریشان ہو گئے۔ اور درباری بھی گھبرا گئے۔ نواب صاحب زیرِلب مُسکراتے رہے لیکن ننھے میاں کمال جوش و خروش سے کھیلتے ہوئے مزید فتوحات حاصل کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھیوں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ دانشمندانہ فعل نہیں۔ اُن کی غرض یہ تھی کہ انھیں مصلحتاً اور روایتاً ولی عہد کو گول کرنے کا موقع دینا چاہیئے لیکن ان کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ وہ حیران تھے کہ بجائے اس کے کہ اُن کی تعریف و توصیف کی جاتی، اُلٹا اُنھیں محتاط ہو کر کھیلنے کی تلقین کیوں کی جارہی ہے۔ سب سانس روکے بیٹھے تھے۔ ولی عہد کی برہمی ہر لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔ اُنھوں نے جھلا کر ننھے بھائی پر ایک دوبار حملہ بھی کیا۔ لیکن انھیں احساس تک نہ ہُوا اور ہر بار پہلو بچا کر نکل گئے۔ نواب صاحب نے صورتِ حال بگڑتی دیکھی تو مصلحتاً کھیل بند کرنے کا حُکم دیا ـــــ کسی نے ننھے بھائی کے کھیل پر نہ ان کی پیٹھ ٹھونکی اور نہ تالیاں پیٹیں ـــــ اور ننھے بھائی کھیل کے نشے میں اس قدر مخمور تھے کہ انھیں تالیوں کی گڑگڑاہٹ کی غیر موجودگی کا احساس تک نہ ہُوا۔

ننھے بھائی کا موقف تھا کہ میچ میں مدِمقابل سے رُو رعایت کیسی۔ جب خم ٹھونک کر آمنے سامنے آ ہی گئے، تو جو بہتر کھیلے میدان مارلے جائے۔ میچ میں ہر کھلاڑی برابر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں اُس کے منصب و مقام کو دخل نہیں ہوتا ـــــ اگر ایسا نہیں ہوتا تو میچ اپنی اہمیّت کھو دیتا ہے۔ اُن کی رائے برحق تھی اور اس سے انحراف ممکن نہ تھا۔ لیکن سوال تو دُوراندیشی اور مصلحت کوشی کا تھا۔ ریاست کے اربابِ بست و کُشاد کھیل میں جیتنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے اور انھیں اس حق سے محروم کرنے والا معتوب قرار دیا جاتا تھا۔ یہ ریاست کا دستور ـــ بے دستوری تھا۔

○ اب نشانہ بازی کا کھیل شروع ہوا۔ ایک لمبے بانس کے سرے پر ایک ہانڈی لٹکا دی گئی، جس میں پانچ اشرفیاں تھیں۔ نشانہ باز ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ حُسنِ اتّفاق سے ننھے بھائی اچوک نشانہ باز تھے۔ دس بارہ سال

کی عمر سے ہی شکار کھیلتے آئے تھے۔ ولی عہد نے ابتدا کی اور نشانہ لگایا جو چوک گیا۔ باقی سب نے ایک ایک کر کے گولیاں
تو داغیں لیکن دیدہ دانستہ نشانہ لگانے سے گریز کیا۔ اب ننھے بھائی کی باری آئی۔ اُنھوں نے بندوق اُٹھائی۔ تڑسے
گولی چلائی اور ہانڈی پھوٹ کر زمین پر آ رہی اور اشرفیاں بکھر گئیں۔ کسی نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا ـــــ دُوسری
بار پھر مقابلہ شروع ہُوا۔ پھر سے ہانڈی باندھی گئی۔ ولی عہد نے دوبار نشانہ لگایا لیکن خالی گیا۔ وہ غم و غصّے کی
شدّت سے کانپ رہے تھے۔ اب کے پھر ننھے بھائی نے نشانہ باندھ کر گولی داغی اور ہانڈی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔
ـــــ آخر تیسری بار پھر ہانڈی باندھی گئی، تو کسی نے آکر ننھے بھائی سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں، چغتائی صاحب"۔

"کیوں؟ کیا کیا ہم نے؟"

"صاحب کیا آپ سمجھتے ہیں ہمارے نشانے آپ سے کم ہیں؟"

"تو لگاتے کیوں نہیں؟"

"کیا بچّوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہر سال صرف ولی عہد ہی ہانڈی توڑتے ہیں"۔

"تو اس سال بھی توڑیں کون روکتا ہے؟"

"افوہ قبلہ آپ تو۔۔۔۔ یہ سُنئے، ولی عہد چار پانچ جتنے فائر کریں آپ چُپ رہیئے۔
گول چلائیے بھی تو ایسے کہ نشانے پر نہ لگے"۔

"ارے واہ کیوں؟"

"دیکھئے چغتائی صاحب آپ کو یہ 'کیوں' بڑی بھاری پڑے گی"۔ وُہ صاحب غرّائے[1]
ولی عہد نے تین فائر کئے لیکن ہانڈی جوں کی توں برقرار رہی ـــــ ننھے بھائی عاقبت اندیشی میں کورے
تھے اور گرد و پیش دیکھ کر چلنے کے قائل ہی نہ تھے۔ اُنھوں نے گولی چلائی تو ہانڈی پاش پاش ہوگئی۔ عظیم بیگ نے یہ
منظر دیکھا تو چکرا کر کرسی سے نیچے گر گئے۔ ننھے بھائی مقابلہ بھُول کر بڑے بھائی کی جانب لپکے، ایک بچّے کی طرح انھیں
اُٹھایا اور بغیر کسی سے کچھ کہے سُنے گھر لے آئے۔
سب گھر والے ننھے بھائی کے بیحد غیر دانش مندانہ رویے پر پریشان ہوگئے۔ اُنھوں نے بہت مغز مارا کہ
وہ مصلحت کوشی سے کام لیتے ہُوئے، ہیکڑی اور خود سری ترک کر دیں۔ دربار کے نظم و ضبط کا پابند رہتے ہُوئے،
اُس کی روایات کا احترام کریں۔ ورنہ حکام کی خوشنودی کھو کر نہ صرف اُن کی بلکہ عظیم بیگ اور عصمت کی ملازمت بھی

---

[1] عصمت چغتائی، "سونے کا اُگالدان" (مضمون)، "کاغذی ہے پیرہن"، ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (دسمبر ۱۹۷۹ء) ص ۱۲

خطرے میں پڑ جائے گی۔ لیکن نہ جانے ننھے بھائی کن خوابوں کی دنیا میں رہ رہے تھے کہ انھوں نے سب کی سُنی اَن سُنی کر دی۔ اور معاملے کو اُس سنجیدگی سے نہ لیا جس کا کہ وہ طلب گار تھا ـــــ ان کا موقف تھا کہ ولی عہد نے یکے بعد دیگرے دو دو تین تین نشانے لگائے لیکن سب خطا گئے جبکہ اُنھوں نے ہر بار پہلے نشانے پر ہی ہانڈی کو اُڑا دیا۔ اس لئے ولی عہد کا جز بز ہونا بے معنی و بے مقصد ہے اور "اسپورٹس مین اسپرٹ" کی کمی کا مظہر ہے ـــ چاہیئے تو یہ کہ انھیں پیٹھ پر تھپکی دی جائے اور انعام واکرام سے نوازا جائے اور ان کا حوصلہ بڑھایا جائے لیکن اس کے برعکس انھیں پھٹکارا اور لتاڑا جا رہا ہے۔ ان کی رائے تھی کہ ولی عہد حاسدانہ جذبے سے متاثر ہیں جس کا کوئی معقول اور مدلل جواز نہیں ـــــ لیکن سوال عاقبت اندیشی کا تھا، روزی روٹی کا تھا، بحث و تمحیص کا نہ تھا۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر چہ معنی دارد۔

ننھے بھائی نواب صاحب سے معذرت خواہ ہوئے۔ اُنھوں نے ان کی عجز وانکساری دیکھی تو پسیج گئے اور انھیں خوش دلی سے معاف کر دیا ـــــ لیکن یہ محض تصنّع اور بناوٹ تھی۔ درحقیقت دلوں میں گانٹھیں پڑ چکی تھیں، جنھیں کھولنا آسان نہ تھا۔ دل کا میل اُترتے اُترتے ہی اُترتا ہے ـــــ دوسرے ہی روز ولی عہد تمام محکموں کا معائنہ کرنے نکلے تو سیدھے ننھے بھائی پر نازل ہوئے۔ نہ جانے اُن کے محکمے میں کب سے بدعنوانیاں ہوتی چلی آ رہی تھیں۔ انھوں نے لاکھ عذر پیش کئے لیکن ولی عہد نے ایک نہ مانی اور وہ غصّے میں پیچ و تاب کھاتے چلے گئے اور اسی وقت حکم صادر فرمایا کہ ننھے بھائی چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ریاست کی حدود سے باہر نکل جائیں ورنہ وہ قانون کی زد میں آجائیں گے ـــــ ننھے بھائی نے بوریا بستر باندھا اور بیوی بچّوں سمیت ریاست سے رُخصت ہو گئے۔

غور فرمایا آپ نے کہ جو بات کھیل کے میدان سے شروع ہوئی تھی اُس نے کتنا سنگین موڑ لیا اور اس کا نتیجہ کس قدر المناک نکلا ـــــ یہ بھی ظاہر ہے کہ ذرا سی ناگوار بات بھی تنگ دل اور کوتاہ بین حکمرانوں کی قوّتِ برداشت سے باہر ہوتی تھی۔ ورنہ اگر حالات کا غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو ننھے بھائی کا "جُرم" اس قدر سنگین نہیں تھا کہ ان کی روزی روٹی پر لات مار کر انھیں بیک بینی و دوگوش ریاست بدر کر دیا جاتا ـــــ مطلق العنان حکمرانوں کے فیصلے اکثر مدلّل اور عقلی نہیں ہوتے بلکہ ان کی WHIM پر منحصر ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مطلق العنانی کے زعم میں جو بھی چاہیں جانچے پرکھے بغیر کر گذرتے ہیں کیونکہ انھیں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہونا پڑتا ـــــ عصمت اس واقعے کو کبھی بھول نہ پائیں۔

بریلی

جاورہ کے سازشی ماحول سے دہشت زدہ ہو کر عصمت بھاگ نکلیں اور سیدھی بریلی پہنچیں جہاں ان کی

بھانجی نیّر کی شادی ہو رہی تھی۔ وہاں اُن کی ملاقات اسلامیہ گرلز ہائی اسکول، بریلی کے مینجر کی اہلیہ سے ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ اسکول مہینہ بھر سے کھُلا ہوا ہے لیکن ابھی تک ہیڈ مسٹریس کا تقرر نہیں ہوا۔ لوگوں کا تقاضا ہے کہ اسلامیہ اسکول کی ہیڈ مسٹریس مسلمان ہی ہونی چاہیئے۔ آپ ہی آجائیے ـــــ دو چار روز بعد مینجر صاحب اُن کے ہاں خود تشریف لائے اور بات طے ہوگئی۔ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا۔ سال بھر کا معاہدہ ہوا۔ رہائش کے لئے کوٹھی میں، جو اسکول کے برابر تھی، وہ جتنے کمرے چاہیں لے سکتی تھیں۔ عصمت نے اسی روز اسکول، جو آٹھویں جماعت تک تھا، کا چارج سنبھال لیا۔

سو روپے ماہوار اُس زمانے میں جب ہر چیز ارزاں اور فراواں تھی، ایک واحد شخص کی ضروریات کے لئے بہت ہوتے تھے۔ اور پھر عصمت کفایت شعار نہیں تو فضول خرچ بھی نہیں تھیں۔ تنخواہ ملتی تو آپا کے حوالے کر دیتیں۔ اور پھر مہینہ بھر اُن سے حسبِ ضرورت لیتی رہتیں۔ اگلے مہینے کی تنخواہ آپا کو دیتیں تو وہ گذشتہ مہینے کی تنخواہ سے بچے ہوئے روپے انھیں لوٹا دیتیں، جو کافی ہوتے تھے۔ عصمت کا تاثر تھا کہ شاید آپا اپنے پاس سے بھی تھوڑا بہت خرچ کرتی ہوں گی ـــــ نزدیک ہی ایک اونچے درجے کا سینما گھر تھا، جس کے منیجر کی بیٹی اسکول میں پڑھتی تھی۔ وہ نئی فلم آنے پر انھیں پاس دلا دیتی اور اس طرح مُفت ہی ان کی تفریحِ طبع کا سامان مہیا ہو جاتا ـــــ عصمت اپنے حالات سے مطمئن اور مسرور تھیں۔

عصمت کی آمد سے پیشتر اسکول کی ہیڈ مسٹریس ایک مسز مارکس تھیں جو عمر رسیدہ اور تجربہ کار تھیں، گو صرف انٹر پاس تھیں۔ اسکول کی بنیاد انھوں نے ہی رکھی تھی۔ عصمت کے آنے پر بھی منیجر صاحب نے مسز مارکس کو مصلحتاً ملازمت سے سبکدوش نہیں کیا تھا۔ وہ سخت گیر تھیں اور شاید نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لئے ذرا سختی سے کام لینا ضروری بھی تھا۔ درحقیقت عصمت کا تقرر اُن کے ساتھ صریحاً ناانصافی تھی لیکن منتظمین بے بس تھے کہ وہ لوگ جو مالی لحاظ سے اسکول کی پُشت و پناہ تھے، مصر تھے کہ ہیڈ مسٹریس کوئی مسلمان ہی ہونی چاہیئے۔ عصمت کی رائے میں اسکول کا مفاد اسی بات میں تھا کہ مسز مارکس کو ہی اسکول کی ہیڈ مسٹریس کے عہدہ پر برقرار رہنے دیا جاتا لیکن ان کا عہدہ مذہب پرستوں کی ضد کی نذر ہو گیا ـــــ مسز مارکس کی سو روپیہ ماہوار تنخواہ برقرار رہی۔

مسز مارکس آئیں تو عصمت احتراماً اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور انھوں نے نہایت ادب سے بات کی، جس سے اُن کا خلوص عیاں تھا اور جس کی مسز مارکس کو ہرگز توقع نہ تھی ـــــ عصمت نے سارے معاملے کی وضاحت بے کم و کاست کر دی تاکہ مسز مارکس کو عصمت کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ انھوں نے کہا کہ مسز مارکس بطور ہیڈ مسٹریس، میں ناتجربہ کار ہوں اور دفتری معمولات (ROUTINE) سے بھی بے بہرہ ہوں۔ میری تنخواہ آپ کی تنخواہ کے برابر ہے اور یہ آپ کے ساتھ ناانصافی ہے۔ بہرحال میں بریلی میں مستقل طور پر قیام نہیں کروں گی،

کیونکہ میرا ارادہ اگلے سال بی۔ٹی کے لئے باہر جانے کا ہے۔ اس اسکول کو آپ نے زندگی عطا کی ہے اور آج یہ جو کچھ بھی ہے آپ کے دَم قدم کی بدولت ہے۔ میں جھُوٹی انا پرستی میں یقین نہیں رکھتی۔ آپ اگر میری ممد و معاون ہوں گی تو یہ اسکول خوش اسلوبی سے چلتا رہے گا ـــ اگر مجھے یہاں سے جانا بھی پڑے تو میرے سامنے متبادل اور بھی ہیں ـــ عصمت نے یہ باتیں پورے اطمینان کے ساتھ بڑے ہموار اور متوازن لہجے میں کہیں جس میں غصے یا خوشامد کا شائبہ نہ تھا۔

مسز مارکس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ انھیں عصمت سے اِس بلا کی صاف گوئی کی امید نہ تھی۔ مسز مارکس کے استفسار پر عصمت نے انھیں بتایا کہ انھوں نے ایک ریاست (جاورہ) کے گرلز اسکول میں ایک سال سے بھی کم عرصہ کام کیا ہے۔ انھوں نے بریلی کے اسکول سے اپنے لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھیں لڑکیوں کی تعلیم میں بے حد دلچسپی ہے ـــ اس پر مسز مارکس نے کہا کہ آپ کو تو مسلمان لڑکیوں سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی ہوگی کیونکہ وہ تعلیم کے میدان میں دیگر قوموں سے بہت پچھڑی ہوئی ہیں ـــ عصمت اپنی فطرت کے مطابق مذہب اور تعلیم کے اختلاط پر بدک گئیں اور انھوں نے اس بارے میں اپنے نظریہ کی وضاحت بہت خوبصورتی سے یُوں کی کہ مسز مارکس کم از کم ہم عورتوں کو ہندو مسلم کرسچین کے چکّر میں پڑنا زیب نہیں دیتا۔ میرے علم کا منبع و سرچشمہ کرسچین اُستانیاں رہی ہیں۔ ہمارے ملک کے بیشتر اسکولوں کی بُنیاد بھی عیسائی اساتذہ نے رکھی۔ اور میرے اساتذہ نے میرے ساتھ دوسرے فرقوں کے مقابلہ کبھی تخصیص نہیں برتی۔ علم کی دولت بانٹتے وقت انھوں نے مجھے صرف ایک طالب علم سمجھا۔ نہ کم نہ بیش۔ اس اسکول میں بھی زیادہ اساتذہ عیسائی ہیں ـــ عصمت کی روشن دماغی، طرزِ استدلال اور بے ساختگیٔ اظہار پر مسز مارکس حیرت زدہ رہ گئیں۔

بریلی کی لڑکیاں جاورہ کی لڑکیوں سے بدرجہا بہتر تھیں۔ انھیں حصُولِ تعلیم کا بے حد شوق تھا اور عصمت کو پڑھانے سے بے حد دلچسپی تھی ـــ مینجر صاحب کا اُنھیں بھرپُور تعاون حاصل تھا۔ اور پاس کے لڑکوں کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی بہت خلیق اور علم دوست تھے۔ انھوں نے عصمت کو ایجوکیشن پر بہت سی کتابیں پڑھنے کو دیں جن سے استفادہ اُن کے بہت کام آیا۔

ایک دن مینجر صاحب نے عصمت کو انسپکٹریس مس فلپس کے عنقریب معائنہ پر آنے کی اطلاع دی۔ عصمت سُن کر خاموش رہیں اور ان کا سپاٹ چہرہ کسی طرح کے تاثر سے مبّرا رہا۔ مینجر صاحب جل بھُن کر کباب ہو گئے۔

"میں نے کیا عرض کیا آپ نے سُنا؟" جب وہ غصہ ہوتے تھے تو بڑے ادب سے بولنے لگتے تھے۔

"سوچ رہی ہوں مجھے کیا کرنا ہوگا۔" میں نے نہایت بھولپن انداز میں کہا۔

"ارے صاحب انسپکٹریس آرہی ہے اور آپ۔۔۔" مارے غصے کے وُہ نیلے پڑ گئے ـــ

"بس آپ بھی حد کرتی ہیں!"

"آپ اطمینان رکھیے۔۔۔"

"خاک اطمینان رکھوں۔ اور اگر گرانٹ بند ہو گئی تو۔۔۔"

"مینجر صاحب کیا اسکول میں آپ نے کچھ بد انتظامی دیکھی۔ کلاسوں میں غل، کوڑا کرکٹ، لڑکیوں کی تعداد پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ ایک بنچ پر دو کو بٹھانا پڑتا ہے، گھڑوں میں خود روز پانی بدلواتی ہوں[1]۔"

لیکن مینجر صاحب کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ آفس نک سک سے درست ہو۔ دیواروں پر تصویریں اور کلینڈر آویزاں ہوں۔ گلدان میں پھول مہک رہے ہوں۔ تاکہ انسپکٹریس آئے تو بے اختیار متاثر ہو۔ عصمت نے انھیں یاد دلایا کہ ایک دفعہ انھوں نے انھیں مالی کے لئے کہا تھا ـــ اس پر مینجر صاحب جو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے چھلک پڑے۔ اپنی مالی مشکلات کا رونا روتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مالی کہاں سے لاؤں۔ اسکول پہلے ہی بصد مشکل گھسٹ رہا ہے اور نہ جانے میں کس طرح جوں توں ہزار مشکلات کے باوجود اسے چلائے جا رہا ہوں۔ اور اسی تگ و دو میں میری وکالت جو میرا واحد ذریعۂ معاش ہے، ٹھپ ہو کر رہ گئی ہے۔ میں اسکول کے لئے دربدر چندہ مانگوں یا وکالت کروں۔ میرے لئے تو نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ ہے۔ میری انہی مشکلات کی وجہ سے میری اہلیہ ہر وقت میری گردن پر سوار رہتی ہیں ـــ عصمت نے کہا اگر یہ بات ہے تو پھر آپ نے رضیہ بیگم کو جو ناکارہ اور از کار رفتہ ہیں کیوں اسکول پر ٹھونس رکھا ہے۔ وہ سارا دن سر پکڑے بیٹھی رہتی ہے۔ عصمت نے یہ کہہ کر نادانستہ یا دانستہ طور پر ان کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا اور وہ بلبلا اٹھے ـــ کم از کم آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ صورتِ حال کو سمجھئے اور مجھے خدارا رضیہ بیگم کا طعنہ نہ دیجئے ـــ جب اس کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا تو اس کے شوہر نے اسے طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کیا۔ وہ بے سہارا، بے یار و مددگار عورت کس کا دروازہ کھٹکھٹاتی۔ کیا شکم پُری کے لئے طوائف کا پیشہ اختیار کر لیتی۔ میں نے اس پر ترس کھا کر اسے اسکول میں سر چھپانے کو جگہ دے دی۔ پینتیس روپیہ مہینہ اسے اپنی جیب سے دیتا ہوں۔ اب وہ دکھیاری سر پکڑ کر نہ بیٹھے تو کیا کرے۔ زندگی اس پر بھاری ہے اور وہ لشتم پشتم دن کاٹ رہی ہے۔ اور لوگوں کے جی میں بے سر و پا جو آتا ہے کہے جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس کے پاس باہر سے چوری چھپے لوگ آتے ہیں۔ مجھ پر بھی الزام دھرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے میری بیوی الگ نالاں ہے۔ مینجر صاحب کبیدہ خاطر ہو گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ظاہر تھا کہ وہ صورتِ حال سے بہت غیر مطمئن اور پریشان ہیں ـــ عصمت یہ

---

[1] عصمت چغتائی: "اُلٹے بانس بریلی کو" (مضمون) "کا غذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (جنوری ۱۹۸۰ء) ص ۳۱-۳۲

سُن کر بو کھلا گئیں۔ ان کا دم گھٹنے لگا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہندوستان بھر کی رضیہ بیگمیں گھوم گئیں جن کے مجازی خداؤں نے بچہ پیدا نہ کرنے پر انھیں بدِ فضول سمجھ کر کوڑے دان میں ڈال دیا تھا۔ اور آج وہ بوسیدہ اور فرسودہ معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی مطلقہ عورتیں بے بسی و بے کسی کے عالم میں دَر دَر کی ٹھوکریں کھا رہی تھیں۔ یہ مرد کے جبر و قہر اور عورت کی زبوں حالی کی عبرتناک داستان تھی۔

عصمت حیران تھیں کہ وکیل لوگ کیوں اپنی پریکٹس کو لات مار کر تعلیم نسواں کے فروغ کے جنون میں مسلم گرلز اسکولوں کی بنا رکھتے ہیں۔ اور پھر انھیں چلانے کے لئے چندہ اکٹھا کرنے اور محکمۂ تعلیم کے ضابطوں کو پورا کرنے کی دُھن میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ مینجر صاحب کی طرح ہی علی گڑھ کے پاپا میاں نے بھی اپنی وکالت کو طاق میں رکھ دیا تھا۔ اور گرلز اسکول کی توسیع اور فروغ ہی ان کی حیاتِ ارضی کا واحد مقصد ہو گیا تھا۔ وہ بھی اپنے اسکول کو بطریق احسن چلانے کے لئے ہمہ وقت سرگرداں رہتے تھے۔ مینجر صاحب کی طرح ان کی زندگی بھی دوبھر ہو گئی تھی — لیکن ایسے لوگوں کا کام ہی بذاتِ خود اُن کے لئے وجہِ تسکین و طمانیت ہوتا ہے۔ انھیں اپنے کام کی تقدیس سے اپنے وجود کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ سب رُکاوٹوں اور پابندیوں کو پیروں تلے روندتے اپنے نصب العین کو پالیتے ہیں۔

انھوں نے مینجر صاحب کو یقین دلایا کہ وہ خاطر جمع رکھیں کہ مس فلپس کا معائنہ بحُسن و خوبی گذر جائے گا۔ — اور ساتھ ہی انھوں نے اپنا تقرری نامہ نکال کر اُن کے حوالہ کر دیا کہ وہ اُسے اپنے پاس رکھیں یا پھاڑ دیں۔ یہ ایک طرح سے ان کی طرف سے پیشگی اطلاع تھی کہ "لو بندگی کہ چھُوٹ گئے بندگی سے ہم"۔ سال بھر کا معاہدہ ہے جس کی تجدید ہمیں درکار نہیں۔

عصمت نے لڑکوں کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو صورتِ حال سے مطلع کیا تو انھوں نے اپنے مالی کو حکم دیا کہ بیس پچیس اچھے پھولوں والے گملے دورویہ آراستہ کر دے۔ چھ سات گلدانوں میں پھُول سجا کر کل صبح کلاسوں میں پہنچا دے۔ اور اسٹور سے کچھ نقشے اور سینریاں لا کر ابھی دفتر میں آویزاں کر دے۔ سبز رنگ کا میز پوش بھی لگا دے۔ آخرالذکر دونوں کام فی الفور کر دے — پھر انھوں نے عصمت کو ہدایت کی کہ ایک دستہ براؤن کاغذ منگوا کر سب رجسٹروں پر چڑھا دو کہ یہ بہت بدرنگ ہو رہے ہیں — سب اُستانیاں کام میں جُٹ گئیں۔ رجسٹروں کو چیک کیا گیا کہ خانہ پُوری میں سہواً کوئی غلطی نہ رہ گئی ہو — اسکول میں پھُولوں کے گملوں سے بہار آ گئی۔ کمرے پھول لگے گلدانوں سے مہک اُٹھے۔

مِس فلپس سانولی سلونی، بھرے بھرے جسم کی خاتون تھیں۔ نازک نازک ناک نقشہ، روشن آنکھیں، جن سے ذہانت مترشح تھی — عصمت نے اُن کے سامنے اسکول کی ابتر حالت مینجر صاحب کی پُرخلوص جدوجہد لڑکیوں کی تعلیم میں دلچسپی اور اُن کی مجبوریاں سب من و عن بیان کر دیں۔ عصمت زبان اور اظہارِ بیان پر

روزِ اوّل ہی سے دسترس رکھتی تھیں مس فلپس بہت متاثر ہوئیں۔ جب وہ جانے لگیں تو انھوں نے آہستہ سے عصمت کو قریب بلا کر کہا: "آج شام میرے ہاں ایک پارٹی ہے۔ آنا پسند کریں گی؟" ــــ "ضرور"۔

عصمت کا بریلی میں قیام بہت ثمر آور رہا۔ انھوں نے ریاست جاورہ کی گھٹی گھٹی فضا اور سازشی ماحول سے نجات پائی تو بریلی کی کھلی فضا میں چمک اٹھیں۔ اسکول کو بطور ہیڈ مسٹریس خلوص، تندہی اور یکسوئی سے چلانے کا تجربہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ ہر قسم کے پڑھے لکھے، مہذب اور متمدن لوگوں سے شب و روز کا سابقہ و رابطہ ان کی شخصیت کو جاذب، پُراثر اور پُروقار بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ اس دور میں ان کی شخصیت رچ بس کر ایک مخصوص سانچے میں ڈھلنی شروع ہوئی جس نے انھیں انفرادیت عطا کی۔ حاضر دماغی اور بول چال میں تیزی طراری گو ان میں ہمیشہ سے تھی لیکن بریلی میں ان کا یہ جوہر کھل اٹھا۔

اسی دور میں عصمت کے دو معاشقے بھی ہوئے۔ ایک سیّد صاحب سے جو محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر تھے اور عصمت کے پڑوس میں ہی رہائش پذیر تھے۔ اور دوسرا اظفر قریشی ضیا سے جو لکھنؤ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے اور طویل خط و کتابت کے بعد اپنے عشق کو پروان چڑھاتے گاہے گاہے بریلی آیا کرتے تھے اور عصمت بھی ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے کشاں کشاں لکھنؤ ان سے ملنے جایا کرتی تھیں۔ ان کا عشق خاصا "دھواں دھار" رہا۔ (جس کا ذکر ایک الگ باب میں تفصیل سے کیا گیا ہے) ــــ ادھر سیّد صاحب کی بیوی کا معاشقہ چھوٹے خان سے چل رہا تھا جو سیّد صاحب کی غیر موجودگی میں ان کے گھر کی زیارت کیا کرتے تھے ــــ یہی نہیں، لوگوں کی چہ میگوئیوں سے بے نیاز مس فلپس اپنے بوائے فرینڈ پرتھوی سنگھ کے ساتھ پینگیں بڑھا رہی تھیں ــــ گویا بریلی کے علمی اور ثقافتی ماحول میں بھی حسن و عشق مست الست اپنا روایتی کھیل کھیل رہے تھے۔

عصمت نے سال بھر اسکول میں کام کیا اور معاہدہ ختم ہونے پر علی گڑھ چلی گئیں ــــ جہاں سے انھوں نے بی۔ٹی کا امتحان پاس کیا۔ اب ان کی تعلیم ختم ہوئی کہ انھوں نے اپنی منزل پالی ــــ اُن دنوں عصمت کے والد جودھپور میں تھے۔ وہ ان کے پاس چلی گئیں۔ وہاں ایک ہیڈ مسٹریس کی جگہ خالی ہوئی۔ جودھپور میں موجود وہ واحد بی اے، بی ٹی مسلم لڑکی تھیں چنانچہ انھیں ملازمت مل گئی۔ جاورہ اور بریلی کے بعد یہ ان کی تیسری ملازمت تھی ــــ جودھپور میں تھوڑا عرصہ ملازمت کرنے کے بعد عصمت بمبئی چلی گئیں۔

بمبئی

شاہد درمیانہ قد، گٹھے ہوئے جسم، گورے رنگ اور تیکھے ناک نقشے والے خوبصورت نوجوان تھے۔ عصمت کی ان سے پہلی ملاقات علی گڑھ کے قیام کے دوران ہوئی جب وہ بی۔ٹی اور شاہد لطیف ایم۔اے

کر رہے تھے ــــ بعدازاں دہلی میں بھی ان کی ایک مختصر سی ملاقات ہوئی۔ شاہد افسانہ نگار بھی تھے تقسیمِ ملک سے پہلے ۱۹۴۲ء کے آس پاس ان کی کہانیاں ماہنامہ "ادبِ لطیف" لاہور میں شائع ہوتی رہیں۔ پھر شاہد بمبئی چلے گئے جہاں انھوں نے بمبئی ٹاکیز میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر بطور افسانہ نگار اور مکالمہ نگار ملازمت اختیار کر لی۔ حسنِ اتفاق سے عصمت کو بھی اسکول انسپکٹریس کے طور پر بمبئی میں ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر ملازمت مل گئی۔ عصمت بمبئی میں اپنے بڑے بھائی کے ہاں رہائش پذیر ہوئیں اور ان کا شاہد لطیف سے پھر سے رابطہ ہو گیا۔ میل جول بڑھا اور شاہد ان کے ہاں آنے جانے لگے۔ دونوں سیر و تفریح کے لئے نکل جاتے۔ ساحلِ سمندر پر ریت پر ننگے پاؤں گھومتے، فلمیں دیکھتے، ادیب احباب سے ملتے جلتے اور ایک دوسرے کی قربت میں راحت محسوس کرتے۔ گویا جلد ہی ان کا معاشقہ شدّت سے پروان چڑھنے لگا۔

عصمت نے ایک کہانی لکھی تو شاہد اسے فروخت کرنے کے لئے بمبئی ٹاکیز لے گئے۔ اس بات کی اطلاع کسی طرح عصمت کے بھائی جان کو مل گئی اور وہ بہت برہم ہوئے۔ درحقیقت وہ روزِ اوّل ہی سے عصمت اور شاہد کے معاشقے کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ عصمت جو ساڑھے تین سو روپیہ کی بہت معقول تنخواہ پا رہی تھیں، ایک سو پچھتّر روپیہ پانے والے شاہد کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائے۔ عصمت کے لئے وہ کسی اونچے خوشحال اور فارغ البال گھرانے کے چشم و چراغ کے متمنی تھے جو کم از کم پندرہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا ہو۔ عصمت سے ان کی برادرانہ محبّت و شفقت، عصمت اور شاہد لطیف کے تعلقات میں سدِّ راہ ثابت ہو رہی تھی ــــ انھوں نے مصلحتاً پیش بندی کے طور پر دونوں کی ملاقات اور باہر سیر و تفریح پر پابندیاں عائد کر دیں۔ شاہد کا ان کے ہاں بے تکلّف آنا جانا بند ہو گیا۔ عصمت جو فطری طور پر خودسر اور آزاد طبع تھیں بھلا پابندِ سلاسل کب ہونے والی تھیں۔ وہ چپکے سے بورڈنگ ہاؤس میں منتقل ہو گئیں ــــ بھائی جان معاملے کو سنگین صورت اختیار کرتے دیکھ کر، پھر عصمت کے (اور اپنے) ماموں زاد بھائی جگنو، جو اُن دنوں بمبئی میں ہی مقیم تھے، کی جانب متوجہ ہوئے۔ یہ وہی جگنو تھے جنھوں نے عصمت کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کی شادی رُکوا دی تھی۔ جگنو تاحال کنوارے ہی تھے ــــ بھائی جان نے جگنو سے کہا کہ وہ عصمت کو اپنے ساتھ شادی کے لئے رضامند کر لیں تو یہ ایک بہت مناسب و موزوں رشتہ رہے گا۔ جگنو مان گئے اور وہ موقع محل دیکھ کر حرفِ مدّعا زبان پر لائے۔ "بھائی نے کہا ہے۔ اگر تمھاری مرضی ہو تو مجھ سے شادی کر لو۔" عصمت نے جواب دیا۔ "توبہ توبہ! تم نے زندگی میں میرے ساتھ اتنی بھلائی کی ہے۔ میں تمھارے ساتھ یہ دشمنی کیوں مول لوں؟"[1]

جلکر بیٹھ جائیں۔

---

[1] عصمت چغتائی "میری آپ بیتی" (مجموعہ) آدھی عورت آدھا خواب"۔ بیسویں صدی پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ نئی دہلی۔ ص ۲۴

اب عصمت وہ عصمت نہ تھیں جو کبھی جگنو پر مرتی تھیں۔ وہ بہت سرعت سے سیکس کے معاملے میں کئی منازل طے کر چکی تھیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ جگنو کو ان جیسی نہیں بلکہ کسی خوبصورت، بھولی بھالی، گھریلو قسم کی رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے اور یہ سب خصائص عصمت میں ناپید تھے ــــ پھر ان کا معاملہ شاہد سے بھی چل رہا تھا۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ عصمت چاہتی تھیں کہ ان کا معاشقہ شاہد سے یوں ہی چلتا رہے اور وہ ان سے شادی کے بندھن میں نہ بندھیں۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ ان کی سی آزاد منش، متلوّن مزاج، لاابالی طبع کی بے عنان عورت کسی سے بطور رفیقۂ حیات زیادہ عرصہ تک خوش اسلوبی سے نہیں نبھا سکتی۔ بایں ہمہ عصمت کے الفاظ میں

"شاہد سے میری صرف دوستی تھی۔ اس سے شادی تو کھیلے میں ہو گئی۔ خواجہ احمد عبّاس نے اپنے گھر کے قریب ایک فلیٹ لے دیا۔ محسن ایک قاضی پکڑ لائے اور شادی ہو گئی"[1] ــــ یہ محض لفّاظی ہے۔ عصمت نے بہ قائمیٔ ہوش و حواس شادی کی تو شادی ہوئی۔ ورنہ یہ کوئی گڑیا گڈّے کا کھیل تو نہیں تھا۔

عصمت نے جو اپنی بشری کمزوریوں سے خوب واقف تھیں۔ شادی سے پیشتر شاہد کو سنجیدگی سے سمجھایا:

> "میں گڑبڑ قسم کی لڑکی ہوں، بعد میں پچھتاؤ گے۔ میں نے ساری عمر زنجیر میں کاٹی ہیں۔ اب کسی زنجیر میں جکڑی نہ رہ سکوں گی۔ فرمانبردار، پاکیزہ عورت ہونا مجھ پر بجتا ہی نہیں ہے۔ لیکن شاہد نہ مانے"[2]

اپنی بے راہ روی اور ہرجائی پن کا اس سے واضح اعتراف ممکن نہیں (عصمت نے حسبِ معمول اپنی روایتی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنی فطری کمزوریوں کو بے کم و کاست شاہد کے سامنے رکھ دیا اور کہہ دیا کہ میں وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں "گڑبڑ قسم کی لڑکی ہوں" اور "فرمانبردار، پاکیزہ عورت ہونا مجھ پر بجتا ہی نہیں ہے" یعنی میں ایک "پتی ورتا"، اطاعت شعار بیوی بن کر نہیں رہ سکتی کہ میں تو بُت ہرجائی ہوں) اپنے ہونے والے شوہر کو یہ کہنے کے لئے جرأت و جسارت چاہیئے تھی۔ دل گُردہ چاہیئے تھا۔ بیشرمی اور بے حیائی چاہیئے تھی۔ اور عصمت ان سب "صفات" سے متصف تھیں ــــ شادی سے ایک دن پہلے بھی عصمت نے شاہد کو تنبیہہ کی:

> "اب بھی وقت ہے مان جاؤ۔ ہم ساری عمر دوست رہیں گے۔ ایک دوست کی طرح کہہ رہی ہوں"[3]

اور شادی کے بعد بھی ایک روز عصمت نے ان سے کہا:

> "بھئی زبردستی تھوڑی ہے۔ نہ نبھے تو طلاق دے دینا"[4]

عصمت جبلّی طور پر ایک روایتی، شوہر پرست، "پتی ورتا"، بیوی نہ تھیں۔ وہ خود پرست، من موجی، آزاد رو

---

[1]، [2]، [3]، [4] عصمت چغتائی "میری آپ بیتی" (مجموعہ آدھی عورت آدھا خواب) بیسویں صدی پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ نئی دہلی ص ۲۴-۲۵

عورت تھیں۔ جدھر سینگ سمائے چل دیں۔ شاید وہ برٹرینڈرسل کی طرح "آزاد محبت" (FREE SEX) میں یقین رکھتی تھیں۔

عصمت کی شادی پر ان کے بڑے بھائی اس قدر آزردہ خاطر ہوئے کہ انھوں نے نہ تو شادی میں شرکت کی اور نہ ہی پھر کبھی زندگی بھر ان کا مُنہ دیکھا۔

عصمت نے بحیثیت مجموعی آسُودہ، پُرآسائش اور مطمئن زندگی گذاری۔ ان کی زندگی میں تنگ دستی کے دَور بھی آئے مگر اِدھر آئے اُدھر گذر گئے۔ ظاہر ہے کہ محض افسانہ نگاری ان کی معقول گذر بسر کی کفیل نہیں ہوسکتی تھی اس لئے انھوں نے اپنے دیگر ہم عصر ادیبوں کی طرح فلموں سے ناطہ جوڑا اور بطور افسانہ نگار اور مکالمہ نگار جہاں نام پایا وہیں دام بھی خوب کمائے ــــــ پھر شاہد لطیف (شوہر) پروڈیوسر تھے۔ انھوں نے عصمت کی شرکت میں بڑی کامیاب فلمیں بنائیں، روپیہ کمایا اور دونوں زندگی کی نعمتوں سے فیضیاب ہوئے ــــــ پھر جہاں ملک کے متعدد رسالوں میں آئے دن ان کی نئی کہانیاں شائع ہوتی رہتی تھیں، وہیں پُرانی کہانیوں کے مجموُعے بھی چھپتے رہتے تھے۔ رسائل کے مُدیران اُن کے افسانوں کے لئے ہمیشہ چشم براہ رہتے تھے۔ یوُں بھی عصمت نامساعد حالات پر رونے بسورنے کی عادی نہ تھیں کہ وہ فطرتاً صابر اور قانع تھیں۔

عصمت اپنی مالی حالت کی بابت جا بجا لکھتی ہیں:

- "خُدا نے ضرورت سے زیادہ دے دیا ہے۔ سنگِ مرمر کا مزار نہیں بنوانا ہے۔"[1]
- "میری کہانی کے مجھے پانچ سو روپے ملتے ہیں اور فلم کی کہانی کے مجھے بیس ہزار روپے ملتے تھے۔ مگر مجھے اتنے ایوارڈ ملے کہ دو ڈھائی لاکھ بیٹیوں اور نواسے کے نام سے جمع کرا دیا ہے۔"[2]
- "میں نے اپنی کتابوں سے کئی لاکھ روپے کمالئے کہ پبلشرز بڑے مہربان تھے . . . پاکستان جاتی ہوں تو لوگ مجھے چھاپنے کا معاوضہ ڈھیروں دیتے ہیں۔ وہاں کچھ خریدنے کی چیز تو ہے نہیں۔ رشتے داروں اور دوستوں کے بچوّں میں بانٹ دیتی ہوں ـــــ میں نے اپنی کوئی کتاب تحفے کے طور پر کسی کو نہیں دی کہ جُملہ حقوق بیچ کر شاندار پانچ کمروں کا فلیٹ لے لیا تھا۔ وہی چل رہا ہے۔"[3]

شواہد سے ظاہر ہے کہ عصمت خوشحال اور فارغ البال رہیں اور جس حال میں بھی رہیں صابر وشاکر رہیں۔ عصمت اپنی اوُلاد کی جانب سے بھی بہت مطمئن رہیں۔ ان کی دو بیٹیاں ہوُئیں، سیما اور سبرینہ۔ ان

---

[1]، [2]، [3] عصمت چغتائی "باتیں عصمت آپا سے" انٹرویو از شمع افروز زیدی ماہنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی۔ سالنامہ (جنوری ۱۹۹۲ء) ص ۱۶، ۳۲، ۲۷

کی بڑی بیٹی سیما کے ہاں ایک بیٹا ہوا، اشیش۔ وہ ان کی بابت بہت مسرت اور تفخر سے لکھتی ہیں:

"میری بڑی لڑکی سیما کی بہت بڑی کمپنی ہے۔ چھوٹی بھی دو تین ہزار پاتی ہے۔ بھولی ہوئی پانچ ہزار کماتی ہے۔ وہی خرچ چلاتی ہیں۔ ایک نواسہ ہے اسے ۵ سو اسکالرشپ ملتی ہے۔ ایک دن میں اُس کے دوست آکر پھونک دیتے ہیں۔"[1]

ان کی بڑی لڑکی سیما نے ایک ہندو سے شادی کی۔ اس کا شوہر فوت ہو گیا۔ مگر اس نے اس کی جائیداد سے کچھ نہ لیا اور چند دوستوں سے مل کر اشتہاری فلم بنائی اور بیٹے کو اشتہاری فن میں گریجویشن کے لئے ولایت بھیج دیا تاکہ واپس آکر وہ اس کمپنی کو سنبھال لے —— سیما اور اس کا بیٹا آشیش آریہ سماجی ہیں —— بسریہ ایک مشہور پارسی پلاسٹک سرجن کی اسسٹنٹ تھی، جو اُسے سرجری سکھا رہا تھا —— عصمت کی بڑی بہن جو باندرہ میں رہتی تھیں، کے ایک بیٹے نے ہندو لڑکی سے شادی کرلی، دوسرے نے پارسی سے اور تیسرے نے مسلمان سے۔ عصمت اس بارے میں لکھتی ہیں:

"غرض میرا خاندان ایک بھیل پوری ہے۔ ہم سب کچھ بھول بھال کر پیار سے رہتے ہیں۔ ہولی، دیوالی، عید، شب برات بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ پیلا رنگ کھیلنا، دیئے جلانا، گنپتی کے جلوس میں ناچنا اور کرسمس پر ہوٹلوں میں HYMNS گانا، کوئی بچوں کو منع کرسکتا ہے —— ہاں میں نے بکرا کبھی نہیں کٹوایا۔ بڑا گوشت میرے یہاں آتا نہیں کہ میرا نواسہ اور اس کی ماں ہندو ہیں۔"[2]

یہ ایک مہذب، متمدن، خوشحال، مذہب کی جکڑ بندیوں سے آزاد، سب تعصبات سے پاک، وسیع الخیال خاندان کی تصویر تھی، جو زمانے کی انگشت نمائی سے بے نیاز، سب غم و فکر سے آزاد اپنی مرضی کے مطابق زندگی جی رہا تھا۔

تقسیمِ ملک کے بعد عصمت پاکستان ایک ہی بار جا پائیں مگر ہندوستان کے طول و عرض میں کئی بار گھومی پھریں جہاں مدعو کی جاتیں قارئین اور مداحین کھنچے چلے آتے۔ پھر ان کی شخصیت بھی اس قدر جاذب اور مقناطیسی تھی کہ لوگ اپنے آپ کھنچے چلے آتے تھے۔ کیونکہ تیز طرار اور اظہار میں بیباک تھیں، دلوں کو مسخر کرلیتی تھیں —— ہندوستان ہی نہیں عصمت سیر و سیاحت کے لئے رُوس، چیکوسلواکیہ، جرمنی، چین، فن لینڈ اور انگلینڈ بھی گئیں اور بہت محظوظ ہوئیں۔ غیر ممالک کو دیکھنے سے ان کے ذوقِ تجسس کی تسکین ہوتی تھی۔ زندگی کے آخری دور میں جب

---

[1] [2] عصمت چغتائی ہ باتیں عصمت آپا سے۔ انٹرویو از شمع افروز زیدی۔ ماہنامہ بیسویں صدی، نئی دہلی، سالنامہ (جنوری ۱۹۹۲ء) ص ۱۹، ۲۷

وہ قلم کو بالائے طاق رکھ چکی تھیں۔ ان سے پُوچھا گیا کہ ان کی آخری خواہش کیا ہے تو انھوں نے کہا کہ گو میں بہت گھومی پھری ہوں، میرا شوق ابھی تشنہ ہے۔ میں اور سیر و سیاحت کرنا چاہتی ہوں۔

عصمت ترقی پسند ادیبہ تھیں اور تمام ترقی پسند ادیب اشتراکی تھے اور رُوس چونکہ اشتراکیت کا منبع تھا اس لئے وہ رُوس کو ایک طرح سے اپنا فادر لینڈ (FATHER LAND) سمجھتے تھے۔ اور اپنے ادب میں اور یوں بھی اشتراکی نظریات کی تبلیغ کرنا اُن کے لئے جزوِ ایمان تھا۔ اسے ذرا کھُل کر کہنا مقصُود ہو تو یوُں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند ادیب کمیونسٹ روس کے توسیعی منصوبوں میں ایک طرح سے ہراول دستے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا نصب العین ملک میں کمیونزم کے لئے راہ ہموار کرنا تھا ــــ اگر ترقی پسند ادیبوں نے اشتراکی نظریات کی تبلیغ کی تو رُوسی حکومت نے بھی ان کے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ سرپرستانہ طور پر ان کی پیٹھ ٹھونکی۔ ان کی بھرپور مالی امداد بھی کی اور انھیں انعامات اور اعزازات سے بھی بے دریغ نوازا۔ نتیجہ یہ کہ "سوویت لینڈ ایوارڈ" کا حصُول ترقی پسند ادیبوں کے لئے منتہائے مقصُود بن گیا ــــ ترقی پسند ادیبوں کو بین الاقوامی مجالس میں رُوس مدعو کیا جاتا اور ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاتی۔ یہاں نمُونے کے طور پر وہاں کے ماحول کی ایک ہلکی سی جھلک پیش ہے، جو عصمت کی ڈائری سے اخذ کی گئی ہے:

○ "ماسکو

۱۳ اپریل ۱۹۷۸ء

"رائیٹرس کلب میں لنچ ہوُا۔ بیحد ووڈکا اور شیمپئن پی گئی۔ عجیب عجیب اسنیکس پہلے ملے۔ پھر بہت مزے کا اسٹیک آیا۔ لنچ پانچ بجے تک چلتا رہا۔ رات کو شاہدہ اور رنجیت کے گھر گئے۔ ان کی بیٹی لیلیٰ مجھ سے ڈیڑھ انچ لمبی ہے۔ باپ سے اُونچی ہے اور ماں تو بہت چھوٹے قد کی ہے۔ وہاں سے گیارہ بجے لوٹے۔ جلدی سو گئے ــــ ایک بجے فیض بھی آ گئے۔ سلطانہ، سردار جعفری گیارہویں منزل پر ہیں۔ میں اور فیض آٹھویں پر۔ فیض پیئے جا رہے ہیں۔ کسی طرح قابُو میں نہیں آتے۔"[1]

○ ۱۴ اپریل ۱۹۷۸ء

دوشنبے بہت خوبصُورت، بہت ماڈرن شہر ہے۔ پُرانے گاؤں کو ختم کر کے بالکل نیا ماڈرن شہر بنا دیا ہے۔ روشنی سے چراغاں کا شبہ ہوتا ہے۔ لوگ فارسی، انگریزی،

---

[1] عصمت چغتائی "عصمت چغتائی کی ڈائری کے اوراق"۔ ماہنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی۔ سالنامہ (جنوری ۱۹۹۲ء) ص ۱۹

اُردو، رُوسی زبان میں کچر کچر بولے جارہے ہیں۔

دو ڈیلی گیٹس بہت پیے ہوئے آگئے اور کونیاک کی بوتل کھول کر سب کے جام بھر دیئے۔ سُلطانہ اور سردار تو ایک جام پی کر بھاگ گئے۔ فیض کو وُہ داب کر بیٹھ گئے۔ فیض نے مجھے بھی اُٹھنے نہ دیا اور وہ دیوانے جام پر جام بھرتے گئے۔ میں نے چپکے سے چائے کی خالی پیالی میں اُنڈیلنے شروع کر دیئے۔ فیض اور وہ دونوں پیتے رہے۔ ان میں سے ایک قزاقستان کا ہے، جسے نہرو ایوارڈ مل چکا ہے۔ آٹھ بار ہندوستان ہو آیا ہے مگر نہ انگریزی جانتا ہے نہ تاجکی نہ اُردو نہ رُوسی۔ بہت مشکل سے اشاروں سے دو چار انگریزی لفظ بول کر کام چلا لیتا ہے۔ آٹھ پیگ پی چکا ہے اور فیض کو پیار کئے جارہا ہے۔ یہاں لوگ فیض اور راج کپور کے بڑے دیوانے ہیں۔

۔۔۔ اس قدر دُھوم دھام تھی کہ میں نے چار پیگ ووڈکا کے اور تین شیمپین کے پی ڈالے۔ ۔۔۔ صرف سیخ کباب شِشلک کھایا اور پھر شیمپین چلی۔ ٹوسٹ چلے۔ خوب اسپیچیں ہوئیں۔ ہاں بھول گئی لنچ کے بعد تین بجے میٹنگ ہوئی اور بہت سے بھاشن جھاڑے گئے۔ ڈانس پر بیٹھنا پڑا جہاں ٹی وی کی روشنیاں بھُونے ڈال رہی تھیں۔

بگراں نے کہا کہ یہاں کا جشن تو ہفتے بھر میں ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں، سُلطانہ اور سردار بگراں کے ہاں جا کر عیش کریں گے۔ بگراں کتنی اچھی طرح ملتا ہے۔ بار بار آکر پُوچھتا ہے۔ ایسے پیارے ایمبیسڈر کہاں ہوتے ہیں۔ میں تو بوڑھی ہو کر بھی۔ بڑے ٹھاٹھ کر رہی ہوں۔ سب میری خاطریں کرتے ہیں۔ یہاں پانی کوئی نہیں پیتا۔ سوڈا یا شراب پیتے ہیں۔ باتھ روم کے نلکے کا پانی پینا سخت منع ہے۔[1]"

یہ اُس جشن اور خاطر مدارات کی مختصر سی جھلک ہے جس سے اپنے قیام کے دوران ہمارے ترقی پسند ادیب روس کی سیر و سیاحت کے دوران مُستفید ہوتے رہے۔ یہ مختلف ممالک سے آئے اشتراکی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا بھاری اجتماع ہوتا جس میں ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیالات کیا جاتا اور آئندہ منصوبوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے لائحہ عمل تیار کیا جاتا ـــــ عصمت کی سرخوشی اور شادمانی ڈائری کے اِن اوراق سے جھلکی پڑتی ہے۔ انھیں جہاں زندگی کی اچھی چیزوں سے رغبت تھی وہیں نت نئے ممالک کی سیر و سیاحت کا بھی بے حد شوق تھا جو بہت حد تک پُورا ہُوا مگر ان کی تشنگی نہ گئی۔

---

[1] عصمت چغتائی: عصمت چغتائی کی ڈائری کے اوراق: ماہنامہ بیسویں صدی نئی دہلی۔ سالنامہ (جنوری ۱۹۹۲ء) ص 19

عصمت شاہد سے اپنی ازدواجی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

"مرد عورت کو پوج کر دیوی بنانے کو تیار ہے۔ وہ اسے محبّت دے سکتا ہے۔ عزّت دے سکتا ہے۔ صرف برابری کا درجہ نہیں دے سکتا۔۔۔ شاہد نے مجھے برابری کا درجہ دیا تھا۔ اس لئے ہم دونوں نے ایک اچھی زندگی گذاری"[1]

مگر عصمت کا یہ بیان حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ شاہد نے انھیں برابری کا درجہ دیا۔ عصمت جیسا کہ ہم جانتے ہیں کسی سے، بھلے وہ شوہر ہی کیوں نہ ہو، مانگ تانگ کر برابری کا حق لینے والی نہیں تھیں۔ وہ برابری کے حق کو لپک کر جھپٹ لینے والی تھیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاہد کو وہ کم ہی خاطر میں لاتی تھیں اور ان سے فلم اور گھر کے معاملات میں عصمت کی اکثر کھٹ پٹ رہتی تھی۔ عصمت کو کسی کے زیر ہونے کا احساس ہی دوبھر تھا۔ زندگی میں انھوں نے کبھی ثانوی کردار ادا نہ کیا۔ اور نہ ہی اپنی انا کے آبگینے کو کبھی ٹھیس لگنے دی ــــ دونوں اپنے اپنے دائرہ کار میں آزاد اور خودمختار تھے۔ کوئی ایک دوسرے کے معاملات میں دخل انداز نہ ہوتا۔ یہ اُن کے درمیان ایک اَن لکھا سمجھوتہ تھا جس کا انھوں نے حتی الوسع احترام کیا ــــ عصمت نے مشہور افسانہ نگار رام لعل کو ایک ملاقات کے دوران بتایا :

"ہم دونوں نے "لو میرج" کی تھی۔ لیکن شاہد پر میں نے روک ٹوک نہیں لگائی۔ چاہے جس سے ملے۔ میں اپنے لئے لکھنے کی پوری آزادی چاہتی تھی، جو مجھے ملی۔ بلکہ اسے کوئی مجھ سے چھین ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک مثالی سمجھوتہ IDEAL ARRANGEMENT تھا"[2]

عصمت "شاہد پر" روک ٹوک" نہ لگا کر خود بھی آزاد ہو گئیں تا کہ شاہد ان پر کوئی "روک ٹوک" نہ لگا سکیں۔ کیونکہ دونوں کو "برابری کا درجہ" حاصل تھا ــــ عصمت کس حد تک آزاد تھیں اس کی ایک مثال پیش ہے :

شاہد احمد دہلوی، مدیر ماہنامہ "ساقی" دہلی نے ایک دفعہ محمد حسن عسکری کو بتایا کہ عصمت اچانک ہی بمبئی سے آگئی ہیں۔ ان کے آنے کی کوئی خاص غرض و غایت نہیں۔ بس ان کے جی میں آئی کہ دہلی چلا جائے۔ اُٹھیں، چل دیں، اور دہلی پہنچ گئیں۔ چلنے سے پیشتر شاہد سے اجازت لینے کی بات تو دُور رہی اُنھوں نے انھیں اپنے روانہ ہونے کی اطلاع تک دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایسے "بے نتھے بیل" کو بھلا کون قابو میں رکھ سکتا تھا۔ یہ واحد مثال یہ جاننے کے لئے کافی ہے کہ عصمت نے شاہد کے ساتھ اپنے تعلقات کو کس سطح پر رکھا۔

اپریل ۱۹۶۷ء میں شاہد بیمار ہوئے اور پھر ایک دن دیکھتے ہی دیکھتے دل کے دورے سے چل بسے۔ عصمت اس بارے میں اپنے دوست، افسانہ نگار رام لعل کو اپنے مکتوب مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۶۷ء میں لکھتی ہیں :

---

[1] عصمت چغتائی، "میری آپ بیتی" (مضمون) مجموعہ "آدھی عورت آدھا خواب" بیسویں صدی پبلی کیشنز۔ دہلی۔ ص ۲۶

[2] رام لعل "عصمت چغتائی" (ادبی خاکے) مجموعہ "دریچوں میں رکھے چراغ" شانتی نکیتن۔ اندرا نگر، لکھنؤ۔ ص ۱۲۴

"شاہد بالکل اچانک چلے گئے۔ صبح دس بجے پہلا دورہ پڑا۔ دس منٹ بعد ٹھیک ہوگئے۔

رات کو دس بجے ایک دم سانس اُکھڑی اور پندرہ منٹ بھی نہ لگے"[1]

ان کے بہت سے دوست احباب جنازے کے ساتھ انھیں سپردِ خاک کرنے گئے، جو فوری طور پر نہ جاسکے وہ اگلے روز عصمت کے ہاں تعزیت کے لئے گئے ان میں ڈاکٹر صفدر آہ بھی تھے موصوف نے مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت مانگی اور عصمت سے اظہارِ ہمدردی کیا تو انھوں نے جواب دیا:

"یہ تو دنیا ہے ڈاکٹر صاحب۔ یہاں آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ جیسے اس ڈرائینگ روم کا فرنیچر۔ یہ صوفہ ٹوٹ جائے گا تو ہم اسے باہر نکال دیں گے۔ اور پھر اس خالی جگہ کو کوئی دوسرا صوفہ پُر کردے گا"[2]

خدارا سچ کہئے کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ مرحوم شوہر کی مماثلت صوفے سے کی جارہی ہے۔ صوفہ تو ٹوٹ جانے پر بدل دیا جائے گا، مگر کیا شوہر بھی نیا آجائے گا تاکہ وہ مرحوم کے خلا کو پُر کرسکے۔۔۔۔ جس فلسفیانہ لاتعلقی کے انداز میں عصمت نے جواب دیا اس سے نرم و نازک انسانی جذبات اور احساسات کے فقدان کا احساس ہوتا ہے۔۔۔۔ اور مرنے کے بعد بھی عصمت نے کبھی شاہد کا ذکر پیار اور محبت اور عزت و احترام سے نہ کیا اور نہ ہی اُن کے ساتھ گذارے ہوئے ایام کو حسرت بھرے دل سے یاد کیا۔

عصمت بڑی جیدار اور دَم دار تھیں۔۔۔۔ انھوں نے کبھی بے محابہ بلند بانگ قہقہہ نہ لگایا لیکن ان کی تیز آنکھوں میں ہمیشہ ایک طنز آمیز شوخی اور ہونٹوں پر ایک تیکھی سی مسکراہٹ تیرتی رہتی تھی۔ سخت مالی بحران میں بھی انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ نہ دوست احباب اور اقربا و اعزا کے سامنے گردشِ ایام کا رونا رویا۔ اپنا دُکھ درد اندر ہی اندر پیتی رہتیں۔ رنج و غم کی شدّت بڑھ جاتی تو رمی کھیلتیں۔ پان زیادہ کھاتیں۔ سگریٹ زیادہ پیتیں۔ باتیں زیادہ کرتیں اور یوں غم غلط کرنے کی سعی کرتیں۔۔۔۔ اُن کے مقرب ترس جاتے کہ وہ انھیں اعتماد میں لے کر اپنے "غم ہائے نہانی" زبان پر لائیں لیکن وہ لب وانہ کرتیں اور کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ ان سے اظہارِ ہمدردی کرے۔ "ہمدردی" ایک ایسا لفظ تھا جس سے انھیں ازلی چڑ اور کد تھی۔ اپنے تئیں ہمدردی کا لفظ سُنتیں تو بھڑک اُٹھتیں۔

عصمت نے اپنی زندگی میں بہت نشیب و فراز دیکھے۔ نشیب کم فراز زیادہ۔ اقتصادی لحاظ سے ان کی زندگی کا بہترین دَور وہ تھا جب وہ کہانیاں لکھتی تھیں اور شاہد لطیف اُنھیں ڈائریکٹ کرتے تھے۔ ان کی کئی پکچرز ہٹ ہوئیں۔ مثلاً "ضدّی"، "بُزدل" وغیرہ۔ مگر فلمیں باکس آفس پر پٹنے پہ آئیں تو پٹتی چلی گئیں۔ اور بالآخر انھوں نے

---

[1] رام لعل: "عصمت چغتائی" (ادبی خاکے) مجموعہ "دریچوں میں رکھے چراغ"۔ شانتی نکیتن۔ اندرا نگر۔ لکھنؤ۔ ص ۱۲۳

[2] شمس کنول "عصمت۔ سماج کی محتسب" (مضمون) ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ سالنامہ (جنوری ۱۹۹۲ء) ص ۲۰

دل برداشتہ ہو کر فلموں سے قطع تعلق کر لیا ــــ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ ادب ان کی گذر بسر کا ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد اُردو کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ حکومت کی سرپرستی برائے نام رہ گئی۔ قارئین بھی کم سے کم تر ہوتے گئے۔ کئی نامور رسائل یا تو پاکستان منتقل ہو گئے یا بند ہو گئے۔ اور جو یہاں لشتم پشتم گھسٹتے رہے وہ افسانوں کا معاوضہ دینے سے قاصر تھے۔ ایسے میں کئی ادیبوں کو پیٹ پر پتھر باندھنے پڑے۔ عصمت ان میں سے ایک تھیں۔

وقت اپنی روایتی برق رفتاری کے ساتھ گذرتا رہا۔ عصمت کو بالآخر ضعیف العمری نے آن لیا۔ مگر انھوں نے فوراً ہتھیار نہیں ڈال دیئے۔ بلکہ پامردی کے ساتھ پیری کے تصور سے نبرد آزما رہیں۔ ان کی خود اعتمادی جوں کی توں برقرار رہی اور معمولاتِ حیات میں بھی ان کی دلچسپی کم نہ ہوئی ــــ مبتدی ادیب اپنی تصانیف پر ان کی رائے مانگتے تو وہ اکثر حسبِ عادت چپ سادھے رہتیں۔ چنانچہ وہ اپنے دوست معروف افسانہ نگار رام لعل کو ایک خط میں لکھتی ہیں:

> "وہ میری رائے مانگتے ہیں۔ کاش ایک عدد چپت بیرنگ بھیجنے کا کوئی طریقہ ہوتا۔
> میں نے کبھی کسی کی رائے نہ مانگی۔ نہ پرواکی کہ اپنی رائے بانٹتی پھروں۔ یعنی میں تنقید نگار بننے کی حماقت کروں۔ جو بھی جو کچھ لکھتا ہے اپنے بھرم پر لکھتا ہے۔"[1]

اس مختصر سے اقتباس سے خود اعتمادی اور بھروسہ مندی پھوٹی پڑتی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو کچھ بھی ہو اپنے ہی دَم سے ہو۔ اپنی ہی ذات سے ہو۔ ستر سال کی عمر میں بھی ان کی تحریر میں وہی پرانی شوخی اور چلبلاہٹ ہے اور تھوڑی سی اتراہٹ بھی کہ "میں نے کبھی کسی کی رائے نہ مانگی" اور یہ اتراہٹ ان پر سجتی پھبتی تھی۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

> "قلم کے علاوہ بھی تو کچھ ہے۔ اور وہ زندہ ہے۔ ٹی وی بھی دیکھتی ہوں۔ ویڈیو بھی۔ پھر خود کہانیاں لکھنا نہیں چھوڑ سکتی۔ ویسے ہی میں دوسروں کی کہانیوں کو پسند یا ناپسند کرتی ہوں اور تمھاری کہانیوں میں شہد ہی شہد ہے۔ آج تک کوئی لفظ تمھارے قلم سے کانٹا بن کر نہیں چبھا ہے۔"[2]

اس عمر میں بھی ان کے معمولاتِ حیات جوں کے توں برقرار رہے۔ زندگی کی دلچسپی اور جاذبیت نے اُن سے منہ نہ موڑا اور لکھنے کا مقدّس فریضہ بھی وہ ویسے ہی ادا کرتی رہیں ــــ پیرانہ سالی میں بھی ان میں جواں عمری کا دَم خم معلوم ہوتا تھا۔ مگر پیری بالآخر انسان کو بے دست و پا کر دیتی ہے۔ بلند و بالا حوصلے اپنے آپ پست ہو جاتے ہیں۔ گوشت پوست کا جسم چرمرا جاتا ہے۔ لاکھ مزاحمت کرنے پر بھی عزیمت منہ چرانے لگتی ہے۔ موت کا سایہ دُور کہیں ذہن کے

---

[1] [2] رام لعل "عصمت چغتائی" (ادبی خاکے) مجموعہ "دریچوں میں رکھے چراغ" شانتی نکیتن۔ اندرا نگر۔ لکھنؤ ص ۱۴۴، ۱۴۵

افق پر لہراتا دکھائی دینے لگتا ہے۔ اور انسان دل ہی دل میں رخت سفر باندھنے لگتا ہے ـــــ وہ منہ پھیر کر زندگی پر بعید حسرت و یاس نظر ڈالتا ہے تو ویران اُداسی کے بحرِ بیکراں میں ڈوب جاتا ہے ـــــ اس عمل سے کسی کو مفر نہیں۔

عصمت نے اب لکھنا چھوڑ دیا۔ جب انسان بڑھاپے میں جسمانی اور ذہنی طور پر مضمحل ہو جاتا ہے تو اس کے فن کے سوتے بھی خشک ہونے لگتے ہیں ـــــ عصمت نے اپنی کئی آدھی ادھوری کہانیوں کا پلندہ مُدیر ماہنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی کے سپرد کر دیا۔ یہ ان کے ادبی کام سے سبکدوش ہونے کی واضح علامت تھی۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ انھوں نے لکھنے سے ہاتھ کیوں کھینچ لیا تو انھوں نے جواب دیا۔

"بہت لکھ لیا۔ اب اوروں کو لکھنے دو۔ نئی نسل کا بھی کچھ حق ہے۔ اب ہم اپنا ڈھول کب تک پیٹتے رہیں[1]"

در حقیقت انھوں نے جتنا لکھا وہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ اُن کے افسانے ان کی بقا کے ضامن ہیں۔ دو ایک خاکے بھی شاید زندہ رہ جائیں۔ مگر یہ بات ان کے ناولوں کی بابت وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔

عصمت کی یادداشت کمزور پڑ گئی جیسا کہ عام طور پر پیری میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے افسانہ نگار رام لعل سے کہا تھا کہ کرشن چندر کی سلمیٰ سے شادی کے وقت وہ نینی تال میں موجود تھیں۔ لیکن اب انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ انھوں نے یہ بات کہی تھی ـــــ ایسے ہی کرشن چندر کی دوسری برسی کے موقع پر انھوں نے لکھنؤ میں ہزاروں سامعین کے سامنے کہا تھا کہ اردو زبان مر چکی ہے اور اب صرف اس کا کریا کرم باقی ہے۔ لیکن اپنی کہی ہوئی یہ بات ان کے ذہن سے اُتر گئی اور ہزار کوشش پر بھی وہ اس کی یاد تازہ نہ کر سکیں ـــــ ان کے حریفوں نے ان کے اس فطری ردِ عمل کو غیر معمولی طور پر اچھالا کہ وہ اب SENILE ہو گئی ہیں۔ اے صاحب، اب تو وہ چار سال کی بچی بن گئی ہیں۔ گڑیاں کھیلنے لگیں۔ حالانکہ یہ سب حقیقت سے بعید تھا۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو صبح عصمت اپنے بستر پر مُردہ پائی گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موت رات سوتے میں ہی ہو گئی تھی ـــــ مرنے سے بیشتر وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ بھئی مجھے تو قبر سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مٹی میں توپ دیتے ہیں۔ دَم گھٹنے لگتا ہے۔ ایک بار قرۃ العین حیدر نے اُن سے کہا کہ دَم ہوتا ہی کہاں ہے جو گھٹے گا۔ کہنے لگیں کہ کیا پتہ کب واپس آ جائے۔ بھئی میں تو اپنے آپ کو جلواؤں گی۔ انھوں نے جو کہا تھا کر دکھایا اور یوں اپنی زندگی بھر کی روایت قائم رکھی۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ میری وفات کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے اور میرے جسدِ خاکی کو الیکٹرک کریموٹوریم پہنچا دیا جائے ـــــ جنازے میں شامل ہونے والوں میں ان کی بیٹیوں اور نواسے کے علاوہ

---

[1] عصمت چغتائی "باتیں عصمت آپا سے"۔ انٹرویو از ڈاکٹر شمع افروز زیدی۔ ماہنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی۔ سالنامہ (جنوری ۱۹۹۲ء) ص ۲۹

ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی، پدما سچدیو کے شوہر سریندر سنگھ، نوتیال اور وشوناتھ سچدیو تھے اور بس ــــ عصمت کی وصیت کے مطابق گیٹ وے آف انڈیا میں ذرا دُور گہرے سمندر میں جا کر ان کی بیٹی سیما نے ایک کشتی پر ان کے پھول رکھے اور ان کے نواسے نے انھیں سمندر کی نذر کر دیا۔

عصمت ایک عہد ساز افسانہ نگار اور فنکارہ تھیں۔ ان کی موت کے ساتھ ہی سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کی چوپائی کا آخری پایہ بھی گر گیا ــ

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ   یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

فارسی میں مرنے والے کے لئے کہا جاتا ہے "مُردہ بدستِ زندہ"۔ یعنی مرنے والا جینے والوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ جو چاہیں اس کا حشر کریں۔ لیکن عصمت نے مر کر بھی خود پر زندہ لوگوں کے اختیارات کو چلنے نہیں دیا۔ گویا انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ عصمت کا وجود جب تک اس دھرتی پر موجود ہے "زندہ یا مُردہ" وہ اپنی علیحدہ ڈگر پر چلتی رہیں گی۔ اُن کے اس فیصلے میں بھی اسی اجتہاد کی شان ہے۔ جو زندگی بھر اُن کا شعار رہا۔

○ عصمت تمام عمر ایک متنازعہ شخصیت رہیں۔ جب انسان رسُوم و قیوُد اور قواعد و ضوابطے سے آزاد ہو جائے تو اس کی بات بھلے ہی عقلی اور منطقی کیوں نہ ہو آسانی سے گلے سے نہیں اُترتی۔ پٹی ہوئی لکیر سے ہٹ کر چلنے کے لئے دم خم چاہیئے، جرأت و جسارت چاہیئے اور مخالفت کے باوصف اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہنے کے لئے مضبُوط قوتِ ارادی چاہیئے ــــ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کسی فیصلے کے صحیح یا غلط ہونے سے قطعِ نظر فیصلہ کرنا اور اس پُر طوفانِ بادوباراں میں مضبُوطی سے جمے رہنا بھی اپنے آپ میں بہت بڑی بات ہے۔ ایسی شخصیتیں خال خال ہوتی ہیں۔ اور ان کا متنازعہ ہونا بھی قدرتی بات ہے۔

موت سے قبل عصمت نے اپنے ایک خط میں شری گنگادھر کو لکھا۔ (خط کا عکس اس باب کے آخر میں ہے):

"مجھے قبر سے خوف آتا ہے۔ میں تو بھسم ہونے کی وصیت کر چکی ہُوں۔ یہ میرا جسم ہے میرا دل و دماغ ہے۔ میں جو چاہوں گی وہی ہوگا۔"[1]

اور وہی ہُوا۔ نتیجہ یہ کہ موت کے بعد بھی وہ ایک ہنگامے کا موجب بن گئیں اور ایک شدید قسم کی بحث چھِڑ گئیں۔ یہ ایک جذباتی قسم کی بحث تھی جس کی شدّت و حدت آج بھی محسُوس ہوتی ہے ــــ ان کے فیصلے پر انگلی اٹھانے والوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر بہت کچھ کہہ ڈالا اور کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے ان کے فیصلے کو قطعاً ان کا ذاتی معاملہ گردانا اور اسے خارج از بحث ٹھہرایا۔ مثال کے طور پر مجرُوح سلطان پُوری نے اپنی رائے سا

---

[1] "عصمت چغتائی کا خط شری گنگادھر کے نام"۔ ماہنامہ "بیسویں صدی"، نئی دہلی۔ (سالنامہ) جنوری ۱۹۹۲ء (خط کا عکس اس باب کے آخر میں ملاحظہ فرمایئے)

اظہار یوں کیا:

"یہ ایک بہت ہی احمقانہ خواہش تھی۔ یہ کیسا سیکولرازم ہے۔ دفنانے کے بجائے جلا دینا، کلچرل ویلیوز کو توڑنے کے لئے۔ نہ وہاں پر کوئی پوجا تھی نہ نماز۔ میں ان کی نعش سوزی میں نہیں گیا۔"[1]

سلمیٰ صدّیقی نے، جو عصمت کی جگری دوست تھیں، اپنے جذبات یوں پیش کئے:

"میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی کیونکہ میں سوچتی ہوں کہ انسان کا اپنی ویلیوز سے جڑا رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ جب بھی ان سے مذہب کے متعلق بات کی تو انھوں نے یہی کہا کہ وہ جل جانا پسند کریں گی۔ وہ سیکولر تھیں مگر مذہب کے بارے میں خاص طور سے موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں ان کے خیالات بہت گنجلک تھے۔"[2]

(محترمہ سے پوچھا جاسکتا ہے کہ اگر اپنی ویلیوز سے جڑے رہنا اتنا ہی اہم ہے تو انھوں نے کرشن چندر کی ویلیوز کا پاس کیوں نہ رکھا اور ان سے شادی کے لئے یہ شرط کیوں رکھی کہ وہ پہلے مشرف بہ اسلام ہوں ـــ ویلیوز کا احترام اپنے لئے ہی مخصوص نہیں ہوتا دوسروں کے لئے بھی ہوتا ہے)

ان کے برعکس سرور جہاں نے عصمت کے فیصلے کی پُرزور حمایت کی:

"سچ تو یہ ہے کہ وہ جاتے جاتے بھی ایک دھماکہ کر گئیں۔ لوگ خفا ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں۔ مذہب کے ٹھیکیدار انھیں بے دین اور مشرک کہتے ہیں کہتے رہیں لیکن انھوں نے قبر کے گوشۂ عافیت کو آباد کرنے کی بجائے اپنا فانی جسم برقی بھٹی کے سپرد کرنا پسند کیا۔ اور مرتے مرتے بھی دوسروں کو جلانے کا سامان کر گئیں۔"[3]

ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے بھی عصمت کے فیصلے کے حق میں آواز بلند کی اور ان کے باغیانہ کردار کو سراہا:

"یہ عصمت کی ذاتی خواہش تھی۔ اس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کی خواہش پر کوئی اعتراض کرے۔ وہ ایک عظیم افسانہ نگار تھی۔ وہ پہلی عورت تھی جس نے جاگیردارانہ حصار کی بُنیادوں کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی۔ انھوں نے دقیانوسیت میں شگاف ڈالا۔ انھوں نے سیکس پر بات کرنے کی ہمت کی جو آج اردو دنیا کے مرد بھی نہیں کرسکتے۔ وہ بہبودِ بشر کی قائل تھیں۔ میں انھیں سلام کرتا ہوں۔"[4]

عصمت کی بیٹی سیما نے ان کے فیصلے کے پس پشت جو جذبہ کارفرما تھا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

۱، ۲، ۳، ۴۔ "تاثرات"۔ ماہنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی۔ سالنامہ (جنوری ۱۹۹۲ء)، ص ۲۲، ۲۲، ۲۱، ۲۲

"انھیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا ہونے (آواگون) میں پورا یقین تھا۔ خود کو نہ دفنانے کا فیصلہ اسلام کی بے حرمتی کرنا نہیں تھا۔ وہ سوچتی تھیں کہ اسلام عظیم اور اچھا مذہب ہے لیکن اس نے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو تبدیل نہیں کیا ہے۔ وہ ہندوازم میں بھی بہت یقین رکھتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ایک عظیم فلاسفی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوازم طویل عرصے سے زندہ ہے۔"[1]

خیر، اپنے اپنے عقائد اور نظریات کے مطابق رائیں بلاشبہ مختلف ہو سکتی ہیں۔ مگر اس بارے میں کچھ باتیں ناقابلِ فہم سی لگتی ہیں۔ پہلی یہ کہ عصمت کے جنازے میں اُن کے ہم مذہب ادیبوں میں سے ایک بھی شامل نہ ہوا۔ حالانکہ بمبئی اُردو ادیبوں کا مرکز ہے۔ سلمیٰ صدّیقی نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بہت عجیب بات ہے کہ یہ شہر اُردو رائیٹرز سے بھرا ہوا ہے مگر ان کے جنازے میں بہت کم ادیب تھے۔"[2]

عصمت کچھ نہ تھیں پھر بھی چوٹی کی ادیبہ تو تھیں۔ منٹو، کرشن چندر اور بیدی کے شانہ بشانہ کھڑی ہونے کی مستحق تو تھیں۔ انھوں نے عمر بھر نخلِ ادب کی جی جان سے آبیاری تو کی تھی۔ آپ اُن کے مذہبی عقائد سے متفق نہیں، نہ ہوئیے مگر انھیں ایک عظیم ادیبہ کے طور پر تو مانئے۔ ادب تو، بہرحال ادب ہے، اس سے صرفِ نظر تو نہ کیجئے ـــــ یقین جانئے وہ اس سزا کی سزاوار نہ تھیں ـــــ دوسری بات جو ناقابلِ فہم اور ناقابلِ یقین لگتی ہے، وہ یہ ہے کہ ترقی پسند ادیب، جو اشتراکی ہونے کے ناطے مذہب کے قائل نہ تھے اور مذہبی تعصبات سے بیگانہ اور بے نیاز ہونے کے بلند بانگ دعوے کیا کرتے تھے اور جو عمر بھر عصمت کے بہت قریب رہے تھے اور جن کی محفلوں کی وہ رُوحِ رواں ہوا کرتی تھیں، وہ کیوں ان کے جنازے میں شامل نہ ہوئے؟ وہ کیوں ان سے اپنے عمر بھر کے مراسم بھول گئے؟ کیوں فلاں بمبئی سے باہر چلے گئے، فلاں کی طبیعت ناساز ہو گئی، فلاں کو مکالمے لکھنے تھے اور فلاں کو کوئی اور ضروری کام پڑ گیا ـــــ اس لئے انھوں نے جنازے میں شرکت کے غیر ضروری کام کو کسی اور وقت کے لئے اُٹھا رکھا۔

اُردو ادب اس باغی مجاہدہ کو بھلا نہ پائے گا!

●

---

[1] [2] "تاثرات"۔ ماہنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی۔ سالنامہ (جنوری ۱۹۹۲ء) ص ۲۱

عکسِ تحریر

آنجہانی عصمت چغتائی

فرید گگّا وجوجی۔

آپکی کتاب "ستی" ملی۔ شکریہ۔

آپکی رائے ہے کہ "ستی" کی رسم بڑی اونچی بات ہے۔ اِسے ترقی دینا چاہئے۔ آپ ہندوستانی ہیں؟ ہندوستان سے جڑے ہوئے بڑے دھارمک وچاروں پر یقین کرتے ہیں۔ آپ ستی کی رسم کی طرفداری کیا کرتے ہیں۔ پتی کے مرنے پر عورت کا ساتھ جل جانا بڑی عقلمندی کی بات ہے۔ آپ ہندوستان کی پالیٹکس سے بھی واقف ہیں اور ہسٹری سے بھی مسلمان عرب ایران توران سے آئے تجارت کے لئے۔ اور بادشاہی کرنے لگے۔ یہاں کے راجاؤں میں پھوٹ تھی اسلئے ہندوؤں نے اُنکا بادشاہ سوآگت کیا۔ وہ عورتیں ساتھ نہیں لائے تھے کیونکہ عورت وہاں پیدا ہوتے ہی دفن کردی جاتی تھی کیونکہ قبیلوں میں پھوٹ تھی وہ ایکدوسرے کی عورتوں کو ننگا کر کے جلوس نکالتے تھے بکری لونڈی بناکر انکی تجارت کرتے تھے۔ اسلئے لوگ لڑکی پیدا ہوتے ہی خود گاڑ دیتے تھے اور جانوروں کی طرح بن گئے تھے۔ مرد آپس میں بھی جھونک مارا لیتے تھے۔ اسوجہ سے عرب بہت کم تعداد میں رہ گئے تھے پھر بھی آپس میں خون خرابہ کرتے رہتے تھے۔ آج بھی ایران کو دیکھئے تو آبادی بہت کم ہے۔ اور مٹھی بھر یہودی اُنکی مرمت کررہے ہیں۔ اور وہ سب سے پچھڑی ہوئی قوم ہیں۔ بادشاہی چل رہی ہے تیل کے بل پر راج کررہے ہیں۔ غریب بہت بری حالت میں ہیں۔ حالانکہ یہ ساری دنیا کے مسلمان حج کو جاتے ہیں ان سے بہت دولت وصول کرتے ہیں۔ جب اسلام آیا تو رسول اللہؐ نے انہیں راہ دکھائی۔ انکی بھی بڑی مخالفت کی مگر غریب عرب اور افریقہ سے پکڑ کر لائے ہوئے حبشی غلاموں کی مدد سے رسول اللہؐ کی

ہے۔ پانچ کمروں کا فلیٹ ہے جب لوگوں نے ذرا پاؤں پھیلا دیا فرمایا ہے تو شاندار فلیٹ میں کمرہ نہ ملا۔ جو میری بیٹی نے ایک ہندو سے شادی کر لی۔ میری بڑی بہن پاکستان میں رہتی تھیں ان کے بیٹے نے ایک ہندو سے شادی کی دوسری نے ایک پارسی سے شادی کر لی۔ تیسری نے مسلمان سے۔ غرضیکہ میرا خاندان ایسا بھیل پوری سا ہے کہ سب گھل مل کر پیار سے رہتے ہیں۔

اگر عورتیں ستی رہتیں تو نہ جانے کیا ہوتا۔ زیادہ تر مسلمانوں کی مائیں ہندو خاندانوں سے آئی ہیں۔ میری ایک بیٹی اور اس کا بیٹا آریہ سماجی ہیں۔ ہم ہولی دیوالی عید شب برات بڑی دھوم سے مناتے ہیں۔ پہلا رنگ کھیلنا دیئے جلانا گیتا کے جلوس میں ناچنا اور کرسمس پر ہوٹلوں میں دعوتیں کھانا کون ہم بھوتوں کو منع کر سکتا ہے۔ ہر تہوار بڑے جوش سے مناتے ہیں۔ ہاں میں نے بکرا کبھی نہیں کٹوایا بڑا گوشت ہمارے ہاں نہیں آتا کہ میرا نواسہ اور اس کی ماں ہندو ہیں۔ بہرحال اور بھی ہیں میری بیٹی کی شادی ہوئی۔ وہ اور اس کا بیٹا ہندو ہیں۔ میری بہن کی ایک پوتی ہندو سے دوسری مسلمان ایک داماد کشمیری ہندو ہے اس کی بیوی مہندی لگاتی ہے اور مانگ بھرتی۔ دوسری بیٹی نے ایک پارسی سے شادی کر لی۔ اس کے دو بیٹے پارسی رسوم ادا کرتے ہیں۔ ان کی دادی نے کشتی کی رسم سے انہیں پارسی بنایا۔ ہم سب سمرن میں حصہ لیتے ہیں جب گرنتھ صاحب راستے میں ہو کر گزرتا ہے تو ہم سب ماتھا ٹیکتے ہیں ان کے آگے۔ جیسے ایک گرو جی سے دو گیتا کا سبق لیا۔ اور ایک ایک شبد پر ایمان لاتی۔ بائبل بھی پڑھی اور قرآن بھی معنوں والا ہی پڑھا۔ کتنا سکون ہے میرے دل و دماغ میں۔

مجھے قبر سے خوف آتا ہے میں نے جسم جلانے کی وصیت کر دی ہے۔ یہ میرا جسم ہے میرا دل و دماغ ہے۔ میں جو چاہوں گی وہی ہوگا۔ میں تین بار روس جا چکی ہوں یورپ بھی گھوما ہے بس امریکہ نہیں گئی ہوں۔ چین میں چار مہینے گھوم آئی ہوں۔ یورپ بھی خوب سیر کی۔

مگر میں تو دنیا کی ہستی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ چیونٹی کو بھی زندہ جلانا برداشت نہیں کروں گی۔ آپ اپنے بیٹے پر جلائیں گے تو میں بے بسی سے سہوں گی۔ آپ کو دعائیں نہیں دوں گی۔

عصمت چغتائی

شخصیّت کے عناصرِ ترکیبی

● شکل و صورت اور لباس :

تجسس کا تقاضہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ جس ہستی کے "فن و فکر" کے ہم اس قدر والا و شیدا ہیں۔ اور جس کی تصنیفات کو ہزاروں لاکھوں قارئین اور مدّاحین سر آنکھوں سے لگاتے ہیں اور جس کے لوح و قلم کا لوہا سخت گیر نکتہ چین بھی مانتے ہیں، وہ شکل و صورت میں کیسی تھی۔ اُس کا ناک نقشہ اور خدّ و خال کیسے تھے۔ وہ ڈیل ڈول اور قد و قامت میں کیسی تھیں۔ اُس کی پوشاک کیسی تھی اور پہلی دفعہ انھیں دیکھ کر انسان کیا تاثر لیتا تھا —— اکثر جی چاہتا ہے کہ غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل فنکارہ اور ادیبہ چہرے مہرے اور شخصیت کے اعتبار سے بھی غیر معمولی ہو تاکہ وہ ہماری اُمیدوں پر پوری اُتریں حالانکہ فن کا شخصیت کے ظاہری پہلوؤں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا —— مثال کے طور پر مشہور ڈرامہ نگار اور مفکّر جارج برنارڈ شا اور مشہور عالم، فلسفی اور مفکّر برٹرینڈ رسل شکل و صورت کے اعتبار سے بالکل معمولی اور غیر جاذب تھے مگر اُن کا فن اُن کی ابدیت کا ضامن ہے —— سعادت حسن منٹو، جو عصمت چغتائی کے نہ صرف ہم عصر بلکہ قریبی دوست بھی تھے، اُن کی شکل و صورت اور لباس کے متعلق لکھتے ہیں :

"عصمت کی شکل و صورت دلفریب نہیں لیکن دل نشین ضرور ہے۔ اس سے پہلی ملاقات کے نقش ابھی تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ بہت ہی سادہ لباس میں تھی۔ چھوٹی کنّی کی سفید دھوتی، سفید زمین کا کالی کھڑی لکیروں والا چست بلاؤز، ہاتھ میں چھوٹا پرس، پاؤں میں بغیر ایڑی کا براؤن چپّل، چھوٹی چھوٹی مگر تیز اور متجسس آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک، چھوٹے مگر گھنگھریالے بال، ٹیڑھی مانگ، ذرا سا مسکرانے

پر بھی گالوں میں گڈھے پڑ پڑ جاتے تھے۔"[1]

مشہور افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک کے الفاظ سے، جنھیں بمبئی میں برسوں عصمت کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا تھا، منٹو کے مندرجہ بالا بیان کی توثیق اس طرح ہوتی ہے:

"عصمت دوہرے بدن، گول گلگوتھنے گالوں اور تیز آنکھوں والی عورت تھی۔ ناک اس کی ستواں نہیں تھی، مگر اس کے چہرے پر بھبتی تھی۔ وہ موٹے شیشوں والی عینک اور بغیر ایڑی والی چپّل پہنتی تھی۔ اس کے بال کالے اور گھنے تھے جن میں وہ بائیں طرف مانگ نکالتی تھی۔ میں نے اسے کبھی بھڑکیلی ساڑی میں نہیں دیکھا۔ وہ بہت ہی سادہ مگر قیمتی ساڑی پہنتی تھی۔ منٹو نے صحیح لکھا ہے کہ وہ دلفریب نہیں دل نشین تھی۔"[2]

دونوں اقتباسات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے عصمت کی شکل وصورت کے نقوش واضح ہوجاتے ہیں۔

ناک نقشہ: گول گلگوتھنے گال، چھوٹی چھوٹی تیز اور متجسس آنکھوں پر دبیز شیشوں والی عینک، کالے گھنے، گھنگھریالے بال۔

لباس: سادہ مگر قیمتی ساڑی، بغیر ایڑی کے چپّل۔

بحیثیت مجموعی، منٹو کے الفاظ میں "عصمت دلفریب نہیں لیکن دل نشیں ضرور تھی۔"

شکل وصورت اور لباس کے بعد ہم متجسس ہیں کہ جانیں کہ عصمت مزاج کے اعتبار سے کیسی تھیں۔ دھیان رہے کہ شکل وصورت کا تعلق شخصیت کے ظاہری اور اوپری عناصر سے ہے، جبکہ مزاج کا واسطہ انسان کے باطن سے ہوتا ہے، جو بظاہر ڈھکا چھپا اور مستور رہتا ہے۔ اور طویل قربت اور صحبت سے ہی آشکار ہوتا ہے۔ مزاج ہمیں انسان کی شخصیت میں دور تک جھانک کر دیکھنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔

● مزاج کی رنگارنگی:

عصمت بہت خوش مزاج اور باغ وبہار طبیعت کی مالک تھیں۔ جو تیزی طراری، شوخی شگفتگی ان کی تحریروں

---

[1] سعادت حسن منٹو "عصمت چغتائی" (خاکہ) عصمت چغتائی نمبر۔ اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی۔ ص ۶۳

[2] اوپندر ناتھ اشک "عصمت چغتائی ـ دوزخی کی باتیں" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (جنوری ۱۹۹۲ء) ص 9

میں ملتی ہے وہی ان کی گفتگو اور لب ولہجہ میں بھی تھی۔ کبھی کبھی دورانِ گفتگو اپنی حرکات و سکنات سے وہ ایک ایسی ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتی تھیں کہ دیکھنے والے عش عش کر اُٹھتے تھے۔ اکثر مجلس احباب میں بولنے پر آتیں تو بغیر رُکے بلا کی روانی کے ساتھ بولتی چلی جاتیں اور کسی کی مجال نہ تھی کہ انھیں بیچ میں ٹوک دے۔ گفتگو کسی موضوع پر ہو وہ ہمیشہ کچھ تازہ اور نئی بات کہتیں جو اُنھیں دُوسروں سے الگ تھلگ ایک جُداگانہ اور امتیازی حیثیت عطا کرتی —— کیونکہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین اور زیرک تھیں۔ ان کی بات اکثر بڑی پُرمعنی، پُرمغز اور بامقصد ہوتی تھی اور اس پر سب کان دھرتے تھے —— کیونکہ اُن کے ہاں خیالات کی یورش ہوتی تھی ان کی گفتگو کی بیساختگی و برجستگی قابلِ دید و شنید تھی۔ —— ان کے بولنے میں ذرا اُتاولا پن تھا۔ بعض اوقات بولنے والے کو بیچ ہی میں روک کر ایسا جُملہ کس دیتی تھیں کہ اس کا ناطقہ بند ہو جاتا تھا —— ان کی گفتگو کی دلچسپی اور جاذبیّت کا ذکر کرتے ہوئے، سلمیٰ صدّیقی، جن سے عصمت کے گہرے مراسم تھے، لکھتی ہیں کہ "عصمت سے جب بھی ملئے کوئی نہ کوئی ایسا دلچسپ فقرہ سُننے کو ملتا ہے کہ مدّتوں یاد رہتا ہے۔"

بے ساختگی

عصمت عام طور پر بے محابا یا بلند بانگ قہقہہ نہ لگاتی تھیں۔ لیکن اُن کی چھوٹی چھوٹی تیز تیز آنکھوں میں ایک عجیب سی طنز آمیز شوخی اور لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تیرتی رہتی تھی جو ان کی شخصیّت کو پُرکشش بنا دیتی تھی۔

○ مشہور نقّاد اور ادیب محمد حسن عسکری، عصمت سے اپنی اوّلیں مُلاقات کے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں:

> "اب جو باتیں کرنے پر آئیں تو دُنیا جہاں کے مسائل پر تبصرہ کر ڈالا اور مَیں بیٹھا "جی ہاں" "جی ہاں" کرتا رہا۔ اُن سے جتنی دفعہ بھی ملاقات ہُوئی اُن کی اور میری گفتگو کا نقشہ یہی رہا۔ لیکن اس میں میری نیازمندی کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی۔ اوّل تو وہ باتیں ایسی ذہانت کے ساتھ کرتی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ ایک عورت کو ایسا دماغ کیسے مل گیا۔ پھر وہ زبان ایسی اچھی بولتی ہیں اور انداز اتنا معصُومانہ ہوتا ہے کہ چاہے وہ بے معنی باتیں ہی کیوں نہ ہوں بیچ میں ٹوکنے کو جی نہیں چاہتا ہے[1]

---

[1] محمد حسن عسکری: "عصمت چغتائی" (مضمون) عصمت چغتائی نمبر (دسمبر ۱۹۹۱ء) اُردو ماہنامہ "مکالمات"۔ دہلی ص ۸

یہ عصمت کے اعجازِ زبان و بیان کا ذکر ہے اور وُہ بھی محمد حسن عسکری کی زبانی ــــــ عصمت کے علم کی بے کنار وسعت، ذہانت اور زیرکی، زبان پر مکمل دسترس اور معصومانہ من موہ لینے والا اندازِ بیان، یہ اُن کی گفتگو کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

○ سلمٰی صدیقی عصمت کی تحریر اور گفتگو میں جو حیرت انگیز مماثلت ہے اُس کا ذکر یوں کرتی ہیں:

"آپ نے کبھی عصمت چغتائی سے بات کی ہے؟ نہیں کی تو بھی کوئی بات نہیں۔ دراصل اُن کی کہانیاں اُنہی کی طرح بات چیت کرتی ہیں۔ بُرا بھلا کہتی ہیں۔ ہنستی بولتی ہیں۔ تیکھے کھٹے میٹھے فقرے کہتی ہیں، لیکن کہانی کی اپنی ایک حد ہوتی ہے۔ اُسے صفحات کے حصار میں رہنا بسنا ہوتا ہے۔ عصمت چغتائی تو اپنے عہد پر محیط ہیں ــــــ آج کل کی نوجوان نسل نے جو ایک بہت معرکۃ الآرا لفظ ایجاد کیا ہے جنریشن گیپ (GENERATION GAP) اس کی گت بنتے دیکھنی ہو تو ذرا عصمت چغتائی کے پاس جا کے دیکھئے۔ ایسا ہنس ہنس کے رُلائیں گی۔ ایسا رُلا رُلا کے ہنسائیں گی کہ لڑکے لڑکیاں کھسیا کے کسی "ڈِس کو تھیک" میں گھُس جائیں گے اور وہاں بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"[1]

یہ عصمت کی تحریر و تقریر کی بے پناہ شوخی، تلخ و شیریں ملی جُلی کیفیت، کٹیلے نوکیلے جُملے، رونے رُلانے ہنسنے ہنسانے کے دلآویز انداز کا ذکر ہے۔ عصمت شوخیٔ طبع اور چُلبلے پَن میں اپنے سے بہت کم عمر کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو بھی یوں مات دے دیتی تھیں کہ وُہ دیکھتے رہ جاتے۔ یہ اُن کی گفتگو کا دلآویز حُسن تھا۔

قارئین کی تفننِ طبع کے لئے کچھ مثالیں بطور مُشتے نمُونہ از خروارے پیش ہیں:

○ ایک بار ایک ادبی نشست میں کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس دونوں برابر برابر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ عصمت آہستہ آہستہ ٹہلتی ہوئی اُن تک پہنچیں۔ اُن دونوں کے پیچھے جا کے کھڑی ہوگئیں، سلمٰی صدیقی کو بلایا اور اُن سے بولیں:

"کون کہتا ہے کرشن گنجا ہے۔۔۔؟

---

[1] سلمٰی صدیقی "عصمت کا جادو" (مضمون) اُردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۸۹

سلمیٰ نے سہم کے کہا۔ "میں تو نہیں کہتی!"

دونوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں: "عباس کے مقابلے میں کرشن کے بال، صرف بال ہی نہیں زُلفیں ہیں۔ گیسو ہیں"۔ پھر ہنس کے بولیں۔ "گنج ہائے گراں مایہ یہی تو ہے بھئی!"[1]

دھیان رہے کہ خواجہ احمد عباس کا سر تو چٹیل میدان تھا جبکہ کرشن چندر کی چندیا پر مقابلتاً خال خال بال تھے ——— پھر "گنج ہائے گراں مایہ" سلمیٰ صدیقی کے والد پروفیسر رشید احمد صدیقی کی مشہور تصنیف بھی ہے، جو خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ دونوں کے گنج کے تعلق سے عصمت کے تخیل کی اُڑان انھیں کہاں سے کہاں لے گئی۔

○ ایک خاتون کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مغلِ اعظم پکچر ہٹ جا رہی تھی۔ وہ خاتون ایک دعوت میں مغلیہ سا جوڑا پہن کر شامل ہوئیں اور کھانے کے بعد ایک صوفے پر مدھوبالا کے پوز میں دوپٹہ تان کر نیم دراز ہو گئیں۔ جو مہمان ہاتھ دھونے کے لئے صوفہ کے پاس سے گذر رہے تھے وہ لامحالہ ٹھٹک کر اُن کو دیکھتے۔ اتنے میں عصمت آپا نمودار ہوئیں اور باآوازِ بلند ڈرامائی انداز میں پکاریں۔ "انارکلی میں آگیا"[2]

○ سال نثار اختر کے انتقال کے وقت ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ ایک خاتون جو اُن کی منہ بولی بہن تھیں، پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ ایک عورت چلّاتے جا رہی تھی۔ ارے بیوہ کو بلاؤ۔ بیوہ کی چوڑیاں توڑو۔ عصمت کچھ دیر خاموشی سے یہ منظر دیکھتی رہیں پھر آگ بگولہ ہو کر اُٹھیں۔ پہلے تو اُن منہ بولی بہن کو اچھی طرح لتاڑا۔ اس کے بعد جو عورت بے چاری بے حال خدیجہ کی چوڑیاں توڑنے پر کمربستہ تھی، عصمت نے اس کی طبیعت صاف کی۔ پہلے تو کڑکیں۔ عورت ہی کیوں کہا جاتا ہے کہ فلاں بیوہ ہے۔ مرد کے لئے کیوں نہیں کہتے کہ فلاں رنڈوا ہے۔ اور فوراً جب وہ رنڈوا ہو تو کھینچ کر اُس کی عینک اور گھڑی توڑ ڈالو۔[3]

○ ایک دفعہ اے۔ ایس۔ بخاری، پطرس نے اپنے ہاں ایک ادبی محفل کا اہتمام کیا جس میں پانچ چھ ادیب بلائے گئے، جن میں محمد حسن عسکری، فیض احمد فیض اور عصمت بھی شامل تھے۔ ہر ایک کو توقع تھی کہ جیسی بے تکلفی عصمت کے افسانوں میں ہوتی ہے، ویسی ہی اُن کی باتوں میں بھی ہوگی، لیکن عصمت تین چار گھنٹے تک خاموش بیٹھی رہیں، اور کوشش کے باوجود نہ کھلیں۔ رسمی گفتگو کے علاوہ اُن

---

[1] سلمیٰ صدیقی "عصمت کا جادو"۔ (مضمون) عصمت چغتائی نمبر (دسمبر ۱۹۹۱ء) اُردو ماہنامہ۔ دہلی، ص ۸۹، ۹۰

[2]،[3] قرۃ العین حیدر "لیڈی چنگیز خان"۔ (مضمون) ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (دسمبر ۱۹۹۱ء) ص ۸۲

کی زبان سے بس دو جملے نکلے ـــــ فیض نے ایک مضمون غالب کے متعلق پڑھا جس میں موت کی آرزو کا ذکر تھا۔ عصمت نے اعتراض کیا کہ یہ آرزو تو آج کل کے شاعروں میں بھی ہے۔ فیض نے جواب دیا کہ "ہاں مگر فرق یہ ہے کہ غالب تو زندہ ۔ ۔ ۔" عصمت نے انھیں بات بھی پوری کرنے دی اور کہا کہ اچھا تو کیا آجکل کے شاعر مر چکے ہیں؟"[1]

یہ عصمت کے اُتاولے پن اور جارحانہ اندازِ گفتگو کی ایک مثال ہے ـــــ وہ بے حد حاضر دماغ تھیں اور اُن کی زبان اُن کے خیالات کا ساتھ دیتی تھی۔

○ ۱۹۸۱ء میں شمس کنول نے جو اُن دنوں بمبئی کے مضافات میں رہائش پذیر تھے، عصمت کو لکھا کہ وہ ان سے صرف پندرہ منٹ کے لئے کسی ضروری کام سے ملنا چاہتے ہیں اور فلاں دن بوقتِ شام اُن کے ہاں آئیں گے امید ہے کہ وہ گھر پر ملیں گی۔ خط لکھنے کے تیسرے دن انھیں عصمت کی طرف سے جواب ملا:

> "عزیزم تم غیر ضروری کام سے بھی مجھ سے ملاقات کر سکتے ہو۔ کیا میرا کارآمد ہونا ضروری ہے۔ تم مع صاحبِ خانہ کے آؤ۔ پندرہ منٹ کے لئے نہیں، پندرہ گھنٹے کے لئے تو کم از کم آؤ۔
>
> تمہاری، عصمت"[2]

شمس کنول اپنی اہلیہ کے ہمراہ اُس شام کو جب اُن کے مکان پر پہنچے تو فلیٹ کا دروازہ ملازمہ نے کھولا۔ چند لمحے ہی بیٹھے تھے کہ دوسرے کمرے سے عصمت ہنستی چیختی پیار بھری گالیاں دیتی ہوئی سامنے آئیں۔ شمس کنول نے پوچھا "کون ہے؟" ـــــ "ارے وہ میرا نواسہ۔ بڑا بے ایمان ہے۔ تاش میں مجھے ہرانا چاہتا ہے۔" پھر فوراً ہی کچھ خیال آیا۔ اندر کمرے میں پلٹ گئیں۔ دراصل وُہ صرف پیٹی کوٹ اور بلاؤز پہنے ہوئی تھیں۔ یعنی قطعی طور پر ایٹ ہوم تھیں۔ ساڑی لپیٹ کر واپس آئیں۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ تھا دوسرے ہاتھ میں سگریٹ لائٹر۔ نواسہ بھی پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر پانچ چھ برس ہو گی۔ سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہنے لگیں "کبھی کبھی دو چار دن کے لئے اسے بلا لیتی ہوں اپنے پاس۔ مگر ہے بڑا رذالہ۔ تاش میں خوب بے ایمانی کرتا ہے میرے ساتھ" شمس کنول وہاں ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے۔ عصمت رہ رہ کر اپنے بچپن کے تلخ و ترش واقعات سُناتی رہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ان کو ہمیشہ "ہانٹ" کرتا رہا۔

عصمت کے خط سے نہ صرف ان کی خوش خلقی اور خوش دلی جھلکی پڑتی ہے۔ بلکہ ان کے نواسے کے تعلق سے ان کے مشفقانہ جذبات بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔

---

[1] محمد حسن عسکری "عصمت چغتائی" (مضمون) اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۸۳

[2] شمس کنول "عصمت ـ سماج کی محتسب" (مضمون) ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۹۲ء

○ عصمت کے پلنگ پر ان کے جانے پہچانے پاندان کے علاوہ دیس بدیس سے آئے اخبارات، رسائل، کتابیں، اُن کی ادھوری کہانیوں کے اوراق، چھالیہ اور قوام والی تھیلیاں، سگریٹ لائٹر، حنا کی شیشی، آئے ہوئے خطوط اور تاش کی گڈی پڑی رہتی تھی ـــــ ان سب کے بیچ چست دُرست عصمت بلاؤز، پیٹی کوٹ یا کفتان پہنے بڑی سنجیدگی سے حبیب کے ساتھ تاش کھیلا کرتیں۔ حبیب ان کا نوکر تھا۔ وہ چارپائی کے نیچے چوکی پر بیٹھ کر ان کے ساتھ کھیلتا۔ عصمت بازی ہار جاتیں تو پان بنا کر اس کی چوپچ میں علی گڑھ سے آیا ہوا قوام لگا کر مُنہ میں ٹھونس لیتیں۔ پھر ایک بار خم ٹھونک کر بازی شروع کرنے سے پہلے حبیب کو ایک موٹی سی گالی دے کر پان کی پیک کو سنبھالتے سنبھالتے کہتیں۔ "حرامزادے، اب کے جیتا تو یاد رکھنا۔" وہ گالیاں سُنتے سُنتے ہی بڑا ہوا تھا ـــــ وہ جب بھی گھر جاتا تو عصمت اُسے تنبیہہ کرتیں۔ "حبیب کے بچّے تمھارے تین بچے ہیں۔ اگر اب کے تمھاری بیوی حاملہ ہوئی تو یاد رکھنا۔" حبیب نیچی نظر کرکے مُسکراتا رہتا[1] ـــــ ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ عصمت کی شخصیت کا یہ کس قدر تابناک پہلو ہے۔ اُنھوں نے حبیب کے تعلّق سے بندہ اور بندہ نواز کا فرق ہی مٹا دیا۔ اُنھوں نے اُسے ایک ملازم سے پہلے گوشت پوست کا انسان سمجھا اور اس سے ویسا ہی سلوک روا رکھا ـــــ عصمت کی گداز دِلی اور انسان دوستی اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔

○ مشہوُر ادیبہ اجیت کور کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا تو ان کی دوست پدما سچدیو نے اُسے اپنے ہاں دعوت دی۔ اس تقریب میں عصمت کے علاوہ دہلی کی بیشتر ادیبائیں موجوُد تھیں۔ پدما کو اس بات کا پتہ نہ تھا کہ عینی (قرۃ العین حیدر) اور عصمت کے تعلقات کشیدہ ہیں اور ان کے درمیان بول چال تک بند ہے۔ عینی اپنے کسی دوست کے ہمراہ آئیں اور ایک طرف الگ تھلگ ہی بیٹھ گئیں۔ عصمت نے انھیں دیکھا، اُٹھیں اور اُن کے پاس جا کر بولیں "بڑ چڑیل میرے ساتھ بات کرتی ہے یا نہیں؟"[2] ـــــ چشم زدن میں رنجش مٹ گئی۔ من مُٹاؤ معدُوم ہو گیا۔ دونوں گنگا جمنا کی طرح گھُل مِل گئیں۔ عصمت میں یہ صفت تھی کہ وہ اپنی انا کو دوستی کی راہ میں حائل نہ ہونے دیتیں۔ لفظ "چڑیل" میں جو اپنائیت اور اُنسیت مضمر ہے اسے ہر باذوق، باشعوُر انسان سمجھ سکتا ہے۔

○ عصمت پدما سچدیو کو پیار سے دیکھ کر کہتیں۔ "پان کھاؤ گی۔" اور پان بنا کر کبھی کبھی شرارت سے اس کی چوپچ قوام والی شیشی سے چھوُ لیتیں۔ پدما کہتیں۔ "آپا میں سردارنی ہوُں۔ گرُو جی ناراض ہو جائیں گے۔" وہ ہنس کر کہتیں۔ "اُنھیں تمھاری نگرانی کے سوا بھلا اور کوئی کام ہے۔ اس کے لئے انھوں نے ایک سردار (پدما کا شوہر)

---

[1] [2] پدما سچدیو "ذکر اُس پری وش کا" سہ ماہی "سمکالین بھارتیہ ساہتیہ" (ہندی) نئی دہلی۔ (اپریل/جون ۱۹۹۰ء) ص ۱۷۹، ۱۸۶

چھوڑ رکھا ہے"۔ــــ ایک بار قوام میں پدما کے پان کی چوپچ ذرا زیادہ بھیگ گئی۔ ان کی آنکھیں اُبل کر باہر آنے لگیں۔ وہ باتھ رُوم میں پانی کے کُلّے کر کے آئیں تو عصمت بولیں "تو برہمنوں کی اولاد کیا خاک قوام ہضم کرے گی۔ سردارنی ہوتی تو زیرے کی طرح چبا جاتی۔ اب تو بھئی سردار کو کہنا پڑے گا کہ تو قوام کھاتی ہے۔ نکال باہر کرے گا تجھے"۔ پھر پیارے بولیں "تم میرے پاس آ کر رہنا۔ پر سردار بڑا پیارا آدمی ہے"[1]

عصمت زندگی سے بھرپور تھیں۔ اُنھوں نے بڑی شوخ و شنگ طبیعت پائی تھی، جو ان کی باتوں کو رنگینی اور رعنائی عطا کرتی تھی۔

○ ہولی کا تہوار تھا۔ ملاڈ میں سعادت حسن منٹو اور شاہد بالکنی میں بیٹھے پی رہے تھے۔ عصمت، منٹو کی بیوی صفیہ کو اُکسا رہی تھیں کہ یہ لوگ اتنا روپیہ اُڑائیں ہم کیوں نہ اس عیش میں شریک ہوں۔ دونوں ایک گھنٹے تک دل کڑا کرتی رہیں۔ اتنے میں ایک ہلڑ سا مچا اور فلمستان سے پروڈیوسر مکرجی، اُن کی بھاری بھرکم بیوی اور دُوسرے لوگ اُن پر حملہ آور ہوئے۔ چند منٹوں میں ان سب کا حُلیہ ناقابلِ شناخت تھا۔ عصمت کی توجہ وہسکی سے ہٹی اور رنگ پر مرکوز ہو گئی "آؤ صفیہ ہم بھی ان پر رنگ لگائیں"ــــــ وہ سب بازار میں نکل آئے۔ چنانچہ گھوڑ بندر روڈ پر باقاعدہ ہولی شروع ہو گئی۔ نیلے، پیلے، سبز اور کالے رنگوں کا چھڑکاؤ سا شروع ہو گیا۔ ایک موٹی بنگالن کے چہرے پر تو عصمت نے تارکول کا لیپ کر دیا۔ ایک دم عصمت نے جرنیلوں کے انداز میں کہا "آؤ پری چہرہ کے گھر پر دھاوا بولیں" اُن دنوں نسیم بانو فلمستان کے فلم "چل چل رے نوجوان" میں کام کر رہی تھی۔ اس کا بنگلہ پاس ہی گھوڑ بندر روڈ پر تھا۔ عصمت کی تجویز سب کو پسند آئی۔ چنانچہ چند منٹوں ہی میں وہ سب بنگلے کے اندر تھے۔ نسیم حسبِ عادت پورے میک اپ میں تھی اور نہایت ہی نفیس ریشمی جارجٹ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ وہ اور اس کا خاوند احسان ان کا شور سُن کر باہر نکلے۔ عصمت نے جو رنگوں میں لتھڑی ہوئی بُھتنی سی لگتی تھیں صفیہ سے، جس پر مزید رنگ لگانے سے کوئی فرق نہ پڑتا، نسیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا "صفیہ، نسیم واقعی حسین عورت ہے"۔ منٹو نے نسیم کی طرف دیکھا اور کہا "حُسن ہے لیکن بہت ہی ٹھنڈا"۔ عینک کے رنگ آلود شیشوں کے پیچھے عصمت کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھومیں اور اُس نے آہستہ سے کہا "صفرادی طبیعتوں کے لئے ٹھنڈی چیزیں مفید ہوتی ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھیں اور ایک سیکنڈ کے بعد نسیم سرکس کا مسخرہ بنی تھی۔[2]

ایسی تھیں عصمت۔ وہ ہر جگہ ایک قائد کی طرح پرچم بلند کئے پیش پیش رہتیں۔ پس منظر رہنا، دُوسروں کے

---

[1] پدما سچدیو "ذِکر اس پری وش کا" سہ ماہی "سمکالین بھارتیہ ساہتیہ" (ہندی) نئی دہلی (اپریل/جون ۱۹۹۵ء) ص ۱۲۹

[2] سعادت حسن منٹو "عصمت چغتائی" (خاکہ) اُردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) ص ۴۶

پیچھے پیچھے سر جھکائے چلنا ان کی فطرت سے بعید تھا۔

○ دھرم ویر بھارتی اور کملیشور سے عصمت کی گہری چھنتی تھی۔ ایک دن دونوں کو شرارت سوجھی۔ بھارتی نے عصمت سے پوچھا "اگر بمبئی میں بھونچال آجائے تو آپ کیا کریں گی؟" عصمت نے برملا جواب دیا "تمھیں اور کملیشور کو فون کروں گی۔ مجھے اپنے دوستوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں خدا کے آگے گڑگڑاؤں گی؟"[1]

یہ نہ صرف دوستوں پر مکمل اعتماد کا اظہار تھا بلکہ خدا کی ہستی پر گہرا طنز بھی۔

○ راجندر سنگھ بیدی بیمار ہوئے تو عصمت گاہے گاہے ان کی مزاج پرسی کو جایا کرتی تھیں۔ انھیں پیٹ کا کینسر تھا اور وہ سخت کرب و عذاب جھیل رہے تھے۔ دوست احباب جو شب و روز اُن کے گرد منڈلایا کرتے تھے ان سے کنارہ کشی کر گئے تھے۔ ایک دن عصمت گئیں تو انھیں معلوم ہوا کہ بیدی اُسی دن چارپائی سے گر پڑے تھے۔ انھوں نے عصمت کو دیکھا تو بے اختیار چھلک پڑے اور بولے "اب مر ہی جاؤں تو اچھا ہے" عصمت کہنے لگیں "ارے جی کر ہی تم نے کیا کر لیا جو مر کر کر لوگے۔ پڑے رہو جہاں ہو"[2] —— انتہائی درد میں بھی بیدی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

○ صابر دت اُن دنوں اپنی مشہور "فن اور شخصیت" سیریز میں خصوصی نمبر نکال رہے تھے۔ جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی نمبر شائع ہو چکے تھے یا عنقریب ہونے والے تھے اور وہ سب اس جہانِ گذراں سے گذر چکے تھے۔ اور بھی کئی ادبا اور شعرا پر اُنھوں نے نمبر نکالنے تھے —— ایک دن صابر دت عصمت سے آکر بولے "آپ کا نمبر نکالنا ہے۔ فلاں فلاں کے نکل چکے ہیں" اُنھوں نے پوچھا "کیسا نمبر؟" صابر دت نے بتایا تو بولیں "ارے وہ نمبر۔ معاف کرو میاں۔ جس جس کا نکلا ہے وہ پھٹا پھٹ مر رہے ہیں۔ مَیں تو ابھی مرنا نہیں چاہتی۔" اُنھوں نے کہا "ایسی بات نہیں۔ فلاں فلاں پر بھی نکلا ہے۔ حال ہی میں کملیشور جی پر نکلا ہے" عصمت جھٹ سے بولیں "وہ ٹھہرا بے شرم ہندو۔ اس کے دشمن مریں۔ میں تو حیادار مسلمانی ہوں۔ فٹ سے مر جاؤں گی۔ بھئی مجھے بڑے کام ہیں۔ تم جاؤ"[3]

اس طرزِ گفتگو پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو یوں لگی لپٹی کے بغیر اپنی بات کہنے کا دم رکھتے ہیں اور وہ بھی اس بے مثل انداز میں۔

○ پدما سچدیو عصمت کی جگری دوست تھیں۔ ایک دن پدما کی موجودگی میں ان کے شوہر سریندر سنگھ نے

---

[1] [2] [3] پدما سچدیو "ذرا اس پری وش کا" سماہی سمکالین بھارتیہ ساہتیہ (ہندی) نئی دہلی (اپریل/جون ۱۹۹۵ء) ص ۱۸۹، ۱۸۶، ۱۸۰

عصمت سے کہا: "یہ پدما بڑی خراب ہے۔ اب تو ہمارا DIVORCE ہو جانا چاہیئے۔" یہ سُن کر پدما کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اگلے روز پدما رسوئی میں کھانا بنا رہی تھیں اور ان کے پاس عصمت کھڑی تھیں کہ سردار جی نے دُوسرے کمرے سے آواز لگائی: "پدما میرا پائجامہ کہاں ہے؟" پدما نے کہا: "آ رہی ہوں۔" عصمت کی گول گول آنکھیں پھیلیں۔ کہنے لگیں: "ارے کل تو اِسے چھوڑنے کی کہہ رہا تھا۔ اب پائجامہ ڈھنڈوا رہا ہے۔" اتنے میں سردار جی رسوئی میں آ گئے۔ وہ بولیں: "بڑا آیا چھوڑنے والا۔ اپنا پائجامہ تک تو ڈھونڈ نہیں سکتا۔ ارے چلی جائے گی تو ننگا پھرے گا ننگا۔" ـــــ سردار جی نے خوش ہو کر عصمت کو گلے لگا لیا تو کہنے لگیں: "بڑا چھوڑنے چلا ہے۔"[1]

سردار جی، عصمت کی اِس پیار بھری پھٹکار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور پدما کی بھی جان میں جان آئی۔

● حوصلہ مند، باعزم:

عصمت کا ذکر آتے ہی جگر مرادآبادی کا یہ شعر لامحالہ زبان پر آجاتا ہے ؎

کارِ عظیم چاہیئے، طبعِ سلیم چاہیئے
عزمِ صمیم چاہیئے، فکرِ مآل کار کیا

عصمت نے اپنی زندگی میں جب بھی کوئی نصب العین اپنے سامنے رکھا، اسے حاصل کرنے کے لئے انھوں نے ہمیشہ محنت اور لگن سے پُرخلوص کوشش کی اور جب تک اپنی منزل کو پا نہ لیا اُن کی بیقراری کو قرار نہ آیا ـــ اپنے موقف سے اُنھوں نے کبھی سرِمو انحراف نہ کیا اور ہمیشہ ثابت قدمی اور پامردی سے اپنی راہ پر گامزن رہیں۔ جو رکاوٹیں اُن کے سدِ راہ ہوئیں، وہ نتائج سے بیگانہ و بے نیاز، والہانہ انداز میں اُن سے ٹکرا گئیں اور کامیابی نے ہمیشہ اُن کے قدم چُومے ـــ عصمت کبھی شخصیتوں سے مرعوب نہ ہوئیں۔ مدِمقابل اُن کے والد بزرگوار ہوں یا والدہ محترمہ، بھائی ہوں یا بہنیں، اعزا و اقارب ہوں یا کوئی اور انھوں نے خوف زدہ ہونا، جُھکنا، دبنا نہ سیکھا۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے معاشرے اور مذہب کے مسلّمات کو بھی جو ان کی میزانِ قدر پر پُورے نہ اُترتے تھے، بے اعتنائی سے ٹھکرا دیا، کہ اس معاملے میں وہ "بُت شکن" واقع ہوئی تھیں۔ جب ناقدین اور مخالفین نے انھیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا تو بھی اُن کی پیشانی شکن آلود نہ ہوئی اور انھوں نے کمال

---

[1] پدما سچدیو: "ذِکر اُس پری وش کا"، سہ ماہی "سمکالین بھارتیہ ساہتیہ" (ہندی) نئی دہلی (اپریل/جون ۱۹۹۵ء) ص ۱۸۱

صبر و تحمّل اور خندہ پیشانی سے ان کے وار سہے ـــــ یہ بات اُن کے آب و گل میں تھی، رگ و ریشے میں تھی ـــــ آئیے ذرا اس اعتبار سے ان کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات پر ایک نظر ڈالیں:

○ جب غور و فکر کے بعد ایک بار اُنھوں نے یہ طے کر لیا کہ وُہ پردہ ترک کر دیں گی، تو اُنھوں نے اپنی والدہ، بھائیوں اور اقرباواعزا کی مزاحمت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان کے طعنے کوسنے سُنے۔ دھمکیاں برداشت کیں۔ یہاں تک کہ مار پیٹ بھی سہی۔ لیکن اپنی کر گذریں۔ اور اپنی کامرانی پر نازاں و شاداں رہیں ـــــ ان کے ماں باپ نے ان کے مڈل پاس کرنے کے بعد جب انھیں مزید تعلیم دلوانے سے سختی سے منع کر دیا تو وہ بغاوت پر تُل گئیں۔ انھوں نے کہا جو ہو سو ہو میں ضرور پڑھوں گی۔ اگر آپ اجازت دیں تو زہے قسمت، ورنہ میں گھر چھوڑ دوں گی اور عیسائی ہو جاؤں گی تاکہ کسی مشن اسکول میں داخلے سکوں۔ یہ بات اُنھوں نے بہت غیر مبہم الفاظ میں بغیر پلکیں جھپکے اپنے والد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہی۔ ان کے والد نے ان کے تعلیم حاصل کرنے کا ذوق و شوق اور آہنی عزم دیکھا تو پسیج گئے۔ عصمت نے نہ صرف علی گڈھ جا کر میٹرک اور ایف اے کیا بلکہ لکھنؤ سے بی۔ اے بھی کیا اور پھر واپس علی گڑھ جا کر بی ٹی کیا اور یوُں اپنے جذبۂ تحصیلِ علم کی تسکین کر کے سُرخرو ہوئیں۔ اُن دِنوں جب خال خال مُسلم خواتین ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی تھیں، یہ عصمت کی بہت بڑی کامیابی تھی ـــــ جب ریاست جاورہ میں جہاں وہ اسکول میں بطور ہیڈ مسٹریس تعینات تھیں، اُنھوں نے دیکھا کہ ان کی رضا و رغبت کے خلاف نواب صاحب اپنے لڑکے کی شادی ان کے ساتھ کرنے کی سازش کر رہے ہیں تو وہ راتوں رات جان جوکھم میں ڈال کر وہاں سے بھاگ نکلیں اور ایک مطلق العنان اور جابر نواب کے ناپاک منصُوبے خاک میں ملا دیئے ـــــ جب بریلی میں اسکول کے منیجر نے ان کے آزادانہ گھُومنے پھرنے پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کی، تو اُنھوں نے اسکول کے ساتھ اپنا معاہدہ انھیں واپس کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اپنی آزادی کھو کر یہاں ملازمت نہیں کرنی ـــــ جب عصمت کا شاہد لطیف سے معاشقہ پروان چڑھا اور شاہد نے عصمت کے بڑے بھائی کے ہاں جہاں وہ قیام پذیر تھیں، آنا جانا شروع کیا تو ان کے بھائی کی پیشانی پر بل پڑ گئے، اور اُنھوں نے شاہد کی آمد پر پابندی عائد کر دی۔ عصمت کو یہ بہت ناگوار گذرا اور وُہ خاموشی سے ہوسٹل میں منتقل ہو گئیں ـــــ عصمت نے شاہد سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو بھائی سدِ راہ ہوئے کہ شاہد لطیف موزوں لڑکا نہیں۔ مگر عصمت ٹس سے مس نہ ہُوئیں۔ نتیجہ یہ اُنھوں نے شادی کر لی اور بھائی سے اُن کا رشتہ عمر بھر کے لئے ٹوٹ گیا ـــــ ذرا ان کی ہمّت اور دیدہ دلیری دیکھئے کہ اُنھوں نے شادی سے پیشتر شاہد کو خود متنبّہ کر دیا کہ میں گڑبڑ قسم کی لڑکی ہوُں۔ اب بھی وقت ہے کہ مجھ سے

رشتۂ ازدواج میں بندھنے کا ارادہ ترک کردو اور دوستی کو یوں ہی چلنے دو۔ بہرحال شادی ہوگئی اور عصمت نے اس کے ساتھ زندگی اپنی شرائط پر گذاری ــــــ منٹو نے عصمت کو جو اُن کی دوست اور ہمراز تھیں، بارہا اپنے ساتھ پاکستان ہجرت کر جانے کے لئے کہا۔ مگر چونکہ یہ اُن کے موقف کے خلاف تھا انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ منٹو نے انھیں طرح طرح کے سُنہرے سپنے دکھائے مگر وہ اپنے عزم پر اٹل رہیں ــــــ عصمت اپنے آبائی مذہب سے مُنہ موڑ کر ہندو دھرم کی جانب جُھکیں تو مُسلم معاشرے نے ایک طرح سے آسمان سر پر اُٹھا لیا اور شدت غم و غصّہ کا اظہار کیا۔ اور تو اور مُسلم ادیب اور دانشور بھی بہت تلملائے، بہت جز بز ہُوئے اور خاموشی سے نہ صرف انھیں کنارے لگا دیا بلکہ ان کے ادب سے بھی کوئی واسطہ نہ رکھا۔ گویا اُنھوں نے عصمت کو نہ صرف بطور ایک انسان کے بلکہ ایک ادیبہ اور فنکارہ کے طور پر بھی طاق میں بٹھا دیا۔ مگر عصمت نے نہ تو پشیمانی یا تاسف کا اظہار کیا اور نہ ہی اپنی اختیار کردہ ڈگر سے متزلزل ہُوئیں ــــــ نہ صرف یہ بلکہ جب اُن کی رضامندی سے اُن کی ایک بیٹی نے ہندو خاندان میں اور دُوسری نے پارسی خاندان میں شادی کر لی تو مسلم معاشرے کا کثیر طبقہ، جن میں ترقی پسند ادیب اور شعرا بھی شامل تھے، بہت سیخ پا ہُوا مگر عصمت نے شمّہ بھر بھی پروا نہ کی ــــــ یہاں تک کہ اُنھوں نے وصیّت کی کہ مرنے کے بعد میرے جسدِ خاکی کو سپُردِ آتش کیا جائے اور میری راکھ کو سمندر میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

مختصراً شواہد سے ظاہر ہے کہ مزاج اور خصائل کے اعتبار سے عصمت ایک آہنی ارادوں کی عورت تھیں۔ اس کا اعتراف دوست دُشمن سب کرتے ہیں۔ بڑے بڑوں سے تنِ تنہا بھڑ جانے والی، قدم بڑھا کر پیچھے نہ ہٹنے والی، دل کی بات برملا مُنہ پر کہہ دینے والی، قول کی سچی، ارادے کی پکی، ہمتِ مرداں مددِ خدا کے مقُولے کی قائل جو کہتیں کر دکھاتیں۔ وہ پیدائشی باغی تھیں۔ اُن کی کتابِ زندگی کا ورق ورق ہمارے سامنے کھُلا پڑا ہے۔ اُنھوں نے اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں سے اُصولی بغاوت کی اور اُنھیں مات دی ــــــ اُنھوں نے اپنے مذہبی عقائد سے، فرسُودہ رسُوم و قیود سے بغاوت کی اور چہار سُو سے اپنے ہم مذہبوں کے طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کے باوجود اپنے موقف پر پہاڑ کی طرح ڈٹی رہیں۔ اُن کے ارادے کی پختگی، بیباکی اور حوصلہ مندی بے مثال تھی۔

● خوددار، غیرت مند:

عصمت کے مزاج کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنی خوشیاں سب میں بانٹ دیتی تھیں۔ اس سے انھیں قلبی طمانیت ملتی تھی۔ مگر اپنے غموں اور دُکھوں کو وُہ اندر ہی اندر پی جاتی تھیں۔ کتنے ہی سخت بُحران سے کیوں نہ گذر رہی ہوں اُنھیں نہ قضا و قدر سے شکایت پیدا ہوتی تھی اور نہ اپنے دوست احباب یا کسی اور سے۔ ایسے میں کوئی ان سے خلوصِ دلی سے بھی ہمدردی کا اظہار کرتا تو وہ جھُنجلا جاتیں اور اپنے اندر اور سمٹ

سکڑجاتیں اور مدِمقابل ان کی آشفتگی کے پیشِ نظر خاموش ہو جاتا۔ ان پر تنگدستی کے ایسے دَور بھی آئے کہ ان کی جگہ کوئی کم ہمت، کم حوصلہ انسان ہوتا تو چرمراکر رہ جاتا۔ لیکن اُنھوں نے لب بند کر کے صبر وشکر سے وقت کاٹ دیا۔ سلمیٰ صدیقی جو اُن کی سہیلی اور ہمراز تھیں اس بارے میں لکھتی ہیں:

"غم سے کسے نجات ہے اور عصمت آپا کو بھی رنج و الم نے کیوں بخشا ہوگا۔ لیکن جانے وہ کس مٹی کی بنی ہیں۔ کبھی روتے بسورتے، سرد آہیں بھرتے اُن کو کسی نے نہیں دیکھا۔ ان کے گھر میں تو کوئی ایسا سیف ڈیپازٹ والٹ بھی نہیں ہے جہاں اپنے سب دُکھ درد اور رنج و غم چھپا کر رکھ دیتی تھیں۔ کتنا جی چاہتا ہے کبھی تو وہ اپنی کوئی پریشانی اپنے کسی ہم عصر، عزیز و اقارب، دوست یا دشمن کو بتائیں سُنائیں —— بہت پریشان ہوں گی تو رمی کھیلیں گی، زیادہ پان کھائیں گی۔ زیادہ گپ کریں گی۔ لیکن ہم اب لاکھ اِس ارمان میں تڑپیں کہ عصمت چغتائی کے مقرّبِ خاص بن کے اُن کی پریشانیوں میں حصّہ بانٹیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ کبھی ایسا مت سوچئے گا۔ ہمدردی کے لفظ سے تو وُہ ایسا بِدکتی ہیں، ایسا بدکتی ہیں کہ خود ہمدردی کا لفظ اُن سے پناہ مانگتا ہے"[1]

قرۃ العین حیدر کے بیان سے سلمیٰ صدیقی کے بیان کی توثیق یوں ہوتی ہے:

"اُنھوں نے اپنی شدید مالی مشکلات کے زمانے میں بھی کسی سے اپنے مسائل کا رونا نہیں رویا۔ نہ دوستوں کی بے التفاتی کا گلہ کسی سے کیا۔ انتہائی خودداری کے ساتھ اپنے قریبی احباب کی محفل میں بیٹھی تاش کھیلا کیں"[2]

یہ ایک بیحد حسّاس، خوددار، غیرت مند عصمت کا کردار ہے، جو صابر، شاکر اور قانع تھیں، جو مصائب اور آلام کو زندگی کا ایک حصّہ سمجھتی تھیں، جو اپنے غموں کو سینے سے لگالیتی تھیں اور جو کبھی حوادث سے ہراساں اور دل شکستہ نہ ہوتی تھیں۔

● مُنہ پھٹ، بے شرم (محبّت کے تعلق سے):

عصمت کی شخصیت کا بھرپُور اور ہمہ پہلو جائزہ لیتے ہوئے ہمیں اُن کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں

---

[1] سلمیٰ صدیقی "عصمت کا جادُو" اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۹۱

[2] قرۃ العین حیدر "لیڈی چنگیز خاں"۔ ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (جنوری ۱۹۹۲ء) ص ۵

کو ملحوظ رکھنا ہوگا ورنہ جائزہ ادھورا رہ جائے گا ——— عصمت کے محبّت سے متعلق جذبات اور احساسات کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں دو باتوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اوّل یہ کہ عام طور پر ایک عاقبت اندیش اور دُنیاوی اعتبار سے سُوجھ بُوجھ رکھنے والا محتاط انسان اپنے زشت کو ڈھکا چھپا رکھتا ہے اور صرف تاباں اور قابلِ قبول پہلو کو پیش کرتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم بالعموم ایک مکھوٹا پہنے دُنیا کے سامنے آتے ہیں اور خود کو وہ ظاہر کرتے ہیں جو فی الواقع ہم نہیں ہوتے ——— مگر عصمت فطرتاً باغی اور مروّجہ اقدار سے منحرف اور بے نیاز تھیں۔ وہ انتہائی صاف گو تھیں اور ان کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی۔ سب ذہنی تحفّظات سے مبرّا اور منزّہ۔ انھیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہ تھی کہ لوگ اُن کی بابت کیا رائے قائم کریں گے۔ وُہ برافگندہ نقاب سامنے آئیں اور اُنھوں نے عام انسانوں کے برعکس خود کو عین مین ویسے ہی پیش کیا جیسی کہ درحقیقت وُہ تھیں۔ ایسے لوگ خال خال ہوتے ہیں، ہزاروں لاکھوں میں ایک۔ عصمت ان میں سے ایک تھیں۔

دُوسرے، عصمت ایک بھرے پُرے، کھاتے پیتے گھر میں پیار اور محبّت سے محرُوم رہیں۔ انھیں نہ شفقتِ مادری ملی اور نہ برادرانہ اور خواہرانہ پیار دُلار۔ اُنھیں ہمیشہ دھتکارا، پھٹکارا اور لتاڑا گیا۔ اور اس بدسلوکی، سخت گیری اور بے رُخی نے اُن پر اَمٹ چھاپ چھوڑی ——— علمِ نفسیات کے ماہرین کی رُو سے ایسا بچّہ بالعموم تاحیات محبّت کے لئے تشنہ رہتا ہے مگر اس کے بچپن کی محرومی اور نامرادی کا مداوا نہیں ہوتا ——— عصمت کے تعلّق سے عشق و محبّت کا ذکر کرتے ہوئے ان دو اساسی پہلوؤں کو مدِّنظر رکھنا ازبس ضروری ہے۔

عصمت کے نزدیک محبّت انسانی زندگی میں بہت اہم اور ضرُوری چیز ہے، جو اُسے توانائی اور بالیدگی عطا کرتی ہے اور اسے اُبھرنے، نکھرنے میں مُمد و معاون ثابت ہوتی ہے ——— محبّت سے جنسی عمل وابستہ ہے اور یہ ایک فطری عمل ہے جس کے لئے کسی خارجی تحریک، انگیخت یا درس و تدریس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ یہ از خود بروئے کار آجاتا ہے ——— عصمت کے الفاظ میں:

> "میں محبت کو بڑی ضرُوری اور بہت اہم شے سمجھتی ہُوں۔ محبت بڑی مقوّی دل و دماغ شے ہے۔ لیکن اس میں لیچڑ نہیں بن جانا چاہیئے۔ اَٹوائی کھٹوائی نہیں لینا چاہیئے۔ خودکشی نہیں کرنا چاہیئے۔ زہر نہیں کھانا چاہیئے۔ یہ میرا نظریہ ہے۔ اور محبّت کا جنس سے جو تعلق ہے وہ فطری ہے۔ وہ زمانہ لدگیا جب محبّت پاک ہُوا کرتی تھی۔ اب تو محبّت ناپاک ہو نا ہی زیادہ خوبصورت مانا جاتا ہے"[1]

---

[1] عصمت چغتائی "عصمت چغتائی سے گفتگو" (انٹرویو) یونس اگاسکر۔ اُردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۲۱

یہ بات انھوں نے بہت محتاط اور مناسب حدود میں رہ کر کہی ہے اور اس کی صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ــــ مگر اکثر اپنی تحریر اور گفتگو میں محبت کے نازک موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ بے عناں ہو جاتی تھیں اور نظم و ضبط کھو کر اُمنگ ترنگ میں، وہ باتیں بھی کہہ جاتی تھیں جو ایک عام انسان اپنے قلب و جگر کے نہاں خانوں میں چھپائے رکھتا ہے اور معاشرے کے نظم کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں زبان پر لانا معیوب سمجھتا ہے۔ مگر عصمت اس اعتبار سے "عام" نہ تھیں اور وہ "تکلف برطرف" کے انداز میں جو جی میں آئے کہہ گذرتی تھیں۔ مثال کے طور پر مشہور افسانہ نگار رام لعل جن سے عصمت کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے، انھیں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"پچھلے دنوں علی گڈھ میں ایک سمینار تھا۔ وہاں لڑکیوں نے عبداللہ ہال کا میگزین تھما دیا۔ اس میں آپ کا بھی ایک دلچسپ مضمون تھا جس میں آپ نے کہا تھا:
"میرے سامنے کوئی عشق کرتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں ہر شخص کے ساتھ عشق کروں جو مجھے اچھا لگتا ہو۔"[1]

دھیان رہے کہ عصمت کا یہ مضمون ایک کالج کے میگزین میں شائع ہوا جسے وہاں کی لڑکیاں بانٹ رہی تھیں۔

○ ایک انٹرویو کے دوران جب اُن سے ایک لڑکی نے سوال کیا کہ کیا انھوں نے کسی سے عشق کیا ہے تو انھوں نے بیساختہ جواب دیا:

"ہاں بھائی بہت عشق کئے۔ یہاں تک کہ کئی یاد بھی نہیں۔"
اب بھی کسی سے عشق ہے؟"
"ہاں فیض اور جعفری سے۔ ایک بار ننھے بھائی (اسرار الحق مجاز) سے بھی کہا تھا کہ سب سے عشق کر چکی۔ آپ سے بھی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ انھوں نے ڈانٹ دیا۔ بیچارے۔"[2]

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ استفسار پر انھوں نے بلا تکلف و بلا تردد ان لوگوں کے نام گنوا دیئے جن سے وہ اس وقت عشق فرما رہی تھیں اور جو ادبی دنیا میں ملک گیر شہرت کے مالک تھے۔ کیونکہ وہ ہر قسم کے ذہنی تحفظات سے مبرا تھیں۔ انھیں اس بات کا احساس تک نہ تھا کہ اُن کی بات پر متعلقہ اصحاب اور قارئین کا ردِعمل کیا ہوگا۔ دوسرے انھوں نے عشق کو کبھی معیوب اور مخفی رکھنے کی چیز نہ سمجھا۔ اور اپنی روایتی بے باکی کے ساتھ حقیقتِ حال کا اظہار کر دیا۔

---

[1] رام لعل۔ عصمت چغتائی کے نام خط، مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۱ء "دریچوں میں رکھے چراغ" اندرا انگر لکھنؤ۔ ص ۱۳۲

[2] شمع افروز زیدی "عصمت چغتائی سے انٹرویو" کاغذی ہے پیرہن۔ روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۶-۵

○ ساحر لدھیانوی کے ہاں بمبئی میں فراق گورکھپوری کے اعزاز میں ایک محفلِ ناؤ نوش کا اہتمام کیا گیا جس میں بہت سے ادیب، شاعر اور فلمی دُنیا سے وابستہ لوگ شریک ہُوئے، جن میں نامور افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک بھی تھے۔ وہ اس محفل کے حوالہ سے عصمت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سبھی مرد عورتیں پی رہے تھے۔ عصمت نے ایک آدھ پیگ پینے کے بعد ہاتھ میں گلاس تھامے اسے گھماتے ہُوئے بآوازِ بلند کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے میں ایک حرام کا بچّہ جنوں لیکن شاہد زہر کھالے گا"[1]

اس دھماکہ خیز بیان پر حاضرینِ محفل مبہُوت رہ گئے۔ یہ بات عصمت نے اپنے شوہر شاہد لطیف کی موجودگی میں کہی۔ کوئی شادی شُدہ عورت ایسی ناگفتنی بات نوکِ زبان پر لا نہیں سکتی اور اُنھوں نے یہ بات بغیر کسی انگیخت یا معقُول جواز کے کہی۔

○ عصمت کی دوست دو تین لڑکیوں نے پدما سچدیو کو ان کے فلیٹ سے نکلتے دیکھا تو وہ پدما اور عصمت کی بیٹی سیما کی مشابہت پر حیران رہ گئیں۔ اُنھوں نے عصمت سے پُوچھا کہ وہ لڑکی جو ابھی گئی ہے سیما تو نہیں تھی مگر اس کی شکل وصُورت اُس سے بہت ملتی جُلتی ہے۔ عصمت نے بڑا سنجیدہ سا مُنہ بنا کر کہا۔ "اب تم نے اُسے پہچان ہی لیا ہے تو بتا دیتی ہُوں کہ یہ میری حرام کی اولاد ہے۔ شادی سے پہلے ہو گئی تھی۔ کیا کرتی، کسی کو دے دی۔ اب جب سے اُسے پتہ چلا ہے کبھی کبھی ملنے آجاتی ہے"۔ بعدازاں جب پدما آئیں تو عصمت نے انھیں بتایا "بڑے مزے آئے۔ بنا چائے پئے ہی چلی گئیں۔ تمھارے لئے چائے منگواؤں"[2]۔

اپنے آپ سے اس نوع کا مذاق کرنے کے لئے خود اعتمادی چاہیئے۔ دل گُردہ چاہیئے۔ عصمت میں ان خصائص کی کمی نہ تھی۔

○ عصمت، پدما سچدیو کو اپنا ایک واقعہ بیان کرتی ہیں ــــ ان کی بیٹی سیما بڑی ہُوئی تو اُسے پھُولوں والی پراندی کا شوق چرایا۔ عصمت بمبئی کے "ریڈ لائٹ ایریا" بھنڈی بازار سے پراندی خرید کر ٹیکسی کا انتظار کر رہی تھیں کہ ایک شخص موٹر میں آیا اور ان کے پاس جا کر بولا "چلیں" اُنھوں نے کہا "چلو"۔ وہ موٹر میں اُس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ جب ذرا آگے بڑھے تو اس نے پُوچھا "کسی ہوٹل میں چلیں"۔ انھوں نے کہا "ہوٹل کیوں میرے گھر چلئے۔ آپ کے فضُول پیسے خرچ ہوں گے"۔ وہ خُوش ہو گیا۔ گھر پہنچے۔ دروازہ

---

[1] اوپندر ناتھ اشک "عصمت چغتائی۔ دوزخی کی باتیں" (مضمون) ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (جنوری ۱۹۹۲ء) ص ۱۰

[2] پدما سچدیو "ذکر اُس پری وش کا" سہ ماہی "سمکالین بھارتیہ ساہتیہ" (ہندی) نئی دہلی (اپریل/جون ۱۹۹۵ء) ص ۱۸۱

کھلا تو ڈرائینگ رُوم میں تاش کھیل رہے لوگوں میں علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، شاہد لطیف اور دو تین دیگر لوگ تھے۔ وہ شخص چونکا۔ اُس نے سوچا ہوگا کہ بڑے اونچے درجے کا مال ہے۔ عصمت نے اُسے بیٹھنے کو کہا تو شاہد بولے "عصمت فلاں کا فون آیا تھا۔" وہ شخص پڑھا لکھا تھا۔ فوراً جان گیا کہ وہ عصمت چغتائی ہیں۔ اس کی گھگی بندھ گئی۔ وہ گھبرا کر بولا "مجھے اجازت دیجئے میں چلوں گا" ــــــ عصمت نے کہا "نہیں۔ آپ نے بھی مجھے یہاں تک چھوڑنے کی تکلیف کی ہے۔ چائے پئے بغیر میں آپ کو جانے نہ دوں گی۔ ابھی کباب تلے جاتے ہیں۔ کھا کر جائیے"۔ وہ غریب مخمصے میں پھنسا خود تلا جا رہا تھا، بولا۔ "مجھے کہیں جانا ہے"۔ ــــ بعد میں عصمت نے سب کو قصہ سنایا تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے ــــ عصمت نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "ارے اس غریب کا زیادہ قصور نہ تھا۔ میں ان دنوں اچھی خاصی بھنڈی بازار والی لگتی تھی۔ اصل میں کالے بال مجھے SUIT نہیں کرتے تھے۔ میں نے ہائیڈروجن پائیرواکسائیڈ اور نہ جانے کیا کیا سے دھلوا کر سفید کئے تو کچھ صورت نکلی"۔[1]

یہ ایک بہت CRUEL PRACTICAL JOKE تھا جسے وہ نامراد شخص تا دمِ مرگ نہ بھول سکا ہوگا۔ ایک عام شخص اس پر دانتوں تلے انگلی دے لیتا ہے۔ مگر عصمت جب نقاب اُتار پھینکتیں تو آگا پیچھا نہ دیکھتیں، سب حدود سے گذر جاتیں۔

اس باب کی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہر واقعہ عصمت کی زبان سے بالواسطہ یا بلاواسطہ بیان ہوا ہے۔ اور ہر واقعہ عصمت کی شخصیت کے ایک مخصوص رنگ کا آئینہ دار ہے اور سب واقعات کو بحیثیت مجموعی دیکھیں تو عصمت کی گونا گونی اور رنگا رنگی اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ عیاں ہو جاتی ہے۔ نہ جانے ان کی شخصیت کتنے رنگوں کا مرقع تھی۔

(یہ عصمت کی کثیر الجہات شخصیت کی بڑی بھرپور اور جاندار تصویر ہے) ان میں اگر زندہ دلی، خوش خلقی، خوش دلی، انسان دوستی، بیباکی، بلند حوصلگی، گداز دلی اور حُسن پرستی جیسے قابلِ قدر اوصاف تھے تو کچھ بشری کمزوریاں بھی تھیں۔ مگر یوں دیکھا جائے تو اس دُنیا میں کون خامیوں اور کوتاہیوں سے یکسر مبّرا ہے کہ انسان زشت و خوب کا مجموعہ ہے ــــ عصمت کی شخصیت کا خوبصورت اور نادر پہلو یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی تھیں، کھلے عام تھیں۔ ڈنکے کی چوٹ تھیں۔ جو وہ ظاہرہ اور اوپری طور پر تھیں باطنی طور پر بھی عین مین وہی تھیں۔ صاف، سچی اور کھری ــــ اور اس اعتبار سے وہ ایک فقید المثال ہستی تھیں۔

[1] پدما سچدیو "یذکراس پری وش کا" سہ ماہی "سم کالین بھارتیہ ساہتیہ" (ہندی) نئی دہلی (اپریل/جون ۱۹۹۵ء) ص ۱۸۵

عشق

ہندوستانی معاشرے میں کسی ادیبہ کا اپنے معاشقوں کا حال بے محابا ضبطِ تحریر میں لانا قریب قریب نادیدہ اور ناشنیدہ ہے۔ "قریب قریب" اس لئے کہ ایسی محض چند ایک مثالیں جو بے ساختہ ذہن میں آتی ہیں، وہ ہیں معروف ادیبہ کملا داس، ناول نگار نین تارا سہگل اور نامور پنجابی شاعرہ اور افسانہ نگار امرتا پریتم۔ ایسی ہی شخصیتیں شاید کئی اور بھی ہوں۔ مگر عصمت چغتائی نے جس بیباکانہ انداز میں اپنے معاشقوں کا حال لکھا ہے کم از کم اردو میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

اور اجیت کور

ہمارے ادب پر بھی عشق چھایا ہوا ہے۔ اُردو ادب میں اُس شاعر کو چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑے گا جس کا کلام حُسن و عشق سے مبرّا و منزّہ ہے۔ فراق گورکھپوری کے مُطابق مغربی ادب کا صرف دس فیصد حُسن و عشق کے معاملات سے متعلق ہوتا ہے جبکہ ہمارے ادب کا نوّے فیصد عشقیہ معاملات کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ عشق شاید ادب کی اہم ضرورت بھی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ادب عشق کی چاشنی کے بغیر ذرا بے کیف اور بے رنگ سا لگتا ہے۔

اگر ہم اپنے مشاہیرِ عالم ادبا، شعرا اور سیاستدانوں کی زندگی پر سرسری سی نظر بھی ڈالیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وُہ سب عشق گزیدہ تھے۔ کسی نے آپ رُتبے اور منصب و مقام کو ملحُوظ رکھتے ہوئے پس پردہ عشق کیا تو کسی نے بلا جھجک نخلِ عشق کی آبیاری کی اور اس کی پردہ پوشی کرنا، اپنے جذبۂ عشق کی تحقیر جانا۔ علامہ اقبال، رادھا کرشنن، جواہر لال نہرو، رابندر ناتھ ٹیگور، محمّد علی جناح سب اِسی زمرے میں آتے ہیں —— پھر ہمارے ادبا و شعرا مشمُول کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، فراق گورکھپوری، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، میراجی، اختر شیرانی، فیض احمد فیض وغیرہ سبھی اسی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

اِس تناظر میں آئیے ذرا عصمت کے معاشقوں پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ اُن کے خود نوشت ہیں اِس لئے مُستند

اور معتبر ہیں۔

○ جگنو عصمت کا ماموں زاد بھائی تھا۔ اُن کی والدہ بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھیں۔ اُن کے والد اُن کی کفالت کرنے سے قاصر تھے۔ عصمت کی والدہ نے اُنھیں پالا پوسا اور اپنے بچوں کی طرح ہی ان کی دیکھ بھال تعلیم و تربیت کی ذمہ داری نبھائی۔ عصمت کے بھائی اُن سے لڑتے جھگڑتے اور مار پٹائی کرتے تھے لیکن جگنو نے کبھی انھیں ایذا نہیں پہنچائی۔ وہ خاموش طبع، سنجیدہ مزاج اور کم آمیز تھے۔ پہلے تولتے پھر بولتے۔ وہ بہت ذہین محنتی اور کھیل کود میں اپنی عمر سے زیادہ چاق و چوبند اور مستعد تھے۔ اماں سے بچّے پیسوں کی ضد کرتے لیکن وہ بے تعلق سے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ یہ دیکھ کر اماں کا دل بھر آتا اور وہ اُن سے پیار سے پوچھتیں کہ اُس نے پیسے کیوں نہیں مانگے تو وہ آہستہ سے جواب دیتے " اماں ابھی ہیں میرے پاس پیسے"۔ وہ پھوپھی کو اماں کہتے تھے۔ اماں اُنھیں اصرار سے پیسے دیتیں۔ جگنو لڑکپن سے ہی قانع اور صابر تھے۔ عصمت کو وہ جغرافیہ پڑھاتے تھے اور اُنھوں نے ہی عصمت کو اللہ تعالیٰ کے تصوّر سے متعارف کرایا۔ تعلیم کے معاملے میں وہ گھر کے دوسرے بچوں کے لئے بھی خضرِ راہ ثابت ہوئے —— جگنو اتنے بڑے کنبے میں سب کو پسند تھے۔ عصمت کو دوسروں سے کہیں زیادہ۔

جگنو سے عصمت کی شادی کی بات چلی۔ بزرگوں کی رائے شادی کے حق میں تھی۔ عصمت کو پتہ چلا تو اُن کے الفاظ میں " مَیں ایک دم لگا میں تڑانے لگی" کیونکہ ان کا ارادہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ سب سے زیادہ مزاحمت جگنو کی ہمشیرہ، عصمت کی بھابی (منجھلے بھائی کی اہلیہ) شوکت آپا کی طرف سے ہوئی۔ اس نے کبیدہ خاطر ہو کر اپنے مخصوص انداز میں کہا:

"جانتی ہو جگنو سے تمھاری شادی کے منصوبے بن رہے ہیں۔ مگر میں ہرگز یہ شادی نہیں ہونے دوں گی۔ خدا نہ کرے جو تم جیسی خود سر، زبان دراز سے میرے بھائی کی قسمت پھوٹے"[1]

لیکن عصمت، عصمت تھیں، فوراً بولیں:

"ہینہ، اس گدھے سے میں کب شادی کرنا چاہتی ہوں۔ لعنت ہے قربجو۔ مجھے گھن آتی ہے کمبخت سے"[2]

عصمت کے رَواروی میں کہے یہ الفاظ ان کے دلی جذبات کے آئینہ دار نہ تھے۔ یہ تو انھوں نے

---

[1] [2] عصمت چغتائی "پھر علی گڑھ چھوٹا" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ (اگست ۱۹۷۹ء) ص ۴۳

اضطراری طور پر شوکت آپا کے تلخ و ترش بیان کے جواب میں کہے تھے۔ بحث مباحثہ میں کسی سے مات کھانا اور اپنی ذلت برداشت کرنا انھیں ہرگز گوارا نہ تھا۔ چنانچہ اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

"مجھے جگنو ہمیشہ بہت پیارے تھے۔ اگر اُن سے میری شادی ہوجاتی تو میں ایک نہایت پتی ورتا بن جاتی۔ مجھے دراز قد مرد پسند تھے۔ اور وہ گھر میں سب سے اُونچے نکلتے تھے۔ آج میں اپنی کہانیوں کے ہیرو کو پرکھتی ہوں تو انھیں بالکل "جگنو" پاتی ہوں۔ جگنو کے دل کا حال میں وثوق سے نہیں بتا سکتی ہوں۔ مگر میں نے ہمیشہ انھیں اپنا رُوحانی محبوب مانا۔"[1]

دھیان رہے کہ جگنو نے ایف۔ ایس۔ سی کی اور بمبئی ڈاکٹری کرنے چلے گئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ بڑے کامیاب ڈاکٹر بنے۔ اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

عصمت نے نہ صرف دل ہی دل میں جگنو کو اپنا "رُوحانی محبوب" مانا بلکہ اپنی کہانیوں کے ہیرو کو بھی ان کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ نیز مستقبل میں اپنے چاہنے والوں کے آئینہ میں جگنو ہی کی تصویر دیکھنے کی تمنا کی۔ مثال کے طور پر جب ظفر قریشی ضیا سے اُن کا معاشقہ ہوا (جس کا ذکر اگلے صفحات میں آئے گا) اور وہ انھیں پہلی بار ملنے بریلی گئے تو عصمت حسبِ وعدہ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھیں۔ ضیا نے انھیں لکھ دیا تھا کہ وہ فرسٹ کلاس کے ڈبے سے سُرمئی سوٹ پہنے، اخبار ہاتھ میں لئے اُتریں گے، تاکہ وہ انھیں آسانی سے پہچان سکیں۔ عصمت لکھتی ہیں:

"فرسٹ کلاس سے جو سُرمئی سوٹ پہنے، اخبار ہاتھ میں لئے اُترا اُسے دیکھ کر میں نمک کا کھمبا بن گئی۔ بالکل ہو بہو جگنو۔ وہی بے حد گھونگھر والے ڈھیروں بال، بچی بچی سی آنکھیں، کھُلا دہانہ، گورا گندمی رنگ، پر آخری بار جگنو کو دیکھا تھا تو دُبلے تھے۔ بس جسم بھر گیا تھا، بے حد سلیقے سے۔ میں ایسے سناٹے میں انھیں دیکھ رہی تھی کہ ضیا مُسکراتے ہوئے سیدھے میری طرف بڑھے "آداب عرض"——"آداب عرض" نہیں یہ جگنو نہیں ضیا تھے۔"[2]

گھونگھر

صاف ظاہر ہے کہ برسوں گذر جانے پر بھی عصمت کو اپنے "رُوحانی محبوب" کی یاد ستاتی رہی اور وہ اپنے من پسند مردوں میں بھی جو اُن کی زندگی میں آئے جگنو کو ہی ڈھونڈتی رہیں۔ درحقیقت عورت اور مرد اپنے

---

[1] عصمت چغتائی "پھر علی گڑھ چھوٹا" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (اگست ۱۹۷۹ء) ص ۴۳

[2] عصمت چغتائی "تالے" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (فروری ۱۹۸۰ء) ص ۱۴

پہلے پیار کو کبھی نہیں بھولتے۔ اُس کے نقش اس قدر گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں کہ وہ اپنی دائمی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان اس اَچھوتے پیار کی میٹھی یادوں کو حرزِ جان بنائے زندگی کی دھوپ چھاؤں سے گذر جاتا ہے۔

جب باتوں باتوں میں عصمت نے جگنو کا ذکر کیا تو ضیا نے کُرید کر اس کی بابت تفصیل سے جاننا چاہا:

"ہاں تو بس اور کوئی بھرپُور محبت، کوئی دل کا داغ۔ کچھ ٹھنڈی آہیں۔ وہ آپ کے کزن جن کا آپ نے کئی خطوں میں ذکر کیا، وہ بمبئی میں ڈاکٹر ہیں۔"

"اوہ جگنو"۔۔۔۔۔ "ہاں ہاں اُن سے تو بچپن سے لیلیٰ مجنوں والا معاملہ رہا ہوگا۔"

"خاک"۔۔۔۔۔ "اندھیرے اُجالے پکڑ دھکڑ، دو چار میٹھے پیار۔"

"کبھی نہیں ہمـ۔۔۔۔" "آپ کے چہرے کا رنگ کہہ رہا ہے کہ جھوٹ بول رہی ہیں۔"

"نہیں اس وقت جھوٹ کا موڈ نہیں۔ بلکہ مجھے تو شکایت ہے۔"[1]

عام طور پر مرد جس محبوبہ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اُس سے وہ اس کے گذشتہ معاشقوں کا حال بھی جاننا چاہتا ہے تاکہ اسے معلوم ہو کہ ماضی اور حال کے عاشقوں کے جھرمٹ میں اس کا کیا مقام ہے۔ اپنے زعم میں وہ "فاتح" ہونے کی حیثیت سے اس پر بلا شرکتِ غیرے اپنا حق جتانا چاہتا ہے۔ اس سے اُس کی دانست میں اس کے مردانہ وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔

بعد ازاں پھر دورانِ گفتگو عصمت نے ضیا کے استفسار پر انھیں اپنے پسندیدہ لوگوں کے نام بتائے۔ مجاز، جگر، نیاز فتح پُوری، پطرس وغیرہ۔ پطرس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"پطرس میری جان ہیں"۔۔۔۔۔ "اور جگنو؟"

"جگنو بھی"۔۔۔۔۔ "جان ہیں؟"

"یہ تو اُن کی شان میں گستاخی ہوگی۔ نہیں جگنو کے لئے دل میں الگ ہی خانہ ہے۔"[2]

یہ جذبۂ رقابت تھا جو رہ رہ کر جگنو کی بابت ضیا کے دل و دماغ کو متلاطم کر رہا تھا۔ اور عصمت فطری بے باکی کے ساتھ اپنے مَن کی بات عین مین کہے جا رہی تھیں۔ عصمت کو جگنو سے والہانہ پیار تھا اور اس کے اعتراف میں انھیں شمّہ بھر بھی جھجک نہ تھی۔ طویل عرصہ گذر جانے پر بھی ان کے پیار کی حدّت و شدّت فرو نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ اندر ہی اندر سلگتی رہیں۔ جب کبھی گھریلو تقاریب میں ان کی ملاقات جگنو سے ہوتی اور وہ ان

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ "تالے" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل"، نئی دہلی (فروری ۱۹۸۲) ص ۱۵

کی جانب ملتفت ہوتیں تو جگنو طرح دے جاتے۔ عصمت نے یہ کہہ کر" بلکہ مجھے تو شکایت ہے": جگنو کے تعلق سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر دیا۔ انھیں اس امر کی "شکایت" رہی کہ اُن کا پیار جگنو کے تغافل اور بے توجہی کے سبب تشنۂ تکمیل رہ گیا اور ان کی ترسی ہوئی رُوح کی پیاس نہ بُجھی ـــــ یہ یک طرفہ عشق عصمت کے ذہن میں تا دمِ مرگ کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا ہوگا۔

○ سیّد صاحب :

بریلی میں سیّد صاحب عصمت کے گھر کے پاس ہی رہائش پذیر تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مہذّب و متمدّن تھے اور محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ بڑے خوش مذاق اور باذوق تھے اور شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ طبیعت میں رومان کی چاشنی بھی تھی ـــــ اُن کی بیوی 'چھوٹی بی' ، بڑی معصوم صورت' منس مکھ اور باسلیقہ تھی۔ لیکن قضا و قدر نے انھیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔

عصمت کی اُن سے ملاقات ایک حسین اتفاق تھا۔ وہ پہلی دو ایک ملاقاتوں میں ہی ایک دوسرے کی جانب کھنچے چلے گئے۔ دونوں پارک میں سیر کو نکل جاتے اور خوب گپ شپ ہوتی ـــــ سیّد صاحب کبھی ولایت تحصیلِ علم کے لئے گئے تھے اور وُہ وہاں کسی لڑکی سے دل لگا بیٹھے لیکن اُن کا عشق پروان نہ چڑھا تو بہت دل شکستہ ہوئے اور حُزن و ملال میں ڈوب گئے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُنھیں بے شمار درد بھرے اشعار یاد تھے۔ آنکھوں میں رُومانی کیفیت اور گلے میں رس لئے وُہ ایک خاص انداز سے شعر پڑھتے تو یوں لگتا کہ وہ عصمت سے مخاطب ہیں۔ کبھی کبھی عصمت کو متاثر کرنے کے لئے اشعار میں" ظالم" وغیرہ کا لفظ بھی جڑ دیتے تھے۔ لیکن عصمت نے اس بات پر زیادہ توجّہ نہ دی۔ اوّل تو اس لئے کہ انھیں فطری طور پر اشعار سے زیادہ رغبت نہ تھی۔ اچھّے شعر نہ اُن کے

نوٹ: عصمت جب بمبئی میں مقیم تھیں اور شاہد لطیف سے اُن کا معاشقہ زور شور سے چل رہا تھا تو ان کے بڑے بھائی نے کوشش کی کہ عصمت جگنو سے، جو تب تک کنوارے تھے اور بمبئی میں ہی رہ رہے تھے، شادی کے بندھن میں بندھ جائیں لیکن عصمت رضامند نہ ہوئیں، کیونکہ عصمت نے خود کو جگنو کے لئے موزوں رفیقۂ حیات نہ پایا۔ جگنو ابھی تک ذہنی اور عادات و اطوار کے اعتبار سے وہی پُرانا جگنو تھا شریف النفس، کم گو، کم آمیز اور قانع۔ مگر عصمت اب اسکی ضد تھیں۔ جگنو کے لئے کوئی بھولی بھالی گھریلو قسم کی خوبصورت لڑکی موزوں تھی ـــــ دوسرے عصمت ان دنوں خود شاہد لطیف کے عشق میں مبتلا تھیں اور اب اُن کے لئے اُٹھایا ہوا قدم واپس لینا ممکن نہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ بیل منڈھے نہ چڑھی [1]

لیکن عصمت کے دل میں اپنے پہلے نامراد پیار کی کسک ضرور رہ گئی ہوگی اور اُنھیں رہ رہ کر ستاتی رہی ہوگی۔

---

[1] عصمت چغتائی: "میری آپ بیتی" (مضمون) مجموعہ "آدھی عورت آدھا خواب"۔ بیسویں صدی پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی ص ۲۴

دل کو چھوتے تھے اور نہ ہی انھیں یاد رہتے تھے —— پھر عصمت کو عشق میں آہیں بھرتے، شعر پڑھتے، میٹھی میٹھی دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے والے لوگوں سے ازلی چڑ اور کد تھی۔ عشق اُن کے نزدیک، اشک و آہ سے عبارت نہیں بلکہ وہ حیات بخش اور دل و دماغ کو توانائی بخشنے والا تھا۔ سیّد صاحب کا رُومان کی چاشنی لیے، غمناک اشعار عصمت کو مخاطب کرکے ایک خاص انداز سے پڑھنا اُن کے دل کی کیفیت کو صاف عیاں کر دیتا ہے۔ اشعار کے حُسن سے انسان متاثر نہ بھی ہو لیکن اُن کے معانی اس پر ضرور کھُل جاتے ہیں۔ وُہ جذبہ ضرور مترشح ہو جاتا ہے جس نے شاعر کو شعر کہنے کی تحریک کی۔ اور وہ جذبہ سامع کے دل و دماغ کو بھی لامحالہ متاثر کرتا ہے، کم کم ہی سہی۔

"ایک دن انھوں نے عصمت سے پوچھا "کبھی کسی سے عشق کیا ہے؟" —— "سینکڑوں دفعہ"، میں نے ڈینگ ماری۔

"ایں؟" —— "کیا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ آپ نے جو کیا؟"

"ایک لڑکی سے کیا۔ زندگی میں ایک بار" —— "بس، ایک دفعہ؟ پھر اور عشق نہیں کئے؟"

"کمال ہے سچا عشق زندگی میں ایک ہی دفعہ کیا جاتا ہے، محترمہ" —— "کیا سچ زندگی میں صرف ایک ہی بار بولا جاتا ہے؟"

"کیا اُلٹی بحث کرتی ہو۔ اُف۔ سارا موڈ خراب کر دیا" —— "سوری!"[1]

بات آہستہ آہستہ پیش رفت کرتی دکھائی دیتی ہے۔ عشق ایسے نازک موضوع پر بحث مباحثہ عاشق و محبوب کے درمیان فاصلہ کم کر دیتا ہے۔ پردے اُٹھتے چلے جاتے ہیں۔ قربت بڑھتی چلی جاتی ہے اور عشق اپنی تکمیل کی جانب رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔

سیّد صاحب کو نوکر نے آکر کہا کہ کھانا تیار ہے اور بیوی بلا رہی ہیں۔ اُنھوں نے عصمت کو بھی چلنے کی دعوت دی کہ آج اُن کا پسندیدہ گوبھی گوشت پکا ہے۔ عصمت نے بہانہ کیا کہ آپا کھانے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔ سیّد صاحب نے کہا کہ میرا نوکر آپا سے کہہ آئے گا کہ آپ کھانا ہمارے ہاں کھائیں گی۔

عصمت نے رازدارانہ لہجے میں سیّد صاحب کو عشق سے متعلق اپنا ایک تجربہ بتایا کہ مجھے بھی ایک بڑا طوفانی عشق ہُوا۔ تب میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی اور وُہ عشق تیرہ چودہ برس کی عمر تک رہا۔ میرا محبوب جو بائیس تیئس برس کا نوجوان تھا، میرے پڑوس ہی میں رہتا تھا۔ اس کا ناک نقشہ آج بھی میرے ذہن پر کندہ ہے۔ مغل شاہزادوں والی سج دھج، سنہری گھنے بال، گہری نیلی آنکھیں، جن میں جھانکنے والا ڈوبتا ہی چلا جائے۔ وہ گھوڑے

---

[1] عصمت چغتائی: "اُلٹے بانس بریلی" (مضمون)" کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (جنوری ۱۹۸۰ء)، ص ۳۳

کو سرپٹ دوڑاتا تھا اور اُس پر یوُں تن کر بیٹھتا تھا ـــــ میں اسے دیکھ دیکھ کر پہروں روتی اور میرا دل دھڑ دھڑ دھڑکتا۔ میں اس سے ڈرتی اور شرم وحیا کی ماری اُس سے اظہارِ عشق نہ کر پائی ـــــ یوُں وہ سپنوں میں آتا تو بڑا نرم ونازک لگتا۔ ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ پیار سے میرا گھونگھٹ اُٹھاتا تو میرا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا ـــــ وہ کئی بار میٹرک میں فیل ہوُا تو بمبئی بھاگ گیا اور سُنا ہے کہ اس نے کسی ایکٹرس سے شادی کر لی ـــــ پھر اُس کی مجھ سے کبھی ملاقات نہیں ہوُئی۔ جی چاہتا ہے کہ وہ مل جائے تو اس کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ کر دو آنسو بہالوں تاکہ دل کا بار ہلکا ہو جائے۔ کسک کی شدّت مٹ جائے۔

حسنِ اتفاق سے بعد ازاں وہی اُن کے سپنوں کا شہزادہ بمبئی میں شاہد لطیف کی ایک فلم کے سیٹ پر انھیں مل گیا۔ دیکھتے ہی عصمت کو اُس نے پہچان لیا اور لپک کر گلے لگا لیا۔ عصمت لکھتی ہیں:

"میں نے دل میں سوچا، ارے کمبخت۔ اب کیا فائدہ؟ تمیں سال پہلے گلے لگایا ہوتا تو اپنی دُنیا میں کیا نہ ہو گیا ہوتا؟ تب تو ہمارا نوٹس نہ لیا۔ ہم کتنے دن تک اپنی بارہ تیرہ برس کی ننھی جان محبّت کی پھواروں سے بھر کر تم پر چھڑکتے رہے! ـــــ اور اُس وقت کے خوبصورت شہزادے کا خواب آج بھی مجھے سودائی کر جاتا ہے۔"[1]

غور فرمائیے کہ اگر سیّد صاحب نے ولایت میں اپنے ناکام عشق کا اعتراف کیا تو عصمت نے بھی اپنی یک طرفہ محبّت کی داستان سنادی ـــــ اب قربت تیزی سے محبّت کا رنگ اختیار کر رہی تھی۔ سیّد صاحب تو پختہ قدم تھے مگر عصمت اپنے پیروں تلے کی زمین ٹٹول رہی تھیں کہ وہ ان کی بیوی کے ردِ عمل کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں۔

سیّد صاحب اپنے ہاں پہنچے تو وہ ڈرائنگ رُوم میں بیٹھ گئے۔ لیکن عصمت ان کے روکنے کے باوجود سیدھی باورچی خانہ میں چلی گئیں، جہاں اُن کی بیوی چمٹے میں کچھ پکڑے جلانے لگی تھیں۔ عصمت نے سلام کیا تو اُنھوں نے عصمت کی جانب مُنہ پھیر کر خوش خلقی سے جواب تک نہ دیا۔ عصمت، دقیقہ شناس تھیں، بھانپ گئیں کہ ان کے قلب وجگر پر کیا گذر رہی ہوگی۔ اِدھر وہ گھر کے کام کاج میں جُٹی تھیں اور اُدھر اُن کے میاں پارک میں ٹہلتے، قہقہے لگاتے، عصمت سے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ عصمت یہ صورتِ حال دیکھ کر اُن کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"چھوٹی بی۔ ایک راز کی بات ہے۔ کسی سے کہیں گی تو نہیں؟"

"راز کی بات۔ کیسا راز؟"

---

[1] اس واقعے کا ذکر عصمت نے اپنے مضمون "میری آپ بیتی" مجموعہ "آدھی عورت آدھا خواب" مطبوعہ بیسویں صدی پبلی کیشنز دہلی ص ۱۲۔۱۳ میں تفصیل سے کیا ہے۔

"آپ کے میاں کو عشق ہوگیا ہے!" (ظاہر ہے کہ اُن کا اشارہ اپنی طرف تھا۔ اور وہ اس بات کو ذرا گھما کر یوُں بھی کہہ سکتی تھیں کہ "مجھے آپ کے میاں سے عشق ہو گیا ہے")

وہ چونک کر میرا منہ تکنے لگیں۔

"اور آپ کچھ نہیں کہتیں؟"

"کیا کہہ سکتی ہُوں۔ میں تو اُن سے کہہ چکی ہُوں۔ دُوسری شادی کر لیں۔ بچہ میرے نصیب میں نہیں [1]"

اب مطلع بہت حد تک صاف ہو گیا تھا اور عصمت کے لئے راستہ ہموار دکھائی دیتا تھا۔

عصمت جھٹ سے اُٹھیں اور اُنھوں نے لپک کر جلتا چھوٹی بی کے ہاتھ سے لے لیا اور اس میں چپکا ہُوا تعویذ آگ پر رکھ دیا اور وہ چشم زدن میں جل گیا۔ عصمت بولیں:

"مولوی صاحب نے یہی کہا ہو گا کہ جونہی تعویذ جلے گا آپ کی نامراد رقیب بھسم ہو جائے گی۔ دیکھو چھوٹی بی میں بھسم نہیں ہوئی۔"

"تعویذ گنڈے والے ٹھگ ہوتے ہیں [1]"

اس طرح عصمت نے کمال بے باکی اور جرأت سے چھوٹی بی سے اپنے ان کی رقیب ہونے کا کھُلا اقبال کیا۔ عصمت انتہائی بے باک تھیں۔ وُہ مدِمقابل کے جذبات اور ردّ عمل سے بیگانہ اور بے نیاز اپنی نہ صرف "کہہ" گذرتی تھیں بلکہ "کر" بھی گذرتی تھیں۔ وہ بے عناں ہو جاتیں تو اُنھیں لگام دینا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ـــــ خیر جب عصمت نے سیّد صاحب سے اپنے معاشقے کی کھُلے بندوں توثیق کر دی تو دونوں کے لئے ہی میدان صاف ہو گیا ـــــ اور چھوٹی بی نے تو اُنھیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ "میں تو اُن سے پہلے ہی کہہ چکی ہُوں کہ دُوسری شادی کر لیں، بچہ میرے نصیب میں نہیں" ـــــ گویا ایک طرح سے چھوٹی بی از خود ان دونوں کے راستے سے خاموشی سے ہٹ گئیں۔

(عصمت چھوٹی بی سے کھُل گئیں تو اُنھوں نے اپنے من پسند مَردوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"مجھے ذہین، حاضر جواب، دل چسپ مرد بہت پسند ہیں۔ تیز طرّار مُنہ پھٹ لڑکیوں سے بھی میری بڑی گاڑھی چھنتی ہے۔ مس نلیس (اسکول انسپکٹریس) کے بوائے فرینڈ ہربھگوی سنگھ سے میری جملہ بازی چلتی ہے۔ وہ میری "لیگ پُلنگ" کرتا ہے میں اس کی۔

---

[1] عصمت چغتائی۔ "اُلٹے بانس بریلی۔" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ آجکل نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۸۰، ص ۴۴

مس فلپس قہقہے لگاتی ہے"۔۔۔

"ارے مس فلپس تو اس کے سنگ سوتی ہے"۔

"اُنھ۔ آپ کی بلا سے۔ آپ کے سنگ تو نہیں سوتی۔ اور چھوٹی بی کیا ثبوت ہے۔ جب سید صاحب چلے جاتے تو آپ چھوٹے خاں کے ساتھ ...؟"[1]

گویا جب بھید کھلنے لگے تو کھلتے چلے گئے۔ اس حمام میں بھی ننگے تھے۔ عصمت اور سید صاحب، مس فلپس اور پرتھوی سنگھ چھوٹی بی اور چھوٹے خاں۔ گویا اس چھوٹی سی جنڈلی میں حسن و عشق کے معاملات کا سلسلہ برملا جاری تھا۔)

عصمت اب بلا تکلف سید صاحب کے ہاں آنے جانے لگیں۔ دونوں گھنٹوں بیٹھے گپ شپ اور ہنسی مذاق کرتے اور محبت میں ڈوبے ایک دوسرے کی صحبت سے فیض یاب ہوتے ——— اور چھوٹی بی بڑی خندہ پیشانی اور خوش خلقی سے ان دونوں کی خاطر مدارات کرتیں ——— نہ صرف یہ بلکہ سید صاحب بھی آزادانہ طور پر عصمت کے ہاں جانے لگے۔ وہ اکیلے جاتے تو عصمت کی آپا ناک بھوں چڑھاتیں اور ان کے رویہ میں ناخوشی اور ناگواری کا احساس ہوتا۔ لیکن بیوی کے ساتھ جاتے تو ان کا رویہ بہت نرم اور خوشگوار ہوتا گویا دونوں کی آمد پر انھیں دلی مسرت ہوئی ہو اور وہ ان کی خوب خاطر تواضع کرتیں ——— معلوم ہوتا ہے کہ عصمت کی آپا نے، چھوٹی بی کی طرح، حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ دونوں جانتی تھیں کہ عصمت اور سید صاحب ٹس سے مس ہونے والے نہیں اور مزاحمت بے سود اور بے معنی ہوگی۔

عصمت کا اسکول سے معاہدہ ختم ہونے پر علی گڑھ جانے کا وقت قریب آیا تو بہت پُر تکلف دعوتیں ہوئیں، جن میں سید صاحب، عصمت، چھوٹی بی اور صدیقی صاحب شامل ہوتے۔ ظاہر ہے کہ میزبان سید صاحب رہتے، عصمت مہمانِ خصوصی ہوتیں اور صدیقی صاحب ایک عام مہمان اور چھوٹی بی ایک فرمانبردار، اطاعت شعار، خدمت گذار۔

---

[1] عصمت چغتائی، "اُلٹے بانس بریلی" (مضمون)، کاغذی ہے پیرہن، ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (جنوری ۱۹۸۰ء) ص ۳۴

نوٹ: نیرنگیٔ زمانہ دیکھئے کہ سید صاحب سے معاشقے کے ساتھ ساتھ عصمت کا معاشقہ ظفر قریشی ضیا سے بھی چل رہا تھا جو بطور خاص لکھنؤ سے، جہاں وہ مقیم تھے، نخلِ عشق کی آبیاری کے لئے گاہے گاہے بریلی آتے رہتے تھے۔ عصمت اُن کی آمد کے لئے چشم براہ رہتیں اور وہ آتے تو اسکول کے کام کاج کو بالائے طاق رکھ کر وہ اپنے آپ کو اُن کی صحبت کے لئے وقف کر دیتیں۔ اُن کے معاشقے کی روداد اگلے صفحہ سے شروع ہوتی ہے۔

○ ظفر قریشی ضیاؔ:

عصمت کا ظفر قریشی ضیاؔ سے عشق بڑا ہیجانی اور طوفانی تھا۔ جوانی دیوانی کا عشق اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ساون کی گھٹا کی طرح اُمڈ گھمڈ کر آتا ہے اور جل تھل کر جاتا ہے ـــــ عصمت کی ظفر قریشی سے اوّلیں اُچٹتی سی ملاقات شاہد احمد دہلوی، مدیر ماہنامہ ساقی" دہلی کے ہاں ہُوئی تھی۔ ظفر قریشی ضیاؔ کو معلوم ہوگیا تھا کہ عصمت اس وقت آئی ٹی کالج لکھنؤ میں زیرِ تعلیم ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں انھیں دل دے بیٹھے تھے ـــــ عصمت لکھنؤ سے بی اے کرنے کے بعد اپنے بھائی عظیم بیگ کے پاس جاورہ چلی گئیں اور کوئی سال بھر بعد بریلی چلی آئیں اور مُسلم گرلز ہائی اسکول میں بطور ہیڈ مسٹرس ملازمت اختیار کرلی۔ اب ضیاؔ کی جانب سے خط و کتابت کے سلسلہ کا آغاز ہوا۔ دونوں طرف سے خط و کتابت انگریزی میں ہوتی رہی ضیاؔ کے خط بے حد خوبصورت شعروں سے مرصّع حسن و عشق کے فلسفہ میں شرابور اور خمار آلود ہوتے تھے۔ ایسے خط جو ایک بیقرار عاشق ہی اپنے محبوب کو لکھتا ہے۔ ظاہر ہے عصمت کے خطوط بھی کچھ کم سُلگتے ہوئے نہ ہوتے ہوں گے۔ اُن جیسی جذبات کی ترجمانی کرنے والے آخر کتنے ادیب ہیں۔ بعض اوقات وہ عصمت کو کوئی کتاب یا کسی اچھے سے مضمون کا تراشہ بھیج دیتے تھے۔ وہ خط بڑے مہذب ڈھنگ سے آداب اور اخلاق کو ملحوظ رکھ کر لکھتے تھے۔ ایک بار اُنھوں نے جگر مرادآبادی کی غزلیات کے مجموعہ "شعلۂ طور"، کی جلد بھیجی۔ جب عصمت کی طرف سے خاطر خواہ جواب ملنے لگا تو ظفر کے خطوط ہر روز آنے لگے۔ بعض اوقات دن میں دو دو خط بھی آتے جن میں جگرؔ، مجازؔ کی شاعری پر اظہارِ خیال ہوتا۔ رشید جہاں، جو نظریاتی اعتبار سے عصمت کی "گرو"، تھیں، کی مشہور تصنیف "انگارے" کے بارے میں بھی ذکر رہا۔ اِس طرح طویل اور بے حد جذباتی خط و کتابت کے بعد دونوں کے درمیان ایک ذہنی رشتہ استوار ہوگیا اور جلد ہی دونوں طرف سے چنگاری شعلے میں اور شعلہ الاؤ میں تبدیل ہوچکا تھا لیکن ابھی ملاقات نہیں ہُوئی تھی۔

کچھ دن بعد ضیاؔ نے اُنھیں لکھا کہ وہ دو دن کے لئے کام سے بریلی آرہے ہیں اور اگر عصمت اُنھیں ریلوے اسٹیشن پر مل جائیں تو دونوں لنچ اکٹھے کھائیں گے۔ شناخت کے لئے انھوں نے لکھا کہ وہ سُرمئی رنگ کا سوٹ پہنے، اخبار ہاتھ میں لئے فرسٹ کلاس کے ڈبّہ سے اُتریں گے ـــــ وہ آئے اور اُنھوں نے عصمت کو پلیٹ فارم پر کھڑی منتظر پایا۔ عصمت کو انھیں دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اُن کے "رُوحانی محبوب" ماموں زاد بھائی جگنو کی تصویر تھے۔ وہی قد و قامت، وہی گورا کھلتا ہُوا گندمی رنگ، وہی ناک نقشہ، وہی گھنے گھنگھرالے بال، وہی مچی مچی آنکھیں، وہی کھُلا دہانہ، وہ بالکل جگنو لگ رہے تھے۔ گھنگرالا

دونوں بڑی بے تکلفی اور تپاک سے ملے گویا برسوں کا دوستانہ، یارانہ ہو۔ اور باتیں کرتے

ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ لنچ اُنھوں نے اسٹیشن کے ڈائیننگ روم میں کیا ـــــ باہر نکلے، تانگہ لیا اور گھومتے پھرتے رہے ـــــ پھر ایک لائبریری میں جا بیٹھے۔ دونوں ایک دوسرے کی جانب پورے طور پر کھنچ چکے تھے اور آپس میں گہری دلچسپی سے باتیں کر رہے تھے۔ ضیا بہت پڑھے لکھے تھے اور لکھنؤ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ اُنھیں اُردو ادب سے خاص طور سے اُردو شاعری سے بہت رغبت تھی۔ میر، غالب، سودا، اقبال، جوش، جگر، اختر شیرانی، مجاز کے ہزاروں اشعار اُنھیں ازبر تھے۔ اشعار کے تعلق سے عصمت کا حافظہ کمزور تھا۔ گو مکالمے اُن کے ذہن رسا میں فوراً جاگزیں ہو جاتے تھے۔ ہاں اشعار کے معنی اُنھیں یاد رہ جاتے تھے۔ عصمت، ضیا کو معنی یاد دلاتیں۔

"وہ کیا شعر ہے غالب کا ہوتا ہے تماشہ . . . "

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ضیا فوراً شعر نہیں پوری غزل سُنا دیتے۔

"اور وہ مریم کا بیٹا، کیا ہے وہ . . ." میں نہایت غیر شاعرانہ انداز میں پوچھتی۔

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دَوا کرے کوئی

"اور وہ جنّت سے نکالے جانے پر" مَیں نہایت پھوہڑ پن سے پوچھتی۔

"نکلنا آدم کا خُلد سے سُنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر . . . .

"تیرے کُوچے سے ہم نکلے" مَیں نے اپنی یادداشت پر خود کو شاباشی دی"[1]

اسکول کالج میں کوئی پارٹی بیت بازی میں عصمت کو ہنسی خوشی سے لینے پر راضی نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ان پر آ کر ہمیشہ پارٹی کی ہار ہوتی تھی۔

ضیا نے عصمت سے وہی سوال کیا جو عام طور پر عاشق ابتدائے عشق میں اپنی محبوبہ سے کرتا ہے۔ "آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟" ـــــ چند ہی گھنٹوں کی صحبت میں عصمت کو یُوں لگا کہ وہ ضیا کو برسوں سے جانتی ہیں۔ یہ ایک طرح سے دو رُوحوں کا ملاپ تھا جو جسموں کے اختلاط کو یقینی ہی نہیں بنا دیتا بلکہ اس

---

[1] عصمت چغتائی "تانے، دُھونُون" "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (فروری ۱۹۸۰ء) ص ۱۴

کے تلطّف و تلذّذ کو بھی دوچند کر دیتا ہے ــــــ ضیا عصمت سے دیر تک اُن کے گذشتہ معاشقوں اور جنسیات پر ان کے نظریات کے بارے میں کُرید کُرید کر باتیں کرتے رہے۔ اس سلسلے میں عصمت کے ماموں زاد بھائی جگنو، داؤد بھائی، سیّد صاحب کا ذکر بھی آیا۔ اتفاق سے مؤخر الذکر دونوں اصحاب سے ضیا واقف تھے۔

اِدھر اُدھر گھوم گھام کر دونوں ایک سینما گھر میں داخل ہو گئے، جہاں کوئی انگریزی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ ضیا کا ہاتھ بار بار کُرسی کے ہتھّے پر رکھّے عصمت کے ہاتھ سے چھُو جاتا" اور پردۂ سیمیں پر دُھندسی چھا جاتی"۔ عصمت لکھتی ہیں:

"ضیا کے ہاتھ بہت خوبصورت تھے۔ ملائم لمبی لمبی اُنگلیاں سڈول سڈول، بادامی ناخن، میں نے اتنے خوبصورت ہاتھ صرف ایک انسان کے دیکھے تھے۔ جگنو کے"۔

"تم ڈاکٹر کیوں نہیں بنے"۔ میں نے ضیا سے پُوچھا ــــــ "بس بنتے بنتے رہ گیا۔ شاعری کے چکّر میں سائینس چھوڑ کر آرٹس لے لیا"۔

"ڈاکٹروں کی اُنگلیاں لمبی ہونا چاہئیں۔ آپریشن میں سہولت ہوتی ہے" ــــــ کیا جگنو کی اُنگلیاں لمبی ہیں؟"

"تمھیں کیسے معلوم؟" ہم نہ جانے کیسے ایک ہی دن میں آپ سے تم پر اُتر آئے ہیں۔[1]

عشق قدم بقدم اپنی تکمیل کی طرف فرحاں و شاداں بڑھ رہا تھا۔ دونوں ذہنی طور پر ہی نہیں، بلکہ جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے سے مانوس ہو رہے تھے۔ ضیا بار بار عصمت کے ہاتھ کے لمس سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور عصمت ضیا کے ہاتھوں کی خوبصورتی، لمبی سڈول اُنگلیوں اور بادامی ناخنوں کو دیکھ کر جگنو کی یاد تازہ کر رہی تھیں ــــــ (ضیا جو ذہنی طور پر جگنو کو اپنا رقیب سمجھ بیٹھے تھے دورانِ گفتگو بار بار انھیں کے ذکر کی طرف لوٹ آتے تھے) ــــــ آہستہ آہستہ دونوں ذہنی اور جسمانی طور پر ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ گفتگو میں "آپ" کی "پُر تکلفی" سے گذر کر اب وہ "تم" کی "بے تکلفی" پر اُتر آئے تھے۔ اور یوں دونوں کے درمیان فاصلے تیزی سے گھٹتے جا رہے تھے اور خوبصورتی یہ ہے کہ یہ خوش آئند احساس دو طرفہ تھا۔

جب عصمت نے ضیا کو بتایا کہ جگنو درحقیقت اس کا ماموں زاد بھائی ہے جسے وہ بچپن کی نادانی میں سگا بھائی

---

[1] عصمت چغتائی "تالے" "(مضمون)" کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (فروری ۱۹۸۰ء) ص ۱۵

سمجھتی رہی تھیں، تو ضیا نے بیساختہ کہا:

"بھائی بنانے والی عادت نہایت فرسودہ ہے۔ جو عورتیں مردوں کو بہت بھائی بھائی کہتی ہیں سخت آوارہ ہوتی ہیں۔"

"میں نے تمھیں تو بھائی نہیں کہا۔"

"ذرا بھائی کہہ کے تو دیکھو۔" ضیا نے میرے گلے پر پنجہ جما کر آہستہ سے دبایا۔ پھر ہاتھ سرک سرک کر گال پر آگیا۔

"شی۔" کسی نے ہماری کھسر پھسر سے چڑھ کر کہا۔ اور ہم فرمانبردار بچوں کی طرح فلم دیکھنے لگے، جس کا آگا پیچھا خلط ملط ہو گیا تھا۔[1]

عصمت کے الفاظ "میں نے تو تمھیں بھائی نہیں کہا" بہت پُر معنی ہیں، جن سے ہلکی سی خود سپردگی کی جھلک ملتی ہے۔ وُہ ضیا سے وہی رشتہ قائم کرنے پر آمادہ تھیں جو ضیا اُن سے کرنا چاہتے تھے۔ اور ضیا نے اپنے دلی جذبات کا اظہار اپنا ہاتھ عصمت کے گلے سے گال تک سرکا کر ظاہر کر دیا تھا ــــ اب مطلع صاف تھا۔

رات انھوں نے بریلی کے بہترین ہوٹل میں کھانا کھایا ــــ اور کھانا کھانے کے دوران ضیا نے عصمت کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے مُسکرا کر کہا:

"یہ غلط احساس نہیں کہ میں تمھیں بہت دن سے جانتا ہوں" ــــ "کیسے جانتے ہو؟"

"مجاز نے ذکر کیا تھا تم اس سے ملنے گئی تھیں اور کافی متاثر ہُوئی تھیں ــــ" اوہ، ہاں تین سال ہوئے جب میں علی گڑھ میں تھی توصیفہ کے ساتھ ملی تھی۔"

"بہت پسند ہے مجاز؟" ــــ "بہت۔"

"شادی کا ارادہ ہے؟" ــــ "کیا جسے پسند کیا جائے اُس سے شادی بھی کی جائے؟"[2]

عام طور پر ہر تبدی عاشق اپنے پیروں تلے کی زمین ٹٹولتا رہتا ہے تاکہ محبوب کے تعلق سے اُسے اپنے عشق کے استحکام کے بارے میں اطمینان رہے۔ محبت ایک بڑا ہی POSSESSIVE جذبہ ہے۔

"اس کے علاوہ تمھارے بھائی عظیم بیگ چغتائی کے ذریعے سے بھی" ــــ "ارے آپ اُن سے مِل چکے ہیں۔ کہاں؟ دہلی میں" ــــ ملاقات نہیں ہُوئی۔ دراصل ایسا ہُوا کہ ایک دفعہ یعنی چند مہینے ہُوئے میرے والد نے شادی کے لئے اشتہار

---

[1] [2] عصمت چغتائی "تلے" "مضمون" کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (فروری ۱۹۸۰ء) ص ۱۵

دیا تھا، تو چغتائی صاحب کا بھی خط آیا تھا تم اس وقت ان کے پاس ہی تھیں" ——

"اوہ، تو وُہ جناب تھے۔ ہاں مجھ سے بھی اُنھوں نے کچھ ڈپٹی کلکٹر کا ذکر کیا تھا۔ نام نہیں بتایا تھا"[1]

باتوں باتوں میں رات کے دس بج گئے۔ عصمت چلنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہُوئیں۔ ضیا نے کہا اتنی جلدی بھی کیا ہے ابھی تو شام ہوئی ہے۔ عصمت بولیں کہ زیادہ دیر ہو جائے تو آپا کو ہول سوار ہو جاتے ہیں۔ شہر بھر میں میری ڈھنڈیا پڑ جاتی ہے۔ سیّد صاحب اور منیجر صاحب کے پاس آدمی دوڑاتی ہیں۔ اب تمھارے ساتھ میرے گھومنے پھرنے پر نہ جانے کیا چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں گی۔ میں مسلم گرلز ہائی اسکول کی ہیڈ مسٹرس ہُوں میری نقل و حرکت پر سینکڑوں نگاہیں جمی رہتی ہیں کہ کہیں لغزش ہو تو لوگ میرے پاؤں تلے سے فرش کھینچ لیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا دستور ہے۔ مجھے اپنی ذمہ داری کا پُورا پُورا احساس ہے اور میں کسی کو انگشت نمائی کا موقع دینا نہیں چاہتی —— ضیا اُنھیں گھر تک پہنچانے گئے۔ دونوں باہر پڑی کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آپا کھنکاریں تو عصمت کو پتہ چل گیا کہ اُنھیں اُن کی خبر ہو گئی ہے اور اب وہ اطمینان سے سو جائیں گی —— دونوں رات کے دو بجے تک ایک دُوسرے میں کھوئے رہے۔ آپا کے کمرے کی بجلی جلی تو ضیا جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے "معلوم ہوتا ہے قلعہ میں جگار ہو رہی ہے۔ دو بج رہے ہیں۔ اب چلنا چاہیے کل صبح . . ." —— "تم مت آنا۔ جانتے ہو آس پاس کی کوٹھیوں کی کھڑکیوں کے پردے ہلنے لگتے ہیں"

عصمت کی آپا بچپن میں اُن کی حرکتوں پر اُنھیں پھٹکارا ہی نہیں مارا بھی کرتی تھیں۔ اب مار کا زمانہ تو رفتہ گذشتہ ہو چکا تھا، لیکن پھٹکار سے وُہ اب بھی چوکتیں نہیں تھیں۔ ایک دن اُنھوں نے عصمت کی بے راہ روی دیکھی تو یُوں پھٹکارا:

"تمھاری حرکتوں پر خوُن کھولتا ہے۔ مگر ٹال جاتی ہُوں کہ بڑی اُستانی ہو۔ لڑکیوں کے سامنے بے عزّتی سے رُعب نہ رہے گا۔ مگر اب بھی تم نے جوتیاں کھانے کی باتیں نہیں چھوڑیں"[2]

چلنے سے پیشتر ضیا نے اُنھیں دعوت دی:

"لکھنؤ چلو نا" —— "لکھنؤ کالج چھوڑنے کے بعد لکھنؤ جانا ہی نہ ہو سکا"

"ہاں بس دو دن کے لئے" —— "خیال بُرا نہیں۔ آئی ٹی کالج کی اکثر یاد ستاتی ہے"

"تو پھر طے ہے؟" —— "قطعی"[3]

---

[1] [2] [3] عصمت چغتائی "تابے یہ مضموں"، کاغذی ہے پیرہن"، ماہنامہ آجکل" نئی دہلی۔ (فروری ۱۹۸۰ء) ص ۱۶ — ۱۷

عصمت لکھتی ہیں:

"یہ دو دن ایک کوندے کی طرح لپکے اور بجھ گئے۔ زبانوں پر بھاری بھاری تالے جھولنے لگے۔ گارڈ نے جھنڈی ہلائی۔ ہم چونک کر کھڑے ہو گئے اور دو جسم ایک دھماکے سے ایک ہو گئے۔ میرے اناڑی ناتجربہ کار ہونٹ آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ ایک جھٹکے سے ضیا نے مجھے جلدی سے ٹرین سے اُتار دیا۔ مگر ہمارے، ہاتھ جُڑے رہے۔

...ضیا کا لمبی اُنگلیوں والا ہاتھ دیر تک ہوا میں میرے وجود کو پکارتا رہا۔"[1]

دو دن عصمت اور ضیا ایک دوسرے میں ڈوبے رہے کھوئے رہے اور یہ عرصہ یوں پلک جھپکتے گذر گیا۔ دم رخصت دو جوان جسم بے ساختہ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ عصمت کے "ناتجربہ کار" ہونٹوں نے زندگی کا امرت رس گھونٹ گھونٹ پی لیا اور ان کی ترستی ہوئی رُوح نے سیراب ہو کر آسمانی رفعتوں کو چھو لیا۔ وہ گاڑی سے اُتر گئیں تو بھی دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رہے۔ گویا جُدائی اُنھیں قبول نہ ہو ——— ضیا کا خوبصورت ہاتھ ہی ہوا میں لہراتا ہوا عصمت کے وجود کو نہیں پکار رہا تھا بلکہ عصمت بھی ہمہ تن آرزو بن کر ضیا کو پکارتی معلوم ہوتی ہیں ——— آسُودہ عشق جسم کے رُوئیں رُوئیں میں مسرّت و انبساط کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ اور دل و دماغ کو ایک ایسا راحت افزا سکون بخشتا ہے گویا اُسے کونین کی دولت مل گئی ہو۔ دُنیا جہاں کی نعمتیں میسّر ہو گئی ہوں ——— کامران عشق حاصل حیات فانی ہے۔

ضیا اس کے بعد بھی دو بار بریلی آئے۔ وہ آتے تو عصمت اسکول کے کام کاج کو بالائے طاق رکھ کر تمام دن ان کی صحبت میں گذارتیں اور وہ اگلے روز لکھنؤ واپس لوٹ جاتے۔ ایک دفعہ وہ کار سے بریلی آئے اور عصمت اُن کے ہمراہ سارا دن نہ جانے کہاں کہاں گھومتی رہیں ——— جب تک اُن کا معاشقہ رہا وہ دُنیا ومافیہا سے بیگانہ ایک دوسرے میں ڈوبے رہے۔ ؎ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

(عصمت کا آخری عشق شاہد لطیف سے ہوا اور وہ دونوں ازدواجی طور پر منسلک ہو گئے ——— اس معاشقے کا حال "حیات" کے باب میں "بمبئی" کے تحت تفصیل سے دیا گیا ہے۔)

---

[1] عصمت چغتائی۔ "تانے"۔ (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (فروری ۱۹۸۰ء) ص ۱۸

پردہ

اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پیشتر پردہ کی بابت سعادت حسن منٹو، جن کی عصمت ہم عصر اور مُنہ بولی بہن تھیں، کے خیالات کا مختصر سا اظہار موزوں و مناسب ہوگا ——— پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو مذہب کے نام پر وہاں پردہ لازم قرار دیا گیا کہ یہ شریعت کا تقاضا تھا۔ منٹو پردے کے سخت خلاف تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے سوال کیا کہ اگر پردہ نہ کرنا مذہب کے احکام کی خلاف ورزی ہے تو بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کی ہمشیرہ فاطمہ جناح اور پاکستان کے وزیرِاعظم لیاقت علی خان کی بیگم صاحبہ کیوں کھُلے مُنہ پھرتی ہیں۔ پھر منٹو نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا کہ بڑے آدمیوں کو پردے کی کیا ضرورت ہے، پردہ تو غریب آدمیوں کے لئے ہوتا ہے۔ اُن کی اِس برحق آواز میں تیکھی چبھن تھی ——— منٹو کی رائے تھی کہ پردہ محض عورتوں کے حقوق کو غصب کرنے اور اُنھیں معاشرتی سرگرمیوں سے دُور رکھنے کا ایک بہانہ ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان عورتیں زندگی کے ہر شعبے میں مَردوں کے قدم سے قدم مِلا کر چلیں اور میدانِ جنگ میں بھی اُن کے دوش بدوش لڑیں۔ لٰہذا پردے کی پابندی بیکار اور بے معنی چیز ہے۔" پردہ ہوتا ہے جہالت کا، غفلت کا، راز کا اور گمنامی کا۔ عورت نہ جہالت ہے نہ غفلت، نہ راز اور گمنامی"۔ پھر پردے کے کیا معنی؟ منٹو کی بیوی صفیہ پردہ نہیں کرتی تھیں اور منٹو کے سب محرم اور نامحرم، ہندو اور مسلم احباب سے کھُلے مُنہ ملتی تھیں اور اُن سے بے تکلّف بات چیت کرتی تھیں ——— منٹو کو پردے میں قدامت پسندی کی بُو آتی تھی اور وُہ اُسے وقت کے تقاضوں کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ خود ترقی پسند، روشن دماغ اور آزاد خیال تھے۔ اس لئے پردے کو عورتوں کے حقوق کے استحصال کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ منٹو مذہب کے اُن احکام کو ماننے سے قاصر تھے جو اُن کے فہم و ادراک کی کسوٹی پر پُورے نہیں اُترتے تھے۔

یہاں یہ لکھنا بجا ہوگا کہ پردے کے تعلق سے منٹو اور عصمت کے خیالات میں حیرت انگیز مطابقت اور یگانگت ہے۔ عصمت بھی پردے کو قدامت پسندی کی علامت اور عورتوں کے استحصال اور اُنھیں گھر کی

چار دیواری میں محبوس رکھنے کا ذریعہ مانتی تھیں۔ اس لئے وہ پردے کے سخت خلاف تھیں اور اُن پر جب پردہ ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو ان کی سرکش اور باغیانہ فطرت بروئے کار آگئی اور وہ اپنے حق کے تحفظ کے لئے مخالفوں سے بے اختیار بھڑ گئیں۔

نیھے بھائی (عظیم بیگ سے چھوٹے بھائی) کی شادی خانہ آبادی تھی۔ سب اعزا و اقارب جمع تھے۔ بڑی بوڑھیاں نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو پند و نصائح سے نواز رہی تھیں۔ وُہ بار بار اُنھیں دوپٹہ سے سر ڈھانپنے اور شریف زادیوں کی طرح ٹھیک سے بیٹھنے کو کہتیں اور جب ان کی باتوں پر کوئی کان نہ دھرتا تو برہم ہو کر اُنھیں جلی کٹی بھی سُنانے لگتیں۔ عصمت کی بڑی بہنیں جو متحمل اور بُردبار تھیں، مصلحت کوشی سے طرح دے جاتیں اور احتجاج میں زیرِ لب بڑ بڑا کر رہ جاتیں۔ عصمت ان کے برعکس تیز طرّار اور برہنہ گُفتار تھیں۔ وہ بلا لحاظِ عمر بغیر کسی لاگ لپیٹ کے پھٹاک سے جواب دیتیں۔ اُن کی درشت طبع والدہ سُنتیں تو جل بھُن کر انھیں مارنے کی دھمکی دیتیں اور کبھی کبھی غم و غصّے سے مغلوب ہو کر جُوتی دے مارنے سے بھی گریز نہ کرتیں۔ عصمت ہمیشہ حفظِ ماتقدّم کے طور پر ان سے دُور بیٹھتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کا وار اکثر خالی جاتا اور جُوتی کسی بے خبر معصُوم کے جا لگتی ـــــ عصمت کو یہ دیکھ کر بہت مُسّرت ہوتی۔ چنانچہ وہ استہزائیہ انداز میں لکھتی ہیں کہ "آماں کا نشانہ بے حد خـــراب تھا۔"

امّاں کو بڑی بوڑھیوں کا احترام بہت ملحُوظ تھا۔ اُنھیں عصمت کی زبان درازی اور برہنہ گفتاری کی وجہ سے بڑی ذلّت اُٹھانی پڑتی تھی۔ وہ اُن کے ابّا میاں سے شکایت کرتیں تو وُہ مزا لیتے ہوئے اُنھیں یوُں اُوپری طور پر ڈانٹ ڈپٹ کرتے گویا در پردہ شہ دے رہے ہوں۔ یہ اُن کا مخصُوص انداز تھا تاکہ ان کی اہلیہ کی تشفّی بھی ہو جائے اور بچّوں پر ہاتھ بھی نہ اُٹھانا پڑے ـــــ امّاں اس حقیقت سے بے بہرہ نہ تھیں۔ وہ اُن سے کہتیں کہ "تمھاری شہ ہی نے اُنھیں شترِ بے مہار بنا دیا ہے"۔ ابّا میاں اُنھیں طفل تسلّی دیتے ہوئے کہتے: "تم کہو تو ہم ان کی مرمّت کر دیں"۔ اس پر آماں سہم جاتیں کہ وہ جانتی تھیں کہ اگر وُہ فی الواقع مارنے پر اُتر آئے تو دیکھتے ہی دیکھتے چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دیں گے۔ اُن کے بھاری کسرتی ہاتھ لوہار کے ہتھوڑے کی طرح پڑتے تھے۔ امّاں اُن کی مار کے تصوّر سے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتیں۔ اور شفقتِ مادری سے مجبُور ہو کر عصمت کی حفاظت پر اُتر آتیں۔

برات کو بذریعہ ریل جودھپور جانا تھا۔ براتی تھرڈ کلاس کے ڈبّے میں سوار تھے۔ عصمت کے دل میں کُھد بد ہو رہی تھی کہ انھیں پہلی بار بُرقعہ پہننا تھا۔ اس ذلّت آمیز احساس سے بچنے کے لئے کئی بار اُن کے جی میں آئی کہ گاڑی کے نیچے کٹ مریں لیکن کوئی اَنجانی طاقت اُنھیں یہ قدم اُٹھانے سے باز رکھ رہی

تھی ـــ عصمت پردے کے سخت خلاف تھیں اور پھر اُن دنوں اُن کے گھر میں ان کے بڑے بھائی معروف طنز و مزاح
نگار عظیم بیگ نے بھی پردے کے خلاف عَلم بلند کر رکھا تھا۔ اُنھوں نے "قرآن اور پردہ" اور "حدیث و پردہ" پر
مضامین لکھ کر قدامت پسند حلقوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ اور پردے کی مخالفت اور موافقت میں بڑی گرمجوشی
سے بحث مباحثے ہو رہے تھے ـــ ملکی سطح پر بھی بمبئی میں مُسلم اکابرین جو دین و ملّت کے پاسبان اور نگہبان
تھے، کا اجلاس ہو رہا تھا، جس میں خواتین کی شمولیت قطعاً ممنوع تھی۔ بایں ہمہ پردے کے خلاف جہاد کا
اعلان کرنے والوں میں بیگم عطیہ فیضی، زہرہ فیضی، بیگم ہمایوں مرزا اور کئی دیگر حوصلہ مند خواتین نے کانفرنس پر
ہلّہ بول کر ایک طوفان سا کھڑا کر دیا۔ یہ سب خواتین اعلیٰ تعلیم یافتہ بارسُوخ، روشن دماغ معاشرے کی فلاح و بہبود
کی خواہاں اور اُونچے خاندانوں سے تعلق تھیں۔ اور پھر وہ بُرقعے پہنے ہوئے تھیں۔ اس پر بھی
کانفرنس کے اربابِ بست وکشاد نے سخت ندامت محسُوس کی اور غم و غصّے سے بلبلا اُٹھے۔ اگر وہ معمولی
گھرانوں سے ہوتیں تو یقیناً ان کی شامت آجاتی۔ عصمت کے الفاظ میں اُن مُٹھی بھر خواتین کے خاموش
احتجاج نے "نہ جانے کتنے کچے ذہنوں سے پردے کا تصوّر جلا کر راکھ کر دیا ہوگا" ـــ مختصراً ان دنوں
مُلکی سطح پر بھی پردے کے خلاف آواز بلند ہونی شروع ہوگئی تھی۔ آواز بلند کرنے والی جدید خیالات کی
حامل، بدلتے وقت کی نبض پہچاننے والی، مُسلم عورتوں کے حقُوق کی محافظ برگزیدہ خواتین تھیں اور ان
کے دوش بدوش کئی بیدار مغز، قدامت پسندی اور فرسُودہ رُسوم وقیوُد کے دُشمن مرد تھے۔ پردے کے
خلاف اُن کا مجاہدانہ جوش و خروش مدلّل اور عقلی تھا جس کو جھٹلانا چنداں آسان نہ تھا ـــ عظیم بیگ
اُن میں سے ایک تھے۔

عظیم بیگ نے بارہا چاہا کہ اُن کی اہلیہ پردہ ترک کردے لیکن وہ جب بھی اس بارے میں اپنے خیالات
کا برملا اظہار کرتے، گھر کے سب افراد بنجے جھاڑ کر اُن کے پیچھے پڑ جاتے۔ ایسے میں عظیم بیگ خاموش
رہنے کو ہی قرینِ مصلحت سمجھتے ـــ لیکن ایک لاوہ تھا جو اُن کے اندر ہی اندر اُبل رہا تھا۔ ہر نیا
خیال یونہی نمُو پاتا ہے۔ زمین نم ہو تو پہلے بیج اپنا مقام بناتا ہے، پھر کونپل پھُوٹتی ہے، پودا سر
اُٹھاتا ہے اور وقت پا کر وہ تناور شجر کی صُورت اختیار کر لیتا ہے اور فضا نعرہ ہائے تحسین سے گونجنے
لگتی ہے ـــ نت نئے خیالات کی نمُود و نمو نسلِ انسانی کا طرّۂ امتیاز ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو آج دُنیا
اپنے موجُودہ منصب و مقام کو نہ پہنچتی ـــ ہر نیا ترقّی پسند خیال انسان کے روشن مُستقبل کا ضامن
اور امین ہوتا ہے۔

عظیم بیگ خرابئ صحت (وہ دق اور دمہ کے مریض تھے) کے باوجُود مستحکم قوتِ ارادی کے مالک

تھے اور اپنے مَوقف کی راستی پر کامل یقین رکھتے تھے۔ اُنھوں نے گھر والوں کی مخالفت کو نظرانداز کردیا۔ بھرے پُرے گھر میں صرف عصمت ہی اُن کی ہمنوا تھیں ـــــ اور ایک دن اپنے نظریہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اُنھوں نے اپنے دوست خواجہ محمّد اسحاق کو اپنے کمرے میں اپنی بیوی کے سامنے لا کھڑا کیا ـــــ "بھابی جان آداب" محمّد اسحاق نے شرماتے ہوئے، نیچی نظر کیے دھیمی آواز سے کہا۔ اُن کی بیوی پر گویا بجلی ٹوٹ پڑی۔ وہ وحشت زدہ، چیختی چلّاتی گھر کے اندر دوڑی اور امّاں سے لپٹ کر زار زار رونے لگی۔ چشم زدن میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ جیسے کوئی اَن ہونی، بعید از قیاس بات ہوگئی ہو۔ جیسے گھر کی تقدیس پر حرف آگیا ہو۔ امّاں کے نزدیک یہ ایک ناقابلِ معافی جُرم تھا جس سے چشم پوشی ممکن نہ تھی۔ اُن کا مُطالبہ تھا کہ راہ گم گشتہ، آوارہ مزاج عظیم بیگ سے سختی سے پیش آیا جائے تاکہ اوروں کو عبرت ہو۔ ورنہ وُہ کھانا پینا بند کردیں گی۔ معاملہ حسبِ دستور ابّا حُضور کے پاس پیش ہُوا۔

"کیوں بھئی کیا قصّہ ہے؟" ابّا نے عظیم بیگ کی طرف نظر ڈالے بغیر پُوچھا ـــــ "کچھ بھی نہیں سرکار" عظیم کھانستے ہوئے بولے۔ گذشتہ رات انھیں دمہ کا دورہ پڑ چکا تھا۔

"تم نے پھر سوئیٹر نہیں پہنا بے وقوف" ـــــ "سرکار ابھی اُتارا ہے بہت میلا ہوگیا تھا"

"لو دیکھ لو۔ لاڈلے کو پھر سر چڑھا رہے ہیں" ـــــ ابّا خاموش اخبار پڑھتے رہے۔

"چوُلھے میں ڈالو مُوئے اخبار کو" امّاں نے اخبار ہاتھ مار کر گرا دیا۔

"اُفوہ، بھئی بتاؤ نا یہ کیا بیہودگی مچا رہے ہو تم؟" ـــــ "کچھ بھی نہیں سرکار"

"کچھ بھی نہیں کے بچّے" ـــــ "اماں میں کچھ بھی نہیں کا بچّہ نہیں۔ آپ دونوں..."

"دیکھ رہے ہو" امّاں روہانسی ہوگئیں "اس سے پُوچھو دُلہن کو اسحاق کے سامنے کیوں کیا" ـــــ "امّاں آپ بھی تو اسحاق کے سامنے آتی ہیں"

"اے لو اور سُنو۔ اے وہ میرے سامنے کا بچّہ ہے، مگر دُلہن..." ـــــ "وہ میرے بھائی کی طرح ہے۔ آپ کی دُلہن کا دیور ہے"

"بس بک بک نہ کر۔ میں کہتی ہوں کچھ کہتے کیوں نہیں؟" امّاں پھر ابّا پر حملہ آور ہُوئیں ـــــ "کیوں بھئی تم نے پردہ کیوں تڑوایا"

"کس کا؟" ـــــ "دُلہن کا"

"دُلہن میری بیوی ہے اور مجھے حق حاصل ہے۔ چاہے پردہ رکھواؤں یا تڑواؤں" ـــــ "ہمارے گھر میں یہ نہیں ہوگا۔ سمجھے؟" امّاں براہِ راست لگام سنبھال کر میدان میں آگئیں۔ ابّا نے اطمینان کا سانس لیا۔

"تو میں کل ہی اپنے ایک دوست کے ہاں منتقل ہو جاؤں گا۔ ایک کمرہ خالی ہے اُن کے
پاس۔ ہم میاں بیوی اور دونوں بچے"۔۔۔۔ "نزہت نہیں جائے گی" امّاں نے
اپنی پوتی نزہت کو ذراسی بھی تب سے پالا تھا۔۔۔۔
"میں جاؤں گا تو بچے بھی جائیں گے"۔۔۔۔ "ارے جام گھلے۔ بڑا آیا بچوں کا سگا۔
پالا ہم نے اور حق تو جتانے بیٹھ گیا۔۔۔"

عظیم بیگ کی بیوی پورے دنوں سے تھیں۔ ایسی حالت میں الگ مکان میں کیسے گذر ہوگی۔ پھر عظیم بیگ
ایل ایل بی کر رہے تھے اور ساتھ ہی تالوں کے کارخانہ میں پینتالیس روپیہ ماہوار پر کلرکی بھی کر رہے تھے۔
اور پھر وہ نامراد بیماری کا شکار بھی تھے۔ یہ سوچ کر امّاں رونے لگیں۔ ابّا بھی مضطرب ہو گئے۔
"نہیں دلہن کا پردہ نہیں ٹوٹے گا۔ ہم اسے منع کر دیں گے کہ وہ تمہارے ساتھ نہ رہے۔
اُسے الگ کمرہ دے دیا جائے گا"۔۔۔۔ "اگر وہ میرا حکم نہ مانے گی تو میں اُسے طلاق
دے دُوں گا"
"کیا بک رہے ہو گدھے" ابّا غرّائے ۔۔۔۔ "تو میں کل بچوں کو لے کر۔۔"
"تو نکل جا یہاں سے۔ دلہن اور بچے نہیں جائیں گے" امّاں نے فیصلہ کیا۔۔۔۔
"بس کوئی نہیں جائے گا۔ کل ہی دمہ کا دورہ پڑا۔ اور قمیض پہنے گھوم رہا ہے"
امّاں اپنی ہار پر بھناتی ایک دم اُٹھ کر دندناتی چل دیں[1]"

ہوتے ہوتے یہ خبر عظیم بیگ کے سُسرال پہنچی تو اُن کے برادرانِ نسبتی کی غیرت اور حمیت نے جوش مارا اور
اُنھوں نے اعلان کیا کہ "اگر ہماری بہن بے پردہ کی گئی اور اُسے سر بازار نچایا تو ہم بہن اور بہنوئی کی گردنیں اُڑا
دیں گے"۔۔۔۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو عظیم بیگ کا مجاہدانہ جوش و خروش بظاہر ماند پڑ گیا اور اُنھیں
طوعاً و کرہاً حالات سے مصالحت کرتے ہی بنی۔ گو نظریاتی اعتبار سے اُن کا استحکام اور استقلال جُوں کا توں
برقرار رہا ۔۔۔۔ عصمت اس تمام واقعہ پر نگاہ رکھے ہوئے تھیں اور آنے والے واقعہ کے پیش نظر اپنے
آپ کو تول رہی تھیں۔ قوّتِ ارادی اور اپنے موقف کی راستی اور سچائی کے اعتبار سے وہ کسی طرح بھی عظیم بیگ سے
کم نہ تھیں۔ بلکہ عظیم بیگ کے امّاں ابّا کے سامنے کھُل کر آجانے نے اُنھیں مزید تقویت بہم پہنچائی تھی اور اُن کی
حوصلہ افزائی کی تھی۔

سسرال کی سسرال

---

[1] عصمت چغتائی "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (اپریل ۱۹۷۹ء) ص ۳۰-۳۱

یہ واقعہ اتنی طوالت سے بیان کرنے کی غرض و غایت یہ ہے کہ یہ بات روشن ہو جائے کہ عظیم بیگ کی تحریروں ان کے گھر کی فضا اور مُلک میں پردے کے خلاف گاہے گاہے اُٹھتی آوازوں نے عصمت کی باغیانہ اور سرکش طبع کو پردہ کے خلاف ڈٹے جانے پر اُکسایا ــــــ عظیم بیگ نے جب عصمت کو گاڑی کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے غصہ اور لاچاری سے مضطرب دیکھا تو وہ فوراً بھانپ گئے کہ معاملہ بُرقعے سے متعلق ہے۔ کیونکہ سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر جب عصمت نے بُرقعہ پہنا تھا تو عظیم بیگ کے سوا اُن کے تمام بھائیوں نے استہزائیہ انداز میں بے تحاشا قہقہے لگائے تھے۔ اور وُہ اُن سے بے تحاشا ٹکرا گئی تھیں۔ اماں نے بیٹوں سے باز پُرس کرنے کی بجائے اُلٹا عصمت کو ایک دھول جڑ دی تھی۔ اس پر آزردہ خاطر ہو کر عصمت لکھتی ہیں:

"بڑی منھ چھٹ تھیں میری اماں"[1]

عظیم بیگ نے کھڑکی کے قریب جا کر عصمت سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا اور اُنھوں نے معاملہ فہمی کے انداز میں سر ہلا دیا ــــــ جودھپور کا اسٹیشن نزدیک آیا تو نوکروں کو بُلا کر بستر اکٹھے کر دیئے گئے اور اُن کے گرد رسّی کے مضبوط جال باندھ دیئے گئے تاکہ انھیں سنبھالنے میں آسانی رہے اور قلیوں کو مزدوری بھی کم دینی پڑے ــــــ اسٹیشن آیا تو سب خواتین بُرقعے پہننے لگیں۔ عصمت نے دیکھا کہ اُن کے بُرقعے کی "کیپ" غائب ہے۔ صرف نیچے کا کوٹ موجود ہے جو اُنھوں نے نہایت "فرمانبرداری" سے پہن لیا اور تیزی سے "کیپ" کی تلاش شروع کر دی۔ جب نہ ملی تو دُوسرے بھی اُن کی مدد کو آ گئے ــــــ عصمت نے آہستہ سے کہا کہ شاید وُہ دُوسرے بستر میں بھول سے بندھ گئی ہو گی۔ وُہ دل ہی دل میں جانتی تھیں کہ کوئی بڑے بستر کو کھولنے اور پھر سے باندھنے کی زحمت نہیں اُٹھائے گا۔ پھر اُن کے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ کوئی اس جھنجھٹ میں پڑتا۔ سب بھائی غم و غصّے سے مغلوب ہو کر بیک آواز پکار اُٹھے "کمبخت کمینی تُو نے جان بوجھ کر (کیپ کو) اس میں ٹھونسا ہو گا۔" اُن پر چاروں طرف سے دھموکوں کی بارش ہونے لگی۔ بقول عصمت "مَیں نے وہ گھونسے لڈّوؤں کی طرح نگل لئے . . . مجھے ایک چادر اوڑھا دی گئی اور مَیں ایک جانباز فاتح کی طرح پلیٹ فارم پر اُتر گئی"[2]

عظیم بیگ نے دُور سے اُنھیں دیکھا تو وہ ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ پھر اُن کی دائمی کھانسی نے ان کی ہنسی کا ساتھ دیا اور دونوں گُھل مل گئیں۔ عصمت نے اُنھیں یُوں ہنستے دیکھا تو وہ بھی بیساختہ ہنسنے لگیں۔ دونوں ایک دُوسرے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور ہنسے جا رہے تھے ــــــ نظر شناس تاڑ گئے کہ یہ

[1-2] عصمت چغتائی "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل"، نئی دہلی (اپریل ۱۹۷۹ء) ص ۳۱

دونوں کی سازش کا نتیجہ ہے اور اس کے پیچھے عظیم بیگ کا شیطانی دماغ کام کر رہا ہے۔ ایک بار پھر عصمت پر گھونسوں کی دُھواں دار بارش ہونے لگی اور اسے بُرا بھلا کہا جانے لگا۔ عصمت نے یہ سب کچھ خوشی خوشی شیرِ مادر سمجھ کر پی لیا ـــــ وُہ باطن میں فرطِ مسرت و انبساط سے پھولی نہیں سمارہی تھیں۔ آج انھوں نے کمال ہمّت اور حوصلے سے قدامت پسندی کے حصار کو مسمار کر دیا تھا۔ فرسودہ رسُوم و قیوُد کو روند ڈالا تھا۔ آج اُن کے حریف بھائی جنھوں نے اُن کی تحقیر و تذلیل میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اُن کے سامنے چاروں شانے چت پڑے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک فاتح تھیں۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

"فتح کا نشہ جس نے چکھا ہے وہی وہ لمحے جی سکتا ہے جو میں اُس دِن پلیٹ فارم پر کھُلے مُنہ جی رہی تھی۔"[1]

ایک بار ابّا نے عصمت سے پُوچھا۔ "تم اسکول میں سر ڈھک کر رکھتی ہو؟" عصمت نے جواب دیا۔ "نہیں، ڈھکے سر میں مَیں بڑی بیوقوف لگتی ہوں۔" ابّا "ہُوں" کر کے رہ گئے۔[2]

جودھپور میں، جہاں عصمت نے اسکول میں بطور ہیڈ مسٹریس ملازمت اختیار کر لی تھی، ہندو عورتیں چادر اوڑھ کر گھر سے نکلتی تھیں اور مسلمان عورتیں بُرقعہ اوڑھ کر۔ عصمت بُرقعہ کی بجائے چادر ہی اوڑھ کر اسکول جاتی تھیں۔ ایک دن اُن کے ماموں نے انھیں چادر اوڑھے دیکھا تو کہا۔ "بُرقعہ اوڑھ کر جاؤ۔" عصمت نے کہا۔ "مذاق کر رہے ہیں۔" اور وہ چادر اُتار پھینک دندناتی ہوئی یہ کہہ کر باہر چلی گئیں کہ "پھر بُرقعہ پہننے کو کہا تو استعفیٰ دے دُوں گی۔" عصمت کی ضد سے سبھی واقف تھے۔ کوئی کچھ نہ بولا۔[3]

ایسے ہی عزم کے لوگ حالات کا رُخ موڑ دیتے ہیں!

بعد ازاں عصمت نے تمام عمر بُرقعہ نہیں پہنا۔ بڑی بڑی تقریبوں میں بھی وہ سفید ریش بزرگوں اور محرموں اور نامحرموں کے سامنے بے تکلف چلی جاتیں۔ اُن سے سیکڑوں ہزاروں خواتین نے جو پردے میں محصُور گھُٹی گھُٹی بجھی بجھی زندگی جی رہی تھیں، پر یرنالی ہوگی اور بُرقعے کو طاق میں رکھ راحت کا سانس لیا ہوگا ـــ TREND SETTER ہزاروں لاکھوں میں ایک آدھ ہی ہوتا ہے۔ اور وُہ خال خال ہی معرضِ وجُود میں آتا ہے ـــــ دھیان رہے کہ جب عصمت اپنی مُرشد ڈاکٹر رشید جہاں کو اوروں سے الگ تھلگ باب ہیئر کٹ کے ساتھ بے آستینوں کی قمیض شلوار پہنے کھُلے مُنہ دیکھتیں تو فرطِ مسرت سے

---

[1] [2] عصمت چغتائی، "میری آپ بیتی"، مجموعہ "آدھی عورت آدھا خواب"۔ بیسویں صدی پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، نئی دہلی، ص ۱۹-۲۱

[3] عصمت چغتائی، "کاغذی ہے پیرہن"، ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی (اپریل ۱۹۷۹ء) ص ۳۱

کھل اُٹھتیں ــــــ فرسودہ اور بوسیدہ رسُوم و قیود کو بیک جنبشِ سر جھٹک دینے کے لئے دل گُردہ چاہیئے۔ ہمّت و حوصلہ چاہیئے۔ جرأتِ رندانہ چاہیئے۔ اپنے موّقف پر ایمانِ محکم چاہیئے۔ عصمت میں یہ خصائص بدرجہ اتم موجُود تھے۔ وُہ پامال راہوں سے ہٹ کر خود اپنا راستہ تراشنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ وہ عورتوں میں مرد تھیں۔ جو کچھ ہو اپنی ہی ذات سے ہو۔ یہ اُن کا مسلک تھا۔ یہی انفرادیت اُن کا طرّۂ امتیاز تھی۔ ــــــ اُن کی شخصیت اور فن دونوں اِس امر کے شاہد ہیں۔

مذہب

عصمت مذہبی طور پر مسلمان تھیں۔ مذہب کے انتخاب میں عام طور پر ہماری رضا ورغبت کو دخل نہیں ہوتا۔ ہمارا جو بھی مذہب ہے وہ ہمیں اپنے والدین سے ورثہ میں ملتا ہے۔ سماج میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے موروثی مذہب کے احکام آنکھیں بند کر کے بے چون وچرا قبول کر لیتے ہیں اور مذہب ان کی اخلاقی اور رُوحانی اقدار کا سرچشمہ اور نجی اور سماجی زندگی کی اساس بن جاتا ہے۔

ایک باشعور، دانشمند، مذہب سے دل چسپی رکھنے والا انسان اپنے مذہبی عقیدوں اور رُسوم وقیود کو جانچتا، پرکھتا اور تولتا رہتا ہے اور دُوسرے مذاہب کے مطالعہ سے اس میں اپنے مذہب کا محاسبہ کرنے اور دُوسرے مذاہب سے موازنہ کرنے کی استعداد اور شعور پیدا ہوتا ہے۔ کئی عظیم، روشن دماغ، عالم فاضل ہستیوں نے اپنے تجربات، مشاہدات اور مطالعات کی بنا پر اپنے ہی مذہبی عقائد پر سوالیہ نشان لگایا۔ ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیدکر جو ایک عالمِ متبحر اور دُستورِ ہند کے خالق تھے، اُنھوں نے ہندو دھرم میں دقیانوسیت اور ایک مخصُوص طبقے کے استحصال کو اتنی شدّت سے محسوس کیا کہ وہ ہندو دھرم ہی سے بدظن ہو گئے اور اُنھوں نے مہاتما گاندھی کی مزاحمت کے باوجود بدھ دھرم اختیار کر لیا اور اُن کے ہزاروں لاکھوں پیرو بھی اُن کے نقشِ قدم پر چل نکلے —— ہندو دھرم کے شہرۂ آفاق مفسّر اور مبلّغ سوامی وویکانند نے بھی مذہبِ اسلام کے کچھ پہلوؤں کی دل کھول کر تعریف کی اور اپنے ہم مذہبوں کو انھیں اپنانے کی تلقین کی —— ہمارے ہزاروں ترقّی پسند ادیب، شاعر اور دانشور، بلا لحاظ مذہب و ملّت، اپنے آبائی دھرم سے بیگانہ، اشتراکی ہو گئے۔ اگر ان کا مذہب سے کوئی رشتہ رہ بھی گیا تو وہ اتنا مبہم تھا کہ اس میں مذہب کے تئیں عقیدت اور احترام کا جذبہ مفقود تھا۔ —— ہزاروں مسلمان دانشور ایسے ہیں جو مذہبی سطح پر تو اپنے معاشرے کے تہوار، عید، بقرعید، شب برات وغیرہ مناتے ہیں لیکن وہ نماز وروزے کے پابند نہیں۔ یہاں تک کہ بعض تو خُدا کے وُجود سے بھی منکر ہیں بہت سے مسلمانوں کو، جن میں مسلم خواتین بھی شامل ہیں، ہندو دھرم کی بعض رُسومات بہت اچھی لگتی ہیں۔ مثال کے

طور پر مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کو بیسیوں مسلمان لڑکیاں جو ان کے فن کی پرستار تھیں، ہندوستان کے مختلف حصّوں سے ہر سال راکھی بھیجا کرتی تھیں اور مقامی لڑکیاں خود آکر راکھی باندھتی تھیں ـــــــ ایسے ہی جیسے ہزاروں ہندؤوں کو مسلم روضوں اور زیارت گاہوں سے عقیدت ہے۔ وُہ وہاں سجدہ ریز بھی ہوتے ہیں، عقیدت کے پھول بھی چڑھاتے ہیں، منّتیں بھی مانتے ہیں اور بایں ہمہ وُہ باعقیدہ ہندو بھی ہیں ـــــــ یہ احساس ہمہ گیر ہے کہ مذاہب خالقِ دو جہاں کو پانے کے مختلف راستے ہیں اور اُن کے اساسی عقائد میں مطابقت اور موافقت پائی جاتی ہے کہ وُہ تمام امن، صلح، آشتی، انسان دوستی اور باہمی بھائی چارے کا درس دیتے ہیں ـــــــ بایں ہمہ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ میں مذہب کے نام پر جو خوں خرابہ اور تباہی و بربادی ہوئی اُس کی مثال نہیں ملتی۔ کیونکہ مذہب بنیادی طور پر بے لچک ہوتا ہے، شدّت سے اپنے عقائد پر پابند ہونے کی تلقین کرتا ہے اور بعض حالات میں اتنی ہی شدّت اور سختی سے دُوسرے مذاہب کے عقائد کو بے معنی اور بے مقصد سمجھ کر ان کی تحقیر و تذلیل کو کارِ ثواب گردانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مذہب تنگ نظری اور تعصّب کو جنم دیتا ہے۔ یہی چیز ہے جو مذاہب کے درمیان بنائے مخاصمت ہے اور خون ریزی کو دعوت دیتی ہے۔ ورنہ مندروں، مسجدوں، کلیساؤں کو منہدم کرنے کا کیا جواز ہے؟ ہزاروں لاکھوں غیر مذاہب سے وابستہ لوگوں کو تہہ تیغ کرنے کا کیا سبب ہے؟ عیسائی ممالک کا مسلم ممالک کے خلاف صف آرا ہونے کی کیا وجہ ہے؟ ـــــــ مسلم اور غیر مسلم ممالک کے بلاک بنانے اور جنگی تیاریاں کرنے کی تہہ میں کیا منطق کارفرما ہے؟ ـــــــ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے جس پر بحث لاحاصل ہے کہ وہ بے نتیجہ رہے گی۔ یہ سوال ہمیشہ جواب طلب رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا کہ جہاں تک مذہبی عقائد کا تعلق ہے، وہ عقلی اور منطقی نہیں ہوتے۔ وہ تحقیق و تفتیش پر بھی مبنی نہیں ہوتے۔ اُن کا کوئی سائنسی جواز بھی نہیں ہوتا۔ وہ محض تقلیدی ہوتے ہیں۔ کورانہ اعتقاد ہی ان کی جڑ بنیاد ہوتا ہے۔ بس اُن پر ایک عام آدمی کو بے چون وچراں ایمان لانا ہی پڑتا ہے کہ اس سے انحراف کو شرک اور الحاد کا نام دیا جاتا ہے۔

یہاں ان اشخاص اور عناصر کی نشاندہی کرنا مقصُود ہے جنھوں نے مذہب کے تعلق سے عصمت کے قلب و ذہن کو متاثر کیا اور انھیں ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔

○ والد :

جیسا کہ اس سے پیشتر "آبامیاں" کے تحت لکھا گیا ہے، عصمت کے والد دہریے تھے، خدائی ہستی سے منکر۔ بایں ہمہ وُہ مسلم علما سے فقہ و حدیث پر بحث مباحثہ کیا کرتے تھے غرض یہ تھی کہ وُہ مذہب کے کیف و کم سے آگاہ ہوں۔ مذہب پر ایمان نہ رکھتے ہوئے بھی مذہب کے سب پہلوؤں کو گہرائی میں جا کر جاننے، پہچاننے کا تجسس اُن میں

ہمیشہ برقرار رہا ــــــ وہ ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے اور اس کا واضح ثبوت انھوں نے محرّم کے موقع پر کانپور میں شرپسندوں کی کوششوں کو ناکام بنا کر دیا۔ ان کے دوست احباب کے وسیع حلقے میں کانپور کے کئی باثروت، بارسوخ ہندو شامل تھے، جن کے ساتھ ان کے گھریلو مراسم تھے۔ گھروں میں آنا جانا تھا۔ ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے، دعوتیں بھی ہوتی تھیں۔ بڑے خوشگوار ماحول میں ہندو مسلم بھائی چارے کا ذکر بھی ہوتا تھا اور انگریزی حکومت کی نکتہ چینی بھی ہوتی تھی ــــــ انھوں نے کبھی اپنی بیوی کو ہندو دھرم کی طرف ان کی رغبت دیکھ کر روکا ٹوکا نہیں تھا۔ بلکہ ایک طرح سے خاموش تماشائی بنے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ کہنے کا حاصل یہ کہ وہ فرقہ وارانہ تنگ نظری اور تعصب سے منزّہ اور مبرّہ تھے۔ ان کا قول تھا کہ ہر انسان اپنے نیک و بد اعمال کی سزا و جزا ضرور پائے گا۔ گویا دہریے ہونے کے باوصف وہ اخلاقی و روحانی اقدار کے حامل تھے اور عامل بھی۔ گویا وہ مذہب سے بے تعلق ایک کشادہ دل، بے عیب، بے ضرر انسان تھے ــــــ عصمت نے لکھا ہے کہ خدا اور رسُول کے بعد وہ ان کے لئے سب سے قابلِ احترام ہستی تھے۔ وہ ان کے بچپن کے ہیرو تھے اور عصمت ان سے برابر برابر ناصل کرتی تھیں ــــــ ایسے میں عصمت کا، زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی سہی، اُن کے رنگ میں رنگے جانا عین فطری بات تھی۔

○ والدہ:

عصمت کی والدہ کا ہندو دھرم کی طرف بڑا واضح جھکاؤ رہا۔ پنڈت جی کو اپنی ہندو سہیلیوں کی طرح وہ ستیہ نارائن کی کتھا کے لئے باقاعدہ ایک روپیہ دیتیں۔ وہ کتھا میں شامل نہ ہوتیں لیکن چڑھاوا چڑھانا نہ بھولتیں۔ ستیلا ماتا کا بھی بھوگ ضرور لگواتیں ــــــ ابّا میاں کا آپریشن ہُوا تو ان کی صحت اور درازیِ عمر کے لئے اُنھوں نے اجمیر شریف میں چادر چڑھائی لیکن جب اس سے تسلّی نہ ہوئی تو پنڈت جی سے بھی ستیہ نارائن کی کتھا کروائی اور اُنھیں عقیدتاً دھوتی اور دو شالہ بھینٹ کیا ــــــ عصمت کی والدہ ہندوؤں کے کئی تہوار بھی بڑے شوق اور عقیدت سے مناتیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد عصمت کے والد کو پھر سے ملازمت مل گئی اور ان کا تعین جودھپور ہُوا، جو ہندو مسلم امن، صلح اور آشتی کے اعتبار سے ایک مثالی شہر تھا اور جہاں ہولی، دیوالی، عید بقرعید سب تہوار مشترکہ طور پر منائے جاتے تھے ــــــ دیوالی پر امّاں دِیا ضرور جلاتیں۔ ابّا میاں کی پنشن اُن کی ضروریات کی کفیل نہیں ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ اُن کی گذر بسر بہت تنگی ترشی سے ہوتی تھی۔ جب اُنھیں جودھپور میں ملازمت مل گئی اور پنشن میں جج کی ماہوار تنخواہ کا اضافہ ہوگیا تو دیکھتے ہی دیکھتے گھر میں خوش حالی اور فارغ البالی کا دَور آ گیا۔ تنگ دستی کی جگہ کشادہ دستی نے لے لی۔ امّاں کو یقین تھا کہ یہ سب لکشمی دیوی کی اَپار کرپا کا نتیجہ ہے۔ گویا امّاں لکشمی دیوی کے تعلق سے ایک طرح سے "بُت پرست" بھی تھیں۔

عصمت اس بارے میں لکھتی ہیں :

"دیوالی پر اماں دیا ضرور جلواتی تھیں۔ انھیں پکا یقین تھا کہ لکشمی دیوی کا اُن پر سایہ ہے۔ انہی کے چرنوں کے صدقے گھر میں دن بدن خوش حالی بڑھ رہی ہے۔ پنشن کے بعد آگرہ اور علی گڑھ میں کافی دُرگت بن گئی تھی اور اب پنشن کے علاوہ جج کی تنخواہ نے پھر ہاتھ کھول دیئے تھے۔" [1]

اماں کی بھی ہندو سہیلیاں تھیں، جن سے اُن کے گھریلو مراسم تھے۔ ایک دُوسرے کے ہاں آنا جانا، اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا تھا۔ وہ سہیلیوں کو کھانے پر مدعو کرتیں تو برآمدہ دھو دیا جاتا، پتلیں صاف کر کے لگا دی جاتیں۔ پڑوس سے برتن منگوائے جاتے اور مہاراج کھانا پروس دیتا۔ گویا مہمانوں کے مذہبی جذبات کا پُورا پُورا لحاظ رکھا جاتا ——— اماں بڑی کشادہ دل اور بے تعصّب عورت تھیں (اس کا ذکر "اماں" کے تحت تفصیل سے کیا گیا ہے)۔ عصمت اس معاملے میں اماں کی پیرو تھیں۔ بلکہ اُن سے چند قدم آگے ہی تھیں کہ وہ نئی نسل سے تھیں جو پُرانی نسل سے کہیں زیادہ بے تعصّب اور کم دقیانوسی تھی ——— عصمت کا ہندو دھرم کی طرف میلان اور رجحان وقت کے ساتھ بڑھتا گیا۔

○ عظیم بیگ :

عظیم بیگ عصمت کے "ادبی گرو" تھے اور باغیانہ طبع کے حامل تھے۔ وہ گھسے پٹے عقائد کے قائل نہیں تھے۔ جو بات ان کی فکر و نظر کی کسوٹی پر پُوری نہ اُترتی اُسے وہ بیک جنبشِ سر ذہن سے جھٹک دیتے تھے اور اپنے عقیدے کے تحفّظ میں ایک مردِ مجاہد کی طرح کمر کس کر میدان میں اُتر پڑتے تھے۔ اکثر اسلامی عقائد کے وہ خلاف تھے اور اپنے مخالفوں سے لوہا لینے میں بے خوف اور بے باک تھے۔ مثال کے طور پر وہ پردہ کے خلاف تھے (جس کا ذکر "پردہ" کے تحت کیا گیا ہے)۔ انھوں نے اپنے نظریہ کے جواز میں "قرآن اور پردہ" اور "حدیث و پردہ" لکھ کر ہلچل مچا دی تھی۔ اور اپنے نظریہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اپنے عزیز دوست خواجہ محمد اسحاق کو اپنی اہلیہ کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اس پر گھر میں جو طوفان برپا ہوا اُسے وہ ہنستے ہنستے مردانہ وار جھیل گئے۔ (اس کا ذکر "پردہ" کے تحت تفصیل سے کیا گیا ہے)۔ عصمت نے انہی کی در پردہ شہ پر برقعہ اُتار پھینکا اور دیگر بھائیوں کی مار پیٹ اور لعن طعن کو خندہ پیشانی سے بُھگتا۔ گویا عظیم بیگ جدید خیالات کے حامل اور قدامت پسند اسلامی روایات کے کٹّر مخالف تھے۔ اسی چیز نے اُن کا جُھکاؤ ہندو دھرم کی طرف کر دیا۔ کیونکہ اسلام کو اُنھوں نے ایک

---

[1] عصمت چغتائی۔ کاغذی ہے پیرہن۔ "سوجھت"۔ ماہنامہ "آج کل"، نئی دہلی۔ نومبر ۱۹۷۹ء، ص ۲۷

بے لچک مذہب پایا ـــــــ پھر اُنھوں نے نہ کبھی نماز پڑھی اور نہ ہی روزہ رکھا حالانکہ شریعت کے مُطابق یہ دونوں فرائض ہر مُسلمان پر لازم ہیں ـــــــ وہ قرآن شریف بھی عام کتابوں کی طرح، لیٹ کر پڑھتے تھے اور اس کے ساتھ سو بھی جاتے تھے جو روایتاً مقدس کتاب کی سریحاً بے ادبی و بے حُرمتی تھی۔ جب انھیں اس بات پر لعنت ملامت کی گئی تو انھوں نے کتاب پر خاکی کاغذ چڑھا دیا اور اُسے معترضین کو قانونی کتاب کہہ کر ٹال دیتے تھے ـــــــ عصمت کے الفاظ میں: "یزید کے بڑے مدّاح تھے اور امام حسین کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے" ـــــــ جب لوگ انھیں کہتے کہ تم اپنے مُلحدانہ نظریات کے باعث جہنّم واصل ہوگے تو وہ جواب دیتے کہ یہاں اللہ میاں نے کونسی جنّت دے دی ہے جو دوزخ کا ڈر ہو۔ اسی وجہ سے سب انھیں "دوزخی" کہنے لگے ـــــــ گویا مذہب اسلام سے انھیں بہت کم لگاؤ تھا اور وہ اُس کی کھُل کر تحقیر اور تضحیک کرنے سے بھی نہ چُوکتے تھے۔ اسلام سے بُعد انھیں شعوری طور پر ہندو دھرم کے قریب لے آیا ـــــــ جودھپور میں اپنی ملازمت کے دَوران اُن کے راجپوت دوست احباب سے بہت گہرے مراسم ہوگئے۔ راجپوتوں کی پارینہ شان وشوکت اور بہادری اور شجاعت کی داستانوں نے بھی اُن پر اَمٹ چھاپ چھوڑی اور وہ ہندو دھرم کی طرف کچھ زیادہ ہی جُھک گئے یہاں تک کہ انھوں نے اپنے تینوں بیٹوں کے راجپوتی نام رکھے ـــــــ تجّو کا نام موہن سنگھ، چھبّا کا نام سوہن سنگھ اور نووارد بچّے کا نام مکھن سنگھ رکھ دیا۔ وہ کبھی اپنے بیٹوں کو اُن کے اصلی ناموں سے نہیں بلاتے تھے۔ بلکہ موہن، سوہن اور مکھن ہی پکارتے تھے۔ کبھی بہت پیار آتا تو اُن کے پیارکے ناموں سے موہنیا، سوہنیا اور مکھو یا مکھی کہتے تھے ـــــــ جب لڑکے بڑے ہوگئے تو موہن اور سوہن زعیم اور نجیم کہلانے لگے مگر تیسرے بیٹے کا نام مکھن سنگھ ہی رہا۔[1] مندرجہ بالا حقائق اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ عظیم بیگ چغتائی جس قدر اسلام سے دُور ہوتے گئے اُسی قدر ہندو دھرم کے نزدیک ہوتے گئے۔ اپنے بچّوں کے ہندو نام رکھ کر اُنھوں نے ایک طرح سے اُنھیں ہندو دھرم اور اس کی روایات سے مُتعارف کرایا۔ اور اس طرح ہندو دھرم ان کے ہاں صدر دروازے سے گھر میں داخل ہوگیا ـــــــ عصمت، جس کے وہ "ادبی گُرو" تھے، ان کے نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور ان کا میلان ہندو دھرم کی طرف بڑھتا گیا اور وہ اپنے آبائی مذہب اسلام سے دُور ہٹتی گئیں۔

○ **عصمت:**

عصمت روزِ اوّل ہی سے ہندو دھرم کی جانب راغب تھیں۔ رامائن کی داستانیں اُنھیں بہت بھاتی

---

[1] عصمت چغتائی۔ کاغذی ہے پیرہن۔ "سوجھت"۔ ماہنامہ "آج کل"، نئی دہلی، نومبر ۱۹۷۹ء ص ۲۹

تھیں۔ رامچندر جی، لکشمن جی وغیرہ سے انھیں بہت عقیدت تھی۔ بھگوان کرشن کو تو وہ کُل کائنات کا نجات دہندہ سمجھتی تھیں اور ان کے سامنے ویسے ہی سربسجود ہوتی تھیں جیسے کہ ایک عقیدت مند ہندو ہوتا ہے۔ چند مثالیں بطور نمونہ پیش ہیں:

○ عصمت کا کوچوان انھیں ترنّم سے رامائن کی کتھا سُناتا تو وہ ہمہ تن گوش سُنتیں۔ ہنومان جی کا اپنی دُم میں آگ لگاکر ساری لنکا کو پھونک دینا، جب ہنومان کو گھائل لکشمن جی کے لئے تلاش کے باوجود بھی سنجیونی بوٹی نہ ملی تو اُن کا اپنی چھنگلی پر پُورا پربت ہی اُٹھالانا اُن کی نظروں میں حیرت ناک معجزے تھے، جو اُن سی حسّاس بچّی کے ذہن کو بے اختیار متاثر کرتے تھے۔ ہر واقعہ کے بعد کوچوان فرطِ عقیدت سے جھوم کر کہتا: "بولو شری رامچندر کی جے"، تو عصمت سمیت سب بچّے بڑے زور سے جے جے کار کرتے۔ درحقیقت ان کے نزدیک کتھا کا سب سے دل چسپ اور جاذب حصہ جے جے کار کرنا ہی تھا۔ کوچوان کا کہنا تھا کہ جو ایک بار شردھا سے رام کا نام لے لے اُس کا کلیان ہو جاتا ہے اور اسے تمام دُکھوں سے رہت ہو کر سورگ پراپت ہوتا ہے — لیکن جگنو، عصمت کا ماموں زاد بھائی، انھیں کہتا کہ جے جے کار کرنے کے بعد تمھاری زبان دوزخ میں جلے گی اور عصمت کو دوزخ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اُدھر کوچوان کا کہنا تھا کہ شری رام چندر کی جے نہ بولوگی تو نرک میں جاؤ گی اور بہت کشٹ بھوگو گی[1] — یہ بچپن میں عصمت کا رامائن کے ایک اہم واقعہ سے ہلکا سا تعارف تھا۔ جُوں جُوں ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا، رامائن کے تئیں اُن کی شردھا اور عقیدت بھی بڑھتی گئی۔ اور ہندو دیو مالا سے اُن کی قربت فزوں تر ہوتی گئی — ہر نیا خیال ایسے ہی پیدا ہوتا ہے اور اپنا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔

○ عصمت گھر پر بچپن ہی سے اسلام کی عظمت اور اس کی دُوسرے مذاہب پر فوقیت اور سبقت کی باتیں سُنتی آئی تھیں — لیکن ساتھ ساتھ انھیں ہندو دھرم سے بھی رُوحانی لگاؤ سا رہا۔ مندروں میں بھجن کیرتن ہوتے، گھنٹے گھنٹیاں بجائی جاتیں، سر پر مُکٹ پہنے سجے سنورے بھگوان رام، ہاتھ میں بنسی لئے مُرلی منوہر کرشن کنہیا، شوخ اور نٹ کھٹ گوپیوں کے سنگ راس رچاتے اور چھیڑ چھاڑ کرتے، یہ سب چیزیں عصمت کو اپنی دل کش رُومانی کیفیت سے موہ لیتی تھیں — بچپن میں ہی ان کے دل میں ہندو دھرم گرہن کرنے کا خیال آنے لگا تھا لیکن وہ اس طریقۂ کار سے بے بہرہ تھیں جو تبدیلیِ مذہب کے لئے ضروری تھا۔ انھوں نے پڑوس میں رہتی اپنی جگری سہیلی سوشی کے ہاں تہواروں پر جھلمل کرتی روشنیاں، شان و شوکت اور دُھوم دھام

---

[1] عصمت چغتائی "جہنم" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن": ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی۔ اپریل ۱۹۸۰ء ص ۲۰

دیکھ کر اُس کی والدہ سے، جنھیں وہ چاچی کہا کرتی تھیں، کہا تھا" چاچی۔ مجھے ہندو بنالو" پہلے تو وہ ششدر رہ گئیں پھر بولیں "دھت"۔ سب نے عصمت کی معصومیت اور بھولپن سے کہی بات کا بہت مذاق اُڑایا۔[1]

○ جب کسی کے ہاں کتھا ہوتی تو پنڈت جی ہندی کی بھُورے رنگ کی پُستک لے کر آتے اور پاٹھ ہوتا۔ بڑو کی چاچی جی بھی ہندی پُستک سے پاٹھ کرتیں۔ عصمت کو دیومالا سُننے کا شوق چرایا تو ساتھ ہی ہندی سیکھنے کی خواہش بھی بیدار ہوئی تاکہ ہندو دھرم کے متبرک صحیفوں کا وُہ براہ راست مطالعہ کر سکیں۔ عصمت کا ہندو دیومالا سے بہرہ ور ہونے کا تجسس بیکراں تھا۔ بڑی بڑی مقدس ہستیوں کی معتقد تو وہ تھیں ہی، لیکن ان سے گذر کر وہ پُورے ہندو دھرم سے وابستہ کتھاؤں، رچناؤں وغیرہ سے بھی شناسا ہونا ضروری سمجھتی تھیں ــــــ عصمت نے ظفر قریشی ضیا سے جب اپنی پہلی ملاقات میں گفتگو کے دَوران بہت سے ہندی الفاظ استعمال کئے تو انھوں نے کہا:

"ہندی کے الفاظ بہت زبان پر چڑھ گئے ہیں"۔

"آج کل میرے ایک مہربان اُونکارناتھ شرما مجھے ہندو مائی تھولوجی پڑھا رہے ہیں"۔

"بڑے میاں تمھیں ہندو بنانے کے چکّر میں ہوں گے"۔

"بڑے میاں نہیں، نوجوان ہیں۔ کافی ہینڈسم۔ مجھے تو ڈر ہے کہ مجھے ہندو بنانے کی بجائے وہی نہ مشرف بہ اسلام ہو جائیں۔ پتہ ہے وہ میرے ہاتھ کا چھُوا بڑے مزے سے کھا لیتے ہیں۔ بے حد روشن خیال ہیں۔ گوشت نہیں کھاتے۔ مگر دسترخوان پر رکھا ہو تو چھُوت نہیں کرتے۔ بس ایک دن ایک نوالہ حلق سے اُتار لیں تو کلیاں ہو جائے"۔[2]

اس گفتگو کا لبِ لباب یہ ہے کہ عصمت نے پُورے انہماک کے ساتھ باقاعدہ ہندو مائی تھولوجی پڑھنی شروع کر دی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے استفادہ بھی کیا ہوگا ــــــ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ کٹر مُسلم طبقہ عصمت کے اس غیر مُسلم رجحان کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا۔

○ عصمت نے جب مُسلم گرلز ہائی اسکول بریلی میں بطور ہیڈ مسٹرس ملازمت اختیار کی تو ایک دن انھوں نے مینجر صاحب سے باتوں باتوں میں اسکول کے عملے سے وابستہ مختلف مذاہب کے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"مجھے تو کوئی یہاں ابھی تک رذیل نہیں ملا۔ صدّیقی صاحب، شنکر جی اور شرما جی (اونکار ناتھ شرما جن سے وہ ہندو مائی تھولوجی پڑھتی تھیں) مسٹر جیکب اور اس دن مسٹر مارکس (اسکول کی پہلی ہیڈ مسٹریس کے شوہر) آئے تھے۔ بڑے ہی بھلے آدمی ہیں"۔

---

[1] عصمت چغتائی۔ "لوہے کے چنے" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ آجکل، نئی دہلی۔ ستمبر ۱۹۷۹ء

[2] عصمت چغتائی "تالے" (مضمون)، "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (فروری ۱۹۸۰ء ص ۱۶)

مارکس کی طرف اشارہ کرکے مینجر صاحب بولے۔

"وہ تو مشنری ہے۔ آپ کو عیسائی بنانے کی کوشش نہیں کی؛ تمام بھنگیوں چماروں کو عیسائی بناتا پھرتا ہے۔"

"بدقسمتی سے میں بھنگی چمار نہیں۔"

"اوہو۔ میرا یہ مطلب تو ہرگز نہیں۔ آپ تو اچھے خاندان کی ہیں۔ آپ خدانہ کرے کیوں ..."

"اچھے بڑے خاندان اور مذہب سے کیا واسطہ؟"

"واسطہ تو ہے۔ سنا ہے شرما جی، بہت گیتا راماین سنا رہے ہیں آج کل۔"

"ہاں شاید وہ مجھے ہندو کرنا چاہتے ہوں گے۔"

"قطعی بڑا کٹر آریہ سماجی ہے" ——— "آپ بھی تو کٹر مسلمان ہیں۔"

"بحمداللہ" ——— "آپ شاید مجھے مسلمان کرنے پر تلے ہوئے ہوں گے۔"

"کیا، یعنی کیا مطلب۔ آپ ماشاءاللہ مسلمان ہیں" ——— "مگر مجھے عیسائی مذہب سے بڑی دلچسپی ہے اور اب ہندوازم کے بارے میں اتنی تفصیل سے پڑھ رہی ہوں تو...

مگر آپ فکر نہ کیجیے۔ میری ذات پر نہ اسلام کو فخر ہے اور نہ کسی (دیگر) مذہب کو فخر کرنے کا موقع ملے گا۔"[1]

اسکول کے مینجر صاحب ایک متعصب، تنگ نظر، کوتاہ بیں، کٹھ ملائی ذہنیت کے انسان تھے۔ وہ عصمت کے مسٹر اونکارناتھ شرما اور مسٹر مارکس کے ساتھ مراسم سے یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھے کہ عصمت شاید سنجیدگی سے ہندو یا عیسائی دھرم اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ یہ ان کا واہمہ تھا جسے حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ عصمت بلاشبہ کبھی عیسائیت کی جانب راغب ہوئی تھیں اور انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے بھی کہا تھا کہ اگر انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ عیسائی مذہب اختیار کرکے کسی مشن اسکول میں داخلہ لے لیں گی ——— دوسرے آئی۔ٹی کالج لکھنؤ جہاں سے انھوں نے بی۔اے کیا تھا ایک کرسچین مشنری ادارہ تھا جس کا نصب العین صرف توسیعِ تعلیم ہی نہیں تھا بلکہ غیر کرسچین لوگوں کو عیسائیت کی جانب راغب کرنا بھی تھا۔ وہاں سب لڑکیوں کو چیپل باقاعدہ جانا ہوتا تھا اور گاہے گاہے عیسائیت پر "سرمن" بھی سننے پڑتے تھے۔ گویا کالج کے ماحول پر عیسائیت کی چھاپ تھی۔ ایسے میں عصمت کی وقتی طور پر عیسائیت سے رغبت چنداں حیران کن بات نہ تھی ——— لیکن جب انھوں نے جذب وانہماک سے پنڈت

---

[1] عصمت چغتائی "تعلیمِ نسواں۔ ایک وبال" (مضمون) "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (مارچ۔۱۹۸۰ء، ص ۱۸)

اونکار ناتھ شرما سے ہندو مائی تھولوجی پڑھی اور ہندو دھرم کا گیان حاصل کیا تو ہندو کلچر سے ان کا رشتہ استوار ہوگیا اور وہ آہستہ آہستہ پورے طور سے ہندو دھرم سے جُڑ گئیں۔

اسکول کے مینجر صاحب کو دیئے گئے اُن کے جوابات کا کاٹ دار طنز حیران کُن ہے اور اُس کی زہرناکی بھلائی نہیں جا سکتی۔ جب اُنھوں نے کہا کہ شرما جی بہت کٹر آریہ سماجی ہیں تو عصمت نے فوراً جواب دیا کہ آپ بھی تو کٹر مُسلمان ہیں۔ اس جواب کا جواب نہ تھا۔ مینجر صاحب ضرور بغلیں جھانکنے لگے ہوں گے ــــ جب مینجر صاحب نے مسٹر مارکس کی بابت کہا کہ وہ تو مشنری ہے اور تمام بھنگیوں چماروں کو عیسائی بناتا پھرتا ہے تو عصمت نے یہ کہہ کر کہ میں نہ بھنگی ہوں اور نہ چمار، ان کا ناطقہ بند کر دیا ــــ اور پھر عصمت نے یہ کہہ کر کہ شاید آپ مجھے مُسلمان بنانے پر تُلے ہوں گے ان کی تحقیر و تذلیل میں اگر کوئی کسر باقی تھی تو وہ بھی پوری کر دی ــــ عصمت کا عقیدہ تھا کہ مذہب کی رُوح اس کی رسُوم وقیود میں نہیں، بلند بانگ دعاوی میں بھی نہیں بلکہ ان رُوحانی اور اخلاقی اقدار میں ہے جو مذہب کا جُزِ لاینفک ہوتی ہیں۔

○ اب ایک اور اہم واقعہ پیش ہے جو عصمت کو "کلچرل وراثت" کے تعلق سے سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ یہ ہماری مخلُوط تہذیب کا ایسا پہلو ہے جس سے صَرفِ نظر ممکن نہیں۔ مگر کیونکہ یہ ایک متنازعہ امر ہے جس سے دونوں فرقوں کے جذبات اور احساسات وابستہ ہیں اور جس سے اُن کے مذہبی عقائد جُڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان پر معرُوضی انداز میں ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا ہوگا۔

آگرہ میں عصمت کے پڑوس میں ایک لالہ جی رہتے تھے جن کی بیٹی سوشی عصمت کی جگری سہیلی تھی۔ بچپن میں بچّے روایتی طور پر چھُوت چھات سے مبرّا سمجھے جاتے ہیں۔ سوشی عصمت کے ہاں بے تکلّف کھانا کھا لیتی تھی۔ پھل، دال موٹھ، بسکٹ پر بھی چھُوت کی پابندی نہ تھی ــــ لالہ جی کے ہاں جنم اشٹمی کا تہوار بڑی دھُوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔ انواع و اقسام کے پکوان پک رہے تھے۔ مٹھائیاں تیار کی جا رہی تھیں عصمت لکھتی ہیں کہ باہر ہم فقیروں کی طرح کھڑے حسرت سے تک رہے تھے۔ سوشی ایسے موقعوں پر بڑی مذہبی بن جایا کرتی تھی۔ ویسے دونوں سہیلیاں سب سے نظر بچا کر ایک ہی امرود باری باری دانت سے کاٹ کر کھا چکی تھیں ــــ "بھاگو یہاں سے" آتے جاتے لوگ انھیں دھتکارتے جاتے تھے۔

"اندر کیا ہے؟" عصمت نے سوشی سے پُوچھا۔ سامنے کا کمرہ پھُول پتّوں سے خوب سجا دھجا تھا۔ اندر سے گھنٹی بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ "ہائے اللہ اندر کون ہے؟" ــــ "وہاں بھگوان براجے ہیں،" سوشی نے بڑے تفخّر سے کہا ــــ "بھگوان!" عصمت کو احساسِ کمتری نے ستایا کہ اِن کے بھگوان کس شان و شوکت اور کرّ و فر سے آتے ہیں۔ ایک ہمارے اللہ میاں ہیں کہ اپنے حجرے سے باہر ہی نہیں نکلتے ــــ پھر نہ جانے ان کی کونسی رگ پھڑکی کہ وہ بلا جھجک بھکاریوں کی صف سے کھسک کر برآمدے میں پہنچ گئیں ــــ اور پھر وہاں سے پلک جھپکتے ہی اُس کمرے میں گھُس گئیں جہاں بھگوان

براجے تھے۔

کمرہ گھی اور لوبان کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ بیچ میں چاندی کا ایک دیدہ زیب پلنا لٹک رہا تھا جس میں ایک مُسکراتا ہُوا اروپہلی بچہ لیٹا مزے سے جھول رہا تھا۔ ناگہاں عصمت نے کمال معصومیت سے آگے بڑھ کر بھگوان کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں لے کر فرطِ عقیدت سے سینے سے لگا لیا ـــــ بچہ اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر آ رہا۔ یہ ایک طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ سوشی کی نانی ہذیانی کیفیت میں واہی تباہی بکنے لگی۔ اس کی والدہ نے لپک کر عصمت کا ہاتھ پکڑا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے لے جا کر مری ہوئی چھپکلی کی طرح گھر سے باہر پھینک دیا ـــــ فوراً عصمت کے ہاں شکایت پہنچی کہ وہ بھگوان کی مقدس مورتی چُرا رہی تھی۔ اُن کی والدہ محترمہ نے غم و غصہ میں سر پیٹ لیا اور عصمت کو بھی پیٹ ڈالا ـــــ عصمت پر چوری کا الزام صریحاً بے بُنیاد تھا۔

اس واقعہ کو برسوں بیت گئے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد عصمت کو اپنی جائیداد کے سلسلے میں آگرہ جانے کا اتفاق ہُوا تو اُنھیں معلوم ہُوا کہ اگلے روز اُن کی بچپن کی سہیلی سوشی کی شادی ہے اور سارے گھر کو مدعو کیا گیا ہے۔ عصمت کو حیرت ہوئی کہ لالہ جی جیسے متعصب اور فرقہ پرست سے ان کے بھائی کے تعلقات کیسے قائم رہے۔ عصمت کی جو دُرگت جنم اشٹمی والے دن ہُوئی تھی وہ اُسے بھُولی نہ تھیں۔ عصمت تو سوشی کے ہاں ہرگز نہ جاتیں مگر سوشی کو عصمت کی آمد کا پتہ چلا تو اُس نے بصد اصرار اپنے بھائی کے ذریعے اُنھیں بلوا لیا۔

عصمت گئیں تو سوشی ہلدی لگائے اُسی کمرے میں بیٹھی تھی جس میں سے، جنم اشٹمی کے روز عصمت کو بیک بینی و دوگوش نکال دیا گیا تھا۔ عصمت کا جی چاہا کہ بھاگ کر واپس چلی جائے لیکن سوشی نے اُسے دیکھتے ہی بصد اشتیاق اس کے پیار کے نام سے پکارتے ہوئے کہا: "کیسی ہے ری چنتی" اور لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور کُنڈی چڑھا دی۔ باہر نانی بڑبڑاتی رہی: "اس وقت کسی کا آنا جانا ٹھیک نہیں" ـــــ سوشی نے شرارت سے مُسکراہٹ دبا کر عصمت کو یُوں دیکھا جیسے کوئی مدّتوں سے رُوٹھے ہوئے جگری دوست کو منانے کے لئے دیکھتا ہے: "ہائے رام کتنی لمبی تاڑ کی تاڑ ہو گئی" ـــــ یہ کہہ کر اس نے مٹھائی کی تھالی نکالی۔ عصمت ہاتھ میں لڈّو لیتے ہی لگی تھی کہ باہر جا کر گُوڑے میں پھینک دیں گی کہ جو ان سے چھُوت کرے وُہ اس کا چھُوا کیوں کھائیں کہ سوشی نے کہا: "آہنک منہ کھول" ـــــ عصمت نے مجبوراً ذرا سا لڈّو کتر لیا۔ باقی بچا ہُوا لڈّو سوشی نے اپنے مُنہ میں ڈال لیا۔ ظاہر ہے کہ جنم اشٹمی والے واقعے کو سوشی بھی نہیں بھُولی تھی۔ آناً فاناً عصمت کے دل و دماغ سے سوشی کے تئیں تلخی و تُرشی کافُور ہو گئی ـــــ وہ دونوں سر جوڑے بچپن کی سہاونی حماقتوں کو یاد کر کے ہنستی رہیں ـــــ چلتے ہوئے سوشی نے ایک ننھا سا پیتل کا گھُٹنوں چلتا ہُوا بھگوان کرشن کا مجسمہ عصمت کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا: "لے چڑیل اب تو تیرے کلیجے ٹھنڈ پڑی" ـــــ یہ ایک طرح سے اُس تذلیل کی تلافی تھی جو عصمت کے ساتھ، اندھے تعصب کی بنا پر برسوں گذرے روا رکھی گئی تھی۔ لیکن

قلب و جگر کے زخم آسانی سے مُندمل نہیں ہوتے۔ ہو بھی جائیں تو اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں ـــــ عصمت اس خوبصورت تبرّک کو پاکر اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہیں:

"میں مسلمان ہوں۔ بُت پرستی شِرک ہے، مگر دیو مالا میرے وطن کا ورثہ ہے۔ اس میں صدیوں کا کلچر اور فلسفہ سمویا ہُوا ہے۔ ایمان علیٰحدہ ہے۔ وطن کی تہذیب علیٰحدہ ہے۔ اس میں میرا برابر کا حصّہ ہے۔ جیسے اس کی مٹّی، دھوپ اور پانی میں میرا حصّہ ہے۔ مَیں ہولی پر رنگ کھیلوں، دیوالی پر دیے جلاؤں تو کیا میرا ایمان متزلزل ہوجائے گا۔ میرا یقین اور شعور کیا اتنا بودا ہے، اتنا ادھورا ہے کہ ریزہ ریزہ ہوجائے گا ـــــ اور مَیں نے تو پرستش کی حدیں پار کرلی ہیں[1]۔"

اس مختصر سے اقتباس میں مذہب کے تعلق سے عصمت کے عقائد و نظریات کا نچوڑ اور لُبِ لباب کشید ہوکر آگیا ہے۔ اسے لکھنے کے لئے مُلک کی مسموم فرقہ وارانہ فضا کو دیکھتے ہوئے دل گُردہ چاہیئے تھا اور یہ صفت قضا و قدر نے انھیں فراغت سے ودیعت کی تھی۔ وہ جو کچھ کہتیں بے جھجک اور برملا کہتیں۔ ردِّ عمل سے بیگانہ و بے نیاز ہوکر کہتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بات ہزاروں لاکھوں دلوں کے تار پر آج بھی مضراب کا کام کرتی ہے ـــــ اس اقتباس میں عصمت کی آواز ایک سچّے و پکّے سیکولرسٹ کی بلند آہنگ آواز ہے۔ جسے مذہبی تعصّب چھُو کر نہیں گیا تھا اور جو کٹّر مذہب پرستی کی نچلی گھناؤنی سطح سے اُٹھ کر حقیقی اور سچّی وطن پرستی کی داعی ہی نہیں عامل بھی تھیں۔ اُن کا یقین تھا کہ قومی ورثہ کے ساتھ مذہب کا کوئی رشتہ ناطہ نہیں ہوتا۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر ایک دُوسرے پر اپنا سایہ ڈالے بغیر قائم و دائم رہ سکتے ہیں ـــــ دھیان رہے کہ یہ نظریہ عصمت کے ایک عام ہم مذہب کو قابلِ قبول نہیں، ہوتا تو وطنِ عزیز کی تقسیم نہ ہوتی۔ وہ قتل و غارت نہ ہوتی جو ہوئی۔ ماں بہنوں، بہو بیٹیوں پر وُہ نہ بیتتی جو بیتی۔ لاکھوں کروڑوں لوگوں کی وُہ دو طرفہ ہجرت نہ ہوتی جو ہوئی۔ ـــــ اگر قومی ورثہ سانجھا نہیں تو پھر سانجھا کیا ہے؟

○ ان خیالات کا اظہار عصمت نے تقسیمِ مُلک کے بعد کیا۔ جب دو قوموں کی تھیوری اور جُداگانہ کلچر کے علمبردار پاکستان حاصل کرچکے تھے۔ اُمید کی جاتی تھی کہ اب مخلوط کلچر کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہوگیا ہے اور دو قوموں کی تھیوری کفنا دفنا دی گئی ہے۔ اس بات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے وزیرِ اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے ۲۱ جنوری ۱۹۴۸ء کو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی کنونشن میں اپنے خطبۂ صدارت میں مسلم طلبا سے دوٹوک سوال کیا:

---

[1] عصمت چغتائی "غبارِ کارواں" (مضمون) ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (نومبر ۱۹۷۰ء - ص ۱۴)

"میں نے کہا ہے کہ مجھے اس ورثے اور اپنے اسلاف پر فخر ہے جنھوں نے ہندوستان کو ذہنی اور ثقافتی سربلندی عطا کی ہے۔ کہئے، آپ اپنے ماضی کی بابت کیا محسوس کرتے ہیں؟ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا بھی اس میں حصّہ ہے اور آپ بھی اس کے وارث ہیں، اور آپ کو اس پر اتنا ہی فخر ہے جتنا کہ مجھے؟ یا آپ اپنے آپ کو اس سے الگ تھلگ پاتے ہیں۔ اور سوچے سمجھے بغیر اسے نظرانداز کر دیتے ہیں یا آپ اس "تھرل" (تھرتھراہٹ) کو محسوس کرتے ہیں جو اس احساس سے پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس انمول خزانے کے ضامن اور امین ہیں۔ آپ مسلمان ہیں اور میں ہندو۔ ہمارے مذاہب اور عقیدے جُداگانہ ہو سکتے ہیں۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی مذہب کے قائل ہی نہ ہوں۔ مگر یہ بات ہماری کلچرل وراثت پر اثرانداز نہیں ہوتی، جو ہم سب کی مشترکہ ہے۔"[1]

یہ اُس عظیم سیاست دان کی آواز تھی جو دِل ہی دِل میں جانتا تھا کہ اس کلچر کو جو ہمیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملی ہے اپنائے بغیر تقسیم شُدہ ہندوستان کبھی امن و چین سے نہیں رہ سکے گا کہ ہمارا پُراچین کلچر ہمارے ملک کی رُوح ہے جس کی تشکیل و تعمیر ہمارے آبا و اجداد نے ہزاروں سالوں میں کی ہے اور جو ہمیں اقوامِ عالم میں ایک جُداگانہ اور امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے۔ اس پر نازاں ہونا مادرِ وطن کے ہر سچے سپوت کا فرض ہے ــــــ جو کچھ پنڈت نہرو نے کہا وہی بات عصمت نے بہت صاف اور واضح طور پر کہی۔ ایک طرح سے عصمت نے پنڈت نہرو کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مجھے اس کلچر پر فخر ہے جو مجھے وراثت میں ملی ہے۔ اس میں میرا حصّہ ہے اور میرا ایمان اسے اپنانے سے متزلزل نہیں ہوتا۔

○ مگر یہ بات صرف پنڈت جواہرلال نہرو تک ہی محدُود نہ تھی۔ بٹوارے کے بعد خالقِ پاکستان محمد علی جناح نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ نوزائیدہ پاکستان میں دو قوموں کی تھیوری اور جُداگانہ کلچر کا تصوّر پھر سے کئی مسائل پیدا کر دے گا، جو پاکستان کی بقا اور استحکام کے لئے خطرناک بات ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے پاکستان کی مجلسِ دستور ساز میں ۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا:

"آپ آزاد ہیں۔ آپ آزاد ہیں کہ پاکستان میں اپنے مندروں، مسجدوں یا جو بھی آپ

---

[1] THE HINDU PHENOMENON, BY GIRILAL JAIN روزنامہ "دی ہندوستان ٹائمز" نئی دہلی (مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۹۴ء) اس تقریر کا انگریزی متن اس باب کے آخر میں دیا گیا ہے۔ مترجم مصنف

کی عبادت گاہیں ہیں، میں جائیں۔ آپ کا مذہب، ذات یا عقیدہ کچھ بھی ہو، اُس کا اِس بنیادی اصُول کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، کہ ہم سب اس مُلک کے برابر کے درجے کے شہری ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس آدرش کو مدِنظر رکھنا ہوگا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہندو، ہندو نہ رہیں گے اور مُسلمان مُسلمان نہ رہیں گے۔ مذہبی اعتبار سے نہیں کیونکہ مذہب تو ہر شہری کا ذاتی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی اعتبار سے[1]

یہ نظریہ اُس جُداگانہ کلچر اور دو نیشن تھیوری کی تکذیب تھا جس کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اور یہ الفاظ بابائے پاکستان کے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ پاکستان میں مُسلمان اور ہندو اپنے اپنے مذہب کے پیرو ہوتے ہوئے برابر کے حقوق کے شہری ہوں گے۔ سیاسی طور پر بلا لحاظ مذہب و ملت ان میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے گا۔ وقت آئے گا جب مذہب نجی اور ثانوی حیثیت اختیار کرلے گا۔ ہندو ہندو نہ رہے گا، مُسلمان مُسلمان نہ رہے گا۔ وہ سب پاکستان کے شہری ہوں گے۔ ــ "اے بسا آرزوئے کہ خاک شُدہ"۔

عصمت بصد حسرت و یاس لکھتی ہیں کہ جب کبھی مُلک کے کسی حصّے سے فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں آتی ہیں تو قلم ان کا مُنہ چڑانے لگتا ہے اور سوشی کا لڈّو گولہ بن کر ان کے حلق میں اٹک جاتا ہے۔ وہ اس ننھے سے بھگوان کرشن سے، جن کی مورتی ان کی سہیلی نے انہیں اس قدر پیار محبت سے دی تھی، مخاطب ہو کر یوں گویا ہوتی ہیں:

> "کیا تم واقعی کسی منچلے شاعر کا خواب ہو؟ کیا تم نے میری جنم بھُومی پر ہی جنم نہیں لیا۔ بس ایک وہم، ایک آرزو سے زیادہ تمہاری حقیقت نہیں۔ کسی مجبُور اور بندھنوں میں جکڑی ہوئی اَبلا کے تخیّل کی پرواز ہو کر تھیں رہنے کے بعد اس نے زندگی کا زہر ہنس ہنس کے پی لیا۔ کیا تم اس دھرتی کے حلق میں اٹکا ہوا تیر نہیں نکال سکتے؟ مگر پیتل کا

---

[1] مدن گوپال "جناح اور سیکولرازم" (مضمون) روزنامہ دی ہندوستان ٹائمز "نئی دہلی۔ مورخہ ۲۹-۷-۹۴

نوٹ: محمّد علی جناح کے قریبی احباب اور مُعتمد مُشیروں نے اُن کے اِس نظریے کی مخالفت کی اور آپس میں طے کیا کہ تقریر کے اِس حصّے کو دستوُر ساز مجلس کی کارروائی سے حذف کر دیا جائے مگر مُدیر روزنامہ "ڈان" نے احتجاج کیا اور معاملہ قائدِاعظم کے نوٹس میں لانے کی دھمکی بھی دی ــــ بہرحال اکثر اخبارات نے اس حصّے کو شائع کرنے سے گریز کیا۔ مگر بعدازاں جسٹس مُنیر نے اپنے ایک فیصلے میں اس معاملے کی تصدیق کر دی۔

اِس تقریر کا انگریزی متن اِس باب کے آخر میں دیا گیا ہے۔ (مترجم۔ مصنّف)

بھگوان میری حماقت پر ہنس بھی نہیں سکتا کہ وہ دھات کے خول میں منجمد ہو چکا ہے
—— کیا ایک دن پیتل کا یہ خول توڑ کر خدا باہر نکل آئے گا؟[1]

یہ صدا ایک دردمند، گداز دل، حسّاس عصمت کی ہے جو اپنے گرد و پیش شب و روز جبر و قہر ہوتے دیکھتی ہے، جو بے ضمیر زردار کے ہاتھوں غریبوں اور ناداروں کا استحصال ہوتے دیکھتی ہے، جو تعیش پسند مردوں کے ہاتھوں بے سہارا عورتوں کی زور زبردستی سے عصمت لٹتے دیکھتی ہے، تو دل مسوس کر رہ جاتی ہے۔ بھگوان دکھ درد کی ماری، غربت کی چکی میں پستی مخلوق کو روتی کراہتی دیکھتا ہے لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتا —— یہ دکھ بھری پکار، یہ لرزتی ہوئی صدائے احتجاج عصمت کی ہی نہیں ہر باشعور، انسان دوست، مذہب پرست ہندو کی بھی ہے —— یہ بھگوان کی ہستی سے انحراف نہیں۔ بھگوان سے دادرسی کی دعا ہے۔

○ اب ایک انٹرویو سے مختصر سا مگر بہت بصیرت افروز اقتباس پیش ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عصمت آہستہ آہستہ مذہبِ اسلام کے مسلّمات سے بھی منحرف ہو گئی تھیں اور اپنے نظریات کا اظہار برملا کرتی تھیں۔

"اب میرا اگلا سوال ذرا ہٹ کر تھا۔ میں نے کہا "حضرت محمدؐ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"HE IS A GREAT MAN" (وہ عظیم شخص تھے)

"خدا کے بارے میں کیا نظریہ رکھتی ہیں؟"

ہنستے ہوئے بولیں "بھئی خدا کا معاملہ۔۔۔ بڑا پرائیویٹ ہے ۔۔۔ لیکن میں اس سے نہیں ڈرتی ہوں؟"

میں ایک لمحہ کے لئے سوچ میں پڑ گئی۔ مجھے ایسے لگا کہ میں خوشی کے پہاڑ سے گرنا شروع ہو گئی ہوں۔ میں پوچھتی ہوں "تسلیم تو کرتی ہیں، اُس کے وجود کو؟"

"اس میں تسلیم کرنے نہ کرنے کی گنجائش ہی کہاں ہے۔ ایک چیز ہے تو ہے۔"

"کیا آخرت میں یقین رکھتی ہیں؟"

"نہیں —— البتہ ری برتھ (آواگون) میں یقین رکھتی ہوں۔ جنت و دوزخ میں میرا یقین بالکل نہیں ہے۔"

۔۔۔ میں جب اپنے گھر جا رہی تھی۔ بہت اُداس تھی جیسے میرا کوئی عزیز مر گیا ہو!"[2]

---

[1] عصمت چغتائی "غبارِ کارواں" (مضمون) ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۵)

[2] شمع افروز زیدی "عصمت سے انٹرویو" "کاغذی ہے پیرہن" روہتاس بکس، لاہور، ص ۸-۹

یہ اقتباس کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔ پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کے تئیں عصمت کا غیر عقیدت مندانہ رویّہ، خدا کی ہستی کی بابت "گومگو" رویّہ، جنّت اور جہنّم کے تئیں یقین کا فقدان اور آواگون میں اعتقاد سب ظاہر کرتے ہیں کہ وہ مذہبِ اسلام کے اساسی عقائد سے کس قدر دُور ہٹ گئی تھیں اور فلسفۂ آواگون پر ایمان لا کر وہ ہندو دھرم کے کس قدر قریب آگئی تھیں ـــــ اقتباس کا آخری جملہ عصمت کے تئیں ایک مذہب پرست مسلمان کے جذبات اور احساسات کی نشاندہی کرتا ہے۔

دھیان رہے کہ عصمت کو مُسلم معاشرے کے جو پہلو بہت ناگوار گذرتے تھے، وہ عورتوں پر جبر و تشدّد اور اُن کے حقوق کا غصب کیا جانا تھا۔ پردہ اُنھیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ طلاق کی رسم انھیں قرونِ وسطیٰ کی یاد دلاتی تھی۔ کثرتِ ازدواج کی شرعی اجازت ان کے نزدیک بہت بڑی لعنت تھی۔ عورت کو تعلیم کی سعادت سے محروم رکھنا ایک جُرم تھا۔ عورت کو گھر کی چار دیواری میں محصُور اور محبوس کر کے محض بچّے پیدا کرنے کی مشین بنا دینا گُناہ تھا ـــــ اس کا موازنہ وُہ ہندو معاشرے سے کرتیں تو انھیں منظر ہی بدلا ہُوا دکھائی دیتا۔

پھر کچھ حالات بھی ایسی کروٹ لیتے رہے کہ عصمت ذہنی طور پر اسلام سے دُور ہوتی گئیں۔ اُن کی ایک بیٹی نے ہندو گھرانے میں شادی کی تو دوسری بیٹی نے پارسی خاندان میں ـــــ اُن کی بڑی بیٹی نے بنگلور میں سول میرج کر لی تو اُس نے انھیں لکھا کہ اُس کے سُسرال والوں کی خواہش ہے کہ مذہبی رسوم کی ادائیگی بھی ہونی چاہیئے۔ آپ بھی آجائیے۔ قرۃ العین حیدر جن کے عصمت سے گہرے مراسم تھے، لکھتی ہیں کہ بنگلور سے واپس آکر عصمت نے انھیں اپنے خاص انداز میں نہایت محظوظ ہوتے ہوئے بتایا کہ صبح صبح وہ اُٹھیں تو سارا گھر سو رہا تھا۔ ان کا پنڈت آگیا اور تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ پریشان ہو کر کہنے لگا کہ مہورت نکلا جا رہا ہے اور گھر والے سوئے پڑے ہیں۔ میں پُوجا کیسے شروع کروں۔ مَیں نے کہا۔ اے پنڈت جی، فکر کس بات کی ہے۔ مَیں پُوجا شروع کروائے دیتی ہُوں۔ بس میں بیٹھ گئی اور پُوجا کروا دی ـــــ قرۃ العین حیدر نے حیران ہو کر پُوچھا "آپ نے پُوجا کس طرح کروائی؟" عصمت نے جواب دیا "اے۔ اس میں کیا تھا۔ پنڈت نے کہا "مَیں منتر پڑھتا ہوں۔ آگ میں تھوڑے تھوڑے چاول پھینکتی جائیے۔ مَیں چاول پھینکتی گئی۔ اتنے میں گھر کے اور لوگ بھی آگئے، بس[1]!"

عصمت کا اپنے آبائی مذہب سے بُعد، اور ہندو کلچر سے قُربت اُن کی ساری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ اِس میں ان کے ماں باپ اور بھائی عظیم بیگ کا بھی بہت اہم کردار رہا۔ عصمت نے مذہبِ اسلام کے جن عقائد کو ناپسند کیا اور جو اُن کی نظر و فکر کی کسوٹی پر پُورے نہ اُترے، اُن سے اُنھوں نے بلا تکلّف اور بلا تردّد

---

[1] قرۃ العین حیدر "لیڈی چنگیز خان" (مضمون) ماہنامہ آجکل، نئی دہلی (ماہ جنوری ۱۹۹۲ء) ص ۵

روگردانی کی۔ ہندو کلچر کی طرف اُن کا جُھکاؤ جذباتی اور سطحی نہیں بلکہ عقلی، منطقی اور شعوری تھا۔ اُنھوں نے ہندو مائی تھولوجی کا درس لیا اور اس پر ایمان لے آئیں۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

"میں نے ایک پنڈت جی سے گیتا کا سبق لیا اور ایک ایک شبد پر ایمان لائی۔ مجھے قبر سے خوف آتا ہے۔ میں تو بھسم ہونے کی وصیت کر چکی ہوں[1]۔"

اور وہ اپنے قول کی پکی اور سچی نکلیں اور بعد از مرگ ان کی وصیت کے مطابق اُن کے جسدِ خاکی کو نذرِ آتش کر دیا گیا —— اور اُن کے ہم مذہبوں کے ایک طبقے نے اِس غیر معمولی جسارت کی اُنھیں بڑی کڑی سزا دی —— درحقیقت اُن کی زندگی میں ہی انھیں ادبی اچھوت بنا دیا گیا تھا اور ایک طرح سے اُن کے ادب سے صرفِ نظر کیا گیا' جیسے عصمت نام کی کوئی ادیبہ کبھی تھی ہی نہیں۔ اِن تعصّب زدہ لوگوں سے کوئی پُوچھے کہ کیا ادب کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے؟

ہم اِس بنیادی حقیقت کو نہ بھُولیں کہ عصمت نے ہندو دھرم اختیار نہیں کیا۔ وہ از اوّل تا آخر مُسلمان رہیں لیکن اُنھوں نے اُس کلچر کو ضرور اپنایا جو ہندو مُسلم دونوں کی مشترکہ ہے۔ عصمت نے اپنی گفتار اور کردار سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہماری قومی سالمیّت اور یک جہتی کو اگر کوئی خطرہ ہے تو ان لوگوں سے جو مُلک کے بٹوارے کے بعد بھی اپنے پُرانے نظریے سے دست بردار ہونے کو تیّار نہیں اور جو یُوں تو سیکولرازم کی دُہائی دیتے رہیں اور ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت کی بات کرتے ہیں لیکن مخلوط کلچر کے نام پر بدک جاتے ہیں —— مذہب اور کلچر کے امتیاز کو مدِّنظر نہ رکھنا حقائق سے دیدہ دانستہ چشم پوشی کرنا ہے۔

●

---

[1] عصمت چغتائی: "عصمت چغتائی کے خطوط جو سپُردِ ڈاک نہ ہوسکے"، روزنامہ "ہند سماچار"، جالندھر (سنڈے ایڈیشن) مورخہ ۵-۱۲-۱۹۹۲)

BOOK EXTRACT / Girilal Jain

Nehru's view of India was synthetic

I have said that I am proud of our inheritance and our ancestors who gave an intellectual and cultural pre-eminence to India. How do you feel about this past? Do you feel that you are also sharers in it and inheritors of it and, therefore, proud of something that belong to you as much as to me? Or do you feel alien to it and pass it by without understanding it or feeling that strange thrill which comes from the realisation that we are the trustees and inheritors of this vast treasure.... You are Muslims and I am a Hindu. We may adhere to different religious faiths or even to none; but that does not take away from that cultural inheritance that is yours as well as mine.

THE HINDUSTAN TIMES
Dated 25.7.1994

O

Jinnah's secularism-II

By Madan Gopal

Having won the battle, the really secular Jinnah spoke to the Constituent Assembly of Pakistan on August 14, 1947.

"You are free; you are free to go to your temples, you are free to go to your mosques, or to any other place of worship in this state of Pakistan. You may belong to any religion or caste or creed. That has nothing to do with the fundamental principle that we are citizens and equal citizens of one state. Now, I think we should keep that in front of us as our ideal, and you will find that in the course of time, Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not in the religious sense, because that is the personal faith of each individual but in the political sense as citizens of the state."

THE HINDUSTAN TIMES
Dated 29.7.1994

شخصیّت اور فن پر خارجی اثرات

یہ جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عصمت کی شخصیت اور فن کو کن خارجی عناصر نے متاثر کیا۔ جبلّی خصائل تو انسان کو قضا و قدر سے ودیعت ہوتے ہیں، جن کا سرچشمہ ہمارے آبا و اجداد ہوتے ہیں لیکن شخصیّت کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے میں خارجی عناصر کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے کسی کی شخصیّت کو جاننے اور پہچاننے کے لئے ان خارجی عناصر کی نشاندہی ازبس ضروری ہو جاتی ہے۔

سماجی زندگی میں انسان کا جن لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے وُہ اُسے کسی نہ کسی طرح مثبت یا منفی طور پر متاثر کرتے ہیں۔ تاہم اس کے بیشتر تاثرات عارضی یا سطحی نوعیّت کے ہوتے ہیں جو انسان کے قلب و ذہن کو چھوئے بغیر اُوپر ہی سے گذر جاتے ہیں ——— لیکن کچھ لوگ ہمیں اپنی پُر تاثر شخصیّت سے، اپنی منفرد نظر و فکر سے، اپنے جُداگانہ عقائد اور نظریات سے، اپنی وسیع القلبی اور ژرف نگاہی سے، اپنے حسنِ سلوک اور برتاؤ سے اس قدر متاثر کرتے ہیں کہ ہماری زندگی پر ایک دائمی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ گویا ہماری انفرادیّت اور شخصیت کی تشکیل میں اس طرح کے لوگوں کا ایک اہم اور نمایاں رول ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی شخصیّت کا پُراثر، دلچسپ، جاذب اور اہم ہونے کا انحصار زیادہ تر اسی بات پر ہوتا ہے ———

بسا اوقات کسی مفکّر یا دانشور کا کہا ہُوا ایک جُملہ ہی ہماری زندگی کا دھارا موڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اور ہمیں انجانی حقیقتوں سے رُوشناس کراتا ہے —— ایک فنکار خاص طور سے ایک افسانہ نگار یا ناول نگار، جس کا نصب العین ہی انسانی زندگی کے ڈھکے چھپے پہلوؤں کو آشکار کرنا ہوتا ہے، انسانی زندگی کی یوں عکّاسی کرنا ہوتا ہے کہ وہ صفحۂ قرطاس پر جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، سانس لیتی دکھائی دے، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وُہ دیدہ و دل وا کر کے زندگی کو بہت قریب سے دیکھے، بہت غور و فکر سے پرکھے اور برتے اور اسے اپنے فکر و فن میں سموئے۔

بچپن کے تاثرات بہت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ وہ نفسیاتی طور پر انسان کو اس قدر

متاثر کرتے ہیں اس کی سائیکی (PSYCHE) پر دائمی اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ اور اس کی زندگی کو ظاہری اور باطنی طور پر ایک مخصوص شکل وصورت، ایک مخصوص آب ورنگ عطا کرتے ہیں ——— عصمت کی کتابِ حیات کا ورق ورق ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے۔ کیونکہ وہ خود اظہار کے معاملے میں بے حد نڈر اور بیباک تھیں اس لئے وہ اپنے خیالات کو، بغیر تصنع و بناوٹ کے، من وعن بیان کر دیتی ہیں اور اُن کا ظاہر و باطن ایک ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ اِس لئے ہمیں اُن کی زندگی کا محاسبہ کرنے اور جن شخصیتوں اور عناصر نے انھیں متاثر کیا، انھیں جاننے میں کوئی دقّت پیش نہیں آتی۔

شخصیتوں سے ہٹ کر کئی واقعات، تجربات اور سانحات بھی ایسے ہوتے ہیں جو انسانی زندگی کو فوری طور پر متاثر کرتے ہیں ——— اور ان سب سے الگ تھلگ، ایک باشعور، باذوق غور و فکر کے عادی انسان پر مطالعات بھی بے اختیار اپنی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ ارفع تصانیف کا مطالعہ بہترین دماغوں کے حامل مفکروں اور دانشوروں کے تجربات، نظریات اور عقائد کا نچوڑ اور لبِ لباب ہوتا ہے۔ ان سے استفادہ ایک مصنّف کے فکر و نظر کو گہرائی اور گیرائی عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بلا استثنیٰ ہر مصنّف، مفکر اور دانشور کو پڑھنے کا شائق پاتے ہیں۔

یہ مختصر سی تمہید، عصمت کو جن شخصیتوں اور عناصر نے جس طرح اور جس حد تک متاثر کیا نمایاں کرنے کے لئے کافی ہے کیونکہ اُن کی زندگی کوئی اسرار نہیں بلکہ اپنی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی ہوئی ایک بے صدا آواز ہے۔

○ عصمت کو بچپن میں سب سے زیادہ ان کے والدِ بزرگوار نے متاثر کیا۔ وہ ایک شفیق باپ اور روشن دماغ، دردمند اور جہاندیدہ شخص تھے۔ انھوں نے عصمت کو ان کے جبلّی خصائل اور عادات سے ہی بھانپ لیا تھا کہ ان کی ذہنی اُفتاد کیسی پڑی ہے اور کون سے عناصر ان کی جسمانی، ذہنی اور مادّی ترقّی میں سدِّراہ ہیں ——— معاشرے کے دستورِ بے دستور کے مطابق عصمت کے بھائی اُنھیں ایک لڑکی ہونے کے ناطے برابر کا درجہ دینے اور اپنا ہمسر ماننے سے قاصر تھے۔ وہ نہ ان کی تعلیم کے حق میں تھے اور نہ انھیں کھیل کود اور ایسے دوسرے مشاغل میں اپنے ساتھ شامل کرنے پر راضی تھے اور کیونکہ وہ عمر میں اُن سے چھوٹی تھیں وہ انھیں عضوِ معطّل یا مدِّ فضول سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ بھائیوں کے ساتھ عصمت کی والدہ بھی شریک تھیں، جو اپنے زمانے کی عام بڑی بوڑھیوں کی طرح ناخواندہ، تنگ نظر اور دقیانوسی خیالات کی حامل اور زمانہ کے تغیّرات سے بے خبر تھیں۔ انھوں نے خود کو ایک مثالی گھریلو عورت مان کر عصمت کو اپنے گھسے پِٹے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی۔ یہ عصمت کے والد ہی تھے، جو

عصمت کی شخصیت کے فروغ میں جو رکاوٹیں تھیں انھیں بڑی خوش اسلوبی سے ہٹاتے گئے اوران کی پیش رفت کے لئے راہ ہموار کرتے گئے۔ عصمت اپنی ماں اور بھائیوں کی کڑی مخالفت کے باوجود تعلیم حاصل کرنے پر سختی سے بضد رہیں، تو اُن کے والد نے اُنھیں حصولِ تعلیم کے لئے علی گڈھ جانے کی نہ صرف اجازت ہی دے دی بلکہ بڑی معقول رقم بھی فراہم کی تاکہ وُہ اپنی رضا ورغبت سے جس قدر چاہیں پڑھیں ——— عصمت نے کہا میں شادی نہیں کروں گی جب تک کہ میں اقتصادی طور پر خود کفیل نہ ہوجاؤں تو اُنھوں نے اپنا آگرہ کا ایک مکان اُن کے نام منتقل کردیا اور کہا کہ اب ہم تمھاری شادی کی ذمّہ داری سے دست بردار ہوتے ہیں تم جب جی چاہے شادی کرنا ——— بھائیوں نے عصمت کو لڑکی جان کر دھتکار پھٹکار کر الگ تھلگ کرنے کی کوشش کی تو والدِ محترم بھر آڑے آئے۔ مثال کے طور پر عصمت کی والدہ اور بھائیوں کی سخت مزاحمت کے باوجود، اُن کے والد نے حکم دیا کہ اُنھیں اُن کے بھائیوں کے ساتھ گھڑسواری اور نشانہ بازی سکھائی جائے۔ والد کے اِس فیصلے نے عصمت کو احساسِ خوداعتمادی اور فتح مندی عطا کیا ——— یہی نہیں عصمت کے اشتیاقِ تحصیلِ علم سے متاثر ہو کر وہ کبھی کبھی انھیں اپنے بزرگ احباب کے پاس بیٹھ کر مختلف موضوعات پر بحث سُننے کی اجازت بھی دے دیتے تھے۔ اس سے عصمت کے ذہن کی کھڑکیوں کے پٹ کھُل گئے اور اُنھیں نئے نئے خیالات اور نظریات سے استفادہ کرنے کا موقع ملا ——— عصمت نے کہا کہ میں پردہ نہیں کروں گی، برقعہ نہیں پہنوں گی تو گھر میں طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن والد جو وقت کی نبض پہچانتے تھے دیدہ دانستہ خاموش رہے اور یوُں ایک طرح سے درپردہ عصمت کو شہ دیتے رہے ——— عصمت نے اپنے والد کو "خُدا اور رسُول کے بعد سب سے قابلِ تعظیم ہستی مانا اور زندگی بھر ان کا ذکرِ خیر ممنونیت اور احسان مندی کے مظہر جذبہ سے کیا۔

○ دُوسرے شخص جنھوں نے عصمت کی تعلیم اور ذہنی تربیّت میں بہت نمایاں کردار ادا کیا وہ اُن کے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی تھے جن کا ذکر "مذہب" اور "پردہ" کے ابواب میں مذہب کے تعلّق کیا گیا ہے۔ اِسے فضلِ ربّانی کہئے کہ عصمت کو حاسد اور تنگ نظر بھائیوں کے جھُرمٹ میں عظیم بیگ جیسا پُرخلوص مشفق اور بہی خواہ بھائی ملا۔ عظیم بیگ دمہ اور تپدق جیسے موذی عوارض کے باعث نحیف ونزار ہوگئے تھے اور اپنے تنومند اور وجیہہ بھائیوں کے سامنے اپنے آپ کو بے بضاعت اور بے بس پاتے تھے۔ گو چھوٹے بھائی انھیں احترام وتعظیم دیتے تھے لیکن عظیم بیگ کو نقاہت اور ناتوانی کے باعث اپنی کمتری اور کہتری کا شدید احساس تھا۔ اس لئے اُنھیں عصمت سے ایک گونہ ہمدردی ہوگئی تھی۔ وہ چاہتے کہ وُہ اپنے دیگر بھائیوں کے دوش بدوش سربلند کر کے کھڑی ہوسکیں۔ اُنھوں نے عصمت کو بہت دانشمندانہ اور کارگر صلاح دی کہ تم لڑکی ہونے کے باعث جسمانی محنت مشقت میں اُن سے نبرد آزما نہ ہوسکو گی۔ اگر تم نے

اُن کو مات دینی ہے تو تعلیم کے میدان میں خم ٹھونک کر اُن کے سامنے آجاؤ اور اُن کا بھرم توڑ دو۔ کوئی اور تمھارا ساتھ نہیں دیتا نہ دے، میں دُوں گا۔ اور اُنھوں نے بے حد خلوص لگن اور محنت کے ساتھ عصمت کی تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُن کا جسم مُشتِ استخواں لیکن ذہن بے حد توانا تھا۔ وہ دن بھر کے تھکے ماندے شام کو کام سے لوٹتے اور بغیر آرام کئے عصمت کو پڑھانا شروع کر دیتے۔ عصمت نے ان سے انگریزی مسلم ہسٹری، قرآن شریف کا ترجمہ، حدیثیں وغیرہ پڑھیں۔ اکثر اوقات کھانستے کھانستے اُن کا دم اُلٹ جاتا لیکن پڑھانا جاری رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عصمت اسکول میں دوبارہ دوہری پروموشن پاکر اپنے بھائی شمیم سے جو اُن سے عمر میں ڈیڑھ سال بڑا اور اسکول میں تین درجے آگے تھا، جا ملیں اور ہوم ورک میں اُس کی مدد کرنے لگیں۔ شمیم میٹرک میں چار بار فیل ہُوا اور دل برداشتہ ہو کر تعلیم سے دست بردار ہو گیا۔ جبکہ عصمت قدم بقدم پیش رفت کرتی بی۔ اے بی ٹی کر گئیں۔ آج بی۔ اے بی ٹی ہر قدم پر ملتے ہیں مگر عصمت کے زمانے میں خال خال مُسلم لڑکی ہی اس درجے تک پہنچ پاتی تھی۔ اگر عظیم بیگ فرشتۂ رحمت بن کر نازل نہ ہوتے تو شاید عصمت کی تعلیم اَدھوری ہی رہ جاتی اور ان کا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا —— پھر عظیم بیگ کے ترّقی پسند عقائد نے عصمت کو وسیع النظری عطا کی اور اُن کی باغیانہ طبیعت کو ہَوا دی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُنھوں نے تمام کُنبے کی مزاحمت کے باوُجود پردہ ترک کر دیا اور بُرقعہ اُتار پھینکا —— عصمت اپنی تعطیلات عظیم بیگ کے ہاں گذارا کرتی تھیں۔ اُنھوں نے ہی انھیں ریاست جاورہ بلا کر، جہاں وُہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، اسکول میں بطور ہیڈ مسٹرس ملازمت دلوائی۔ ریاست میں عصمت کو ریاستی نظام کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ نواب کی تعیّش پسندی اور آمرانہ روّیہ، رعایا کی غربت، پسماندگی اور ناخواندگی نے انھیں بے طرح جھنجھوڑ دیا —— پھر عظیم بیگ خوُد ایک بہت معرُوف اور مقبُول طنز و مزاح نگار تھے اور کئی کتابوں کے مصنّف تھے۔ عصمت نے اُن کی انگیخت اور اُکساہٹ پر ہی لکھنا شروع کیا اور ایک نامور ادیبہ کے طور پر وقت کے ریگ زار پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ گئیں —— اِس طرح عظیم بیگ نے عصمت کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے، اقتصادی آزادی پانے اور ادبی میدان میں قدم جمانے میں قابِلِ تحسین کردار ادا کیا۔ عظیم بیگ عصمت کے لئے محض "برادرِ بزرگ" ہی نہیں "رہبرِ کامل" بھی تھے، جنھوں نے عصمت کی جبلّی اور فطری صلاحیتوں کو سنوارنے، نکھارنے اور اُبھارنے میں خضر آسا اُن کی رہنمائی کی۔

○ اپنے خاندان سے باہر جن لوگوں نے عصمت کو سب سے پہلے متاثر کیا اُن میں ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ، جنھیں علی گڈھ والے احترام سے "پاپا میاں" کہتے تھے، کی بڑی بیٹی ڈاکٹر رشید جہاں پیش پیش تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں عصمت کا رابطہ رشید جہاں سے ہُوا، جو بہت تعلیم یافتہ (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس)، آزاد خیال، پسماندۂ ظلم رسیدہ

عورتوں کے حقوق کی علمبردار اور اشتراکی نظریات کی حامل تھیں۔ عصمت کے نزدیک وُہ ایک "طوفانی ہستی" تھیں جنھوں نے انھیں ہلا کر رکھ دیا۔ اُن سے گھنٹوں باتیں کرنے پر بھی عصمت کا جی نہ بھرتا۔ انھوں نے عصمت کو اشتراکیت کے بُنیادی عقائد سے روشناس کرایا اور وہ "سرخ" نہیں تو "پیازی"، ضرور ہو گئیں۔ عصمت نے ان کو اپنا "گرو"، مانا اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنا عین سعادت جانا۔ عصمت کے الفاظ میں:

"ان سے جو سبق ہم نے پہلا سیکھا وُہ یہی تھا کہ مشاہدات اور تجربات کو زمانے کی جھوٹی اخلاقی اقدار سے خوف زدہ کرنے کی بجائے دِل کی بات بیباکی سے کہہ دو۔ ہندوستانی گھرانے میں جاگیری معاشرے نے عورتوں کو اتنا پابند بنا دیا تھا کہ وہ اپنی خواہشات، محسوسات اور سوچ کی غلام ہو گئی تھیں۔ ان ہی عورتوں کی نفسیاتی اُلجھنوں اور تضادات کو میں نے اپنے افسانوں میں کھُل کر بیان کیا۔"[1]

یہ بوسیدہ اور فرسودہ اخلاقی اقدار کو طاق میں رکھ کر اور تجربات اور مشاہدات کو مشعلِ راہ بنا کر، اپنی بات بے باکی اور دلیری سے کہہ دینے کا سبق تھا، جسے عصمت نے سیکھا اور اپنے فن اور زندگی میں سمویا —— نتیجہ یہ ہُوا کہ عصمت جاگیری نظام کی چکّی میں پستی اوسط طبقے کی مظلوم مُسلمان عورتوں کی گھُٹن، جلن اور تشنہ کامی کو نوکِ قلم پر لائیں، جو اُن کے زمانے میں بڑے دل گُردے کا کام تھا۔ اس دور میں خطِ مستقیم سے سرِ مو انحراف پر بھی مذہب، تہذیب اور اخلاق کے اجارہ داروں کی اُنگلی فوراً اُٹھ جاتی تھی لیکن عصمت اپنی ڈگر پر رواں دواں رہیں —— عصمت لکھتی ہیں:

"مجھے روتی بسورتی حرام کے بچّے جنتی ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ مخواہ کی وفا اور جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں، مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قطعی وُہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا، میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق مقویٔ دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ —— یہ سب میں نے رشید آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ آپا جیسی لڑکی سو لڑکیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔"[2]

---

[1] عصمت چغتائی "ملاقات۔ عصمت چغتائی" جلیل باز یدپوری، عصمت چغتائی نمبر (۱۹۹۱ء) اُردو ماہنامہ "مکالمات"، دہلی، ص ۲۳-۲۴

[2] عصمت چغتائی "بچپن اور خاندانی ماحول" عصمت چغتائی نمبر (۱۹۹۱ء) اُردو ماہنامہ "مکالمات"، دہلی، ص ۴۷

عصمت نے رشید جہاں کے نظریات کو اپنانے اور خود کو اُن کے سانچے میں ڈھالنے کی شعوری کوشش کی۔ حیران کن بات یہ ہے کہ رشید جہاں کے خیالات اور اعتقادات بہت حد تک پہلے ہی سے ان کے قلب و ذہن میں رچے بسے تھے۔ رشید جہاں کی قربت نے صرف اُن کی دھار تیز کر دی اور عصمت کے خیالات اور نظریات کو استحکام اور استقلال عطا کیا۔

○ عصمت کو متاثر کرنے والی ہستیوں میں ان کی بی اے میں انگریزی کی اسّی سالہ اُستاد ڈاکٹر ٹکّر بھی تھیں۔ وہ ایک عالم متبحّر تھیں۔ اُن کے شاگرد وُزرا، کمانڈر ان چیف جنرل اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز افسران رہے تھے ——— کئی اساتذہ اپنے بیکراں علم اور پُرخلوص رویّے سے طالب علموں کی زندگی کا رُخ ہی موڑ دیتے ہیں اور ان میں تحصیلِ علم کی ایسی شمع روشن کرتے ہیں جو عمر بھر زندگی کی اندھیری اور اُوبڑ کھابڑ راہوں میں انھیں راستہ دکھاتی رہتی ہے۔ علم کی شمع کی ضَو کبھی کم نہیں ہوتی بلکہ تحصیلِ علم کے ساتھ اس کی لَو زیادہ اُونچی، زیادہ روشن ہوتی جاتی ہے ——— ڈاکٹر ٹکّر نے عصمت میں علم کی وسعت، رفعت اور عُمق کا احساس پیدا کیا اور اُن پر غور و فکر کی راہیں کھول دیں۔ اور اُن میں خود سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کی استعداد پیدا کی، جو نعمتِ خداوندی ثابت ہوئی ——— جو موضوع بھی زیرِ بحث آتا، ڈاکٹر ٹکّر اس پر کمال دسترس اور وثوق سے بولتیں، کچھ اس طرح کہ اس کا کوئی گوشہ اَن چھُوا اور تشنہ نہ رہ جاتا۔ درس و تدریس سے عمر بھر ان کی وابستگی رہی تھی مگر پیرانہ سالی میں بھی اُن کا ذوق و شوق اور تجسّس کم نہ ہُوا تھا۔ طالبات کے کورس کو بالائے طاق رکھ کر وہ کبھی کبھی اُن اچھُوتے موضوعات پر اظہارِ خیال فرماتیں جو لڑکیوں کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوتے تھے ——— وہ کسی نظم کا کوئی ٹکڑا لیتیں اور اس پر گفتگو شروع کر دیتیں ۔ ہومر اور ورجل پر بغیر پیشگی تیاری کے مکمّل تیقّن کے ساتھ بولتیں۔ بائبل کی تفسیر ایک پیشہ ور مسیحی مبلّغ کی طرح یُوں کرتیں کہ لڑکیاں انگشت بدنداں رہ جاتیں ——— نظم، نثر، ڈرامے سے قطعِ نظر زندگی کے اسرار و رُموز کو بھی سُوت کی اَنٹی کی طرح کھولتی چلی جاتیں۔ وہ ایک مکمّل اُستاد تھیں اور لڑکیوں کے لئے ایک دوست، فلسفی اور رہبر کا درجہ رکھتی تھیں۔ ہر سال نئی لڑکیاں آتیں لیکن اُن کی گرمجوشی، خلوص اور اشتیاق میں کوئی کمی نہ آتی۔ وہ اپنے علم کی دولت کو بے دریغ اور بلا تخصیص ایک دریا دل سخی کی طرح دونوں ہاتھوں سے بانٹتیں۔ جزا اور ستائش سے بیگانہ اور بے نیاز[1] ——— عصمت ڈاکٹر ٹکّر کو ان لوگوں میں شمار کرتی تھیں، جنھوں نے ان کی زندگی کو معنویت اور مقصدیت عطا کی اور ان کے قلب و ذہن پر اپنی اَمٹ چھاپ چھوڑی۔

---

[1] عصمت چغتائی، "روشنی، روشنی، روشنی"۔ "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل"، نئی دہلی۔ مئی۔ ۱۹۸۰ء، ص ۱۷

عصمت لکھتی ہیں کہ ان کے لئے یہ بتانا محال ہے کہ انھیں کس کس نے متاثر کیا۔ درحقیقت جس کسی سے بھی انھیں سابقہ پڑا، وہ اپنا نقش چھوڑ گیا۔ یہ بات ہر حساس فنکار پر صادق آتی ہے ـــــ ڈاکٹر اشرف نے کتنے ہی عقدوں کو سلجھایا ـــــ ڈاکٹر رام بلاس شرما نے "بکھرے ہوئے تاروں کو جوڑ کر ایک سلسلہ قائم کرنے میں سہارا دیا" ـــــ "کرشن چندر کی کہانیوں میں عجیب عجیب نازک پھتروں سے ملاقات ہوئی" ـــــ فضل الرحمٰن، پرووائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے عصمت کو غیر شعوری طور پر بہت کچھ پڑھایا۔ اُن کے مطابق "میں اُنھیں ڈکشنری کی طرح استعمال کرتی ہوں۔ کسی بھی ڈرامہ یا شعر کا حوالہ دے دیجئے پھر وہ سناتے چلے جاتے ہیں" ـــــ عصمت کو ان کے شوہر شاہد لطیف نے بھی متاثر کیا۔ وہ ان کے خاوند بھی تھے اور دوست بھی۔ وہ عصمت کی تمام کہانیوں اور ناولوں پر نظرِ ثانی کرتے تھے۔ عصمت کی اَنا اور ہیکڑی شکر گذاری سے ان کی معاونت کا اعتراف کرنے میں سدِ راہ تھی لیکن دل ہی دل میں وہ ان کی قائل تھیں[1]

○ ان کے علاوہ عصمت کے کچھ ایسے بے تکلف دوست اور سہیلیاں بھی تھیں، جن سے گپ شپ ہوتی۔ ادبی بحث مباحثہ بھی ہوتا۔ پھلجھڑیاں چھوٹتیں، قہقہے لگائے جاتے، چونچیں بھی ہوتیں طبیعت بہل جاتی اور دل و دماغ تازہ ہو جاتے ـــــ عصمت کو بات چیت سے بہت رغبت تھی۔ چھیڑ چھاڑ کرنا، ہنسنا ہنسانا، فکر انگیز اور معنی خیز باتیں کہنا اور سننا انھیں بہت بھاتا تھا۔ اپنی اس جنڈلی کے سب لوگوں سے کسی نہ کسی اعتبار سے وہ متاثر تھیں کہ ہر ایک کا اپنا اپنا ایک مخصوص منصب و مقام تھا ـــــ سرِ فہرست سعادت حسن منٹو تھے۔ انُ سے گھنٹوں ادبی اور غیر ادبی امور پر بات چیت۔ بڑی گرمجوشی سے ہوتی کہ دونوں گرم مزاج اور تیز طرار تھے۔ کبھی کبھار تلخی و ترشی بھی در آتی۔ مگر چند ہی لمحوں میں روٹھے مَن بھی جاتے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی صحبت میں تلطف اور تلذذ حاصل ہوتا۔ عصمت لکھتی ہیں: "منٹو سے باتیں کر کے احساسات پر دھار آجاتی تھی۔ چھ چھ سات سات گھنٹے منٹوں میں گذر جاتے تھے"[2] ـــــ منٹو کی بیوی صفیہ بیگم سے بھی ان کی طویل گفتگو رہتی۔ مگر وہ ادبی سطح پر نہیں ہوتی تھی ـــــ علی سردار جعفری سے ان کی گرما گرم بحث ہوتی۔ کج بحثی اور جگلے بازی میں اُنھیں مزا آتا۔ عصمت لکھتی ہیں کہ: "جتنی تلخی، ترشی اور کاٹ اس شخص کی زبان میں ہے، اتنی ہی نرمی اور مٹھاس بھی ہے۔ جلانے پر آئے تو بھون کر رکھ دے" سردار جعفری کی بیوی سلطانہ جعفری سے بھی عام گپ شپ رہتی ـــــ قدسیہ زیدی سے باتیں کر کے جی ہی نہ بھرتا تھا" ـــــ سلمیٰ صدیقی (کرشن چندر کی اہلیہ) کے حسنِ زبان و بیاں کی وہ قائل

---

[1] ،[2] عصمت چغتائی "غبارِ کارواں" (مضمون) ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (نومبر ۱۹۷۰ء) ص ۱۳ ، ۱۲

تھیں "بس دو باتیں کرو کام و دہن معطر ہو جائے گا" ــــــ قرۃ العین حیدر "نہایت بکی واقع ہوئی ہیں۔ نہایت سرپٹ بولتی ہیں۔ جیسے بولنے کو بہت ہے اور وقت بھاگا جا رہا ہے"[1] ــــــ ایسے لوگوں میں عصمت کی ماموں زاد بہنیں اختر اور جمیلہ بھی شامل تھیں۔ ان کی خوش بیانی پر لوگ چونک پڑتے تھے۔ جب وہ بولتیں تو باقی سب ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ بقول عصمت "ٹوٹے اُدھورے کٹے کٹے جملے مگر معنی سے بھرپور۔ اُن کی زبان میں اپنی ننہیال کے ناطے دلّی کی بیگمات کی میٹھی بولی کا عجیب لٹکا ہے۔ میری کہانیوں میں مکالمے اُن ہی کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں"[2] ــــــ یہ ان کی زبان اور لب و لہجے کو عصمت کا خراجِ تحسین ہے۔ عصمت کے مکالمے ان کے ادب کی امتیازی خصوصیت ہیں جو کچھ حد تک اُن کی ماموں زاد بہنوں کے مرہونِ منت ہیں۔

ایک فنکار ہر کسی سے سیکھتا ہے اور تمام عمر سیکھتا ہی رہتا ہے "پیر شو بیا موز" کی مثال اس پر صادق آتی ہے۔ ایسا نہ ہو تو اُس کے فن میں تنوع اور گوناگونی کہاں سے آئے ــــــ علی گڑھ میں عصمت کا خاندانی دھوبی ننھا رام اُن کا گہرا دوست تھا۔ وہ علی گڑھ جاتیں تو وہ خود اُن کے کپڑے لینے آتا اور گھٹنوں اکڑوں بیٹھا گپّیں مارتا۔ وہ عصمت کو ایسی ایسی انوکھی اور نادر کہانیاں سُناتا جو اُنھوں نے کبھی پڑھی سُنی نہ تھیں۔ وہ عمر رسیدہ تھا اور اپنی کپکپاتی ہوئی آواز میں کتھا میں گا کر سُناتا تھا۔ چاندی کی انگوٹھی والی اُنگلی سے چوکھٹ پر تال دیتا ــ ہنکارے سے میوزک پیس بھی لگاتا جاتا۔ بیچ بیچ میں اپنے گُرو کے اقوال بھی دُہراتا جاتا ــــــ آلھا اودل بڑی گھن گرج سے سُناتا ــــــ رُخصت ہونے لگتا تو پانچ روپیہ انعام اور ایک روپیہ آمد و رفت کا کرایہ پاتا ــــــ اگر کہو تو ٹھیٹ برج بھاشا میں تشریح بھی کر دیتا۔ عصمت کے الفاظ میں "میں نے اُن کے طبقہ کی زبان اُن ہی سے سیکھی ہے"[3]۔

○ کسی ادیب یا شاعر کے لئے پڑھنا اور ہمیشہ پڑھتے رہنا اشد ضروری ہے۔ ورنہ اس کے علم کے سوتے جلد ہی خشک ہو جاتے ہیں اور وہ یا تو اپنے آپ کو دُہرانے لگتا ہے یا لکھنا بند کر دیتا ہے ــــــ پڑھنا نہ صرف توسیعِ علم کا باعث ہوتا ہے بلکہ وجہ انبساط بھی ــــــ جو لوگ ادیب یا شاعر نہیں ہوتے، صرف "علم دوست" ہی ہوتے ہیں ہم ان کے ہاں بھی ترتیب سے شلفوں پر لگی کتابوں کا جاذب نظر منظر دیکھتے ہیں ــــــ اور شاید ہی کوئی مصنّف ہو جسے پڑھنے کا "جنون" نہ ہو۔ پڑھنا نہ صرف تحصیلِ علم کا ذریعہ ہے بلکہ اعلیٰ اذہان سے غائبانہ تبادلۂ خیالات کا اہم وسیلہ بھی ہے۔

عصمت اپنے ذوق و شوقِ کُتب بینی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

---

[1] [2] [3] عصمت چغتائی "غبارِ کارواں" (مضمون) ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (نومبر ۱۹۷۰ء) ص ۱۲-۱۳-۱۴

"زندگی میں سب سے زیادہ مجھے کتابوں نے متاثر کیا ہے۔ مجھے ہر کتاب سے کچھ نہ کچھ ملا ہے۔ اپنی زیادہ تر اُلجھنوں کا جواب ان ہی میں ڈھونڈا اور پایا ہے۔ کتابیں قریب ترین دوست اور غمگسار ثابت ہوئی ہیں۔ ہزاروں محرومیاں، تاریکیاں ان ہی دوستوں کے سہارے جھیلی ہیں۔ ہر کتاب کے مصنف کو میں نے ایک قسم کا رشتہ دار سا محسوس کیا ہے۔ نام کہاں تک گنواؤں۔ ہارڈی، براؤنٹی سسٹرز سے شروع کرکے برنارڈ شا تک پہنچی۔ مگر روسی ادیبوں نے زیادہ متاثر کیا اور جب عقل و ہوش کو کسی راہبر کی تلاش تھی تب ان کتابوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ پولیٹیکل فلاسفی خشک مضمون رہی اور روسی ادب ذہن کے کونے کونے میں جذب ہوگیا۔ چیخوف کو تو میں آج بھی برکت کے لئے آموختہ کے طور پر پڑھتی ہوں۔ جب کوئی کہانی قابو میں نہیں آتی۔ پتہ نہیں چلتا کہاں سے شروع کروں کہاں ختم کروں تو میں دماغی ورزش کے لئے چند کہانیاں چیخوف کی پڑھ ڈالتی ہوں۔ ایک دم ذہن پر دھار سی رکھ جاتی ہے اور قلم چل نکلتا ہے۔"[1]

ادبی و علمی اعتبار سے وسعتِ نظری پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے یا باذوق پڑھے لکھے اصحاب کی صحبت سے۔ اور دونوں ہی میسّر ہوں تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔

آئی ٹی کالج لکھنؤ میں جس چیز نے عصمت کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ وہاں کی نہایت خوبصورت اور وسیع لائبریری تھی جو ہزاروں کتابوں سے سلیقہ اور قرینہ سے سجی سنوری تھی۔ ان کے پہلے چند روز تو قعرِ حیرت میں گم کتابوں کو دیکھنے ہی میں صرف ہو گئے ——— لائبریری میں جاکر ان پر نشہ سا طاری ہو جاتا تھا۔ پُرانی اور نئی کتابوں میں ایک عجیب سی دلِ خوش کُن خوشبو سی ہوتی ہے۔ عصمت انھیں اشتیاق سے کھول کر سُونگھا کرتیں۔

کالج کے زمانے میں رات کو ہوسٹل میں مقررہ وقت پر روشنی بند کرنی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی کسی کتاب میں یوں ڈوب جاتیں کہ روشنی بند کرنے کا گھنٹہ بج جاتا، میٹرن آکر منع کرتی اور بغیر روشنی گُل کئے نہ ٹلتی تو وہ کسی سینئر (بی۔ اے، ایم۔ اے فائینل کی لڑکی) کے کمرے میں جاکر پڑھتیں۔ اگر وہاں بھی میٹرن کے آنے کی آہٹ ہوتی تو باتھ روم میں جاکر بیٹھ جاتیں۔ اُن کا ذوقِ کُتب بینی بے پناہ تھا۔ انھوں نے امام حسینؑ پر اپنی کتاب "ایک قطرۂ خون" لکھنے سے پیشتر انیس کے مراثی کی پانچ جلدیں بڑی توجہ سے پڑھیں۔ اور بھی

---

[1] عصمت چغتائی: "روشنی، روشنی، روشنی"، "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل"۔ نئی دہلی (مئی ۱۹۸۰ء) ص ۱۷

اس موضوع سے متعلق انھیں جو مواد ملا اسے انھوں نے ایک محقق کی نظر سے پڑھا۔ تب کہیں انھوں نے اپنا ناول لکھا ـــــ انھیں ہندو مائی تھولوجی سے رغبت ہوئی تو باقاعدہ ایک وِدوان پنڈت کی زیرِ ہدایت مہینوں اس کا مطالعہ کیا تب اس پر ایمان لائیں۔ کہنے کا حاصل یہ کہ مطالعہ ان کے لئے اتنا ہی اشد ضروری تھا جتنا کہ کھانا یا نہانا دھونا یا سونا ـــــ یہاں یہ لکھنا غیر موزوں نہ ہوگا کہ عصمت کے شوہر شاہد لطیف بھی کتابوں کے دیوانے تھے۔ وہ ہمہ وقت ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں کتاب لئے رہتے تھے۔ قریب قریب ہر ماہ دو تین سو کی کتابیں خرید کرتے۔ کمیاب اور نایاب کتابیں پرانی کتابوں کی دکانوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے۔ جوئندہ یابندہ کے مصداق ہر وقت اچھی کتابوں کی تلاش میں رہتے۔ انھوں نے نہ جانے کتنی گرانقدر کتابیں جمع کرلی تھیں، جنھیں عصمت بصد اشتیاق چاٹ گئیں۔ شاہد لطیف کی زندگی میں انھوں نے کبھی کتاب نہ خریدی ـــــ رات کو سونے سے پیشتر ان کا کچھ پڑھنا زندگی بھر کا معمول رہا۔ بستر پر کتابیں اور رسالے نہ پڑے ہوں تو انھیں گھر سونا سونا لگتا تھا۔[1]

یہ اُن خارجی عناصر کا تفصیلی بیان ہے جنھوں نے عصمت کی شخصیت اور فن کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا۔ والدِ محترم، برادرِ بزرگ عظیم بیگ، ڈاکٹر رشید جہاں، اساتذہ، عزیز دوست اور مطالعہ ان سب نے مل کر ان کی شخصیت اور فن کی تہذیب، تشکیل اور تکمیل میں نمایاں کردار ادا کیا ـــــ وہ نہ صرف ایک منفرد ادیبہ تھیں، ایک منفرد شخصیت بھی تھیں۔ اردو ادب میں شخصیت اور فن دونوں اعتبار سے اُن کا ایک اپنا منصب و مقام ہے۔

●

---

[1] عصمت چغتائی "روشنی، روشنی، روشنی" "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ آجکل، نئی دہلی۔ (مئی ۱۹۸۰ء)

لحاف

(مقدمے کی روداد)

عصمت چغتائی نے ۱۹۴۲ء میں جب اپنی مشہور کہانی "لحاف" لکھی تو وہ اپنے بھائی کے ہاں مقیم تھیں۔ کہانی رات کو لکھ کر صبح انھوں نے اپنی بھاوج کو سنائی (ایسے ہی جیسے منٹو اکثر کہانی لکھ کر اپنی بیوی صفیہ بیگم کو سنایا کرتے تھے یا کرشن چندر سلمیٰ صدیقی کو) —— کہانی کی ادبی حیثیت کی بابت تو وہ خاموش رہیں لیکن پہچان گئیں کہ وہ کن بیگم صاحبہ سے متعلق ہے۔

عصمت نے کہانی کو ماہنامہ "ادبِ لطیف"، لاہور کو برائے اشاعت بھیج دیا اور وہ جوں کی توں چھپ گئی ——
انھی دنوں شاہد احمد دہلوی مدیر ماہنامہ "ساقی"، دہلی نے عصمت کی کہانیوں کا مجموعہ شائع کیا تو انھوں نے "لحاف" کو بھی اس میں شامل کر لیا —— تب عصمت کی شادی شاہد لطیف سے عنقریب ہونے ہی والی تھی۔ وہ خود افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے کہانی پڑھی تو ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ آپس میں خوب جھک جھک، تو تو میں میں ہوئی۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا بہرحال گرتے پڑتے، "نہ نہ" کرتے شادی ہو گئی۔

دسمبر ۱۹۴۴ء میں ایک پولیس انسپکٹر نے چند کانسٹیبلوں کی معیت میں عصمت کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ اس وقت عصمت، شاہد لطیف اور محسن عبداللہ گھر پر موجود تھے۔ پولیس انسپکٹر نے عصمت کو بتایا کہ اُن کے نام کورٹ سے سمن آیا ہے، جس کے مطابق انھیں دو فروری ۱۹۴۵ء کو اسپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں لاہور حاضر ہونا ہے۔ غیر حاضری کی صورت میں سخت کارروائی کی جائے گی —— عصمت نے معاملے کی سنجیدگی کا احساس نہ کرتے ہوئے اپنی روایتی خود پسندی اور ہیکڑی میں سمن لینے سے انکار کر دیا اور انسپکٹر پولیس سے کج بحثی پر اُتر آئیں۔ شاہد لطیف اور محسن عبداللہ کے سمجھانے بجھانے پر انھیں صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوا تو وہ سمن لینے پر راضی ہو گئیں ——

عصمت لکھتی ہیں:

"سمن کی سُرخی پڑھ کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ لکھا تھا: ISMAT CHUGHTAI VS THE CROWN

ارے یہ بادشاہ سلامت کو مجھ سے کیا شکایت ہو گئی جو مقدمہ ٹھونک دیا؟"

"مذاق نہ کیجئے" انسپکٹر صاحب سختی سے بولے۔ "پڑھ کر دستخط کر دیجئے۔"[1]

---

[1] عصمت چغتائی۔ "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل"، نئی دہلی (مارچ ۱۹۷۹ء) ص ۳

عصمت نے دستخط کر دیئے۔ اب اُن پر یہ بات روشن ہوگئی کہ ان کی کہانی "لحاف" کو لے کر فحاشی کے الزام میں سرکار عالی مدار نے اُن پر مقدّمہ دائر کر دیا ہے۔ اور اب سمّن کی تعمیل اُن پر قانونی طور پر لازم ہے۔

اب ضابطے کے مطابق انسپکٹر نے انھیں تھانہ چل کر ضمانت دینے کے لئے کہا۔ عصمت نے بہت پیچ و تاب کھایا۔ وہ بہت جز بز ہوئیں لیکن اس کارروائی سے مفر ممکن نہ تھا۔ بالآخر شاہد لطیف اور محسن عبداللہ کے کہنے سُننے پر وہ اُن کے ساتھ ماہم تھانہ گئیں اور محسن عبداللہ نے اُن کی پانچ سو روپیہ ضمانت دے کر گلو خلاصی کرائی۔

گھر واپس آکر عصمت اور شاہد لطیف اور محسن عبداللہ میں بہت جھگڑا ہوا۔ بہت تلخ و تُرش باتیں کہہ کر دلوں کی بھڑاس نکالی گئی۔ شاہد لطیف رات بھر کڑھتا اور سُلگتا رہا۔ پھر بھی اس کا غم و غصّہ فرو نہ ہوا۔ نوبت طلاق تک آ پہنچی لیکن عصمت جھکی دبی نہیں — عصمت نے محسن عبداللہ کا منہ یہ کہہ کر بند کر دیا کہ اگر تم نے زیادہ بک بک جھک جھک کی تو میں انڈر گراؤنڈ چلی جاؤں گی اور تمھاری پانچ سو روپیہ ضمانت اپنے آپ ضبط ہو جائے گی اور یہ شاید کھوکھلی دھمکی نہ تھی کہ عصمت بالعموم جو کچھ کہتی تھیں کر گذرتی تھیں — لیکن شاہد لطیف مقدّمہ بازی اور بدنامی کی تحقیر و تذلیل سے ذہنی طور پر مصالحت کرنے سے قاصر تھا۔ یہ خیال ہی اُس کے لئے باعثِ شرم و ندامت تھا کہ فحاشی کے الزام میں مقدّمے کی بابت پڑھ کر اس کے اعزا و اقارب اور دوست احباب اُن کی بابت کیا رائے قائم کریں گے۔ اور اُس کا یہ احساس بے بُنیاد نہ تھا — جب یہ خبر رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئی تو ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ عصمت کے سُسر نے شاہد لطیف کو رنجیدہ خاطر ہو کر ایک بہت جذباتی خط لکھا:

"دلہن کو سمجھاؤ۔ کچھ اللہ رسُول کی باتیں لکھیں کہ عاقبت درُست ہو۔ مقدّمہ اور وہ بھی فحاشی پر۔ ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ اللہ رحم کرے"[1]

یہاں یہ جاننا ضرُوری ہے کہ آخر "لحاف" میں ایسی کونسی فحش بات تھی جس کے سبب قانون کی "جبینِ ناز" پر شکن پڑ گئے۔ اور اُس نے عصمت کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہم اِس افسانہ کو بار بار پڑھیں تو ہم پر یہ احساس حاوی ہو جاتا ہے کہ اس افسانہ میں ایسی کوئی بات نہیں جس پر اُنگلی رکھ کر کہا جاسکے کہ یہ بات اخلاق و آداب سے گری ہوئی ہے اور فحاشی کی زد میں آتی ہے کہ کوئی بات کھُل کر اور عریاں طور پر قلم بند نہیں کی گئی۔ ہر بات اشارے کنائے سے تہذیب کی حدُود میں رہ کر نوکِ قلم پر لائی گئی ہے — ہاں ایک فن شناس، معاملہ فہم، دُور رس ناقد یا قاری یہ ضرُور محسُوس کرتا ہے کہ اگر فحاشی کہیں ہے تو وہ کہانی کے موضُوع میں پنہاں ہے کہ ہم جنسیت (LESBIANISM) کا موضوع، جس پر یہ کہانی مبنی ہے شاید "شجرِ ممنُوعہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاید یہ موضوع ہی "ناگفتنی" ہے۔ اور اس پر

---

[1] عصمت چغتائی "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (مارچ ۱۹۷۹ء) ص ۲۴

قلم اُٹھانا ہی فحاشی کے الزام کو دعوت دینا ہے —— بہرحال "لحاف" کے چند اقتباسات پیش ہیں جن سے قانون کی برہمی کا سبب عیاں ہو سکتا ہے :

- "کمرے میں گھُپ اندھیرا اور اس اندھیرے میں بیگم جان کا "لحاف" ایسے ہل رہا تھا جیسے اس میں ہاتھی بند ہو۔" بیگم جان" میں نے ڈری ہوئی آواز نکالی۔ ہاتھی ہلنا بند ہو گیا۔ لحاف نیچے دب گیا۔"
- "ربو ہچکیاں لے کر روئی۔ پھر بلی کی طرح سپر سپر رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں۔ اوہ میں تو گھبرا کر سو گئی۔"
- "ہاتھ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم بھی نہیں ہوا۔ بیگم جان تو چت لیٹی تھیں اور میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا —— "ادھر آ کر میرے پاس لیٹ جا۔" انھوں نے مجھے بازو پر سر رکھ کر لٹایا۔" اوں" میں منمنائی —— "اوئی۔ تو کیا میں کھا جاؤں گی" —— میرا دل چاہا کسی طرح بھاگوں اور انھوں نے زور سے بھینچا۔" اوں"۔ میں مچل گئی —— باوجود سردیوں کے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُن کے ہونٹوں اور ناک پر چمک رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ ٹھنڈے سرد تھے مگر نرم نرم —— انھوں نے شال اُتار دی تھی —— اور مجھے ایک مٹی کے کھلونے کی طرح بھینچ رہی تھیں —— اُن کے گرم گرم جسم سے میرا دل بولانے لگا۔ مگر اُن پر تو جیسے بھُتنا سوار تھا۔"
- تھوڑی دیر کے بعد وُہ پست ہو کر نڈھال لیٹ گئیں۔ اُن کا چہرہ پھیکا اور بدرونق ہو گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔"
- "اور پھر اس کے بعد بیگم جان کو دَورہ پڑ گیا۔ سونے کا ہار جو تھوڑی دیر پہلے مجھے پہنا رہی تھیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مہین جالی کا دوپٹہ تار تار۔ اور وُہ مانگ جو میں نے کبھی بگڑی نہ دیکھی تھی، جھاڑ جھنکاڑ ہو گئی —— "اوہ —— اوہ —— اوہ" —— وہ جھٹکے لے لے کر چلانے لگیں —— بڑی جتنوں سے بیگم جان کو ہوش آیا۔"
- "ہاتھی پھڑ پھڑ کر رہا تھا۔ اور جیسے اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا —— چپڑ چپڑ کھانے کی کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی مزیدار چٹنی چکھ رہا ہو۔"
- "میں نے ڈرتے ڈرتے پلنگ کی دوسری طرف پیر اُتارے اور سرہانے ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبایا۔ ہاتھی نے لحاف کے نیچے ایک قلابازی لگائی اور پچک گیا۔ قلابازی لگانے میں لحاف کا کونا

فٹ بھر اُٹھا ـــــ اللہ ۔ میں غڑاپ سے بچھونے میں تھی۔

اِن اقتباسات سے ہم آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قانون کی برہمی کا سبب کیا ہوسکتا ہے۔ اس افسانے میں جو باتیں جنسی عمل کے تعلق سے اشارے کنائے سے کہی گئی ہیں ان میں لحاف کے اندر ہاتھی کا اُبھرنا اور واحد متکلم کے بیگم جان کو آواز دینے پر بیٹھ جانا، بلّی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے کی آوازیں آنا، واحد متکلم سے مالش کراتے ہوئے بیگم جان کا اچانک چت لیٹ جانا، سردیوں کے باوجود بیگم جان کے ہونٹوں اور ناک پر پسینے کی بوندوں کا نمودار ہونا، لحاف میں ہاتھی کا اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کرنا، پھر چپڑ چپڑ کھانے کی کچھ آوازیں سنائی دینا جیسے کوئی مزیدار چٹنی چکھ رہا ہو، شامل ہیں ـــــ قاری اندازے اور قیافے سے کسی معقول نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔ مگر یہ سب باتیں ڈھکی چھپی ہیں۔ پورے افسانے میں نہ تو کوئی فحش جنسی جذبات کو مشتعل کرنے والی زبان استعمال کی گئی ہے اور نہ ہی جنسی حرکات کا کھلا بیان ہے۔ ہر بات نظم و ضبطِ اخلاق اور آداب کی حدود میں رہ کر، کم از کم الفاظ میں کہی گئی ہے ـــــ مگر یہ موضوع ہی عریاں اور فحش ہے۔ بدیں وجہ اخلاق کے داعیوں، فن کے منتسبوں اور قانون کے پاسبانوں کی انگلی لامحالہ اُٹھ جاتی ہے ـــــ اور فنکار انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

اس واقعہ کی بابت منٹو کو پتہ چلا تو انھوں نے عصمت کو فون پر بتایا کہ اُن پر بھی اُن کے افسانے "دھواں" کو لے کر فحاشی کے الزام میں حکومت نے مقدمہ دائر کردیا ہے۔ اور حسنِ اتفاق سے اُن کا مقدمہ بھی اُسی روز اُسی عدالت میں ہے ـــــ اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنی اہلیہ صفیہ بیگم کے ساتھ عصمت کے ہاں پہنچ گئے۔ وہ بہت پُرمسرت اور پُرجوش تھے جیسے کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دیا ہو ـــــ عصمت اُوپری طور پر بڑی حوصلہ مندی اور جیداری سے معاملہ کا سامنا کر رہی تھیں لیکن اندر ہی اندر ان کے دل میں دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی۔ منٹو کی آمد پر اُن کی ڈھارس بندھی۔ چنانچہ عصمت لکھتی ہیں: "منٹو نے وہ شہ دی کہ میرا ڈر بھی نکل گیا۔" شاہد لطیف کو بھی حوصلہ ملا۔

منٹو اس میدان کے شہسوار تھے۔ یہ اُن کا فحاشی کے الزام میں پہلا مقدمہ نہ تھا۔ انھوں نے کچہریوں کی خاک بہت چھانی تھی اور وہاں کی اُجاڑ اور اُداس فضا سے بھی مانوس تھے۔ وہ اُردو ادب کے نام نہاد پاسبانوں اور نگہبانوں کو خوب جانتے تھے، جو اخلاق اور تہذیب کے نام پر شور و غوغا مچا کر پریس برانچ کو ادیبوں کے خلاف مقدمات دائر کرنے پر اُکساتے رہتے تھے ـــــ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ادبی شاہپاروں کی صحیح قدر و قیمت کو ایسے ہی جانتے تھے جیسے جواہر کو جوہری۔ بدیں وجہ وہ غیر موافق خارجی حالات سے بآسانی متاثر نہیں ہوتے تھے۔ ان میں بلا کا دم تھا اور وہ خود اپنے محافظ تھے ـــــ درحقیقت مقدمے کا خوف تو کجا، انھیں بیحد خوشی

---

[1] عصمت چغتائی، "لحاف"، اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۰، ۱۹۲، ۱۹۴

تھی کہ انھیں اسی بہانے لاہور جانے اور ہم پیالہ ہم نوالہ احباب سے ملاقات کا موقع ملے گا۔ ناؤ ونوش کی محفلیں گرم ہوں گی اور گذرے ہوئے حسین ایام کی یادیں پھر سے تازہ ہو جائیں گی (— اُنھوں نے عصمت اور شاہد لطیف کو افسردہ اور پژمردہ دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں والہانہ جوش و خروش سے کہا :

"ارے ایک ہی تو مرکے کی چیز لکھی ہے آپ نے — اماں شاہد تم بھی کیا آدمی ہو۔ یار تم بھی چلنا تم نے جاڑوں کا لاہور نہیں دیکھا۔ خدا کی قسم ہم تمھیں اپنا لاہور دکھائیں گے۔ کیا تیکھی سردی پڑتی ہے۔ تلی ہوئی مچھلی آہاہا، وہسکی کے ساتھ۔ آتش دان میں دہکتی ہوئی آگ، جیسے عاشقوں کے دل جل رہے ہوں۔ اور بلڈ ریڈ مالٹے۔ آہا۔ جیسے معشوق کے بوسے۔" — "ارے چپ کرو منٹو صاحب! صفیہ نے اُن کی زبان کے اُمڈتے ہوئے بہاؤ کو باندھ لگاتے ہوئے کہا۔[1])

اُدھر عصمت کے ہاں مغلظات بھرے خطوط کا تانتا لگ گیا۔ اُن کی اگلی پچھلی سات پشتوں کو پُن کے رکھ دیا گیا۔ گالیاں بھی ایسی ایسی نادر اور اَن سُنی کہ لکھنے والوں کی جودتِ طبع کی داد دینے کو بے اختیار جی چاہے۔ عصمت خط کھولتے ہوئے ڈر جاتیں اور ایک اُچٹتی سی نظر ڈال کر انھیں نذرِ آتش کر دیتیں۔ رسائل اور اخبارات میں "لحاف" کولے کر عصمت کے خلاف مضامین کی ایک باڑھ سی آگئی۔ وہ سخت جان تھیں، جھیل گئیں۔ مگر اُنھوں نے کسی کے ساتھ بحث مُباحثہ میں نہ اُلجھنے کو ہی قرینِ مصلحت جانا — عصمت کو احساس ہو گیا تھا کہ اُن سے لغزش ہو گئی ہے۔ لیکن ؎ خود کردہ را علاجے نیست۔ چنانچہ وُہ لکھتی ہیں:

"میں نے کبھی اپنی غلطی کو ماننے سے انکار نہیں کیا۔ ہاں مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ مجھے اپنے جُرم کا اعتراف تھا۔ صرف منٹو ایک ایسا انسان تھا، جو میرے اِس بُزدلانہ رویّہ پر بھڑک اُٹھتا تھا۔ مَیں خود اپنے خلاف تھی اور وہ میری حمایت کرتا تھا۔"[2]

اس مقدّمے میں منٹو عصمت کے لئے ریڑھ کی ہڈّی تھے۔ اُن کی ہمّت اور حوصلہ بڑھانے والے۔ انھیں جُرأت اور جسارت کا درس دینے والے، عصمت کا دَم خم منٹو کی بدولت تھا۔ عصمت، شاہد لطیف کی معیّت میں بمبئی سے مقرّرہ تاریخ کو عدالت میں حاضر ہونے کے لئے لاہور کے لئے روانہ ہوئیں۔ دہلی سے شاہد احمد دہلوی مُدیر ماہنامہ "ساقی"، دہلی اور اُن کے کاتب جنھوں نے کہانیوں کے اُس مجموعے کی کتابت کی تھی جس میں "لحاف" شامل تھا، اُن کے ساتھ ہو گئے۔ حکومت نے شاہد احمد دہلوی کو مجموعہ شائع کرنے اور اُن کے کاتبوں کو اس کی کتابت

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ "کاغذی ہے پیرہن"، ماہنامہ "آجکل"، نئی دہلی۔ (مارچ ۱۹۷۹ء) ص ۴

کرنے کے جُرم میں مقدمے میں ماخوذ کر لیا تھا ـــــ یہ مقدمہ ماہنامہ "ادبِ لطیف"، لاہور پر نہیں بلکہ عصمت کے افسانوں کے مجموعے پر چلایا گیا تھا۔

لاہور میں شاہد احمد دہلوی اور عصمت مشہور ادیب اور ناول نگار ایم۔ اسلم کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ اِدھر دُعا سلام ہوئی اُدھر ایم۔ اسلم نے عصمت کو اُن کی عریاں نگاری پر جھاڑنا پھٹکارنا شروع کر دیا۔ عصمت پر بھی بھوت سوار ہو گیا۔ وہ اُن سے بھڑ گئیں اور اُنھوں نے بھی اُنھیں ان کی کتابوں کے حوالوں سے تُرکی بہ تُرکی جواب دیئے۔ بہت لے دے کے بعد دونوں جب ذرا ٹھنڈے ہوئے تو عصمت نے مصالحت کی غرض سے بہت عجز و انکسار سے کہا:

"اصل میں اسلم صاحب مجھے کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ "لحاف" والے موضوع پر لکھنا گناہ ہے۔ نہ میں نے کسی کتاب میں پڑھا کہ اس مرض یا لَت کے بارے میں نہیں لکھنا چاہیئے۔ شاید میرا دماغ عبدالرحمٰن چغتائی کا برش نہیں ایک سستا سا کیمرہ ہے جو کچھ دیکھتا ہے، کھٹ سا بٹن دب جاتا ہے اور میرا قلم میرے ہاتھ میں بے بس ہوتا ہے۔ میرا دماغ اسے ورغلا دیتا ہے۔ دماغ اور قلم کے قضیہ میں دخل انداز نہیں ہو پاتی۔"[1]

عصمت فی الواقع اِس حقیقت سے بے خبر تھیں کہ ہم جنسیت جیسے بے حد نازک اور جوکھم بھرے موضوع پر لکھنا ان کے لئے اس قدر مصیبت کا باعث ثابت ہوگا۔ اور اُنھیں ادبی حلقوں سے متعلق، دوست احباب میں خجل اور خفیف ہونا پڑے گا۔ اگر اُنھیں اِس بات کا احساس ہوتا تو یقیناً یہ نوبت ہی نہ آتی۔ لیکن اب جب سر پر آن ہی پڑی تو صبر و تحمل سے اس کا سامنا کرنا ہی مناسب ہوگا اور جو گذرے اُسے خندہ پیشانی سے سہنا ہوگا۔

ایم۔ اسلم نے اُنھیں مشورہ دیا کہ وہ اور منٹو معافی مانگ لیں تو فوراً اُن کی گلو خلاصی ہو جائے گی۔ ورنہ دو سو سے پانچ سو روپیہ تک جُرمانہ ہو سکتا ہے اور بدنامی اس کے علاوہ ہوگی ـــــ عصمت نے جواب دیا کہ جُرمانہ تو جوں توں اِدھر اُدھر سے لے دے کر ادا کر دیا جائے گا اور جہاں تک بدنامی کا تعلق ہے وہ تو پہلے ہی بہت ہو چکی ہے اب مزید کیا ہوگی۔

منٹو بھی بمبئی سے لاہور پہنچ گئے ـــــ منٹو اور عصمت دونوں نے مصلحتاً ایک ہی وکیل مسٹر ہیرالال کی خدمات حاصل کیں کیونکہ دونوں کے مقدمات کی نوعیت ایک سی تھی اور اُن کی پیشی بھی ایک ہی عدالت میں تھی۔

---

[1] عصمت چغتائی "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ (مارچ ۱۹۷۹ء) ص ۶

دونوں نے اپنے وکیل کے ذریعے درخواست دی کہ انھیں اپنا کام کاج چھوڑ کر بمبئی سے لمبا سفر طے کر کے بار بار لاہور پیشی بھگتنے کے لئے آنا پڑے گا۔ اس لئے اُنھیں حاضر ہونے سے معاف فرمایا جائے۔ مجسٹریٹ صاحب نے درخواست ردّ کر دی۔ اب منٹو اور عصمت کو اس تلخ و سنگین حقیقت کا احساس ہُوا کہ وہ دونوں قانون کی نظروں میں فی الواقع مجرم ہیں اور عدالت کے رحم و کرم پر ہیں۔ اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل داخل کر دی گئی۔ اور دُوسرے دن منٹو اور عصمت جسٹس اچھرو رام کی عدالت میں پیش ہوئے۔ انھوں نے دونوں کو غور سے دیکھا اور کہا۔ "مجھے آپ دونوں کے افسانے بہت پسند ہیں" منٹو اور عصمت بہت خوش ہوئے کہ یہ الفاظ جسٹس اچھرو رام کے مُنہ سے نکلے تھے، جو نہ صرف ایک معزز جج تھے بلکہ جنھیں اُردو ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ منٹو اور عصمت کو اپنے سامنے بطور ملزم دیکھتے ہی وُہ ان کی مقبولیت اور ادبی قامت کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے لیکن جسٹس اچھرو رام نے کیس آنریبل جسٹس دین محمّد کی عدالت میں منتقل کر دیا۔ اگلے روز دونوں اُن کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ جسٹس دین محمّد نے قہر آلود نگاہوں سے انھیں دیکھا اور بڑبڑائے "ان لوگوں کا وجود ہی ننگِ ادب ہے" انھوں نے پہلے تو اپیل منظور کرنے سے انکار کر دیا لیکن پھر ردّ و کد کے بعد نیم دلی سے درخواست **منظور** کر لی۔

عدالت میں بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ بیشتر لوگ منٹو کے دوست اور پرستار تھے یا ادب و شعر سے وابستہ تھے۔ کچھ لوگ ازراہِ تجسس بھی پہنچ گئے تھے کہ دیکھیئے کیا ہوتا ہے اور کچھ محض اس لئے کہ اس ادیبہ کو ایک نظر دیکھ لیں جس نے اپنے بے باک اور بے حجاب افسانے سے برِّصغیر کے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ اُن کے نزدیک عصمت ایک نادرالوجود اور فقید المثال فنکارہ تھیں جنھوں نے ایک ممنوعہ موضوع پر لکھنے کی جسارت کی تھی۔

عدالت کی پہلی پیشی پر کوئی خاص کارروائی نہ ہُوئی۔ جج صاحب نے عصمت سے فقط یہ پُوچھا کہ کیا آپ نے افسانہ "لحاف" لکھا ہے۔ عصمت نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے اقبالِ جرم کیا۔ اور بس۔ سارا وقت فریقین کے وکیل بولتے رہے اور کیونکہ عصمت اور منٹو آپس میں سرگوشیوں میں مصروف رہے، اُن کے پلّے کچھ بھی نہ پڑا ـــــ اب اُنھیں دُوسری پیشی پر آنا تھا۔

عصمت اور منٹو کے کئی بہی خواہوں اور مدّاحوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ معافی مانگ کر معاملہ ختم کریں اور ذہنی کوفت سے جو اُنھیں ہو رہی ہے چھٹکارہ پائیں۔ وہ ازراہِ عقیدت اُن کی طرف سے جُرمانہ ادا کرنے کے لئے بھی تیار تھے۔ لیکن معافی مانگنے کا تصوّر ہی منٹو جیسے انا پرست، ہٹیلے اور بلند پایہ ادیب کے لئے بعید از قیاس تھا۔ اور عصمت منٹو کی رضامندی کے بغیر کوئی قدم اُٹھانے سے قاصر تھیں۔

"لحاف" کو فحش ثابت کرنے والے گواہ عصمت کے وکیل کی کڑی جرح کی تاب نہ لاکر بوکھلا سے گئے تھے۔ کہانی میں انھیں کوئی قابلِ گرفت لفظ نہیں مل رہا تھا۔ بعد از تلاشِ بسیار ایک صاحب نے دُور کی کوڑی لاتے ہوئے کہا کہ یہ جملہ ـــــ "عاشق جمع کر رہی تھیں" فحش ہے۔

"کون سا لفظ فحش ہے۔ جمع یا عاشق؟" وکیل نے پوچھا۔

"لفظ عاشق" گواہ نے ذرا تکلّف سے کہا۔

"مائی لارڈ! لفظ 'عاشق' بڑے بڑے شعراء نے بڑی فراوانی سے استعمال کیا ہے اور نعتوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ کو اللہ والوں نے بڑا مقدّس مقام دیا ہے۔"

"مگر لڑکیوں کا عاشق جمع کرنا بڑی معیوب بات ہے" گواہ نے فرمایا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کیونکہ ـــــ یہ شریف لڑکیوں کے لئے معیوب بات ہے۔"

"جو لڑکیاں شریف نہیں اُن کے لئے معیوب نہیں؟"

"آ ـــــ نہیں۔"

"میرے موکّل نے ان لڑکیوں کا ذکر کیا ہے جو شریف نہیں ہوں گی۔ کیوں صاحب بقول آپ کے غیر شریف لڑکیاں عاشق جمع کرتی ہیں؟"

"جی ہاں! ان کا ذکر کرنا فحاشی نہیں۔ مگر ایک شریف خاندان کی تعلیم یافتہ عورت کا ان کے بارے میں لکھنا قابلِ ملامت ہے" گواہ صاحب زور سے گرجے۔

"تو شوق سے ملامت فرمایئے۔ مگر قانون کی گرفت کے قابل نہیں ہے۔"[1]

معاملہ بالکل بے جان ہو گیا۔

ادھر اُن کے اَن جانے بہی خواہوں اور مدّاحوں نے جو انھیں معافی منگوا کر قانون کی آہنی گرفت سے نجات دلانا چاہتے تھے، اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ایک صاحب نے چپکے سے عصمت کے پاس آکر سرگوشی کے انداز میں کہا: "اگر آپ لوگ معافی مانگ لیں تو ہم آپ کا سارا خرچہ بھی دیں گے اور . . ." لیکن عصمت کو منٹو کی رضامندی کے بغیر کوئی حتمی فیصلہ لینے کا یارانہ تھا۔ اور منٹو کے حوصلے حسبِ معمول بلند تھے۔ انھیں یقین تھا کہ مقدموں میں دَم نہیں اور فیصلہ بہر صورت اُن کے حق میں ہی ہوگا اور وہ باعزّت بری ہو جائیں گے۔

---

[1] عصمت چغتائی: "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ (مارچ ۱۹۷۹ء) ص ۸

"کیوں منٹو صاحب معافی مانگ لیں، جو روپے ملیں گے، مزے سے چیزیں خریدیں گے۔"

میں نے منٹو سے پوچھا۔

"بکواس" منٹو نے اپنی مورپنکھی آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"مجھے افسوس ہے یہ سرپھرا منٹو راضی نہیں۔

"مگر آپ —— اگر آپ ہی ——"

"نہیں آپ نہیں جانتے یہ شخص بڑا فیتین ہے۔ بمبئی میں میرا جینا دوبھر کر دے گا۔

اس کے غصے سے وہ سزا بدرجہا بہتر ہوگی جو مجھے ملنے والی ہے۔"[1]

عصمت نے کمال صاف گوئی سے صورتِ حال بے کم و کاست بیان کر دی جس میں منٹو کے تئیں پُرخلوص احترام کا جذبہ بھی شامل تھا۔ جج صاحب نے عصمت کو فحاشی کے الزام سے باعزت بری کر دیا۔ اور انھیں عدالت کے عقبی کمرے میں طلب کیا اور بڑی گرم جوشی اور تپاک سے بولے :

"میں نے آپ کی کہانیاں اکثر پڑھی ہیں اور وہ فحش نہیں اور نہ "لحاف" فحش ہے۔

مگر منٹو کی تحریریں بڑی غلاظت سے بھری ہوتی ہیں۔

"دُنیا بھی غلاظت بھری ہے۔" میں منحنی آواز میں بولی۔

"تو کیا یہ ضروری ہے کہ اُسے اُچھالا جائے؟"

"اُچھالنے سے وہ نظر آجاتی ہے اور صفائی کی طرف دھیان جاسکتا ہے۔"

"جج صاحب ہنس دیئے۔"[2]

یہ عصمت کو جج صاحب کا خراجِ تحسین تھا۔ عصمت یقیناً اس پر پھولی نہ سمائی ہوں گی اور احساسِ جرم جو اب تک اُن کے قلب و ذہن کو کُرید رہا تھا نابید ہو گیا ہوگا۔

○ یہاں یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ عصمت پر عام طور پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اُن کے فن پر جنسیت غالب ہے۔ مگر یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنس کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں جس پر لکھنا معیوب ہو۔ جنس انسانی زندگی کا بہت اہم اور قابلِ قدر حصہ ہے پھر اس سے مفر کیوں۔ ہاں "جنس زدہ" ہونا معیوب ہے —— پھر جنس کی اپنی حدود ہیں جن سے تجاوز کرنے پر تحریر مبتذل ہو کر فحاشی میں بدل جاتی ہے جس سے سماجی اور اخلاقی اقدار پامال ہوتی ہیں، اور قانون کی پیشانی پر بَل پڑ جاتے ہیں۔

---

[1] [2] عصمت چغتائی "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی (مارچ ۱۹۷۹ء) ص ۹، ۱۰

سب سے مقدم بات یہ ہے کہ فحاشی کی بات نوکِ زبان پر لانے سے پہلے ہمیں فحاشی کی نوعیت اور ماہیت کا صحیح تصور ہونا چاہیئے کہ فحاشی ایک بہت نازک اور TRICKY موضوع ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر انگلی رکھ کر وثوق سے کہا جا سکے کہ یہ فحش ہے اور یہ فحش نہیں کیونکہ یہ بہت حد تک ہمارے اندازِ فکر و نظر پر منحصر ہے ___ دھیان رہے کہ فحاشی ایک اضافی چیز ہے۔ اس کا کوئی پختہ مقیاس یا پیمانہ نہیں جو فحش اور غیر فحش میں امتیاز کر سکے۔ جو چیز آپ کے نزدیک فحش ہے عین ممکن ہے کہ اوروں کی نظر میں فحش نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فحاشی ہمیشہ بحث کا موضوع بنی رہی ہے ___ پھر فحاشی کا تصور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جو چیز آج فحش ہے کل کو فحش نہیں بھی قرار دی جا سکتی۔ بدیں وجہ بعض ادب پارے جو کبھی فحش قرار دیئے گئے تھے آج فحش نہیں سمجھے جاتے۔ کیونکہ اخلاقی اقدار تغیر پذیر ہوتی ہیں۔ "لیڈی چیٹرلیز لوور" کی مثال ہمارے سامنے ہے ___ پھر جو ادب پارہ ایک ملک میں فحش ہے ضروری نہیں کہ اسے دیگر ممالک میں بھی فحش سمجھا جائے کہ ہر ملک کے اپنے ناپ تول ہیں جو وہاں کی کلچرل ویلیوز یا اخلاقی اور روحانی اقدار پر مبنی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جو چیز امریکہ، فرانس اور انگلینڈ جیسے کھلے معاشروں میں بے ضرر اور قابلِ قبول سمجھی جاتی ہے، عین اغلب ہے کہ وہی چیز مسلم ممالک کے بند معاشرے میں فحش اور مخربِ الاخلاق سمجھی جائے ___ پھر یہ بھی مدِنظر رہے کہ ایک ہی ملک میں ایک قانون کے تحت ایک عدلیہ ایک ادب پارے کو فحش ٹھہراتا ہے تو دوسری عدالت اسے بے ضرر قرار دے کر مصنف کو باعزت بری کر دیتی ہے۔ منٹو کے پانچ مقدمات پر یکے بعد دیگرے ایک نظر ڈالئے، بات واضح ہو جائے گی ___ یہ سب لکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ فحاشی کا تصور ذرا واضح ہو جائے۔

بدایوں

(عصمت کے ادب پر جنسیت غالب ہونے کے جواز میں بالعموم "لحاف" کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ کھلے دل و دماغ سے اور ذہنی محفوظات سے مبرا ہو کر دیکھا جائے تو "لحاف" میں فحاشی ہے کہاں۔ ہاں اگر فحاشی کہیں ہے تو وہ شاید اس کے موضوع "ہم جنسیت" میں ہے، جو کسی وقت شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا مگر آج ہمارے تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے میں فحش نہیں سمجھا جاتا ___ مگر جہاں تک ٹریٹمنٹ کا تعلق ہے "لحاف" میں فحاشی کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔ اس میں کوئی چیز محض جنسی تلذذ اور تلطف حاصل کرنے کے لئے نہیں کہی گئی۔ کوئی چیز فقط جذبات کو مشتعل کرنے یا ذہن کو ترغیب دینے کے لئے نہیں کہی گئی۔ پھر از اوّل تا آخر جنسی عمل نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ "لحاف" میں بنتے بگڑتے POSES اور اس میں سے نکلتی آوازوں سے اپنی اپنی بساط کے مطابق تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ جب عمل ہی ڈھکا چھپا رہے تو وہ فحش کیوں کر ٹھہرا۔)

درحقیقت اس افسانے کو غیر ضروری طور پر اچھالا گیا۔ اس کے لئے ایک تو اس کے موضوع کی نوعیت ذمہ دار تھی، جس پر مرد افسانہ نگاروں کو بھی لکھنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اس لئے "لحاف" کی غیر معمولی تشہیر ہوئی ـــ پھر مقدمے نے اُسے مزید ہوا دی ـــ اور پھر لوگوں کی دلچسپی اس لئے بھی بڑھ گئی کہ اس کی مصنفہ ایک نوجوان مسلم ادیبہ تھی۔

یہ بات مدّ نظر رہے کہ ایسے متنازعہ اور نازک موضوع پر لکھتے ہوئے بہت کچھ مصنف کی فنی چابکدستی پر منحصر ہوتا ہے۔ ایک بھونڈے اور بھدّے غیر ادبی انداز میں کہی گئی بات فحش ہو سکتی ہے مگر اگر وہی بات قرینے سلیقے سے، اشارے کنائے سے، دھیمے اور متین انداز میں کہی جائے تو وہ فحاشی اور قانون کی زد سے باہر ہو جاتی ہے ـــ عصمت کے فن کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے حد ایجاز پسند ہیں اور کم از کم الفاظ میں، محض اشاروں کنایوں میں، اکثر آدھے ادھورے جملوں میں نازک سے نازک بات یوں اطمینان سے کہہ جاتی ہیں کہ احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ بہت کچھ قاری کی فہم و فراست اور سوجھ بوجھ پر چھوڑ دیتی ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کبھی کبھی اَن کہی بات، کہی گئی بات سے کہیں زیادہ متاثر کرتی ہے، بشرطیکہ وہ سمجھ میں آجائے ـــ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ عصمت کے خلاف استغاثہ کی طرف سے اُٹھائے گئے اعتراضات کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ "لحاف" میں فحش الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ جب وکیل صفائی نے کہا کہ ایسے الفاظ کی نشاندہی کیجئے تو بعد از تلاشِ بسیار استغاثہ کے گواہ بغلیں جھانکنے لگے اور آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئے اور مقدمہ خارج ہو گیا ـــ عصمت کی فنی چابکدستی نے انھیں بچا لیا۔

"لحاف" نے عصمت کے فن کو داغدار کیا۔ وہ جنسیات پر لکھنے والی فحش نگار قرار دی گئیں۔ اور "لحاف" کا لیبل اُن پر چپک کر رہ گیا۔ (ایسے ہی جیسے منٹو کو آج تک "کالی شلوار" والا منٹو کہا جاتا ہے) "لحاف" عصمت کے لئے ایک چڑ، ایک طعن بن گیا۔ اور ان کی بے ضرر، صاف ستھری کہانیوں پر بھی "لحاف" کا سایہ لہرانے لگا۔ چنانچہ وہ انتہائی حزن و ملال سے لکھتی ہیں: "لحاف نے مجھے بہت جوتے کھلوائے"[1]

پھر "لحاف" نے ان کی گھریلو زندگی کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ کچھ اس طرح کہ اُن کی اپنے شوہر شاہد لطیف سے طویل عرصے تک اَن بَن رہی۔ ہنستی کھیلتی مسکراتی زندگی میں زہر گھُل گیا۔ عصمت کے الفاظ میں "اس کہانی پر میری اور شاہد کی اتنی لڑائیاں ہوئیں کہ زندگی جنگ کا میدان بن گئی"[2] ـــ عصمت کو اپنی لغزش کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی اور انھوں نے تا حیات اپنی ذات اور فن کے تحفّظ کے لئے

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ مارچ ۱۹۷۹ء۔ ص ۱۰

اس راہ سے گریز کیا۔

کئی سال بیت گئے، عصمت علی گڑھ گئیں تو انھیں اُن بیگم صاحبہ کا خیال آیا جو "لحاف" کی مرکز و محور تھیں۔ اور حسنِ اتفاق سے ایک تقریب میں اچانک ان سے بالمشافہ ملاقات ہو گئی۔ لمحہ بھر کے لئے عصمت کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ لیکن بیگم صاحبہ کی باچھیں کھل گئیں۔ انھوں نے اپنی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے عصمت کی جانب دیکھا اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے لپک کر ان کو گلے لگا لیا۔ وہ انھیں ایک طرف لے گئیں اور بولیں:

"پتہ ہے میں نے طلاق لے کر دوسری شادی کر لی ہے۔ ماشاء اللہ میرا چاند جیسا بیٹا ہے۔"

اور میرا جی چاہا کسی سے لپٹ کر زور زور سے روؤں۔ آنسو روکے نہ رُکے۔ مگر میں قہقہے لگا رہی تھی۔ انھوں نے میری بڑی شاندار دعوت کی۔ مَیں مالا مال ہو گئی۔ اُن کا پھول سا بچہ دیکھ کر مجھے ایسا لگا وہ بھی میرا کوئی ہے۔ میرے دماغ کا ٹکڑا۔ میرے ذہن کی جیتی جاگتی اُولاد۔ میرے قلم کا بچہ! ـــــ اور میں نے جان لیا کہ چٹان میں بھی پھول کھل سکتے ہیں۔ خونِ جگر سے سینچنے کی شرط ہے![1]

عصمت کی خوشی بجا تھی اور اُن کا احساسِ تفخر بھی بجا تھا کہ وہ داغِ ملامت جو "لحاف" نے انھیں عطا کیا تھا از خود مٹ گیا۔ وہ فحش نگاری کا دھبّہ جو اُن کے فن کی پیشانی پر لگ گیا تھا اپنے آپ کافور ہو گیا ـــــ "لحاف" کے تعلق سے وہ فحش نگار نہیں، حقیقت نگار تسلیم کی جانے لگیں۔ اور تو اور ترقی پسندوں نے بھی، جن سے نظریاتی اعتبار سے وہ وابستہ تھیں، اُن کے حقیقت نگار ہونے کو بسر و چشم قبول کیا ـــــ "لحاف" کی بیگم صاحبہ کا "چاند جیسا بیٹا"، عصمت کی کہانی کا جواز بن گیا۔

●

[1] عصمت چغتائی "کاغذی ہے پیرہن" ماہنامہ "آجکل"۔ نئی دہلی (مارچ ۱۹۷۹ء) ص ۱۰

متفرّقات

ترّقی پسندی ○ اُردو کا مسئلہ ○ قومی ایک جہتی ○ حقوقِ نسواں ○ فلمی کہانیاں

ترقّی پسندی

اُردو کے ترقی پسند ادیب درحقیقت ایک بہت بڑی کھیپ کی صورت میں ۱۹۳۵ء کے آس پاس منظرِ عام پر آئے اور چھا گئے۔ "ترقی پسندی" ایک "تمغہ" بن گئی۔ لیکن جب ادب اُن کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت نہ کرسکا تو اُنھوں نے فلموں کا رُخ کیا اور بطور افسانہ نگار، مکالمہ نگار اور گیت کار فلموں سے مُنسلک ہوگئے۔ کچھ ایک نے ہدایت کاری بھی کی اور کچھ پروڈیوسر بن گئے۔ یہاں تک کہ کچھ ایک نے فلموں میں بطور اداکار بھی کام کیا۔ یہ آرام دِہ اور پُرآسائش زندگی بسر کرنے کی جانب ایک قدم تھا ـــــ بمبئی کی فلمی دُنیا ترقی پسند ادیبوں کا مرکز و محور بن گئی ـــــ لیکن ساتھ ساتھ ہمارے ادیبوں نے نخلِ ادب کی آبیاری بھی جاری رکھی۔ مگر ظاہر ہے کہ اُن کی توجہ بٹ گئی جو اُن کے فن پر اثر انداز ہوئی۔ بعضوں کا فن پست ہوگیا۔ کرشن چندر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ بعضوں کے فن کا معیار تو برقرار رہا لیکن تخلیقی عمل کی رفتار سست پڑ گئی، جیسا کہ راجندر سنگھ بیدی کی صورت میں ہُوا۔ بعض شاعروں نے فلمی گیتوں میں جہاں تک ہو سکا اپنے نظریات کو بحُسن و خوبی سمویا اور نام پایا جیسا کہ ساحرؔ لدھیانوی اور کیفیؔ اعظمی نے لیکن وہ فلموں کے ہی ہو کر رہ گئے جس سے اُن کے فن کو ضعف پہنچا۔

دھیان رہے کہ ادب کے ذریعہ سیاسی نظریات کی تبلیغ ایک بڑا کٹھن اور تلوار کی دھار پر چلنے والا کام ہے۔ کرشن چندر اس راستہ پر چلے اور اُن کا فن بُری طرح مجرُوح ہُوا۔ بیدی نے اپنے فن کو سیاسی نظریات سے ملوّث ہونے سے بچا لیا اور بہت کامیاب رہے ـــــ منٹو بدقسمتی سے پاکستان میں نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ وہ نیم دلی سے نیم اشتراکی رہے۔ ترقی پسندوں نے ان کی حمایت سے مُنہ موڑ لیا۔ لیکن منٹو نے فن کو اپنے نظریات پر ترجیح دی، اس کے تقدس کو پہچانا اور ترقی پسندوں کے "ہدایت نامہ" پر عمل پیرا ہونے سے انکار کر دیا ـــــ عصمت ایک ترقی پسند ادیبہ تھیں اور وہ روزِ اوّل ہی

سے متوسط طبقے کی مسلم خواتین کے حق میں جوش و خروش سے آواز بلند کر رہی تھیں مگر انھوں نے اپنے فن کو اپنے نظریات سے الگ تھلگ رکھا اور دونوں کے اختلاط کو فن کے حق میں مضرت رساں جانا۔

ترقی پسندی کے تعلق سے، مندرجہ بالا کوائف کے پس منظر میں، آیئے ذرا عصمت پر ایک مختصر سی نظر ڈالیں۔
انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس اپریل ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی زیرِ صدارت لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ عصمت جب لکھنؤ میں بی۔ اے میں پڑھتی تھیں۔ انھوں نے ڈاکٹر رشید جہاں کی معیت میں کانفرنس میں شرکت کی عصمت نے ابھی لکھنا شروع نہیں کیا تھا اور نہ ہی اُنھیں تب اپنی خوابیدہ ادبی صلاحیتوں کا کوئی واضح احساس تھا۔ کانفرنس کی روداد بھی اُن کی فکر و فہم سے ماورا ہی رہی۔ مگر کیونکہ بی۔ اے میں اُن کا ایک مضمون سیاسیات تھا۔ انھیں رُوسی ادب کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ ہی اُنھیں موپساں، چارلس ڈکنز، ہنری بلزاک، ایملی زولا اور جارج برنارڈ شا سے بھی خصُوصی دل چسپی رہی۔ گویا غیر شعوری طور پر وہ فکشن کے وسیع مطالعہ سے ادب کے میدان میں قدم رکھنے کی جانب بڑھ رہی تھیں ـــــ ۱۹۳۸ء میں اُنھوں نے اپنا پہلا ڈرامہ "فسادی" لکھا، جو ماہنامہ "ساقی" دہلی میں شائع ہُوا۔ پھر انھوں نے اپنے محدُود تجربات اور مشاہدات پر مبنی ایک کہانی "گیندا" لکھی اور وہ بھی چھپ گئی۔ ازاں بعد اُنھوں نے جو کچھ بھی لکھا اسے شرفِ قبولیت ملا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے بیباک زبان و بیان اور غیر روایتی موضوعات پر اُنگلی اُٹھنے لگی۔ عصمت اس غیر متوقع مخالفت سے مرعوب نہ ہوئیں، بلکہ ان کی ضدی طبیعت کو ہوا ملی۔ اور وہ لُطف اندوز ہوتی ہُوئی اپنی راہ پر تیز قدمی سے گامزن ہوگئیں۔
ـــــ یہ بھی عصمت کا ترقی پسند مُصنفین سے وابستگی کی جانب ایک غیر شعوری قدم تھا۔

جب مُلک راج آنند نے سلور فش ریسٹورنٹ، بمبئی میں پہلی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا انعقاد کیا تو عصمت کو بھی مدعو کیا گیا۔ وہ تب محکمۂ تعلیم سے، جہاں وہ اسکول انسپکٹرس کے طور پر ملازم تھیں۔ سبکدوش ہو کر فلموں سے بطور افسانہ نگار وابستہ ہو چکی تھیں۔ شاہد لطیف سے تب ان کی شادی ہو چکی تھی اور وہ ان کی کہانیاں ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ کانفرنس میں اُنھوں نے شاہد لطیف کی معیت میں شرکت کی۔ مدعوئین کو ایک بہت پُر تکلف دعوت دی گئی لیکن عصمت نے اعتراف کیا کہ "سچ پُوچھئے تو وہاں جو بحث مباحثہ ہوا وہ کچھ زیادہ میرے پلّے نہیں پڑا"[1] ـــــ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی انھیں کمیونزم کے بنیادی عقائد کا زیادہ علم نہ تھا۔ یہ شعور بعد ازاں اُن میں آہستہ آہستہ پیدا ہُوا اور مُستحکم ہوتا گیا۔

۱۹۴۵ء میں ترقی پسند مُصنفین کی انجمن کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے زیادہ قریب آگئی۔ اور بمبئی میں اُن کی میٹنگیں بڑے جوش و خروش سے ہونے لگیں۔ میٹنگیں عام طور پر خواجہ احمد عبّاس کے ہاں منعقد

---

[1] عصمت چغتائی ـ "ترقی پسند ادب اور میں" (مضمون) عصمت چغتائی نمبر (دسمبر ۱۹۹۱) اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی ص ۱۳۷

ہوتی تھیں، جن میں بڑے انقلابی منصوبے بنائے جاتے تھے۔ عصمت کو انقلاب سے زیادہ دل چسپی اُن زندہ دل، مہذب اور متمدن، اُبھرتے ہوئے نوجوان فنکاروں سے تھی، جو اپنی خاندانی روایات کو خیر آباد کہہ کر، ایک نئے اَن دیکھے راستے پر بڑے ولولوں کے ساتھ چل نکلے تھے۔ لیکن ابھی وہ سب اپنے فن کی ابتدائی منازل پر تھے۔ پھر بھی ان کی صحبت میں عصمت کے ذہن میں جو جالے تنے ہوئے تھے وُہ بہت حد تک دُور ہو گئے۔ ____ عصمت نے کسی خاص مقصد کو مدِ نظر رکھ کر لکھنا شروع نہیں کیا تھا لیکن کمیونزم کے فلسفہ نے انھیں جو کچھ سمجھایا اُسے اُن کے قلب و ذہن نے فوراً قبول کر لیا۔ اِس بارے میں وہ لکھتی ہیں :

"کمیونسٹ پارٹی سے قربت بڑھی تو مجھے طبقاتی اُتار چڑھاؤ کا علم ہُوا۔ اور میں نے پہلی بار جانا کہ میری مسرتوں کی دشمن میری دادی نانی نہیں یہ نظامِ حکومت ہے۔ اس زمانے میں مجھے کمیونزم کے بارے میں تفصیل سے معلومات حاصل ہوئیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ دُنیا میں امن و امان اور خوشحالی صرف اشتراکی نظام کے ذریعہ قائم رہ سکتی ہے اور اس یقین میں ابھی تک کوئی دراڑ نہیں پڑی۔"[1]

ترقّی پسند ادیبوں نے بھی جب دیگر ناقدین کی طرح عصمت کے فن پر جنسیات کی مہر ثبت کر دی تو اُنھوں نے اپنے افسانوں کا پھر سے بغور جائزہ لیا اور پایا کہ اُن میں فحاشی ناپید ہے۔ وہ خاموش رہیں اور اُنھوں نے حسبِ معمول اپنے فکر و فہم اور ایقان کو مشعلِ راہ بنائے رکھا اور کسی کی تنقید اور نکتہ چینی سے بے نیاز رہیں ــــ لیکن ترقّی پسند تحریک سے ان کو جو کچھ قابلِ قبول ملا، اُسے اُنھوں نے بقدرِ شوق و ظرف سمیٹ لیا۔

بھیمڑی کی ترقّی پسند کانفرنس میں یہ قرار داد پاس کی گئی کہ آئندہ وہی ادب قابلِ قبول ہو گا جس کا تعلق براہِ راست کسان اور مزدور کی زندگی سے ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اس فیصلے کی رُو سے عصمت ترقّی پسندوں کی صف سے باہر ہو گئیں کہ اُنھیں کسان اور مزدور کی زندگی سے کوئی وابستگی نہ تھی کہ وہ ان کے تجربات اور مشاہدات کے دائرے سے باہر تھی۔ عصمت اس بارے میں آزردہ خاطر ہو کر لکھتی ہیں :

"ہم نے کانفرنس میں بہت سے غلط فیصلے کئے تھے۔ مثلاً یہ کہ ادیب وُہی ہے جو کسان اور مزدُور کے لئے لکھے تو مَیں تو اسی وقت ختم ہو گئی تھی۔ مَیں نے اُن سے کہا تھا کیا میں ادیبہ نہیں ہُوں ؟ اُنھوں نے کہا کہ آپ ادیبہ ہی نہیں ہیں۔ مَیں نے کہا نہ ہونے دو، نہیں ہُوں ادیبہ تو کیا ؟ میں نے کوئی ادیبہ بننے کے لئے تو لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔"[2]

---

[1] عصمت چغتائی: "ترقّی پسند ادب اور مَیں" (مضمون) عصمت چغتائی نمبر (دسمبر ۱۹۹۱ء) اُردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی۔ ص ۱۳۸

[2] عصمت چغتائی: "عصمت چغتائی سے گفتگو" (انٹرویو) عصمت چغتائی نمبر (دسمبر ۱۹۹۱ء) اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی۔ ص ۲۰

عصمت کو مُسلم متوسط طبقے کی گھریلو زندگی سے دل چسپی تھی جسے اُنھوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا اور جس پر وہ کمال فنی دسترس سے لکھتی تھیں۔ بدیں وجہ اُنھوں نے سوچ بچار کے بعد پارٹی کے فیصلے کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یوں بھی وہ اپنے فن کے معاملے میں کبھی قواعد وضوابط کی پابند نہ ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے جو کچھ لکھا اپنی رضا اور رغبت سے لکھا۔ اور کسی موضوع کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرنے کے بعد چھوا۔ مگر کیونکہ وہ اشتراکیت سے متاثر تھیں، اس لئے اس سے عمر بھر وابستہ بھی رہیں۔

آہستہ آہستہ ترقی پسند تحریک کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ بے جان ہوگئی۔ آئے دن اس کی پُرجوش مجالس میں بنائے جانے والے انقلابی منصوبے رفت وگذشت ہوگئے۔ ترقی پسند ادیب، جنھوں نے تحریک کو اپنے کندھوں پر برسوں اُٹھائے رکھا تھا اپنے بیوی بچوں اور فلموں میں جذب ہوکر رہ گئے۔ اُردو زبان خود بے زبان ہوگئی اور اس کا کوئی پُرسانِ حال نہ رہا۔ ترقی پسند ادیب پھر بھی مری مری آوازیں یہ کہتے رہے کہ گو تحریک کا جسم مرگیا ہے اس کی رُوح زندہ ہے —— مگر یہ کھوکھلی اور بے معنی بات تھی۔

عصمت کا قلم کبھی اُن کی روزی روٹی کا وسیلہ نہ رہا تھا۔ اُنھوں نے فلموں سے روپیہ کمایا اور بحیثیت مجموعی آسودہ زندگی بسر کی۔ جب معیاری اُردو ادبی رسائل ناپید ہوگئے تو اُنھوں نے ماہنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی اور ماہنامہ "شمع" نئی دہلی میں لکھنا شروع کردیا۔ اُنھیں اب بھی اطمینان تھا کہ اُن کا ادب جس طبقے کی عکاسی کرتا تھا اس تک اب وہ براہ راست پہنچنے لگی تھیں —— لیکن ان کی بات میں وزن نہ تھا۔ معیاری رسائل کے ساتھ ہی معیاری ادب بھی ناپید ہوگیا —— پھر جب اُردو زبان ہی معتوب ٹھہری تو ادب کی تخلیق کے سوتے اور سرچشمے بھی سُوکھ گئے۔

عصمت ترقی پسند تحریک کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

> "میرا یقین ہے کہ ہر ادب پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ قرآن، بائبل، تورات اور وید پروپیگنڈا ہیں۔ میر، غالب، ذوق، حالی، شبلی، حسرت موہانی کی شاعری پروپیگنڈا ہے۔ مہاتما بُدھ کا پیغام پروپیگنڈا ہے۔ تُلسی داس، کبیر، خسرو کا کلام پروپیگنڈا ہے۔ ہر قابلِ ذکر ادبی کاوش کسی نہ کسی نقطۂ خیال کا پروپیگنڈا ہوتی ہے۔ پروپیگنڈا انسانیت کے خلاف بھی ہوسکتا ہے۔ اِس کی مثالیں اُس ادب میں ملتی ہیں جو حقیقت سے فرار کی تلقین کرتا ہے۔ ناداری اور مُفلسی کو نوشتۂ تقدیر کا نام دیتا ہے اور توہم پرستی کو ایمان کہتا ہے"[1]

[1] عصمت چغتائی "ترقی پسند ادب اور میں"، (مضمون) عصمت چغتائی نمبر (دسمبر ۱۹۹۱ء) اُردو ماہنامہ مکالمات" دہلی ص ۱۴

عصمت کا یہ نقطۂ نظر مدلل عقلی اور مبنی بر حقائق نہیں۔ مقدس مذہبی کتابیں تو مانا کہ پروپیگنڈا کا وسیلہ ہوتی ہیں اور یہ پروپیگنڈا مذہبی مبلغ مثلاً پنڈت، سادھو، مہاتما ——— مولوی، مفسر، ولی اللہ، پیر فقیر ——— گرنتھی ——— پوپ، پادری وغیرہ کرتے ہیں جو مذہب کے اجارہ دار اور "مجاور" ہیں، اس کے خدائی نگہبان اور پاسبان ہیں۔ مگر مذہب پر منبر سے بولنے والے خطیب ہیں ادیب اور شاعر نہیں۔ اس فرق کو ہر حال میں ملحوظ رکھنا ہوگا ——— اور پھر یہ بھی دھیان رہے کہ مذہب کے عقائد اور قواعد و ضوابط پر خواندہ، متمدن اور فہم و فکر کے حامل لوگوں سے ناخواندہ اور کوتاہ عقل لوگ کہیں زیادہ شدّت اور رغبت سے عمل پیرا ہوتے ہیں ——— مگر اچھا ادب ایک الگ ہی چیز ہے، ارفع، اعلیٰ اور لطیف، جو قلب و ذہن کو مسرت و انبساط عطا کرتا ہے۔ لطیف جذبات اور نرم و نازک احساسات کو آسودگی اور راحت بخشتا ہے۔ اور جسے ایک مہذب اور متمدن انسان ہی دل کی گہرائیوں سے محسوس کر سکتا ہے ——— ادب ایک آرٹ ہے، فن ہے۔ جیسے مصوری، سنگ تراشی، رقص و سرود۔ ایک اعلیٰ فنِ تعمیر کا نمونہ۔ ادب ایسے ہی وجۂ انبساط ہوتا ہے جیسے گلاب کا مہکتا، دہکتا پھول، جیسے سوتے میں مسکراتا ہوا معصوم بچہ، جیسے چاندنی میں تاج محل، جیسے اجنتا اور ایلورا کے سنگتراشی کے لافانی مجسمے، جیسے میر کی غزل۔ کیا یہ سب پروپیگنڈا ہیں؟ ——— ادب بذاتِ خود ہرگز پروپیگنڈا نہیں ہوتا۔ جب تک کہ عمداً اسے پروپیگنڈا کے لئے ہی استعمال نہ کیا جائے۔

شاید عصمت نے یہ لکھ کر ادب میں اشتراکیت کے پروپیگنڈا کو جائز ٹھہرانے کی سعی کی ہے۔ گو انھوں نے کبھی اپنے فن کو نظریاتی اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا تھا ——— عصمت بھول گئیں کہ تبلیغ کی غرض سے، ادب اور سیاسی عقائد کا اختلاط ادب کے حق میں سمِ قاتل ہوتا ہے ——— منٹو پر جب اشتراکیوں نے اپنا گھیرا تنگ کر دیا اور بقول شورش کاشمیری "ہدایت نامہ خاوند" کی پیروی پر اصرار کیا تو منٹو نے اپنے ادب کو اشتراکیت کا آلۂ کار بنانے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ (اشتراکی) "بیرونی سیاست کے مصنوعی ابرو کے اشارے پر" ایسا کر رہے ہیں اور "مجھے اس کسوٹی پر پرکھ رہے ہیں جس پر "سرخی" ہی سونا ہے"[1] اور انھوں نے اشتراکیت کو تج کر فن کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ منٹو کے فن کی عظمت میں ان کی اِس انفرادیت کا بہت بڑا ہاتھ ہے ——— بیدی سے نریش کمار شاد نے ایک انٹرویو کے دوران پوچھا کہ ادب میں نظریات کا امتزاج کس حد تک جائز ہے تو انھوں نے برملا جواب دیا، "نامحسوس حد تک"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کے ادب میں ان کے اشتراکی نظریات کی کہیں ہلکی سی جھلک بھی نہیں ملتی۔ انھوں نے کہیں اپنے ادب کی طہارت کو سیاست سے ملوّث نہیں ہونے دیا۔

---

[1] سعادت حسن منٹو "جیب کفن" (مضمون) مجموعہ "یزید" ساقی بک ڈپو۔ دہلی ص ۱۷۶

—— عصمت نے جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے، پارٹی کے فیڈٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے، کسان اور مزدور کے لئے اپنا ادب وقف کرنے سے انکار کر دیا اور ادب کے تعلق سے اپنی "خود مختاری" پر آنچ نہ آنے دی۔ اور اپنے فن کی تقدیس کو برقرار رکھا —— لیکن ان سب کے برعکس کرشن چندر نے اپنے ادب میں اشتراکیوں کے مبلغ کا کردار بڑے جوش و خروش اور کرّ و فر سے ادا کیا اور اپنے فن کو بٹّہ لگا لیا۔ یہاں تک کہ بعضوں نے انھیں افسانہ نگار اور ناول نگار ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ کرشن چندر کے مزاحیہ اور طنزیہ مجموعے مثلاً "شکست کے بعد" اور "مزاحیہ افسانے" اس اعتبار سے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ کرشن چندر تو اشتراکیت کے آلۂ کار تھے ہی، انھوں نے اپنے ادب کو بھی "ہز ماسٹرز وائس" بنا کر رکھ دیا۔ یہ کرشن چندر کے ادب کے لئے بہت بڑا المیہ رہا۔

جب عصمت کی زندگی کے آخری ایام میں اُن سے سوال کیا گیا کہ ترقی پسند تحریک کا مستقبل کیا ہے، تو انھوں نے دو ٹوک جواب دیا:

> "ترقی پسند تحریک اب ہے ہی کہاں۔ مستقبل تو اس کا ہے ہی نہیں۔ بس لوگ دل کی تسلّی کے لئے ترقی پسندی کا غُل مچاتے ہیں۔ منٹو، کرشن، بیدی اور سجّاد ظہیر کے ساتھ ہی یہ تحریک ختم ہو گئی۔"[1]

یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اپنی مختصری پینتیس چالیس سالہ زندگی میں اُردو ادب کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں —— معرضِ وجود میں آتے ہی اُس کے گرد ہونہار ادیبوں اور شاعروں کا ایک جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا۔ اُنھوں نے ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر لگن اور خلوصِ دل سے فن کی گیسو آرائی کی۔ اور صحت مند رقیبانہ جذبے سے متاثر ہو کر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی، جس نے ان کے فن کو جِلا دی اور اُسے اپنی معراج پر پہنچا دیا۔ ترقی پسند تحریک نے انھیں تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پروئے رکھا اور بکھرنے نہ دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ادبی دنیا میں وہ ایک "عظیم قوت" بن کر اُبھرے اور چھا گئے۔ اور ایک عرصہ تک چھائے رہے —— وہ سبھی فلسفۂ اشتراکیت پر ایمان رکھتے تھے اور اسے انسان کے خوشحال اور مسرت زا مستقبل کا امین سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان کا ادب عوامی زندگی کا عکّاس تھا۔ وہ از خود حقیقت نگاری سے ہمکنار ہو گیا اور اسی ارضیت نے اُسے شرفِ قبولیت عطا کیا اور وہ کھِل اٹھا۔ نتیجہ یہ کہ برِّ صغیر میں اُن کے نام اور کام کا ڈنکا چہار سُو بجنے

---

[1] عصمت چغتائی: "باتیں عصمت آپا سے" انٹرویو از ڈاکٹر شمع افروز زیدی۔ ماہنامہ بیسویں صدی نئی دہلی۔ سالنامہ جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۲۸

لگا۔ آج بیشتر ترقی پسند فنکاروں کے رُخصت ہو جانے کے بعد بھی اُن کا ادب زندہ اور تابندہ ہے۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ اُن کے ادب کا بہترین حصہ مُلکی اور غیر مُلکی زبانوں میں مُنتقل ہو چکا ہے اور یہ بات اُس کی بقائے دوام کی ضامن ہے۔

اُردو کا مسئلہ

اس میں شک نہیں کہ تقسیمِ ملک نے اُردو زبان پر ایک کاری ضرب لگائی۔ جب ملک کا بٹوارہ چاہنے والوں نے یہ برملا کہا کہ ایک فرقے کی زبان ہندی ہے اور دُوسرے کی اُردو۔ اور یوں زبان کے ڈانڈے مذہب سے ملا کر اُردو کو (دیگر اسباب کے علاوہ) تقسیمِ ملک کے جواز کے طور پر پیش کیا تو اُردو زبان کی بقا پر خود ہی سوالیہ نشان لگ گیا۔ اُردو پاکستان کی قومی زبان ٹھہری اور ہندی ہندوستان کی راشٹر بھاشا۔ ہندوستان میں دیکھتے ہی دیکھتے اُردو زبُوں حالی کا شکار ہو گئی اور اس کا کوئی پُرسانِ حال نہ رہا۔ ایسے میں کچھ حقیقت شناس ترقی پسند ادیبوں نے ہندی کے حق میں آواز اُٹھانے کی جسارت کی، جن میں عصمت چغتائی، مجرُوح سلطان پوری اور رضیہ سجاد ظہیر پیش پیش تھے۔ کئی دیگر ادبا بھی دل ہی دل میں ان کے ہمنوا تھے مگر اُن میں حقیقتِ حال کو زبان پر لا کر اُردو کے نگہبانوں کے عتاب کا جوکھم اپنے اُوپر لینے کی تاب نہ تھی ـــــ عصمت نے کرشن چندر کی دوسری برسی کے موقع پر لکھنؤ میں ایک بڑے اژدہام کی موجودگی میں یہاں تک کہہ دیا کہ اُردو زبان مر چکی ہے۔ اب اس کا صرف کریا کرم (آخری رسُوم) باقی ہے۔ کہنے کا حاصل یہ کہ ادبی حلقوں میں اُردو زبان کی بے بسی اور بے چارگی کا احساس شدّت سے پیدا ہو چکا تھا اور ادیب اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کی بقا کے لئے تجاویز سجھا رہے تھے۔

عصمت کے نام کے ساتھ جو باتیں منسُوب کی گئیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ اُردو رسم الخط کو دیوناگری میں بدلنے کے حق میں ہیں۔ قدرتی طور پر اس سے اُردو کے "بہی خواہوں" کو فکر لاحق ہوئی کہ اُردو کی ایک ملک گیر شہرت کی ادیبہ ہوتے ہوئے عصمت نے ایک ایسی بات کیسے کہہ دی جس سے اُردو زبان کی شکل وصُورت ہی مسخ ہو جائے گی۔ اس سے عصمت کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اُردو حلقوں میں اُن کی سُبکی بھی ہوئی۔ ادبی مجالس میں وہ جہاں بھی جاتیں اُن سے وضاحت طلب کی جاتی۔ حالانکہ عصمت نے بار بار کہا کہ انھوں نے اُردو رسم الخط بدلنے کے لئے ہرگز نہیں کہا مگر ان کے حریف رہ رہ کر اس بات کو اُٹھاتے رہے۔ عصمت اس بارے میں اپنا نظریہ یوں پیش کرتی ہیں:

> "اُردو کا رسم الخط نہیں بدلنا ہے۔ کیونکہ یہ ایک طرح کا شارٹ ہینڈ ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں اُردو کی مخالف ہُوں یا رسم الخط بدلنا چاہتی ہوں۔ مَیں تو یہ کہتی

ہوں کہ اُردو کے ادبِ عالیہ کو ٹرانسلیٹ نہ کیا جائے۔ ہندی میں جوں کا توں محفوظ کر لیا جائے ــــــ اُردو کا اسکرپٹ بچّوں کو سکھایا جائے تو بچّوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ ہمارا ادب ہندی کی قطار میں کھڑا ہو کر بالکل ہی پٹ جاتا ہے۔ کیونکہ ادیب لوگ اُس کا ترجمہ خود تو کرتے نہیں۔ بلکہ اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کراتے ہیں جس کی وجہ سے ہیئت ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے میری باتوں کو غلط سمجھا۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اُردو کا رسم الخط بدلنا چاہتی ہوں ــــــ حالانکہ میں یہ کہتی ہوں کہ جب اُردو کو ہندی میں منتقل کیا جائے تو ترجمہ کرنے کی بجائے صرف رسم الخط ہندی رہے۔ باقی الفاظ اُردو ہی کے رہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہم اُردو چھوڑ دیں۔[1]

یہ کہہ کر عصمت نے اپنی جانب سے بات صاف کر دی مگر ایک عرصہ تک اُن پر انگلی اٹھتی رہی اور وہ صفائی پیش کرتی رہیں۔

عصمت کے دل و دماغ میں یہ دیکھ کر ایک لاوا دہکتا رہا کہ کرسئ اقتدار پر متمکن طبقہ محض زبانی جمع خرچ کرنے میں یقین رکھتا ہے۔ ورنہ نہ وُہ اُردو کے تحفّظ، ترقّی اور بقا میں یقین رکھتا ہے اور نہ ہندی میں۔ اس کی دلچسپی بس انگریزی زبان تک محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اُردو تغافل کا شکار ہو کر دم توڑ رہی ہے وہیں ہندی بھی پُر اطمینان طور پر پیش رفت کرنے سے قاصر رہی ہے۔ عصمت کی بات میں وزن ہے کہ اس میں سچائی کی چاشنی ہے اور وہ صدق دِلی سے کہی گئی ہے

"مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارے لیڈر جتنی اچھی انگریزی بول اور لکھ سکتے ہیں، آج آزادی کے بیالیس سال بعد بھی اتنی پُراثر ہندی اور اُردو نہیں بول سکتے۔ انگریز نے ملک دو حصّوں میں بانٹا تھا، ہمارے حکمران اُن سے آگے بڑھ گئے اور ملک جو بیس صوبوں میں بانٹ دیا گیا۔ ہر صوبے کی الگ زبان، مگر حکمران طبقے کی زبان انگریزی ہی ہے۔ عوام صوبائی زبانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ حاکم طبقہ ایک دوسرے کی بات سمجھتا ہے۔ سب کی ایک ہی چال ڈھال ہے۔ اُوپر کی سطح پر ساری چھین جھپٹ چلتی ہے (مجھوتے) ہوتے ہیں۔ اخبار نکلتے ہیں سب حاکموں کی زبان۔ یعنی انگریزی زبان میں۔۔۔ بلاوجہ اُردو کا شور مچایا جاتا ہے اور ہندی کو راشٹریہ بھاشا کہا جاتا ہے لیکن سارا کام انگریزی میں ہی ہوتا ہے۔ اگر واقعی انگریزی کی بجائے ہندوستانی زبانوں میں

---

[1] عصمت چغتائی: "باتیں عصمت چغتائی سے"۔ انٹرویو از ڈاکٹر شمع افروز زیدی ماہنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی۔ سالنامہ جنوری ۱۹۹۲ء ص ۳۱

تعلیم منظور بھی تو چین کی طرح یکلخت انگریزی اسکول ہندوستانی زبانوں میں تعلیم دیتے، ورنہ
بند کر دیئے جاتے اور انگریزی دُوسری مغربی زبانوں کی طرح بطور ایک مضمون کے پڑھائی جاتی۔
مگر سرکاری زبان انگریزی ہی رہی کیونکہ وہ طاقتور طبقے کی زبان تھی ہے[1]

اس طویل اقتباس کے لئے معاف فرمایئے کہ اس کے بغیر اُردو کے تعلق سے عصمت کے نظریات کو تاریخی تناظر میں جان پانا ممکن نہ تھا ـــــ عصمت کی حق گوئی اور بے باکی ملاحظہ ہو کہ انھوں نے حکمراں طبقے کی استحصال پسندی اور ریا کاری کا پردہ کس طرح نتائج سے بے نیاز ہو کر چاک کیا ہے۔ کیونکہ بالعموم جو حکمران طبقے کے کردار پر انگشت نمائی کرتا ہے وہ اس کے عتاب کا شکار ہو جاتا ہے۔ حکمران طبقے کی دل چسپی انگریزی میں اس لئے ہے تاکہ وہ غیر معین عرصہ کے لئے ملک پر مسلّط رہے۔ یہ جہاں ریا کاری اور فریب کاری ہے، وہیں ملک کے وسیع مفادات سے صریحاً اور عمداً تغافل بھی ہے۔ یہی وجہ ہے حصولِ آزادی کے اڑتالیس سال بعد بھی ملک انگریزی زبان کے شکنجے میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے اور اس کی نجات کے آثار کہیں دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتے۔

عصمت آزردہ خاطر ہو کر کہتی ہیں کہ اُردو ان کے نزدیک فقط غریب طبقے کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے اجو سرکاری امداد ملتی ہے وہ منتظمین کتر بیونت کے بعد ہی دیتے ہیں۔ عوام کی اکثریت حسبِ سابق ناخواندہ اور جاہل ہے جو پڑھتے ہیں وہ روٹی روزی کی خاطر انگریزی ہی پڑھتے ہیں۔ کیونکہ عوام کے لئے اوّلین مسئلہ گذربسر کا ہے، نان نفقہ کا ہے۔

> ،، رہا اُردو کا مسئلہ تو تقسیم نے مسلمانوں کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ انجانی محرومیاں جان پر سوار ہو گئیں۔ اب وہ پیٹ بھرنے کی سوچیں یا اُردو کے مسئلے کو سوچیں۔ اُردو سے بڑے بڑے جغادری اپنے پیٹ پھُلا رہے ہیں۔ اُنھیں پیسے سے مطلب ہے اُردو جائے بھاڑ میں ہے[2]

آپ اُردو کے مسئلے کو آج کے تناظر میں دیکھئے تو عصمت کے تیز و تند بیان کی صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ آج مٹھی بھر لوگ اُردو پر ناگ کُنڈلی مارے بیٹھے ہیں۔ انھیں اُردو کی فلاح و بہبود سے کہیں زیادہ اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔ اُردو کی حالت جتنی پتلی ہوتی جاتی ہے وہ شائد اتنے ہی فربہ ہوتے جاتے ہیں۔ یہ اُردو زبان کا المیہ ہے ـــــ اُردو زبان کے مختلف پہلوؤں کی بابت عصمت کا نظریہ صاف ہو جاتا ہے۔ کوئی عصمت جیسی بے لوث، بے غرض، دبنگ ادیبہ ہی صورتِ حال کو یوں بے کم و کاست پیش کرنے کی جسارت کر سکتی تھی۔

لہ ۲ہ عصمت چغتائی: باتیں عصمت آپا سے"۔ انٹرویو از ڈاکٹر شمع افروز زیدی۔ ماہنامہ بیسویں صدی نئی دہلی۔ سالنامہ۔ جنوری ۱۹۹۲ء۔ ص ۳۱، ۲۹

قومی یک جہتی

عصمت ہندوستان کی یک جہتی اور سالمیت کی علمبردار تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملک کی تقسیم کے خلاف تھیں اور جہاں ان کے بیشتر اعزا و اقارب اور دوست احباب پاکستان ہجرت کر گئے، وہ ہندوستان میں ثابت قدمی اور پامردی سے ڈٹی رہیں۔ اُن کے نزدیک اس معاملے میں مصلحت کوشی کو دخل نہ تھا بلکہ ان کے لئے یہ جزوِ ایمان تھا۔ وہ روزِ اوّل سے ہی دل و جان سے سیکولر تھیں اور روزِ آخر تک سیکولر رہیں۔ تقسیمِ ملک کے بحران کی گھڑی میں ہندوستان سے ہجرت کر جانا ان کے نزدیک ان کے نظریات کی تکذیب تھی —— عصمت کو ملک کے بٹوارے کا دلی رنج تھا اور پھر جس بھدّے اور بھونڈے ڈھنگ سے یہ تقسیم عمل میں لائی گئی اس سے ان کا رنج دوچند ہو گیا تھا۔ وہ گاہے گاہے دُکھ بھرے دل سے اپنے جذبات کا اظہار کرتی رہیں اور پیچ و تاب کھاتی رہیں۔ —— پھر وہ ہندوستان میں جو مسلمان رہ گئے تھے ان کا تقابل پاکستان میں رہ گئے ہندوؤں سے کرتی رہیں۔ جب وہ پاکستان گئیں تو تحقیق کے بعد یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں کھُل گئیں کہ اقلیتی فرقے کی اکثریت معدُوم کر دی گئی ہے۔ دھیان رہے کہ انھوں نے اس معاملے کو ہندو مُسلمان کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا بلکہ انسانیت کی نگاہ سے اس کا محاسبہ کیا۔ ہندوستان میں جہاں ان کے ہم مذہب حالات سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی مصلحتاً خاموش رہے عصمت بلند بانگ انداز میں اپنے نظریات کا اظہار کرتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ اُن کی نظروں میں معتوب ٹھہریں اور ہدفِ ملامت بنیں۔ یہاں عصمت کی شخصیت کے اس اہم پہلو کو جاننے کے لئے ان کی تحریروں کا غائر مطالعہ ازبس ضرُوری ہے —— عصمت جو کچھ بھی تھیں ڈنکے کی چوٹ تھیں۔ انھوں نے اپنے نظریات کا اظہار لاگ لپیٹ کے بغیر بہت جیداری اور حوصلہ مندی سے کیا اور کڑی مزاحمت اور مخاصمت کے باوصف کبھی سر خم نہ کیا کہ یہ اوصاف ان کی سرشت میں تھے۔ انھوں نے اپنے حریفوں کی طعن و تشنیع اور انھیں سماجی اور ادبی اعتبار سے چُپکے سے بالائے طاق رکھ دینے کو بھی متانت اور خندہ پیشانی سے جھیلا۔ نہ ان کی جبیں پر شکن پڑے اور نہ ان کے پائے استقلال میں لغزش آئی۔ یہ سب اُن کے اپنے عقائد کی اصالت میں یقینِ محکم کے طفیل تھا۔

آئیے ذرا مختصر طور پر دیکھیں کہ وہ "قومی یک جہتی" کے بارے میں کیا کہتی ہیں تاکہ ان کی تحریروں کے آئینہ میں انھیں معرُوضی طور پر تولا پرکھا جا سکے۔

> "آج کل قومی یک جہتی پر بہت زور دیا جا رہا ہے کہ جیسے ملک کے سارے دُکھ قومی یک جہتی نہ ہونے کی وجہ سے تباہی پھیلا رہے ہیں —— اگر قومی یک جہتی منظور تھی تو مذہب کے نام پر ملک ہی کو کیوں تقسیم ہونے دیا۔ اور اگر مذہب کے نام پر تقسیم کی گئی تو اس پر پُوری طرح پہلے عمل کیوں

نہیں کیا گیا جنھوں نے تقسیم کے لئے ووٹ دیئے تو پھر مذہب کے مطابق پہلے سکون سے بٹ جاتے۔ پھر ملک کی آزادی کا جشن منایا جاتا جو پاکستان کے لئے ووٹ دیتے، وہ آرام سے چلے جاتے۔ اس میں چند سال لگتے۔ آزادی چند سال بعد ملتی، اتنا خون خرابہ تو نہ ہوتا۔ لوگ آرام سے اپنی جائیداد، زمینیں، باغات، مکانات ٹھکانے لگا کر خوشی خوشی اپنی پسند کے ملک میں بس جاتے۔ پھر مذہب میں گورنمنٹ کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ سب یا تو ہندوستانی ہوتے، یا پاکستانی۔ مذہب کی مکمل آزادی ہوتی۔ مندر، مسجد اسی طرح قائم رہتے۔ یہ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا جھگڑا بھی نہ ہوتا۔ آج بھارت کے لیڈر ایک دوسرے کو خوب گالیاں دیتے ہیں۔ ان کی آپس کی جوتم پیزار، لوٹ کھسوٹ سے جنتا کیسا خوبصورت سبق حاصل کرتی ہے — عوام سے قومی یک جہتی کی فرمائش کی جاتی ہے اور حاکم طبقہ جوتم پیزار میں جٹا ہوا ہے۔ جب بڑے بابا پانی پر اُتارو ہوں تو چھوٹے بھی اُن سے داؤ پیچ سیکھ لیتے ہیں۔ اُوپر قومی یک جہتی ہو تو اس کی پرچھائیں نیچے بھی پڑے۔[1]

عصمت نے کیا حق بات کہی ہے۔ ملک کو تقسیم کرنے کے بعد، قومی یک جہتی اور سالمیت کا راگ الاپنا فی الواقع ریاکاری ہے — پھر جب قوم کے نام نہاد راہبروں میں خود جوتیوں میں دال بٹ رہی ہو تو ان سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ قوم کے شیرازے کو بکھرنے سے بچائے رکھیں گے۔ یہ تو "دیگراں را نصیحت خود را فضیحت" والی بات ہوئی — ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ عصمت نے قومی یک جہتی کے خود ساختہ علم برداروں کو کیسا دنداں شکن جواب دیا ہے۔ ان کا یہ انداز تمام عمر قائم و دائم رہا۔

- عصمت ہندوستان میں قیام پذیر مسلمانوں کا پاکستان میں رہ گئے ہندوؤں سے تقابل کرتی ہیں۔ دراصل یہ تقابل دونوں ممالک کے ارباب بست و کشاد کی ذہنیتوں کا تقابل ہے۔ برصغیر کے ادیبوں میں شاید عصمت کے سوا اور کوئی نہ تھا جو اس قدر صاف گوئی سے اس نازک موضوع پر قلم اُٹھانے کا حوصلہ کرتا۔ ہندوستان میں جہاں اقلیتی فرقہ صلح، امن، آشتی سے رہتا اور پھلتا پھولتا دکھائی دیتا ہے وہیں عصمت کے الفاظ میں، پاکستان میں اقلیتی فرقہ "آنکھ میں لگانے کو نہیں ملتا"۔ عصمت لکھتی ہیں:

"بھئی تم بھی کمال کرتی ہو۔ ارے ہمارا دل گردہ دیکھو۔ تم نے الگ ملک مانگا۔ ہم نے اپنا سب سے زرخیز اور حسین حصّہ تمھیں دے دیا۔ اپنے بھائی بند بانٹ دیئے۔ جس کا جی

---

[1] عصمت چغتائی، "باتیں عصمت آپا سے" انٹرویو از ڈاکٹر شمع افروز زیدی۔ ماہنامہ بیسویں صدی نئی دہلی، سالنامہ جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۳۱

چاہے یہاں رہے۔ چاہے تو مزے سے تمھارے ملک میں چلا جائے۔ تم نے تو سب ہندو
بھگا دیئے یا چٹ پٹ کر دیئے۔ مگر ہندوستان میں جس نے چاہا جائیداد پر قبضہ رکھنے کے
لئے ڈٹا رہا۔ وہاں تو ہندو مجھے آنکھ میں لگانے کو نہیں ملا۔ مگر یہاں اُنیس کروڑ موجود ہیں۔
دو مسلمان صدر بھی بنے اور کروڑوں اپنی خوشی سے یہاں جاگیریں، انڈسٹریاں کھیت کھلیان
سنبھالے ڈٹے ہوئے ہیں۔[1]

یہ تقابل بڑا معنی خیز اور بصیرت افروز ہے۔ دیکھئے عصمت نے چند ہلکے پھلکے جملوں میں کس ادا سے کتنا کچھ کہہ دیا ہے۔ ایک مخصوص طبقہ ان کے کڑوے سچ کو ہضم کر پانے سے قاصر رہا اور اس نے بہت غم و غصّے کا اظہار کیا مگر عصمت نے کمال شانِ بے اعتنائی سے اُس کی طرف مُڑ کر بھی نہ دیکھا اور اپنے آپ میں مگن اپنی ڈگر پر رواں رہیں۔ وہ نتیجے سے بے پروا رہیں مگر نتیجہ اُن کا تعاقب کرتا رہا، حتیٰ کہ اُس نے انھیں جا لیا——— ان کے انجام سے ہم سب واقف ہیں۔

حقوقِ نسواں

یہاں مختصر الفاظ میں عصمت کی شخصیت کے اس مخصوص پہلو کا ذکر مقصود ہے جو انھیں ان کے فن کی طرح عرصۂ دراز تک زندہ رکھے گا۔ درحقیقت ان کا فن اور شخصیت اس اعتبار سے اس قدر مربوط اور مخلوط ہو گئے ہیں کہ بعض اوقات انھیں ایک دوسرے سے الگ کر کے ان کا محاسبہ کرنا چنداں آسان نہیں۔ انھوں نے نچلے اور متوسط طبقے کی عورت کی زبوں حالی پر اپنے نظریات کا بلند بانگ اظہار نہ صرف اپنے بیانات اور مضامین میں کیا بلکہ اُسے اپنے فن میں بھی سمویا۔

عصمت جبلّی طور پر باغی واقع ہوئی تھیں۔ ان کے آب و گِل میں باغیانہ انداز روزِ اوّل سے ہی موجود تھا۔ مگر باغیانہ جذبات کا کسی کے وجود میں موجود ہونا ایک بات ہے مگر انھیں نہ صرف اظہار کا لبادہ اوڑھانا بلکہ عملی جامہ پہنانے کے لئے بے لچک رویّہ اپنانا اور چہار سو سے مخالفت کے باوصف پامردی اور ثابت قدمی سے اپنے موقف پر ڈٹے رہنا دُوسری بات ہے۔ مسلّمہ عقائد اور نظریات سے انحراف کرنے اور ایک مردِ مجاہد کی طرح شدّ و مد سے اپنی آواز کو برِّصغیر کے طُول و عرض میں پہنچانے کے لئے دَم خم چاہیئے تھا، جرأت اور جسارت چاہیئے تھی، اور رگوں میں اسپات کی آمیزش چاہیئے تھی۔ عصمت ان اوصاف سے متصف تھیں۔

---

[1] عصمت چغتائی، "دوشیزہ" کی مدیرہ کے نام خط۔ ماہنامہ بیسویں صدی، نئی دہلی۔ سالنامہ۔ جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۱۶

عصمت ابھی تو دس برس کی بچّی ہی تھیں کہ وہ اس راز کو پاگئیں کہ والدین لڑکیوں سے لڑکوں کے مقابل امتیازی سلوک روا رکھتے ہیں اور لڑکے بھی لڑکیوں کو اپنے سے کمتر اور کہتر سمجھتے ہیں۔ درحقیقت یہ نظریات ہمارے معاشرے میں نہ جانے کتنی صدیوں سے گھر کر چکے تھے اور ان کی جڑیں کتنی گہری اور وسیع پھیل چکی تھیں کہ ان کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کا تصوّر ہی "مجذوب کی بڑ" سا لگتا تھا۔ ایسے ناسازگار ماحول میں اپنے نظریات کی بے باکانہ تبلیغ کرنا اور اوروں کو اپنے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب دینا بہت جوکھم کا کام تھا، جسے ایک مردِ مجاہد ہی انجام دے سکتا تھا۔ عصمت ایک ایسی ہی مجاہدہ تھیں۔ انھوں نے دقیانوسی عقائد کی فصیلوں میں جو شگاف کئے وہ وقت کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتے گئے۔ یہ ان کا ایک ایسا کارنامہ تھا جس سے ایک مخصوص طبقے نے نہ صرف صَرفِ نظر کیا بلکہ انھیں ملعُون اور مطعُون بھی گردانا۔ مگر انھوں نے نہ قدم پیچھے ہٹائے، نہ اپنی زبان کی عنان کھینچی اور نہ اپنے قلم پر روک لگائی۔ بلکہ وہ جذبہ بتدریج فزوں تر ہوتا گیا اور اس کی تب و تاب آخری دَم تک ماند نہ پڑی —— یہاں ہم اس اساسی بات کو نہیں بھول سکتے کہ وہ اوّل و آخر ایک عظیم ادیبہ اور فنکارہ تھیں مگر وہ ساتھ ساتھ ایک سماجی رہنما اور مصلح کا کردار بھی بڑی شد و مد سے ادا کرتی رہیں گویا کوئی مقدّس فریضہ ادا کر رہی ہوں۔

جیسا کہ "حیات" کے باب میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ عصمت نے اپنی آنکھوں سے جو عورت کی زبوں حالی دیکھی۔ مرد کے ہاتھوں اس کی جو دُرگت بنتے دیکھی۔ اور جس خاموشی، بے بسی اور بے چارگی سے اُسے مرد کے ظلم و جبر کو سہتے دیکھا، اُس نے انھیں حد درجہ متاثر کیا۔ ہمارے معاشرے میں تب عورت گھر کی چکّی میں پستی، مرد کی ہوس کا شکار بنتی۔ ہر سال بچّے پیدا کرتی، گھر کی چار دیواری میں محبوس رہتی، باہر نکلتی تو پردہ کرتی، تعلیم کے جوہر سے محرُوم رہتی، اقتصادی طور پر مرد کی دستِ نگر رہتی، مرد اس پر سوتَن لے آتا تو بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لا سکتی۔ مرد جو چاہے کر گذرے اسے "خدائے مجازی" سمجھ کر سرِ تسلیم خم کر دیتی اور جب اس کی کشتی مرد کے لائے طوفانوں میں گھر جاتی تو وہ اسے مشیّتِ ایزدی جان کر، صبر و شکر کر کے حیاتِ ارضی گذار دیتی —— یہ تھے وہ حالات جن کے خلاف عصمت نے آواز بلند کی اور یہ آواز اُبھرتی، پھیلتی، بڑھتی چلی گئی —— اور اسی نسبت سے ان کی مخالفت اور مزاحمت بھی شدید سے شدید تر ہوتی گئی۔

عصمت کو اس بات کی شکایت رہی کہ مرد نے کچھ مخصوص خصائص عورت سے منسوب کر دیئے اور ان پر کھری اُترنے کی ذمّہ داری اس پر عائد کر دی۔ اور تقابل سے خود کو تمام ذمّہ داریوں سے آزاد رکھا۔ عورت سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مرد کے مقرر کردہ مقیاس پر پوری اُترے۔ "یہ کرے اور یہ نہ کرے"، "یوں جئے اور یوں نہ جئے" مگر مرد پر کوئی پابندی عائد نہ تھی۔ گویا مرد عورت کا خود ساختہ محاسب بن گیا۔ آخری فیصلہ مرد کے ہاتھ میں رہا

اورعورت بے دست و پا ہوکر رہ گئی ـــــ پھر مرد نے عورت کو اپنی فکرونظر کے مطابق تولا، پرکھا اور اپنا فیصلہ صادر کردیا۔کسی نے اسے حسن کا پیکر گردانا، کسی نے اُسے پارسائی اور نیک سیرتی کا مجسمہ قرار دیا، کسی نے اُسے خُدا کے بعد سب سے قابلِ احترام ہستی جانا توکسی نے اُسے شیطان کی خالہ گردانا۔ مرد نے "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست" کے مصداق عورت کا محاسبہ کیا اور یوُں اپنی برتری قائم رکھی۔

عورت کو جب مختلف اوصاف کا حامل قرار دیا گیا تو اُس سے معاشرے کی توقعات خود بخود وابستہ ہو گئیں۔ مثلاً عصمت کے الفاظ میں:

"مَردوں نے کہا مرد ظالم ہوتا ہے" وہ چپُ چاپ ظلم سہنے لگیں"

"مَردوں نے کہا" عورت ڈرپوک ہے" وہ چوہے تک سے ڈرنے لگیں"

"پھر فرمایا۔ وقت پڑے تو عورت جان پر کھیل جاتی ہے" بس پھٹ سے جان پر کھیل گئیں"

"ماں کی ممتا کا ساری دُنیا ڈھول پیٹتی ہے۔باپ کی باپتا کا رونا کوئی نہیں روتا۔عورت کی عزت لٹ سکتی ہے،مرد کی نہیں لٹتی۔شاید مرد کی عزت ہی نہیں ہوتی جو لوٹی کھسوٹی جاسکے۔ عورت کے حرامی بچہ ہوتا ہے مرد کے کچھ نہیں ہوتا"[1]

عصمت کو مرد سے یہ شکایت رہی کہ اس نے عورت کو یا تو ساتویں آسمان پر چڑھا دیا یا تحت الثریٰ میں پٹخ دیا مگر اعتدال کا راستہ کبھی اختیار نہ کیا۔ اس نے عورت کو کبھی اپنا ہم سر نہ مانا۔اسے ایک ہی صف میں اپنے شانہ بشانہ کھڑا نہ کیا۔اور اپنی نظروں میں وہ اس سے بلند و بالا ہی رہا۔ وہ عورت کی ناز برداری کرسکتا ہے۔ اُسے پیار اور محبت دے سکتا ہے مگر اسے برابر کا درجہ نہیں دے سکتا۔گویا عورت مرد کی نظروں میں سب صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کے باوصف اس سے دو چار بالشت نیچی ہی رہی ـــــ پھر جب عورت وفا کی پُتلی ٹھہری تو راہِ مُستقیم سے لغزش کھانے پر وہ لائقِ گردن زدنی قرار دی گئی۔ مگر مرد اس بندش سے آزاد رہا۔"لغزش" سے اس کی نظر کبھی نیچی نہیں ہوتی۔عورت شرم وحیا سے مرجاتی ہے۔زنا کاری میں عورت مرد دونوں شریک ہوتے ہیں مگر عورت حرامی بچہ گود میں لئے بیچ چوراہے کھڑی رہ جاتی ہے جبکہ مرد کھلے عام دندناتا پھرتا ہے اور اس پر کوئی انگلی نہیں اُٹھاتا ـــــ جب مرد جابر اور ظالم ٹھہرا تو جبر و قہر سہنا ازخُود عورت کا شعار بن گیا ـــــ عورت کا بوقتِ ضرورت مرد کی خاطر جان پر کھیل جانا ایک فطری بات ٹھہری مگر اس کے مقابل مرد کا عورت پر نچھاور ہو جانا ضروری نہیں ـــــ تضاد واضح ہو جاتا ہے۔عصمت کے استدلال میں وزن ہے۔حقیقت کا گہرا رنگ ہے۔ دھیان رہے کہ اس بات

---

[1] عصمت چغتائی۔ آدھی عورت آدھا خواب (مضمون) مجموعہ "آدھی عورت آدھا خواب" بیسویں صدی پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، نئی دہلی، ص ۲۸

کا اطلاق خاص طور پر ہمارے مسلم معاشرے کے متوسط اور پسماندہ طبقے پر ہوتا ہے جہاں عورت سر تسلیم خم کر کے مرد کی "سرداری" اور "حکمرانی" قبول کر لیتی ہے۔ عصمت کو جب بھی موقعہ ملا انھوں نے اپنے نظریات کا برملا اظہار کیا۔ مثال کے طور پر قرۃ العین حیدر اس بارے میں لکھتی ہیں کہ جاں نثار اختر کے انتقال کے وقت ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ ایک خاتون جو اُن کی منہ بولی بہن تھیں، پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ ایک عورت چلائے جا رہی تھی "ارے بیوہ کو بلاؤ۔ بیوہ کی چوڑیاں توڑو"۔ عصمت کچھ دیر خاموشی سے یہ منظر دیکھتی رہیں۔ پھر آگ بگولا ہو کر اُٹھیں۔ پہلے تو منہ بولی بہن کو اچھی طرح لتاڑا۔ اس کے بعد جو عورت بے چاری بے حال خدیجہ کی چوڑیاں توڑنے پر کمر بستہ تھی، عصمت نے اس کی طبیعت صاف کی۔ پہلے تو کڑکیں۔ عورت ہی کو کیوں کہا جاتا ہے کہ فلاں بیوہ ہے۔ مرد کے لئے کیوں نہیں کہتے کہ فلاں رنڈوا ہے۔ اور فوراً جب وہ رنڈوا ہو تو کھینچ کر اس کی عینک اور گھڑی توڑ ڈالو[1]۔

عصمت کا عقیدہ تھا کہ عورت کی زبوں حالی کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ ناخواندہ ہے۔ اس لئے اسے نہ تو اپنے حقوق کی آگہی ہے اور نہ ہی ان کے تحفظ کا احساس۔ پھر وہ بفرض محال احتجاج کرے بھی تو اس کی آواز صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسرے اقتصادی طور پر وہ مرد کی غلام ہے۔ جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت حاصل نہیں کر پاتی، وہ اپنی موجودہ حالت سے کبھی اُبھر نہیں سکتی۔ ان کے نزدیک ایک عورت جو اپنے خاوند سے محض روٹی کپڑے کی خاطر یا یوں کہیئے کہ جان و تن کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے چمٹی رہتی ہے۔ اُس سے ایک طوائف کہیں بہتر ہے جو اپنا جسم بیچ کر روٹی کما کھاتی ہے اور آزادانہ طور پر زندگی بسر کرتی ہے۔ عصمت کی بات بے جواز نہیں۔ انھوں نے اپنے اس نظریے کا کھلے عام اظہار کیا۔ اس بارے میں سلمیٰ صدیقی جو عصمت کی گہری دوست اور رازداں تھیں لکھتی ہیں کہ ایک دفعہ شامتِ اعمال سے ایک طوائف کہیں عصمت سے اپنا دُکھڑا رونے بیٹھ گئی۔ سب کچھ کہہ چکی تو اس نے اپنے اِس نیک ارادے سے عصمت کو مطلع کیا کہ وہ اپنی گناہ کی زندگی سے عاجز آ گئی ہے اور باقی ماندہ زندگی شریفانہ طور پر گذارنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ عصمت یہ سُن کر آپے سے باہر ہو گئیں:

> "ہے ہے کمبخت کیا بھوکوں مرنے کا ارادہ ہے۔ ۔ ۔؟ کتنے عیش کر رہی ہو۔ شریفوں کے کیا سُرخاب کے پر لگے ہوتے ہیں، جو شریف بننے کے لئے مری جا رہی ہو ـــــ کبھی پیشہ ترک کرنے کی غلطی بھی مت کرنا ـــــ اور چھوڑ دو تو میرے پاس مت آنا روتی بلکتی ـــــ شریف بیویوں کی طرح شریف مردوں کے جوتے ڈنڈے سہتی ہوئی۔"

1۔ قرۃ العین حیدر، "لیڈی چنگیز خان" (مضمون)، ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۹۲ء ص (۴-۵)

اور عصمت نے اس طوائف کو طوائف رہنے کے ایسے ایسے فائدے بتائے کہ وہ لالہ رُخ اپنے

کاشانے میں واپس چلی گئی۔[1]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں عصمت پردے کے بھی سخت خلاف تھیں۔ پہلے تو اُنھوں نے خود گھر والوں کی سخت مزاحمت کے باوجود بُرقعہ اُتار پھینکا۔ پھر پردے کی رسم کے خلاف علَم بلند کیا اور کھُلے عام اپنے نظریہ کی تبلیغ کی۔ اس بارے میں سلمیٰ صدّیقی ایک واقعہ بیان کرتی ہیں ـــــ ایک ٹریننگ کالج میں عصمت کو مدعو کیا گیا۔ انھوں نے اپنے بے جھجک لہجے میں بہت کچھ کہہ ڈالا۔ لڑکیوں کو بُرقعے اور پردے کے حصار سے باہر آنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔ ایک متشرّع قسم کے بُزرگ کو اس تقریر پر اعتراض ہُوا اور عصمت کو مخاطب کرکے ذرا ترش روئی سے بولے:

"محترمہ! کیا آپ چاہتی ہیں کہ لڑکیاں اپنے عُریاں جسم کی نمائش کریں؟"

عصمت نے اطمینان سے فرمایا "جی ہاں۔ اگر اُن کے جسم پر کوڑھ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔"

سلمیٰ صدّیقی، عصمت کے اس جُملے کا حُسن یوں بیان کرتی ہیں:

"بظاہر فقرہ بڑا چبھتا ہُوا ہے۔ لیکن غور کیجئے تو بڑا بلیغ ہے۔ عصمت چغتائی تو محض یہ کہنا چاہتی ہیں کہ کوئی کام کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر اس عمل یا نظریے یا اعتقاد یا ایقان کے جسم پر کوڑھ نہ ہو۔"[2]

اور عصمت کا یہ جارحانہ انداز تمام عمر جاری رہا۔ انھوں نے اپنی تقاریر، مضامین، انٹرویوز حتیٰ کہ ادب میں بھی یہ جہاد شدّ و مدّ سے برقرار رکھا۔ بلاشبہ اُن کا انداز بعض اوقات بڑا تیکھا ہوتا تھا۔ مگر ان کے نظریات کی صداقت اور ان کی بے لوث اور پُر خلوص سعی بلیغ سے انکار ممکن نہیں ـــــ لُطف یہ ہے کہ گاہے گاہے وہ اپنے ہمراز دوستوں سے بھی اپنے نظریات کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتی رہتی تھیں کہ اُن کی تائید سے اُنھیں حوصلہ ملتا تھا اور زیادہ زور سے آواز بلند کرنے کے لئے ہمّت بندھتی تھی۔ مثلاً ایک بار عصمت نے کرشن چندر سے سوال کیا:

"پیشہ ور اور شریف زادی میں کیا فرق ہے؟"

"وہی جو تاج محل ہوٹل اور فٹ پاتھ پر لگے خانچے میں ہے۔"

"پیٹ تو دونوں جگہ بھر جاتا ہے۔"

"تاج اور شیرٹن کے کھانے سے پیٹ کے ساتھ دماغ بھی آسودہ ہو جاتا ہے اور فٹ پاتھ کے کھانے سے خونی پیچش کے جراثیم سے پالا پڑتا ہے۔"

"شادی بھی تو اکثر پیشہ ہی بن جاتی ہے۔ جو عورت صرف روٹی کی خاطر شادی کرتی ہے اس

---

[1] [2] سلمیٰ صدّیقی "عصمت کا جادو" (مضمون) اُردو ماہنامہ "مکالمات" نئی دہلی۔ عصمت چغتائی نمبر (دسمبر ۱۹۹۱ء) ص ۹۰، ۹۱

میں اور نگہبانی میں کیا فرق ہے؟"

"صرف نام کا فرق ہے۔"[1]

عصمت نے جن موضوعات پر عمر بھر جہاد چھیڑے رکھا وہ ہیں پسماندہ طبقے کی فلاح و بہبود، حقوقِ نسواں، تعلیمِ نسواں اور پردہ۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ عصمت بعض اوقات جذبات سے مغلوب ہو کر مناسب حدود سے گذر جاتی تھیں اور ناگفتنی باتیں بھی ان کی نوکِ زبان پر آجاتی تھیں مگر ماننا پڑے گا سوتے ہوؤں کو جگانے کے لئے صُور پھونکنا ہی پڑتا ہے ـــــ اور پھر زخم جتنا گہرا ہو گا نشتر بھی اتنا ہی گہرا لگے گا۔ عصمت نے صدیوں سے طاری جمُود کو توڑنے کی مخلصانہ کوشش کی اور ان کی آواز کی گونج آج بھی سُنائی دیتی ہے۔

عصمت کی شخصیّت کا یہ گراں قدر پہلو بطور ایک انسان کے انھیں اپنے تمام ہمعصر ادیبوں میں ایک جُداگانہ اور منفرد حیثیت عطا کرتا ہے۔

فلمی کہانیاں

عصمت کی فلمی کہانیوں کو ہم اُن کی ادبی تخلیقات میں شامل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ عام طور پر فلمی کہانیوں کی چنداں قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ اکثر کہانیوں کے موضوع کا تعین پروڈیوسر یا ڈائرکیٹر کرتے ہیں۔ افسانہ نگار کہانی کا کینڈا یا ڈھانچہ تیار کرتا ہے۔ مکالمہ نویس مکالمے لکھتا ہے منظر نویسی کرتا ہے اور پھر باکس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر کاروباری نقطۂ نظر سے عوام کی دل چسپی کے لئے "مرچ مسالا" بھرا جاتا ہے۔ ہر طبقے کے فلم بینوں کے لئے کچھ نہ کچھ کشش کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ پھر پروڈیوسر اور ڈائرکیٹر اپنی کاروباری مصلحتوں اور پیشہ ورانہ سُوجھ بُوجھ کے مطابق کہانی کی نوک پلک دُرست کراتے رہتے ہیں ـــــ اور پھر جب فلم پردۂ سیمیں پر دکھایا جاتا ہے تو بیچارہ افسانہ نگار یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے کہ اُس کی کہانی کا ناک نقشہ بُری طرح مسخ کر دیا گیا ہے ـــــ عصمت اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یُوں کرتی ہیں:

> "فلموں کے لئے لکھنے وقت معلوم ہُوا کہ یہاں نہ بیبا کی کی دھونس چلتی ہے، نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہیئے جو چھپّر پھاڑ کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مُطابق چلنا ہو گا۔ لہٰذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔"[2]

---

[1] عصمت چغتائی: "چراغ روشن ہُوا"، مجموعہ "آدھی عورت آدھا خواب"۔ بیسویں صدی پبلی کیشنز (پرائیویٹ لمیٹڈ)۔ نئی دہلی۔ ص ۱۳۴۔

[2] عصمت چغتائی: "بچپن اور خاندانی ماحول"۔ (مضمون) عصمت چغتائی نمبر (دسمبر ۱۹۹۱ء) اُردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی۔ ص ۴۸

باکس آفس پر فلم کی کامیابی کا انحصار کئی باتوں پر ہوتا ہے۔ مرکزی اور ثانوی کردار، گیت کار، سنگیت کار اور گلوکار کے کام پر بہت کچھ منحصر ہوتا ہے۔ ڈائرکشن اور فوٹو گرافی کا بھی بہت اہم مقام ہے۔ بعض فلمیں محض ہیرو اور ہیروئن کے نام اور کام کے سہارے چل نکلتی ہیں۔ بعض صرف گیت اور دھنوں کے بل بوتے پر کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطانپوری کے گیت اور لتا منگیشکر، آشا بھونسلے، محمد رفیع اور مکیش کی آواز فلم کی کامیابی کی ضمانت ہوتے ہیں ——— پھر فلم خواہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو فلمی کہانی کی کوئی دائمی قدر و قیمت نہیں ہوتی ——— عصمت نے کُل ملا کر چودہ پندرہ فلمی کہانیاں لکھیں لیکن آج اُن کی ادبی قیمت صفر ہے۔ فلمی کہانیوں کو ادبی کسوٹی پر پرکھنا بہت بڑی بھول ہے۔ ہمارے نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک فلموں کی جانب ادب کی خدمت کے لئے نہیں بلکہ روپے پیسے کی مقناطیسی کشش کی وجہ سے راغب ہوئے تاکہ وہ ایک آسودہ اور پُر آسائش زندگی بسر کر سکیں۔ ادبی افسانہ نگاری نام زیادہ دے سکتی ہے اور دام کم۔ جبکہ فلمی کہانی نویسی دام زیادہ دے سکتی ہے اور نام کم۔ چنانچہ عصمت اس بارے میں لکھتی ہیں:

> "مَیں نے چودہ پندرہ کہانیاں، ڈائیلاگ اور سینار یو لکھے ہیں۔ میں نے کوئی (ادب کی) زیادہ خدمت و دمت نہیں کی بلکہ اپنی خدمت کی ——— زیادہ تر اپنے گذارے کے لئے مَیں نے لکھا۔ صرف افسانے لکھ کر تو میں اپنا گذارہ نہیں کر سکتی۔ میگزینوں اور اخباروں میں لکھ کر تو میرا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ میرے لئے فلم ایک ذریعۂ آمدنی ہے۔"[1]

یہ صحیح ہے کہ ہمارے ادیبوں نے آسودگی کی خاطر فلمی صنعت سے ناتا جوڑا۔ مگر یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ بعض ادیبوں اور شاعروں نے پابندیوں کے باوصف فلموں کو کچھ حد تک اپنے رنگ میں رنگ دیا اور اُن پر اپنے نظریات کی مہر ثبت کر دی۔ مثال کے طور پر ساحر لدھیانوی نے فلمی گانوں کو ان کی پست سطح سے اُٹھا کر معنویت، مقصدیت اور ادبیت عطا کی۔ "سماج کو بدل ڈالو"، "ساتھی ہاتھ بڑھانا"، "عورت نے جنم دیا مَردوں کو، مَردوں نے اُسے بازار دیا" جیسے گیتوں نے فلموں کو ایک نیا آدرش، ایک نئی سمت دی ——— ایسے ہی خواجہ احمد عبّاس کے نظریات کی سُرخی راج کپُور کی فلموں خاص طور سے "آوارہ" اور "شری چار سَو بیس" میں صاف نظر آتی ہے ——— راجندر سنگھ بیدی نے "داغ" اور "دستک" جیسی خوبصورت مقصدی کہانیاں فلموں کو دیں ——— اور بھی فلموں سے وابستہ کئی ادیب اور شاعر اسی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ فلمی دُنیا اُن

---

[1] عصمت چغتائی "عصمت چغتائی سے گفتگو" (انٹرویو) عصمت چغتائی نمبر (دسمبر ۱۹۹۱ء) اُردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی ص ۲۲

کی گراں قدر خدمات کو کبھی بھلا نہ سکے گی ۔

یہ امر غور طلب ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے فلموں سے وابستگی اختیار کر کے اپنی ادبی صلاحیتوں کو زنگ آلود نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے فلمی کہانیوں کے دوش بدوش اپنے ادبی مشاغل بھی شدّ ومدّ کے ساتھ جاری رکھے اور اپنی ادبی صلاحیتوں اور اہلیتوں کو ہمیشہ بروئے کار لاتے رہے۔ بدیں وجہ وہ آج بھی اپنے فن میں زندہ وتابندہ ہیں اور مدتوں رہیں گے جبکہ اُن کی فلمی کہانیاں کبھی کی کفنائی اور دفنائی جا چکی ہیں ۔

بہ ایں وجہ

لیکن ہمارے بہت سے ادبا اور شعرا کو فلمی زندگی راس نہ آئی اور وہ دل شکستہ ہوکر اسے چھوڑ گئے۔ ان میں منشی پریم چند، جوشؔ ملیح آبادی، ساغرؔ نظامی، اوپندر ناتھ اشکؔ، علی سردار جعفری، بھگوتی چرن ورما، امرت لال ناگر، حیات اللہ انصاری وغیرہ کے نام فوراً ذہن میں آتے ہیں ۔

ہمارے جن افسانہ نگاروں نے نہ صرف فلمی کہانیاں اور مکالمے لکھے بلکہ فلمیں بھی بنائیں اُن میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور خواجہ احمد عبّاس پیش پیش ہیں ۔

عصمت جن فلموں سے وابستہ رہیں وُہ حسب ذیل ہیں :

شمار	فلم کا نام	ہیرو اور ہیروئن کے نام	ریلیز کا سال
۱	چھیڑ چھاڑ	نذیر ــــ ستارہ	۱۹۴۳ء
۲	شکایت	شیام ــــ سنیہہ پربھا	۱۹۴۸ء
۳	ضدّی	دیو آنند ــــ کامنی کوشل	۱۹۴۸ء
۴	آرزو	دلیپ کمار ــــ کامنی کوشل	۱۹۵۰ء
۵	بُزدل	کشور ساہو ــــ نمّی	۱۹۵۱ء
۶	شیشہ	سجّن ــــ نرگس	۱۹۵۲ء
۷	فریب	کشور کمار ــــ شکنتلا	۱۹۵۳ء
۸	دروازہ	شیکھر ــــ شیاما	۱۹۵۴ء
۹	سوسائٹی	ناصر خان ــــ نمّی	۱۹۵۵ء
۱۰	لالہ رُخ	طلعت محمود ــــ شیاما	۱۹۵۸ء
۱۱	سونے کی چڑیا	طلعت محمود ــــ نوتن	۱۹۵۸ء
۱۲	گرم ہوا	بلراج ساہنی ـ گیتا سدھارتھ	۱۹۷۳ء
۱۳	جنون	ششی کپور ــــ نفیسہ علی	۱۹۷۹ء

مندرجہ بالا فلموں میں "آرزو"، "شیشہ"، "بزدل"، "فریب"، "دروازہ"، "سوسائٹی" اور "سونے کی چڑیا" فلمیں عصمت اور اُن کے شوہر شاہد لطیف نے فلم ساز (پروڈیوسر) اور ہدایت کار (ڈائریکٹر) کی حیثیت سے بنائیں ——— عصمت کے الفاظ میں "صرف دو ایک اچھی کہانیاں لکھیں جیسے "بزدل"، "سونے کی چڑیا"، "ضدّی"، اور "دروازہ"۔ لیکن ہماری فلمیں چلی نہیں، اِس لئے ہم ختم ہو گئے"[1]

جب عصمت سے ایک انٹرویو کے دوران یہ استفسار کیا گیا کہ ان کی فلموں کے ڈائیلاگ ان کے افسانوں کے ڈائیلاگ سے اس قدر مختلف کیوں ہیں تو اُنھوں نے جواب دیا۔

"جیسا ڈائریکٹر یا پروڈیوسر کہتا ہے، مَیں ویسے ڈائیلاگ لکھتی ہُوں۔ مَیں فلم کے لئے فلم کی ضرورت کے مطابق ڈائیلاگ لکھتی ہُوں۔ مَیں اس میں اپنا رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کرتی ہُوں"[1]

عصمت کی بہترین فلم "گرم ہوا" تھی۔ جس کی کہانی عصمت نے لکھی جبکہ ڈائیلاگ اور سینار یو کیفی اعظمی کے تھے۔ یہ امر حیران کُن ہے کہ عصمت نے شیام بنیگل کی فلم "جنون" میں ایک بُڑھیا کا رول بھی بحُسن وخوبی ادا کیا، جبکہ اس سے قبل اُنھوں نے کبھی فلمی اداکاری نہیں کی تھی۔ جب اُن سے اس بارے میں پُوچھا گیا تو اُنھوں نے حسبِ معمول ہنستے ہنستے اور خوب مزے لے لے کر جواب دیا:

"اس بُڑھیا کا رول پہلے ایک اور آرٹسٹ کو دیا گیا تھا۔ لیکن وہ مرنے سے بہت ڈرتی تھی۔ اس فلم میں اُسے ایک منزل پر مرجانا تھا۔ اور اتفاق دیکھو وہ فلم میں اَدھورا کام چھوڑ کر مر گئی۔ یعنی مرنے کی اداکاری کرنے سے پہلے ہی۔ شیام بنیگل نے ایک روز اچانک مجھے وُہی رول آفر کر دیا۔ مَیں تو بھئی مَوت ووت سے بالکل نہیں ڈرتی۔ کل کی آتی آج آجائے۔ مَیں نے جھٹ اس رول کو قبُول کر لیا"[2]

اِس فلم میں عصمت کی اداکاری بالکل نیچرل محسُوس ہوتی تھی۔ اور مکالمے بھی اُنھوں نے بغیر کسی کوشش کے بڑی روانی سے ادا کئے تھے ——— ہمارے جن ادیبوں نے فلموں میں اداکاری کی اُن میں مہندر ناتھ (کرشن چندر کے چھوٹے بھائی) سرِفہرست ہیں۔ اُنھوں نے کرشن چندر کی دو فلموں "سرائے کے باہر" اور

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ "عصمت چغتائی سے گفتگو"۔ یونس اگاسکر۔ "عصمت چغتائی نمبر"۔ (دسمبر ۱۹۹۲ء) اُردو ماہنامہ "مکالمات"۔ دہلی ص ۲۲

[3] رام لعل۔ "عصمت چغتائی مجموعہ" "دریچوں میں رکھے چراغ"۔ شانتی نکیتن، اندرانگر، لکھنؤ۔ ص ۱۳۹

"راکھو" میں ہیرو کا رول ادا کیا ——— سعادت حسن منٹو نے اشوک کمار کی فلم "آٹھ دن" میں ایک فوجی کپتان کا رول ادا کیا تو ان کے پسینے چھوٹ گئے ——— اوپندر ناتھ اشک نے ایک بہت مختصر سا کردار راجندر سنگھ بیدی کی آخری فلم "آنکھن دیکھی" میں نبھایا۔

بحیثیت مجموعی ہمارے چوٹی کے افسانہ نگاروں کو فلمی زندگی سے وابستگی نے خوشحالی اور فارغ البالی عطا کی اور وہ جینے کی طرح جئے ——— عصمت بھی ان میں سے تھیں۔

●

فن

تخلیقی طریقۂ کار اور اسلوب

کسی کہانی کار کے تخلیقی طریقۂ کار کو ہم دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اوّل کہانی کے لئے موضوع کا انتخاب اور مواد کی فراہمی۔ دوم اظہار کے لئے مخصوص لوازمات کا مہیّا ہونا تاکہ تخلیقی عمل بروئے کار آکر اپنے انجام کو پہنچے ـــــــ آئیے۔ اس بارے میں عصمت پر کچھ کہنے سے پیشتر تقابل کی غرض سے ذرا اُن کے ہمعصر چوٹی کے دو ایک فنکاروں پر اُچٹتی سی نظر ڈالیں۔

○ سعادت حسن منٹو بلا کے زُود نویس اور بسیار نویس تو تھے ہی، بدیہہ نویس بھی تھے۔ اُنھوں نے ڈھائی سَو کے قریب افسانے لکھے جن میں سے بیشتر افسانے بیساختہ لکھے گئے۔ کسی کی زبان سے کوئی فکر انگیز جملہ نکلتا تو انھیں فوراً افسانہ لکھنے کی انگیخت ہوتی۔ ہنگامی حالات سے متاثر ہوتے تو بھی ان کا قلم جُنبش میں آجاتا۔ آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کے دوران ایک سال کے مختصر سے عرصے میں انھوں نے سَو سے زیادہ ڈرامے لکھے جن میں سے اکثر کرشن چندر یا ان کے دیگر رفقائے کار کی فرمائش پر لکھے گئے اور خوبی یہ کہ ہر ڈرامہ براہِ راست ٹائپ رائیٹر پر سب کی موجودگی میں ایک ہی نشست میں لکھا گیا اور وُہ نشر ہُوا ـــــــ بعض اوقات رات کو خیالات کا ہجومِ بیکراں اُن کے ذہن میں خلفشار مچائے رکھتا۔ احساسات نئے احساسات کو بیدار کرتے، جزئیات نئی جزئیات کی نمُود کرتیں اور یہ سلسلہ دراز ہوتا جاتا۔ بالآخر مطلع صاف ہونے لگتا اور افسانہ تمام جزئیات کے ساتھ ایک مخصُوص ترتیب سے سانچے میں ڈھلنے لگتا ـــــــ صبح اُٹھتے تو ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہوتے ـــــــ بعض اوقات افسانہ نازل نہ ہوتا تو بہت بے چین ہوتے۔ گھر میں اِدھر اُدھر اضطراب کے عالم میں گھُومتے تو ان کی اہلیہ صفیہ بیگم کہتیں کہ اب رہنے دو۔ بہت ہو چکی۔ اللہ کا نام لے کر شروع کرو اور لکھ ڈالو۔ اور وہ لکھ ڈالتے۔

انھیں لکھنے کے لئے کسی خاص ماحول کی ضرُورت نہ تھی۔ تخلیہ اور خاموش فضا بھی درکار نہ تھی۔ وہ لکھتے وقت کرسی پر ٹانگیں اُٹھا کر اُکڑوں بیٹھ جاتے، نفیس رنگین کاغذ کا پیڈ اپنے گھٹنوں پر رکھ لیتے، قلم ہاتھ میں لیتے اور بسم اللہ کے اعداد ۷۸۶ لکھ کر افسانہ شروع کر دیتے۔ گھر میں ان کی بچّیاں شور مچا رہی ہوتیں تو وہ ان سے بھی باتیں

کرتے جاتے۔ آپس میں جھگڑتیں تو اُن کے جھگڑے نمٹاتے، کوئی ملنے والا آجاتا تو اس کی خاطر تواضع کرتے ــــ مگر افسانہ نویسی جاری رہتی۔

کرشن چندر کا یہ قاعدہ تھا کہ جب بھی انھیں کوئی پلاٹ سوجھتا، وہ اس کے بنیادی خیال کو قلم بند کرکے محفوظ کرلیتے تھے تاکہ ذہن سے اُتر نہ جائے۔ اس طرح انھیں پلاٹ سوجھتے رہتے اور وہ نوٹ کرتے رہتے۔ جس خیال کو وہ کہانی کے سانچے میں ڈھال دیتے، اسے اپنی فہرست سے قلم زد کردیتے اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ــــ وہ بلا کا تخلیقی ذہن رکھتے تھے۔ دورانِ گفتگو کوئی غیر معمولی جملہ، روزمرّہ کی زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ یا حادثہ، کسی غیر معمولی شخصیت سے ملاقات، اُن کے افسانہ ساز ذہن میں کہانی کے بنیادی خیال کی تشکیل کردیتی تھی۔ اکثر اوقات انھیں کہانیوں کے پلاٹ یونہی گرے پڑے مل جاتے تھے، سرِراہ باتوں باتوں میں بغیر سعی اور کاوش کے۔ اسے نعمتِ خداوندی ہی کہہ سکتے ہیں ــــ اُن کے تخیل کی بے پناہ پرواز افسانے کے بنیادی خیال کو افسانے کا ہیولا تشکیل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی تھی۔ پھر ان کی باریک بین اور دُور رس نگاہیں، تجربات اور مشاہداتِ زندگی سے افسانوں کے لئے موزوں جزئیات مہیا کرتے تھے۔ اس طرح کرشن چندر کا ذہن ایک خودکار مشین کی طرح بلا تکلف اور بلا تردّد کہانیوں کی تخلیق کرتا رہتا تھا ــــ اس بات میں حقیقت کی چاشنی ہے کہ کرشن چندر کو پلاٹ کی بھی حاجت نہ تھی۔ اُن کے قلم میں وہ جادو تھا کہ صحرا میں کھڑے ہوئے تنہا درخت اور سڑک کے کھمبے پر ایک کامیاب افسانہ یکساں انداز میں لکھ سکتے تھے۔ یہ ان کی پروازِ تخیل کا اعجاز تھا ــــ رات کو سوتے میں بھی انھیں کوئی خیال سوجھتا یا جزئیات ان کے ذہن میں آتیں تو فوراً اُٹھ کر لکھ لیتے۔ تاکہ ذہن سے اتر نہ جائے۔

جونہی کرشن چندر کے ذہن میں کہانی کا پلاٹ مرتّب ہو جاتا۔ جزئیات ایک مخصوص ترتیب اور تواتر کے ساتھ اپنے اپنے مقام پر آجاتیں تو وہ فوراً تخلیہ چاہتے اور کہانی کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کردیتے۔ وہ اس بلا کے زود نویس تھے کہ دس پندرہ صفحے بغیر رُکے تھمے برق رفتاری سے لکھ دیتے تھے۔ افسانہ ہمیشہ ایک ہی نشست میں ختم کرتے اور اس پر کبھی نظرِ ثانی نہ کرتے۔ گویا جو لکھ دیا وہ حرفِ آخر ہوگیا۔ انھوں نے اپنے کئی شاہکار افسانے مثلاً "کالو بھنگی"، "اَن داتا"، "موبی" وغیرہ ایک ہی نشست میں لکھے۔

لکھنے کے لئے کرشن چندر ہمیشہ نہایت عمدہ چکنا نیلے رنگ کا پیڈ استعمال کرتے۔ برسوں وہ نب والے معمولی ہولڈر سے لکھتے رہے۔ بعد ازاں انھوں نے پارکر یا شیفر فاؤنٹین پن استعمال کرنا شروع کردیا۔

اس طریقۂ کار پر کرشن چندر تا حیات کاربند رہے۔

عصمت بھی اپنے ہم عصر فنکاروں کی طرح بے حد زود نویس تھیں۔ ان کے اپنے بیانات کے مطابق ان کی کوئی کہانی محض تخیل پر مبنی نہیں۔ گویا ان کا فن زندگی کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش

، کچھ دیکھتیں، اس سے متاثر ہوتیں تو اُسے فنکارانہ چابکدستی سے افسانے کے سانچے میں ڈھال دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے اکثر و بیشتر ہمارے معاشرے کے ایک مخصوص طبقے کے شب و روز سے متعلق ہیں اور ان میں حقیقت کا بڑا گہرا رنگ نمایاں ہے۔ ایک اپنی ہی ارضیت ہے ـــــ اس عمل سے اُن کے متلاطم ذہن کو سکون ملتا۔ قلبی طمانیت ملتی۔ عصمت اس بارے میں کہتی ہیں :

"میری کوئی کہانی تخیل کی پیداوار نہیں۔ جب کوئی مسئلہ دماغ میں اُلجھ جاتا ہے تو ایک نامی خلش ہوتی ہے اور کہانی کی صورت میں ایک بوجھ سا دل سے اُتر جاتا ہے ـــــ وہ جسے کیفیت کہتے ہیں انسان کے دل میں اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ کسی واقعہ یا پابندی سے متاثر ہوتا ہے۔ جھنجھلاہٹ، غصہ، غم اور مختلف جذبات اُبھرتے ہیں۔ اور میرا تجربہ ہے کہ کہانی یا مضمون کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کر دینے سے نسبتاً سکون مل جاتا ہے۔"[1]

ظاہر ہے کہ یہ شعوری طور پر نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ جانے کوئی واقعہ کب، کیوں، کہاں قلب و جگر کو چھو جائے اور پُرسکون ذہن کو مرتعش کر دے اور افسانہ نگار عصمت اپنے فن کے توسط سے اظہار کی راہ ڈھونڈنے لگیں۔

"یہ بتانا مشکل ہے کہ کس لمحہ ایک خیال، ایک مشاہدہ دل کو چھو گیا۔ خیال میں پکتا رہتا ہے۔ تیار ہو جاتا ہے اور مادی صورت میں کہانی بن جاتی ہے۔ یہی حال ہر کہانی کا ہوتا ہے۔ مواد بُوند بُوند دماغ میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ جسے انسان محسوس بھی نہیں کرتا۔"[2]

گویا جب ان کا ذہن متاثر ہوتا تو ردِّ عمل کے طور پر فنکارانہ اظہار کے لئے وہ غیر محسوس طور پر بُوند بُوند جُزئیات فراہم کرنے لگتا۔ اور یوں افسانہ معرضِ وُجود میں آجاتا۔

اب قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کس طرح کے واقعات، سانحات، مشاہدات اور تجربات ان کے ذہن کو متلاطم کرتے تھے جن سے ان کے تخلیقی عمل کو اُکساہٹ ہوتی اور کوئی افسانہ خلق ہو جاتا۔ اس کا جواب خود عصمت کی زبان سے سُنئے :

"دیکھئے، ناانصافی پر مبنی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی میرے دل کو چُبھتی ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ کسی عورت کو شراب پی کر اس کا شوہر پیٹتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ سڑک پر کوئی ننھا سا ہاتھ بھیک مانگتا ہے۔ مَیں دیکھتی ہوں تو دس برس کی عمر کے بچے لوگوں کے پیچھے بھاگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ٹیکسی چاہیئے۔ لڑکی چاہیئے . . . میں بھی پاس سے گذرتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ روزگار کے لئے

---

[1] [2] "عصمت چغتائی سے ایک ملاقات" انٹرویو از جلیل بازید پوری۔ ماہنامہ "شیرازہ" سری نگر۔ جلد ۳۰، شمارہ ۱۰/۸۔ ص ۲۸

اتنا چھوٹا سا بچہ آج عورت سپلائی کر رہا ہے۔ وہ چاہے اس کی ماں ہو، اس کی بہن ہو۔ ان کے لئے کون ... مجھے بڑا غصہ آتا ہے اس سماج پر جہاں خریدنے والے موجود ہیں اور بیچنے والے بھی!"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی تمام تخلیقات آپ کے غصّے کا اظہار ہوتی ہیں؟"

"ہاں زیادہ تر تو غصّے کا اظہار ہوتی ہیں۔ اور چڑ کے لکھتی ہوں شاید"[1]

اوپر کا مکالمہ جزوی طور پر عصمت کے افسانوں کے بنیادی محرکات کا مظہر ہے اور وہ ایک حساس، گداز دل، انسان دوست معاشرے کی ناہمواریوں پر دل گرفتہ اور عورت کی زبوں حالی پر نالاں فنکارہ کے طور پر سامنے آتی ہیں کہ جب شرابی شوہر بے وجہ اپنی بے بس بیوی کو زدوکوب کرتا۔ جب معصوم ننھے منّے بچے روٹی کے دو ٹکڑوں کے لئے سڑکوں پر بھیک مانگتے دکھائی دیتے۔ جب بچّے اپنی جسم فروش ماؤں، بہنوں کے لئے گاہکوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تو عصمت کا دل عورت کی بدحالی اور مرد کی زورزبردستی، معاشرے کی ناہمواری اور اخلاقی اقدار کے تنزل پر متلاطم ہو جاتا تھا اور غم و غصّے کے اظہار کے طور پر ان کا قلم حرکت میں آجاتا تھا۔

اظہار کے لوازمات کے تعلق سے منٹو، جن کی عصمت سے بہت قربت رہی، لکھتے ہیں کہ انھیں برف کھانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ بچّوں کی طرح ڈلی ہاتھ میں لئے دانتوں سے کٹا کٹ کاٹتی رہتیں ـــــ چارپائی پر کہنیوں کے بل لیٹی ہیں۔ سامنے تکیے پر کاپی کھُلی رکھی ہے۔ ایک ہاتھ میں فاؤنٹین پن اور دوسرے ہاتھ میں برف کی ڈلی ہے۔ ریڈیو اونچے سُروں میں چل رہا ہے۔ مگر اُن کا منہ اور قلم دونوں کٹا کٹ چل رہے ہیں ـــــ کبھی کبھی ان کا اڑیل قلم مہینوں لکھنے پر مائل نہ ہوتا۔ مگر جب لکھنے پر آتیں تو گھنٹا بن کر برستیں۔ ان دنوں انھیں تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ کھانا پینا، نہانا دھونا سب بھول جاتیں۔ شب و روز بس لکھنے کی دھن سوار رہتی۔ ہمہ وقت اوندھی لیٹی کاغذ پر قلم دوڑاتی رہتیں ـــــ اس بلا کی زود نویس تھیں کہ انھوں نے اپنا شاہکار ناول "ٹیڑھی لکیر"، جو پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے، فقط سات آٹھ نشستوں میں لکھ ڈالا۔ یہ اُن کے دماغ کی زرخیزی اور قلم کی برق رفتاری کا ثبوت تھا۔

سلمیٰ صدیقی، عصمت کے تخلیقی عمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ایک دفعہ انھوں نے عصمت کے ذہن میں کہانی کی نمود ہوتے دیکھی۔ ان کے چہرے بشرے کے اُتار چڑھاؤ کی سیڑھیوں پر انھوں نے ایک کہانی کو لرزتے دیکھا۔ بس کہانی پہ وہ عالم طاری تھا جو جن پہ بوتل میں بند ہوتے وقت طاری ہوتا ہوگا۔ علی گڑھ میں سخت سردیوں کا زمانہ تھا۔ جنوری کی مہاوٹیں پڑ رہی تھیں۔ عصمت آپا اپنی بھاوج اختر چغتائی کے گھر دالان میں

---

[1] عصمت چغتائی، اکادمی کی ایک محفل میں (انٹرویو) ماہنامہ "شیرازہ" سری نگر۔ جلد ۳۰، شمارہ ۸/۱۰۔ ص ۱۱-۱۲

تخت پر بیٹھی تھیں۔ اور اُجلا اُجلا چاندی کا پاندان ان کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ملاقاتیوں میں طلبا، طالبات، دوست، احباب وغیرہ کے علاوہ ایک معمر خاتون بھی وہاں بیٹھی تھیں... بے حد صاف شفاف، میدے شہاب ایسی رنگت، بے حد نرم و نازک خدّو خال، بے حد دھان پان۔ لگتا تھا عورت نہیں چمیلی کی کلی پلنگڑی پہ کھلی ہے ــــــ کسی نے سرگوشی میں کہا "کیسی خوبصورت ہیں۔ بڑی بی۔ اپنے دِنوں میں کیا ستم ڈھاتی ہوں گی" عصمت نے بھی اُسی سرگوشی میں جواب دیا "بالکل کنواری لگتی ہیں" ــــــ اور اس طرح عصمت کی نہایت خوبصورت کہانی "گھونگھٹ" نے جنم لیا۔[1]

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ کس طرح کبھی کبھی کسی کو دیکھ کر ایکا ایکی عصمت کے ذہن میں کہانی کا پلاٹ کوندے کی طرح لپک جاتا اور یوں ایک صاف شفاف افسانہ معرضِ وجود میں آجاتا ــــــ ایسے ہی انھیں اپنے مرحوم بھائی عظیم بیگ چغتائی کی پہلی برسی پر رات کے بارہ بجے اُن کی یاد آئی تو انھوں نے اُن پر اپنا شہرۂ آفاق خاکہ "دوزخی" قلم بند کیا ــــــ ہنگامی حالات میں بھی ان کا قلم حرکت میں آجاتا تھا۔ تقسیمِ ملک کے فسادات پر اُن کے افسانے "جڑیں" اور "دھانی بانکپن" اس امر کے شاہد ہیں۔

کہانی لکھ چکنے کے بعد عصمت چاہتیں کہ وہ اُسے کسی مقرّب یا ادیب دوست کو سُنائیں اور دیکھیں کہ اس کی نظروں میں اُن کی کاوش کیسی رہی۔ کرشن چندر کا بھی یہی دستور تھا کہ وہ کہانی ختم ہوتے پر اپنی اہلیہ سلمیٰ صدیقی کو سُناتے۔ اگر کہانی زیادہ طویل ہوتی تو وہ انھیں پڑھنے کے لئے دے دیتے ــــــ اور یہی معمول منٹو کا تھا۔ وہ کہانی اپنی بیوی صفیہ بیگم کو سُناتے اور اگر کبھی اس کے باریک نکات اُن کی فہم و فکر سے بعید ہوتے تو اُنھیں وہ بھی سمجھاتے۔ جب تک شاہد لطیف زندہ رہے وہ عصمت کی کہانیاں توجہ سے پڑھتے، اپنی رائے دیتے، املا کی غلطیاں ہوتیں تو اُن کی تصحیح بھی کرتے۔ عصمت کے بیان کے مطابق "میری تمام ناولوں و کہانیوں پر وہ نظرِ ثانی کیا کرتے تھے" ــــــ عصمت دل ہی دل میں ان کی رائے کی قدر کرتی تھیں۔ مگر اس کے برملا اعتراف سے احتراز کرتیں ــــــ عصمت اپنی کہانیاں اپنی عزیز دوست ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ مشہور ڈوگری اور ہندی ادیبہ پدما سچدیو کو بھی سُنایا کرتی تھیں۔ وہ اُنھیں بتاتیں کہ کہانی کے مواد کا ماخذ کیا تھا اور اُسے فن کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے کیا کیا پھیر بدل کیا گیا اور کہانی کو کس طرح سمیٹا گیا ــــــ پدما اس بارے میں لکھتی ہیں:

"ان کی "بچھو پھوپھی" کہانی پڑھتے پڑھتے آج بھی مجھے ان کے بتانے کا انداز تل کر

---

[1] سلمیٰ صدیقی "عصمت چغتائی کا جادو" (مضمون) اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۹۱

یاد آتا ہے۔[1]

یہاں یہ لکھنا بے جا نہ ہوگا کہ عصمت کے افسانوں کے موضوعات کا دائرہ اتنا وسیع نہیں جتنا کہ ان کے ہم عصر ہم پایہ افسانہ نگاروں کا ہے۔ عصمت کے افسانے مُسلم معاشرے کے متوسط طبقے سے متعلق ہیں، جسے انھوں نے بہت نزدیک سے دیکھا بھالا، جانچا پرکھا تھا۔ اس کے ہر پہلو سے انھیں کماحقہٗ واقفیت حاصل تھی۔ اس طبقے کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بھی ان کی باریک بین اور دُور رس نگاہوں سے بچ نہیں پائیں۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعات کی تنگ دامانی کے باوصف انھوں نے بہت صاف شفاف اور آبدار افسانوں کی تخلیق کی۔

---

[1] پدما سچدیو۔ سہ ماہی "سم کالین بھارتیہ ساہتیہ" (ہندی) نئی دہلی۔ اپریل۔ جون ۱۹۹۵ء۔ ص ۱۸۶

چُنندہ افسانوں کا تجزیاتی مُطالعہ

چوتھی کا جوڑا ○ دو ہاتھ ○ گیندا ○ جڑیں ○ لحاف ○ ننھی کی نانی ○ بھول بھلیاں ○ ساس ○ بچھو پھوپھی

چوتھی کا جوڑا

"چوتھی کا جوڑا" کا شمار عصمت کے شاہکار افسانوں میں ہوتا ہے۔ یہ مختصر افسانہ اپنے اندر بڑا کرب، بڑا درد سموئے ہُوئے ہے۔ اور ہمارے معاشرے کے غربت زدہ طبقے کی نامرادیوں اور محرومیوں کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے ـــــ غریب ماں باپ کے لئے سب سے سنگین مسئلہ جوان لڑکیوں کے لئے بَر ڈھونڈنے کا ہوتا ہے اور یہ مسئلہ براہِ راست جہیز کی لعنت سے جُڑا ہُوا ہے۔ لڑکی کے بیاہ کی فکر میں ماں باپ کا دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اور جب مُسلسل تگ و دو کے باوُجود کوئی مناسب رشتہ نہیں ملتا تو چار و ناچار تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن اُمید کا دامن پھر بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ـــــ اُدھر لڑکی احساسِ کمتری کی ماری، اپنے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھتی، ایک خیالی دُولھے کی موہوم سی آس دل میں لئے جوانی کی حُدود سے گذر جاتی ہے اور اُسے اپنے تیرہ و تار مُستقبل کا خیال اندر ہی اندر کُریدتا رہتا ہے ـــــ اِدھر ماں باپ پیرانہ سالی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اپنے انجام کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ اُن کے ارادے کمزور اور ہمّت پست ہو جاتی ہے اور وہ کسی غیبی طاقت کو مدد کے لئے پکارتے معلوم ہوتے ہیں ـــــ زندگی کس قدر بے رحم ہے۔ خاص طور سے غُربت اور عُسرت کے ماروں کی زندگی، جو مر مر کر جینے اور جی جی کر مرنے سے عبارت ہے۔

کبریٰ کی ماں کپڑے کی کتر بیونت اور ناپ تول میں بہت ماہر تھی۔ جب کوئی کپڑا سلوانا ہوتا، چوتھی کا جوڑا ہو یا کفن، محلّے بھر کی عورتیں ـــــ بڑی بوڑھیاں، جوان عورتیں، نوخیز لڑکیاں اور نئی بیاہی دُلہنیں ـــــ اس کے ہاں دوڑتی آتیں اور اس کا آنگن ان کی آوازوں سے گونجنے لگتا ـــــ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتی، کلف توڑتی، کبھی تکون بناتی، کبھی چوکھٹا۔ کپڑے پر نظر جما کر دل ہی دل میں حساب بٹھاتی، کتر بیونت کرتی اور جب اسے کامل اطمینان ہو جاتا تو اس کے شکن زدہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلتی اور وہ قینچی اُٹھا لیتی ـــــ اور وہاں موجود عورتیں جو سانس روکے امّاں کے فیصلے کی منتظر ہوتیں، ایک لمبی گہری اطمینان کی سانس لیتیں۔

یہی امّاں کا ذریعۂ معاش تھا۔ اسی سے ان کی روزی روٹی چلتی تھی۔ لشتم پشتم گذر ہوتی تھی۔ کبھی کچھ بچ جاتا تو اپنی جوان

بڑی بیٹی کبریٰ کے لئے کوئی چھوٹا موٹا جوڑا بنا کر رکھ لیتیں، تاکہ کہیں اس کی بات پکّی ہو جائے تو زیادہ دوڑ دھوپ نہ کرنی پڑے۔ ان کی سب سے بڑی پریشانی بیٹی کے لئے کوئی لڑکا ڈھونڈنا تھی۔ دہلیز کی طرف دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں، مگر کوئی پیغام ہی نہ آتا ـــــ اور چھوٹی لڑکی حمیدہ کھیرے ککڑی کی طرح بڑھ رہی تھی۔ مگر کبریٰ رخصت ہو تو وہ چھوٹی بیٹی کی سوچے۔

ان

سمجھیں

ابا میاں نحیف و نزار، مشتِ استخواں تھے۔ ایک تو عمر کا تقاضا، پھر دمہ کا نامراد مرض اور اس پر کبریٰ کی شادی کی فکر، یہ سب اُن کو دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے۔ دمہ کے دورے پڑتے تو کھانستے کھانستے اُن کا دم اُلٹنے لگتا اور دیر تک بیٹھے ہانپتے رہتے۔ لیکن علاج معالجے کے لئے گھر میں پیسہ نہ تھا۔ ڈاکٹر انجکشن تجویز کرتے اور مقوی غذا کھانے کو کہتے مگر یہ دونوں ان کی بساط سے باہر تھے۔ بیوی اُن کی حالت دیکھ کر کہتی:

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے۔ کتنی بار کہا تم سے۔"

"بڑے شفا خانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ اور روز تین پاؤ دُودھ اور آدھ چھٹانک مکھن۔"

"اے خاک پڑے اِن ڈاکٹروں کی صُورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی اُوپر سے چکنائی۔ بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی۔"

"دکھاؤں گا۔" ابا حقہ گڑگڑاتے اور اچھو لگتا۔

"آگ لگے اس مُوئے حُقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھئے آنکھ اُٹھا کر۔"

ہوشیار اور نبض شناس بیوی ڈاکٹری علاج کو اپنے مقدُور سے باہر پا کر، پہلے ابا میاں کو حکیم سے مشورہ کرنے کو کہتی ہے اور فوراً ہی ان کی توجہ کبریٰ کی شادی کے معاملے کی جانب موڑ دیتی ہے ـــــ اور ابا میاں کے علاج معالجے کی بات بیچ ہی میں دھری رہ جاتی ہے، جیسے وہ کوئی مدِ فضول ہو ـــــ غربت انسان کو بے دست و پا کر دیتی ہے، اور بیماری اُسے موت کے دہانے پر لا کھڑا کرتی ہے ـــــ ایسے ہی کھانستے کھانستے ابا میاں ایک دن چوکھٹ پر اوندھے مُنہ گر کر دم توڑ گئے ـــــ اور ان کے مرنے کے بعد ان کی چھوٹی بیٹی حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی۔ ـــــ خیال فرمائیے اس جملے میں کس قدر درد و کرب چھپا ہے۔ گویا میٹھی روٹی کوئی بہت نایاب اور گرانقدر نعمت ہو۔ مگر یہ بھی اس کا مقدر نہ تھی۔ ناداری میں انسان ہیچ و حقیر چیزوں کے لئے بھی ترس جاتا ہے اور وہ اس کی نظروں میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔

مگر کہانی کا بنیادی تھیم بی اماں کی بڑی بیٹی کبریٰ کی شادی کا معاملہ ہے، جواب ایک ضعیف العمر بیوہ ماں کے سینے

پر بارِ گراں ہے، لیکن اس کے لئے کوئی پیغام ہی نہیں آتا ــــ کبریٰ صحت کے اعتبار سے کمزور ہے اور صبح تا شام گھر کے کام کاج میں جٹی رہتی ہے۔ وہ درحقیقت جوانی کی منزل سے کبھی کی گذر چکی ہے اور اس کی سب اُمنگیں ترنگیں بجھ گئی ہیں۔ یوں کہئے کہ اس غریب پر کبھی جوانی آئی نہ تھی۔ نہ اس کی آنکھوں میں کبھی کرنیں ناچیں، نہ اس کی جبیں پر کوئی سرکش لٹ لہرائی، نہ اس نے کبھی چاہا کہ اُسے کوئی بڑھ کر اپنی باہنوں میں بھر کر سینے سے لگا لے۔ اگر کبھی جھجکی جھجکی، سہمی سہمی جوانی آئی بھی، تو وہ ہوا کے دوش پر آئی بدلی کی طرح بن گرجے برسے گذر گئی ــــ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

پھر ایک دن اماں کو ان کے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا بیٹا راحت پولیس ٹریننگ کے سلسلے میں آرہا ہے۔ اماں نے یہ مژدہ سنا تو دیکھتے ہی دیکھتے ان کی یاس آس میں بدل گئی۔ انھیں راحت کی ذات میں اپنے ہونے والا داماد دکھائی دیا۔ شہنائیوں کی آواز ان کے کانوں میں گونجنے لگی۔ ان کی بیٹی کبریٰ کی قسمت جاگ گئی۔ حمیدہ نے بھی گہری لمبی اطمینان بھری سانس لی کہ اس کی آپا کبریٰ کی مراد بر آئی تھی۔ اماں نے جلدی سے اِدھر اُدھر سے کچھ روپے اکٹھا کئے اور ایک کریپ کا دوپٹہ خرید ڈالا۔ کبریٰ نے تھوڑا سا چونا منگا کر بیٹھک پوت ڈالی۔ بیٹھک تو چمک اٹھی مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اُڑ گئی ــــ اماں کی گھبراہٹ دیکھتے ہی بنتی تھی۔ انھیں بارات دروازے پر کھڑی دکھائی دے رہی تھی کہ اللہ میاں نے آخر ان کی سن لی تھی۔ حمیدہ نے اپنی آپا کے لئے سربسجود ہو کر خدا سے فجر کی نماز میں دعا مانگی:

"اللہ میرے اللہ میاں، اب تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔"

یہ ایک چھوٹی بہن کے دل سے نکلی دعا تھی ــــ کبریٰ خود زبان کھولنے سے قاصر تھی کہ نسوانی شرم و حیا مانع تھی۔ نہ جانے وہ دل ہی دل میں کب سے اپنے دولہا کا انتظار کر رہی تھی، جو اس کے خوابوں میں تو آتا تھا لیکن گھوڑی پر چڑھے، سہرا باندھے، بینڈ باجے کے ساتھ نہ آیا تھا ــــ چھوٹی بہن حمیدہ خوب جانتی تھی کہ آپا کا مقدر جاگتے ہی اس کی شادی کا امکان بھی روشن ہو جائے گا۔

راحت آگیا اور سیویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلا گیا ــــ راحت کی خاطر مدارات میں گھر کے چاندی کے چھوٹے موٹے زیورات چل دیئے۔ آخر تھے ہی کتنے۔ مگر اُس کی مہمان نوازی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اماں، کبریٰ اور حمیدہ خود روکھا سوکھا زہر مار کرتیں مگر راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے اور اسے کوفتے اور بریانی کھلائی جاتی۔ کڑھا ہوا بالائی والا دودھ پلایا جاتا ــــ یہ تو مصلحت کا تقاضا تھا۔ جس شجر کا کل کو پھل کھانا ہو اس کی آبیاری تو آج ہی سے کرنی ہو گی۔ راحت ان کا اپنا ہو جائے گا تو جو کمائے گا کبریٰ کی ہتھیلی پر ہی رکھے گا ــــ راحت کے کپڑے دھوئے جاتے۔ گندے چکٹ رومال، موزے، بنیان صاف کئے جاتے اور وہ صبح انڈے پراٹھے ٹھونس کر جاتا اور شام کو آ کر کوفتے اور بریانی کھا کر سو جاتا ــــ کئی روز گذر گئے مگر راحت کی طرف سے بات کرنا تو کجا کوئی اشارہ کنایہ بھی نہ ہوا۔ آخر وہ ذاتِ شریف منہ سے کچھ بولے تو پتہ چلے کہ اس کا عندیہ کیا ہے۔

اماں کی مُنہ بولی بہن اُن سے اس بارے میں کھُسر پھُسر کرتی تو وہ راحت کی طرف سے تاویلیں پیش کرتے لگتیں کہ لڑکا بہت شرمیلا ہے۔ اس لئے کچھ کہتے ہوئے جھجکتا ہے ــــ لیکن یہ طفلِ تسلی تھی، خود فریبی تھی، اپنی جھینپ مٹانے کا ایک طریقہ تھا ـــ اس نے اماں کو رازدارانہ طور پر بتایا کہ کس طرح ان کی میری بہنوں کے لئے ان کے والد نے بر ڈھونڈ لئے تھے۔ لڑکیاں خوب رو نہیں تھیں لیکن والد نے ایک لڑکے کو پندرہ تولے سونا دیا اور والسرائے کے دفتر میں ملازمت دلادی اور لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ دوسری کی شادی بھی ایسے ہی کہیں ہو گئی۔
ــــ اماں نے یہ سُن کر گہری ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری، اُسے لڑکا ملنے میں کیا دیر لگتی ہے"ــــ یہ کبریٰ کی ماں کا اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کی طرف اشارہ تھا کہ مالی اعتبار سے وہ ایک بے بضاعت اور بے وقعت انسان تھی اور یہی بے بضاعتی اور بے وقعتی شب و روز اس کے قلب و جگر کو چاٹتی رہتی تھی مگر اس سے مفر ممکن نہ تھا۔

بہت غور و خوض کے بعد یہ طے پایا کہ راحت کو کھلی کے کباب کھلا کر اس کا مذاق اُڑایا جائے ایسے ہی جیسے ہونے والے بہنوئی یا داماد کا لوگ باگ اُڑایا کرتے ہیں۔ غرض و غایت یہ تھی کہ وہ کھُلے اور کچھ مُنہ سے اُگلے اور اس جمُود کو توڑے۔
ــــ حمیدہ اندر کھانا لے کر گئی، اس نے کھایا مگر وہ اس کے ساتھ مذاق کرنے کی ہمت نہ جٹا پائی۔ اماں نے ٹہوکا دیا تو اُس نے پوُچھ لیا:

"راحت بھائی کباب پسند آئے" بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوُچھا۔

"جواب ندارد"

"بتائیے نا؟"

"اری ٹھیک سے جا کر پوُچھ" بی اماں نے ٹہوکا دیا۔

"آپ نے لا کر دیئے اور ہم نے کھائے۔ مزیدار ہی ہوں گے"

"ارے واہ رے جنگلی" بی اماں سے رہا نہ گیا "تمھیں پتہ بھی نہ چلا، کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے"

"کھلی کے؟ ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں۔ میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھونسہ کھانے کا۔"

بی اماں کا مُنہ اُتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوُئی پلکیں اُوپر نہ اُٹھ سکیں۔ دوسرے روز بی آپا نے روز سے دُگنی سِلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے۔

"کہئے آج کیا لائی ہیں۔ آج تو لکڑی کے بُرادے کی باری ہے"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

"میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔"

اسے قدرت کی ستم ظریفی ہی کہئے کہ وہ سب شب و روز اپنی بساط سے گذر کر راحت کی خاطر تواضع کرتے بے حال ہو گئیں۔ وہ اس بے حس احسان فراموش، ندیدے راحت کو مرغن غذائیں کھلاتیں۔ اُسے گوشت، پُلاؤ، بریانی، قورمہ کھلانے میں گھر میں سینت سینت کر رکھی کئی چیزیں بک گئیں۔ لیکن اس ناشکرے کو کچھ بھی پسند نہ آیا۔ اس کی بے غیرتی اور بے حیائی برہنہ ہو کر سامنے آ گئی۔ بی اماں نے تو خوش دلی سے ازراہِ مذاق کھلی کے کباب کھلائے تھے مگر راحت میاں نے سب کھایا پیا حرام کر دیا۔ وہ تو سب مہمان نوازی میں مر مٹیں مگر اس گھامڑ گنوار پر رتی بھر اثر نہ ہُوا۔

راحت اب زیادہ وقت گھر پر ہی گذارنے لگا۔ شاید بی اماں کی مراد بر آنے والی تھی۔ سچ کہتے ہیں اُوپر والے کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں لیکن یہ سب ان کی خوش فہمی اور خود فریبی تھی کہ راحت اب ایک دوسری ہی ڈگر پر گامزن ہو گیا تھا۔ بی اماں سارا دن چوتھی کے جوڑے سلتیں۔ کبریٰ چولھا پھونکتی اور راحت کسی نہ کسی بہانے حمیدہ کو اندر بلاتا رہتا۔ وہ اندر جاتی تو اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا۔ جگتے بازی کرتا۔ کئی بار چھینا جھپٹی میں حمیدہ کی چوڑیاں تک ٹوٹ جاتیں۔ مگر اس کے بلانے پر اسے پھر جانا پڑتا ـــــ حمیدہ بی آپا کی خاطر اس تذلیل کو شیر مادر سمجھ کر خاموشی سے پی جاتی اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتی کہ کہیں بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے۔ وہ عمداً اس سے ذرا دُور رہنے لگی کہ اس کی نگاہوں میں آرزو تھی، حرص و ہوا تھی۔ ایک لوہی تھی جو اس کے جسم کے نشیب و فراز کا جائزہ لیتی معلوم ہوتی تھی ـــــ حمیدہ کو اُمید تھی کہ جلد یا بدیر راحت راہِ راست پر آ جائے گا اور بی آپا سے شادی کے لئے رضامند ہو جائے گا۔ پر یہ نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ بالآخر ایک دن حمیدہ چھلک پڑی اور اس نے سب بات بی اماں اور بی آپا کو من و عن بتا دی۔ لیکن انھوں نے اسے ہنس کر نظرانداز کر دیا کہ یہ معاملہ حمیدہ اور اُس کے ہونے والے بہنوئی کے درمیان تھا اور اس میں کوئی غیر متوقع یا قابلِ اعتراض بات نہ تھی۔

کبریٰ نے بڑے شوق سے سُوئیٹر بُنا اور اُسے حمیدہ کو دیا کہ وُہ راحت کو دے آئے۔ حمیدہ نے آپا سے بہتیرا کہا کہ اُسے خود سوئیٹر کی بہت ضرورت ہے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہُوئی۔ نہ جانے انسان کن اُمیدوں پر فریب کھائے جاتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا، سوچتا، سمجھتا ہے لیکن دامنِ اُمید نہیں چھوڑتا۔ چھوڑ دے تو اس کی زندگی قبل از وقت ہی ویران ہو جائے ـــــ بہن کے اصرار پر حمیدہ نیم دلی سے سوئیٹر راحت کو دینے اندر جاتی ہے، تو وُہ پوچھتا ہے:

"کیا یہ سُوئیٹر آپ نے بُنا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تو بھی ہم نہیں پہنیں گے۔"

حمیدہ جل کر راکھ ہو گئی۔ اسے اُس سے اس بدتمیزی کی اُمید ہرگز نہ تھی کہ یہ نہ صرف اس کی تضحیک تھی بلکہ آپا کی تحقیر بھی۔

"میرا جی چاہا کہ اس کا مُنہ نوچ لوں۔ کمینے، مٹّی کے تودے۔ یہ سُوئیٹر اُن ہاتھوں نے بُنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ ان ہاتھوں کا بُنا ہُوا ہے جو ننھے پنگوڑے جُھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں ان کو تھام لو گدھے کہیں کے۔ اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمھاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پُور اور بھارت ناٹیم کے مُدرا نہ دکھا سکیں گے۔ انھیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انھیں پھولوں سے کھیلنا نصیب نہیں ہُوا۔ مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈُبکیاں لگاتے ہیں۔ چُولھے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دیئے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔"

یہ مختصر سا ٹکڑا اس لڑکی کی داستانِ غم ہے جس نے جوانی کے سلگتے ہوئے ارمان دل میں لئے دُور اُفق پر نظر جمائے رکھی کہ کبھی تو وہاں سے اُس کے سپنوں کا شہزادہ نمودار ہو گا۔ اور بڑھ کر پیار سے اس کا ہاتھ تھام لے گا۔ اور وہ دل و جان سے اس کی ہو جائے گی۔ اس کی خدمت گذاری اور اطاعت شعاری کرے گی اور اس کی زندگی کو آرام و آسائش سے منوّر کر دے گی۔ اس کے بچوں کی ماں بن کر ان کا پالنا جُھلائے گی اور اس کی رفیقۂ حیات بن کر اس کا دُکھ درد ہنسی خوشی بانٹ لے گی۔ اور یوُں دونوں پر حیات گذراں آسان ہو جائے گی ــــ راحت شاید میرے سپنوں کے شہزادے تم ہی تھے۔ اب تک زندگی میں مجھے محنت مشقت کرنے اور اپنے ناآسودہ ارمانوں کی چِتا میں جلنے کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اب تم آ گئے ہو تو میرا ہاتھ تھام لو۔ نہ جانے میں کب سے تمھاری راہ تک رہی تھی۔ ــــ یہ حمیدہ کی زبان سے کُبریٰ کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز تھی۔

یوُں دیکھا جائے تو کبریٰ اب پیار اور محبت کی بھوکی نہیں تھی۔ وہ نرم و نازک جذبات جو محبّت کرنے اور کئے جانے کی ترغیب دیتے ہیں، اس میں کبھی کے مر چکے تھے۔ اس کی اُمنگیں ترنگیں سسک سسک کر دم توڑ چکی تھیں۔ اس کے چہرے پر پکّے مہاسے تھے اور نزلے کی وجہ سے اس کے بال پکنے شروع ہو گئے تھے۔ اب

توبس وہ روٹی کپڑے کا سہارا چاہتی تھی کہ جسم وجان کا رشتہ جوں توں قائم رکھ سکے اور وہ اپنی عمر رسیدہ بیوہ ماں کے سینے پر بوجھ نہ رہے اور ساتھ ہی وہ اپنی چھوٹی بہن کے لئے راہ ہموار کر دے جو خود جوانی کی دہلیز پر دامن پھیلائے کھڑی تھی ـــ لیکن کئی لوگ کس قدر ابھاگے اور قسمت کے ہیٹے ہوتے ہیں کہ ان کی کوئی سنتا ہی نہیں۔ خدائے بزرگ و برتر بھی نہیں، جو خالق کون و مکان بھی ہے اور رحیم و کریم بھی۔

کئی روز گذر گئے۔ نہ راحت منہ سے کچھ پھوٹا اور نہ ہی اس کے گھر سے کوئی پیغام آیا۔ بی اماں نے زچ آکر پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ نیاز کے ملیدے کی طشتری بی اماں نے حمیدہ کو دی تاکہ اسے راحت کے تنورِ شکم میں جھونک دیا جائے۔ حمیدہ طشتری لئے راحت کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ ۔۔۔ یہ ملیدہ" اس نے اُچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔
اس کے پیر لرز رہے تھے۔ جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو۔ اور پھر پہاڑ کھسکا ۔۔۔ اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دُور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدے کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔
ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا ۔۔۔ نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔
نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اُوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہوگئی۔
صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہوگیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔"

غور فرمائیے کہ مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنے والا کس قدر ناشکرا تھا۔ وہ اتنا عرصہ بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی سے بن بلایا مہمان بنا رہا اور اپنی میزبان کی چھوٹی بیٹی حمیدہ کو بھی تہہ دام لانے کی سعی کرتا رہا۔ اس کا رخصت ہونا بی اماں کے لئے جہاں ان کی تمناؤں کا خون تھا وہاں ان کے لئے وجہ سکون و اطمینان بھی تھا کہ انھیں ایک مارِ آستین سے چھٹکارہ ملا۔

"اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے، پراٹھے نہ پکے اور سویٹر نہ بُنے۔ دق نے جو ایک عرصے سے بی آپا کی تاک میں بھاگتی پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ ایک ہی جست میں اسے دبوچ لیا۔ اور انھوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔"

موت میں کبری کو زندگی مل گئی کیونکہ اس کی زندگی ایک مرگِ مسلسل تھی۔ وہ جب تک جی اپنے غموں اور دکھوں کا

بارِگراں ڈھوتی رہی۔ اس نے کبھی زندگی کی راحتوں، آسائشوں اور مسرّتوں وشادمانیوں کا منہ نہ دیکھا۔ غربت کی چکّی میں پستے پستے ازدواجی زندگی کے خواب بُنتے بُنتے وہ اس دُنیا سے چلی گئی۔

ابّا چلے گئے، کبریٰ رخصت ہو گئی۔ بی امّاں رختِ سفر باندھے تیار بیٹھی تھیں۔ اب حمیدہ بی آپا کی طرح اپنی جوانی کا جنازہ اُٹھائے نہ جانے کب تک کسی خیالی دُولھا کی آمد کی موہوم سی اُمید پر بیٹھی رہے گی۔ اب تو گھر میں ایک چھلّا بھی نہ تھا کہ دے دلا کر وہاں انڈے تلے جائیں، پراٹھے سینکے جائیں اور سُوئیٹر بُنے جائیں ــــــ مرتے تو امیر غریب دونوں ہیں۔ مگر امیر قدرے آرام سے مرتا ہے اور غریب کی موت تکلیف دہ اور کربناک ہوتی ہے۔ پھر غریب تو نہ جانے اپنی زندگی میں کے بار مرتا ہے۔ اس لئے اسے مر کر بار بار مرنے سے نجات مِل جاتی ہے کہ وہ سوزِ غم ہائے نہانی سے چھُوٹ جاتا ہے۔

یہ افسانہ بلاشبہ عصمت کی کردار نگاری کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور اس افسانے کا یہی پہلو ہے جس نے ایک پیش پا اُفتادہ موضوع کو رفعت اور عظمت عطا کی ہے ــــــ بی امّاں ایک روایتی شفیق، غمگسار، ممتا سے بھری اپنی اولاد پر جان چھِڑکنے والی مادرِ مہربان ہے۔ ایسی ہی ماں کے پیروں تلے جنّت بستی ہے۔ غربت میں بھی وہ اپنے وقار، حمیت اور غیرت پر آنچ نہیں آنے دیتی۔ اور راحت کی اپنی مقدُور سے کہیں زیادہ خاطر مدارات کرتی ہے کہ کسی طرح بیل منڈھے چڑھے اور وُہ اپنی ذمّہ داری سے سُبکدوش ہو۔ ایک ایک کر کے وہ اپنے چند زیورات تک فروخت کر دیتی ہے مگر اس کی پیشانی پر شکن نہیں پڑتی۔ تہی دستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اور زیادہ محنت مشقّت کر کے گھر کا کام چلاتی ہے۔ وہ خاموشی سے اپنی جانِ ناتواں پر کرب وعذاب سہتی ہے مگر حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتی اور صبر و تحمّل سے آگے بڑھتی ہے۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ قسمت نے اس سے مُنہ موڑ لیا اور وہ بے نیل و مرام اس جہانِ گذراں سے گذر گئی۔ وہ ایک پیاری قابلِ تعظیم ماں تھی۔

کُبریٰ کی بیحد موثّر تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ ضرُوری نہیں کہ ایک اعلیٰ کردار میں حرکت وحرارت ہو۔ کبریٰ کو ایسا ہی کردار زیب دیتا ہے جیسا کہ اُسے پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک خاموش، گُم صُم سی لڑکی ہے کہ وہ جوانی کی اُمنگوں ترنگوں کا مُنہ بولتا مدفن ہے۔ حالات کی نامساعدت اور ناگواری نے اس کے لبوں پر مہرِ سکوت ثبت کر دی ہے۔ اس پر جوانی آتے آتے ٹھٹک کر رُک سی گئی ہے اور وہ اپنے خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہے ــــــ امّاں کو اپنی سہیلی سے شادی کی بابت سرگوشیاں کرتے دیکھتی ہے تو ان کی حرکات وسکنات سے، اشاروں کنایوں سے فوراً بات کی تہہ تک پہنچ جاتی ہے مگر کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کرتی کہ وہ دل ہی دل میں جانتی ہے کہ یہ بیل کبھی منڈھے نہ چڑھے گی ــــــ جب آنگن میں محلّے کی کنواری لڑکیوں، نو بیاہتاؤں اور بڑی بُوڑھیوں کی صدائیں گونجتی ہیں تو وہ الگ تھلگ رسوئی میں بیٹھی کام کاج میں جُٹی رہتی ہے ــــــ راحت آتا ہے تو چپ چاپ گھر کی جھاڑ پُونچھ کرتی ہے اور خود ہی چُونا منگوا کر کمرہ پوت دیتی ہے ــــــ وہ اس کی خاطر تواضع

میں صبح تا شام مصروف رہتی ہے اور ساتھ ساتھ اس کے لئے سُوئیٹر بُن دیتی ہے۔ یہ فعل اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے ــــ درحقیقت اس کا ہر فعل بزبانِ بے زبانی بولتا ہے۔ اس کی خاموشی بہت بلند آہنگ ہے اور اس میں گہرائی ہے، معنویت ہے کہ وہ ایک گونگی لڑکی کی خاموشی نہیں ــــ کُبریٰ کا کردار بڑا جاندار، بڑا موثر ہے۔

حمیدہ ایک ذہین، فرض شناس، فرمانبردار بیٹی اور ہمدرد اور غمگسار بہن ہے۔ وہ تندہی اور لگن سے اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اور اپنی بڑی بہن کی خاطر راحت کی پُرخلوص تواضع اور خدمت کرتی ہے اور خاموشی سے مصلحت کے طور پر اس کی دست درازی کو بھی سہہ گذرتی ہے۔ یہ ایک غیر معمولی بیٹی اور بہن کا کردار ہے۔

راحت کا کردار اپنی بدطینتی اور بداخلاقی کے اعتبار سے بڑا کراہت آمیز مگر موثر ہے۔ وہ ایک عجیب الخلقت انسان نما حیوان ہے۔ وہ چُپ سادھے رہتا ہے گویا مہمان نوازی کرانا اس کا پیدائشی حق ہو۔ ازراہِ مذاق یہ بتائے جانے پر کہ اس نے کھلی کے کباب کھائے ہیں وہ ردِ عمل کے طور پر اپنے اصلی رنگ رُوپ میں سامنے آجاتا ہے اور اپنے تیز و تند رویے سے بی اماں اور حمیدہ کے پاؤں تلے سے زمین کھسکا دیتا ہے۔ اس کے ہر جواب سے کمینگی، کم ظرفی اور محسن کُشی ٹپکتی ہے ــــ وہ اس قدر سفلہ خصلت ہے کہ حمیدہ کو اپنی حرص و ہوا کا نشانہ بنانا چاہتا ہے اور اکیلے میں اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ یہ اس مارِ آستین کا کردار ہے جسے بی اماں نے خوش فہمی میں اپنا داماد بنانے کے سُنہرے خواب دیکھے تھے ــــ راحت بدکرداری کا مجسمہ ہے۔

اس افسانے کا ہر کردار اپنے اپنے مقام پر بھرپُور اور جاندار ہے اور قاری پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔

اس کہانی کا المیہ کبریٰ کا المیہ ہی نہیں یہ ابا میاں اور بی اماں کا المیہ بھی ہے۔ جنھوں نے کبریٰ کے لئے بَر کی تلاش میں نہ جانے کتنی عمر مصائب اور آلام کے بحرِ بیکراں میں غوطے کھاتے گذار دی ــــ یہ درحقیقت ایک کُنبے کا المیہ بھی نہیں ــــ یہ لاکھوں گھروں کا المیہ ہے جہاں جوان لڑکیاں اپنے والدین کی غُربت اور عُسرت کے سبب دل ہی دل میں اپنے مقدر کو روتی کوستی اس دُنیا سے رُخصت ہو جاتی ہیں ــــ غُربت اور جہیز کے مسائل والدین کے حوصلے پست کر دیتے ہیں اور وہ حالات کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں ــــ عصمت کی دردمندی اور گداز دلی اس افسانے کے ہر لفظ سے جھلکی پڑتی ہے ــــ انھوں نے اس مسئلے کا کوئی حل نہیں سجھایا اور بطور ایک فنکار یہ شاید ان کے منصب کا تقاضہ بھی نہیں تھا۔ ان کا کام صرف شیشہ دکھانا تھا، سو دِکھا دیا۔ حالات کی عکاسی کرنی تھی سو کر دی ــــ اور حُسن و خوبی کی۔

یہ افسانہ عصمت کے طنز کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے اور طنز بھی ایسا تیکھا اور تیزابی کہ قلب و جگر کو برماتا چلا جائے اور بھلائے نہ بھولے ــــ دھیان رہے کہ موثر طنز افسانے کی معنویت اور مقصدیت کو چار چاند لگا دیتا ہے اور جو بات چند صفحات میں نہیں کہی جا سکتی وہ طنز کے توسط سے دو چار جُملوں میں بہتر طور پر کہی

جا سکتی ہے۔ برائے مہربانی اس مکالمے پر پھر سے ایک نظر ڈالیے جو راحت اور بی اماں اور حمیدہ کے درمیان ہوا اور جس کا ذکر اُوپر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ایسا کاٹ دار اور تلخ و تُرش طنز ہمارے چوٹی کے فنکاروں میں بھی شاذ ہی ملتا ہے۔

○ افسانے کے استخوانی ڈھانچے کو جُزئیات ہی گوشت پوست اور خدّوخال عطا کرتی ہیں۔ اور انہی سے کہانی نکھرتی سنورتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جزئیات موضوع کے اعتبار سے مناسب و موزوں ہوں اور ان کی کڑی سے کڑی ملتی چلی جائے۔ جُزئیات کا حُسن اس بات میں ہے کہ ان کا انتخاب بڑی باریک بینی سے کیا جائے جس کا انحصار فنکار کی قوتِ مشاہدہ پر ہے۔ نگاہ جتنی دُوررس اور باریک بیں ہوگی جُزئیات اُتنی ہی بھرپُور ہوں گی۔ پھر جُزئیات پیش کرنے کا بھی ایک مخصُوص انداز ہوتا ہے۔ خوبصُورتی سے کہی گئی بات ہمیشہ قاری کو اپنی جانب متوجّہ کرتی ہے —— یہاں زبان اور اسلوبِ بیان کا سوال آجاتا ہے۔ اگر زبان میں شیرینی اور رنگینی ہو، لطافت اور نفاست ہو، طنز و مزاح کی چاشنی ہو تو وہ کہانی کو آب و رنگ عطا کرتی ہے —— یہ کہانی جُزئیات نگاری کے بہت ارفع نمونے پیش کرتی ہے جن میں سے دو ایک ملاحظہ ہوں :

○ "کُبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں۔ کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مُسکرا پڑتیں۔"

○ "چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپا جھپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پرو دیئے۔ نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے۔ کُبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی۔"

○ "کُبریٰ کی ماں کے پُراستقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی۔ چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس اُن کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھُوٹ رہا تھا۔ وُہ اُداس اُداس گہری جُھرّیاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دَم اُجاگر ہوگئیں، جیسے جنگل میں آگ بھڑک اُٹھی ہو اور انھوں نے مُسکرا کر قینچی اُٹھالی۔"

○ "اسی وقت بی امّاں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اُتار کر مُنہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشہ سلمہ ستارہ اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چُونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چِٹّا ہوگیا۔ مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اُڑ گئی۔ اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکّر کھا کر دوہری ہوگئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گذری۔"

یہ جزئیات اپنی موزونیت، مشاہدے کی باریکی اور زبان و بیان کے حسن کے اعتبار سے مسحور کن ہیں۔

○ زبان و بیان پر عصمت کی دسترس قاری کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اور بے اختیار کلمۂ تحسین منہ سے نکلتا ہے۔ ان کے ہر چند جملوں کے بعد کوئی خوبصورت تشبیہ، استعارہ یا محاورہ ملنا ناگزیر سا ہے اور وہ اپنے مخصوص مقام پر اس قدر موزوں و مناسب ہوتا ہے گویا انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہو۔ خدا جانے ان کے خزانے میں ایسے کتنے جواہر ریزے ہیں، جو ختم ہونے میں نہیں آتے اور وہ کبھی ان کا اعادہ نہیں کرتیں۔ اس لئے ان کی تحریر کی تازگی اور شگفتگی قائم رہتی ہے ـــــ اس افسانے کو ہم جتنی بار پڑھتے ہیں، زبان و بیان کا حسن بیش از بیش کھلتا چلا جاتا ہے ـــــ ان کی تشبیہوں کی چند مثالیں بطور نمونہ پیش ہیں:

○ "دُبلی پتلی ماں اُسے اپنے گھٹنوں پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو۔"

○ "ابا کتنے دُبلے پتلے جیسے محرّم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔"

○ "لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔"

○ "نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔"

○ "کھانسی سینے میں بے طرح اُلجھتی جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑ پھڑا رہے ہوں۔"

○ "جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اُٹھ رہی ہے۔"

○ "کس کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ نا تھا جائے گا۔"

لیکن اس افسانے میں ان کی زبان کا حسن تشبیہات اور محاورات تک ہی محدود نہیں۔ ان کے بعض جملے اس قدر فکر انگیز اور معنی خیز ہیں کہ قاری بے اختیار ذرا رُک کر سر دُھنتا ہوا آگے چل دیتا ہے۔ اس نوع کی چند مثالیں پیش ہیں:

○ "جب سے ابا گذرے سلیقہ کا دم بھی بھول گیا۔"

○ "وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔"

○ "یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بقر عید کو کام آئے گی۔"

○ "اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق۔ اُونہہ۔ اری چل دیوانی۔"

○ "تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔"

اُوپر عصمت کی تشبیہات، محاورات، فکر انگیز جملوں، حسنِ زبان و بیان اور قوتِ مشاہدہ کی امثال پیش کرنا

اس لئے ضروری تھا کہ ان کی بدولت اس افسانے کی تب و تاب میں غیر معمولی اضافہ ہُوا ہے ــــ گویہ ماننا پڑے گا کہ یہ سب خصائص اور اوصاف عصمت کی تحریر کا جُزوِ لاینفک ہیں۔ اور ان کی وجہ سے ہی وہ اپنے بیشتر ہم عصروں پر بھاری ہیں۔

اس افسانے کی ابتدا بہت جاذب اور دلچسپ ہے اور انجام بھی تعجب خیز اور فکر انگیز ہے۔ خوبی یہ ہے کہ افسانہ بتدریج قدم بقدم پیش رفت کرتا ہُوا اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ آغاز اور انجام کو ملاتی ہوئی کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے اور حسنِ تحریر یہ ہے کہ ہر جُز اپنے مقام پر مناسب و موزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ بحیثیت مجموعی ایک اکائی کی طرح اُبھر کر بے اختیار متاثر کرتا ہے ــــ یہ افسانہ بے حد گتھا ہُوا اور مربُوط ہے۔ اس میں کوئی جُملہ بھی فالتو اور فاضل نہیں۔ عصمت نے نظم و ضبط سے کام لیتے ہُوئے اپنے قلم کو سختی سے افسانے کے چوکھٹے تک محدُود رکھا ہے ــــ اسی لئے کہانی کا مرکزی خیال پُورے طور پر نمایاں ہو کر اسے بلند مقام عطا کرتا ہے۔

یہ افسانہ عصمت کے شاہکار افسانوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

دو ہاتھ

ہمارے علم میں اُردو صنفِ افسانہ نگاری میں "بھنگی" پر دو ہی افسانے لکھے گئے ہیں۔ ایک کرشن چندر کا شاہکار افسانہ "کالو بھنگی" اور دوسرا عصمت کا یہ افسانہ "دو ہاتھ"۔ بھنگی کا پیشہ ہمارے ہاں صدہا برسوں تک غربت، پسماندگی اور حقارت کی علامت بنا رہا ہے۔ جیسے جیسے ہمارے معاشرے کا خوابیدہ ضمیر آنکھ کھولتا جائے گا، بھنگی نام کا یہ شخص قعرِ ذلالت سے نکل کر انسانوں کی صف میں شامل ہوتا جائے گا۔

جنگِ عظیم نازل ہوئی تو پُورے مُلک میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہزاروں لاکھوں بیکار لوگوں پر روزگار کے دروازے کُھل گئے۔ رام اوتار خاکروب کو بھی بھرتی ہو کر لام پر جانے کا حکم ملا۔ اس کی والدہ بوڑھی مہترانی نے بہت واویلا مچایا کہ رام اوتار اس کا اکلوتا بیٹا ہے، مگر حکمِ حاکم مرگِ مفاجات والی بات تھی۔ مہترانی پیچ و تاب کھا کر خاموش ہو گئی ــــ رام اوتار کے لام پر جانے کے بعد خلافِ توقع اس کی جوان نو بیاہتا بہو کُھل کھیلی تو محلے کی خواتین کے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی جو اس بڑھتے ہوئے خطرے سے نپٹے۔ کمیٹی کی صدر اعزازی واحد متکلم کی والدہ محترمہ تھیں۔ بوڑھی مہترانی کو محلّے کی عدالت کے سامنے حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرنے کا حکم ہوا۔ عدالت کا رویّہ شروع سے ہی جارحانہ اور معاندانہ تھا۔ اس نے مہترانی کو مخاطب کرتے ہوئے

کہا۔ کیوں ری چڑیل تونے بہو قطامہ کو چھوٹ دے رکھی ہے کہ ہماری چھاتیوں پر کودوں دَلے۔ ارادہ کیا ہے تیرا۔ کیا منہ کالا کرائے گی؟" بڑھیا نے جواب میں معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ تو بہو کو قابو میں کرنے کے سب حربے اپنا چکی ہے مگر وہ اس کی سنتی ہی نہیں اور پھر وہ خود ہی عدالت سے مؤدبانہ پوچھتی ہے کہ وہ کیا کرے۔ صدر نے رائے دی کہ "موئی کو میکے پھنکوا دے"۔ عدالت کا یہ مشورہ مہترانی کو مطلق راس نہیں آتا اور وہ صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے کہ یہ ایک ناممکن سی بات ہے کہ اس نے ساری عمر کا اندوختہ دو سو روپے خرچ کرکے اسے حاصل کیا ہے۔ پھر وہ اگر اسے میکے بھیج دے تو اس کا باپ اسے کسی دوسرے مہتر کے ہاتھ بیچ دے گا۔ مزید براں بہو چار آدمیوں کا کام نپٹاتی ہے۔ ایسی کماؤ اور فائدہ مند بہو کو وہ کیسے کھو دے ـــــ بایں ہمہ عدالت نے مہترانی کو حکم دیا کہ وہ بہو کی لگام ذرا کس کے رکھے ورنہ اس کے خلاف سخت کاروائی کی جائے گی ـــــ مگر مہترانی عدالت کی تنبیہہ پر کان نہیں دھرتی۔

بڑھیا بہت چست و چالاک ہے اور بکارِ خود ہوشیار۔ جب رتی رام کی آمد کے بعد بہو کا رویّہ دیکھ کر عدالت اسے پھر طلب کرتی ہے تو وہ خواتین کی مجلس میں تن کر کھڑی رہتی ہے۔ عدالت اُسے مخاطب کرکے سخت لب و لہجے میں کہتی ہے کہ وہ اپنی بہو کی کالی کرتوتوں سے بے بہرہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے رتی رام اور اس کی بہو کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا ہے لیکن مہترانی یُوں بنتی ہے گویا ان کی بات اس کے پلّے نہیں پڑی اور وہ اُلٹی آپے سے باہر ہو کر چیخنے چلّانے لگتی ہے گویا اس پر بہت ظلم ہو رہا ہو۔ وہ عدالت کی اراکین کی سیدھی اور کھری الزام تراشی سے خوف زدہ نہیں ہوتی اور نہ ملتجیانہ رویّہ اختیار کرتی ہے۔ بلکہ وہ کمال ہوشیاری سے اپنی مدافعت پر ڈٹ جاتی ہے اور بات کا رُخ موڑ دینے کی کوشش کرتی ہے کہ اس کے بیٹے رام اوتار کی غیر موجودگی میں اس پر بیجا تہمتیں دھری جارہی ہیں۔ بے معنی اور بے مقصد بہتان تراشی اور طعن و تشنیع کی جارہی ہے جبکہ اس کی بہو بالکل بے قصور ہے۔ وہ کسی کے لینے دینے میں نہیں بلکہ وہ تو رام اوتار کی یاد میں آنسو بہاتی ہے، آہیں بھرتی ہے، محنت اور لگن سے اپنا کام کرتی ہے اور کسی سے ہنسی مذاق تک کرنے کی روادار نہیں۔ پھر نہ معلوم لوگ اس معصوم، بے گناہ کی جان کے دشمن کیوں ہوگئے ہیں ـــــ اور بڑھیا مہترانی ہر طرح کے لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر "تکلّف برطرف" کے انداز میں جارحانہ رُخ اختیار کرکے ان پر پل پڑتی ہے کہ وہ ہرگز نہ سمجھیں کہ بڑے گھروں کی امیرزادیاں بڑی پاک اور اُجلی اُجلی ہیں کہ وہ ان کے سیاہ کارناموں سے خوب واقف ہے۔ اس پر ان کے سب بھید آشکار ہیں۔ یہ تو اس کی شرافت اور بھلمنساہٹ ہے کہ وہ یہ سوچ کر اپنا منہ نہیں کھولتی کہ اس نے اُن کا نمک کھایا ہے، ورنہ وہ اُن کے رازہائے درُونِ خانہ جو اس کے سینے میں دفن ہیں، کھول دے تو ایک طوفان مچ جائے۔ مگر فی الحال اُسے خاموشی ہی زیب دیتی ہے ـــــ ہاں اگر حد سے گذر کر اسے ڈرایا دھمکایا گیا، اسی طرح لتاڑا پھٹکارا گیا تو شاید اسے مجبور ہو کر ان کی سب ناگفتنی باتیں

بھی زبان پر لانی پڑیں ـــــ صاف ظاہر ہے کہ بڑھیا نے بہت ہمت اور جی داری کا ثبوت دیا۔ اس کا بے باکانہ انداز اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے اپنی بہو کو گناہگار تسلیم نہیں کیا۔ اس نے ملزمانہ اور ملتجیانہ رویّہ بھی اختیار نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اُلٹا ان سب کو ملزموں اور گناہگاروں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ جہاندیدہ اراکینِ عدلیہ ضرور سوچتی ہوں گی کہ انھوں نے بھڑوں کے چھتے کو خواہ مخواہ چھیڑ دیا ہے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ بڑھیا اس قدر ہوشیاری سے ان کی بساط ہی اُلٹ کر رکھ دے گی ـــــ درحقیقت بڑھیا ضعیف العمر سہی مگر فاتر العقل نہیں۔ ذہنی طور پر وہ چُست درست اور اپنے نیک و بد سے خوب آگاہ ہے اور حرف گیری کرنے والوں کا مُنہ توڑ جواب دینا جانتی ہے ـــــ نتیجہ یہ کہ بڑھیا کا دَم خم دیکھ کر سب کے ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔

جب بہو کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو بڑھیا ماتھا نہیں پیٹتی، سینہ کوبی نہیں کرتی بلکہ اُلٹا اس کی باچھیں کھِل جاتی ہیں اور فرطِ مسرت سے مغلوب ہو کر وہ رام اوتار کو اس کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کا مژدۂ جانفزا سُناتی ہے اور اسے جلد از جلد گھر لوٹ آنے کو کہتی ہے ـــــ بڑھیا کی فہم و فراست یا یوُں کہئے کہ عیّاری اور مکّاری حیرت انگیز ہے کہ وُہ باتوں ہی باتوں میں سب کو دھتا بتا دیتی ہے۔ اور کانوں میں تیل دیئے اور آنکھیں میچے اپنی راہ پر گامزن رہتی ہے۔ وہ اکیلی زمانے کا ناطقہ بند کئے دل ہی دل میں ضرور جھکتی ہوگی کہ وہ تنِ تنہا سب پر بھاری ہے ـــــ اس افسانے میں بڑھیا ایک چالاک ہوشیار اور زمانہ ساز عورت کے طور پر اُبھر کر سامنے آتی ہے اور بے اختیار متاثر کرتی ہے۔ وہ سُنتی سب کی ہے مگر کرتی اپنی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ انگشت نُمائی کرنا، غیبت کرنا، پند و نصائح سے کام لینا، خود کو معاشرے کے اخلاق کا پاسبان اور نگہبان ظاہر کرنا زردار لوگوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ مگر وہ اپنے ذہن میں بالکل صاف ہے کہ اس کا مفاد کس بات میں ہے۔ وہ جانتی ہے کہ پوتا خاندان کو آگے بڑھائے گا۔ بڑھاپے میں اس کا اور رام اوتار کا سہارا بنے گا، خود کھائے گا اور انھیں بھی کھلائے گا۔ گھر میں دو ہاتھوں کا اضافہ ہوگا تو حال پُر اطمینان اور مُستقبل پُر امید ہو جائے گا ـــــ ایک جُملے میں یہ کہ بڑھیا کی نظروں میں اس معاملے کا اقتصادی پہلو اخلاقی پہلو سے کہیں زیادہ بامعنی اور بامقصد ہے کہ اخلاقیات کا درس دینے والے بھوکے پیٹ کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

بوڑھی مہترانی ایک زمانہ دیکھے ہوئے ہے۔ اس نے زندگی کا سرد گرم چکھا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ رام اوتار لام پر گیا ہوُا ہے۔ اور اس کی بہو جوان ہے۔ جوانی یوُنہی دیوانی ہوتی ہے اور اسے راہ سے بے راہ ہوتے دیر نہیں لگتی کہ زمانہ اُسے چین سے جینے نہیں دیتا۔ لوگوں کی ٹوہ لینے والی تیز نظریں اس پر لامحالہ اُٹھ جاتی ہیں۔ بڑے بڑے دراز ریش فرشتہ صوُرت پھسل جاتے ہیں۔ اس لئے اس کی چشمِ نگراں ہر وقت بہو کی عصمت و عفت کی پاسبان اور نگہبان بن کر اس کا تعاقب کرتی رہتی ہے اور اس کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھتی ہے۔

یوں بُڑھیا اپنے کام میں مستعد ہے۔ محلہ بھر اس کی کارکردگی اور خدمت گذاری کا معترف ہے۔ کسی کو دردِ زہ شروع ہو تو فوراً سرہانے آکھڑی ہوتی ہے۔ اپنے عمر بھر کے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر لیڈی ڈاکٹر تک کو بے جھجک اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ ہدایتیں دیتی ہے ــــ زچہ کو سماوی آفات اور بلائیات سے تحفظ کے گُر سمجھاتی ہے اور کچھ منتر پھونک کر تعویذ پلنگ کے ساتھ باندھ دیتی ہے۔ گویا گھروں میں اُس کی حیثیت ایک معتبر بھروسہ مند اور تجربہ کار عورت کے طور پر ہے، جو اپنے فرائض سے بحُسن وخوبی عہدہ برآ ہوتی ہے ــــ مگر بُڑھیا کو اب اس بات کا شدید احساس ہے کہ چالیس برس کی مدتِ مدید تک محنت مشقت کرتے کرتے اس کی صحت رُو بزوال ہے اور اس کی کمر نے جواب دیدیا ہے اور ایک طرف جُھک کر وہیں جُھکی رہ گئی ہے ــــ گویا پیرانہ سالی میں اب اُسے قدرے آرام کی ضرورت ہے۔

رام اوتار اور اس کی ماں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اس اعتبار سے کہ دونوں ایک دوسرے کے نبض شناس ہیں اور دونوں کا مفاد بھی مشترکہ ہے۔ ماں بیٹا جو ٹھہرے۔ بادی النظر میں سماج کے مروّجہ اخلاقی معیار کے مُطابق رام اوتار ہمیں ایک بے حمیت، بے شرم اور بے ضمیر انسان معلوم ہوتا ہے اور اس میزانِ قدر پر تولا جائے تو بُڑھیا بھی اس سے چنداں مختلف نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کو تولنے پرکھنے کے اس طبقے کے اپنے ترازو الگ ہیں۔ باٹ الگ ہیں۔ فیتے اور پیمانے الگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رام اوتار اپنی ماں کی طرح سماج کے پاسبانوں کی خود ساختہ پابندیوں کے کھونٹے سے بندھنے والا نہیں۔ سماج کے کرتا دھرتا دانشوروں کی باتوں پر کان دھرنے والا نہیں ــــ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ ان لوگوں کے کہنے سُننے پر اپنی بیوی کو غم وغصے کے جذبات سے مغلوب ہو کر گھر سے نکال باہر کرے گا تو وہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارے گا اور عمر بھر دستِ تاسّف ملتا رہے گا کہ تہی دست ہونے کی وجہ سے وُہ دُوسری شادی نہ کر پائے گا۔ اس معاملے میں واحد متکلّم کے والد سے رام اوتار کی گفتگو بڑی بصیرت افروز ہے:

"ابے نِرا اُلّو کا پٹھا ہے تو۔ نکال باہر کیوں نہیں کرتا کمبخت کو۔"

"نہیں سرکار کہیں ایسا ہوئے سکے ہیں۔" رام اوتار گھگیانے لگا۔

"کیوں بے؟"

"ہجور ڈھائی تین سو پھر سگائی کے لئے کا س سے لاؤں گا اور برادری جمانے میں سَو دو سَو الگ کھرچ ہو جائیں گے۔"

"کیوں بے تجھے برادری کیوں کھلانی پڑے گی؟ بہو کی بدمعاشی کا تاوان تجھے کیوں بھگتنا پڑے گا؟"

"جے میں نہ جانوں سرکار۔ ہمارے میں ایسا ہوے ہے۔"

"مگر لونڈا تیرا نہیں رام اوتار، اس حرامی رتی رام کا ہے۔" ابّا نے عاجز آکر سمجھایا۔

"تو کا ہوا سرکار۔ میرا بھائی ہوتا ہے رتی رام۔ کوئی گیر نہیں۔ اپنا کھون ہے۔"

"نرا اُلّو کا پٹھا ہے۔" اّبا بھنّا اُٹھے۔

"سرکار لونڈا، بڑا ہو جائے گا اپنا کام سمیٹے گا۔" رام اوتار نے گڑگڑا کر سمجھایا۔ "وہ دو ہاتھ لگائے گا۔ سو اپنا بُڑھاپا سنور جائے گا۔" ندامت سے رام اوتار کا سر جھک گیا۔[1]

رام اوتار کی گفتگو سب اُلجھنوں کو سلجھا دیتی ہے۔ سب گرہوں کو کھول دیتی ہے اور بات شیشہ ہو جاتی ہے۔ اگر اسے ایک جملے میں بیان کرنا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ "لونڈا بڑا ہو کر دو ہاتھ لگائے گا۔ کام سمیٹے گا اور رام اوتار کا بُڑھاپا سنور جائے گا۔" بس اتنی سی بات تھی جسے سماج کے دانشوروں کی چشمِ نگراں دیکھ نہ سکی ——— ایک طرف رام اوتار کے سامنے بُڑھاپے کی امکانی تہی شکمی اور برہنہ پائی کا دُکھڑا، تیرہ و تارمستقبل کا ہوا کھڑا تھا اور دوسری طرف ایک محفوظ، مامون، پُرسکون بُڑھاپا تھا۔ اس نے دوسرا متبادل اختیار کرنے کو قرینِ مصلحت جانا اور اس پر اُنگلی رکھ دی ——— اقتصادی صعوبتوں کے سامنے کھوکھلی اخلاقی اقدار کا درس کس قدر بے معنی اور بے مقصد معلوم ہوتا ہے۔ رام اوتار کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اگر وہ دباؤ میں آکر بہو کو گھر سے نکال بھی دے تو نئی شادی کے لئے وہ روپیہ پیسہ کیسے جُٹا پائے گا۔ تہی دست برادری کی خاطر مدارات کیسے کرے گا ——— اس کے علاوہ ایک اہم اور غور طلب نکتہ یہ بھی ہے کہ رام اوتار کے نزدیک بہو کسی بداخلاقی کی مرتکب ہی نہیں ہوئی اور نہ ہی رتی رام نے کوئی گناہ کیا ہے، کہ آخر الذکر تو رشتہ میں اس کا بھائی ہے۔ اس کے گوشت کا گوشت، پوست کا پوست اور خون کا خون ہے ——— اس طرزِ استدلال کے سامنے سب عقلی اور منطقی باتیں، سب اخلاقی اور رُوحانی فلسفے ہیچ و حقیر معلوم ہوتے ہیں ——— یہ حقیقت ہے کہ نام نہاد اخلاق بعد میں بولتا ہے مگر زندگی کے سنگین حقائق پہلے پنجے جھاڑتے ہیں اور ایک عام انسان ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا ——— دھیان رہے کہ ہمارے ملک میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں ایک عورت کئی بھائیوں کی مشترکہ بیوی ہوتی ہے۔ اس پر نہ قانون اُنگلی اٹھاتا ہے اور نہ سماج معترض ہوتا ہے۔ بلکہ سماج اور قانون کی رضا و رغبت سے ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس رواج کی جڑ بنیاد وہاں کے لوگوں کی اقتصادی مجبوریاں ہیں ——— رام اوتار کی بات کچھ سمجھ میں آنے لگتی ہے۔

بہو ایک حرّافہ ہے۔ بھلے ہی وہ سیاہ فام ہے اور دائیں آنکھ سے بھینگی ہے۔ مگر زہر میں بُجھے تیر چلانے کے لئے اس کی بائیں آنکھ ہی کافی ہے، جس کا تیر ہمیشہ نشانے پر بیٹھتا ہے۔ جُوٹھن کھا کھا کر وہ فربہ اندام ہو گئی ہے اور اس کے جسم سے کڑوے تیل کی سڑاند آتی ہے۔ مگر اس کی آواز میں بلا کی کوک ہے اور تیج تہوار پر جب وہ لہک لہک کر کجریاں گاتی ہے تو فضا مرتعش ہو جاتی ہے ——— جب رام اوتار لام پر جانے لگتا ہے تو وہ ایک وفا شعار، عصمت مآب،

---

[1] عصمت چغتائی۔ "دو ہاتھ"۔ مجموعہ "دو ہاتھ"۔ روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۱۴

پتی ورتا بیوی کی طرح بلک بلک کر روتی ہے۔ گویا اس کا سہاگ ہمیشہ کے لئے چھن رہا ہو۔ رام اوتار کی موجودگی میں وہ یہ لمبا گھونگھٹ نکالا کرتی تھی مگر اس کے رخصت ہونے کے بعد گھونگھٹ کی لمبائی آہستہ آہستہ کم ہونے لگتی ہے ــــ تھوڑے دن وہ غمگین صورت بنائے، سر جھکائے، روئی روئی آنکھیں لئے، میلے کی ٹوکری اُٹھائے پھرتی ہے۔ مگر پھر وہ دھیرے دھیرے ایک آفت برپا کر دیتی ہے۔ اِتراتی، اِٹھلاتی، کانسی کے کنگن چھنکاتی جدھر سے نکل جاتی ہے شاگرد پیشہ لوگ بچھے جاتے ہیں۔ اس پر جان و دل نثار کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ ایک بے لگام کھنا بیل تھی، بے وقوف اور بے باک۔ یا یوں کہئے کہ بے شرم و بے حیا ــــ اور تو اور بھلے گھروں کی بیویاں بھی اس کے تیور اور رنگ ڈھنگ دیکھ کر اپنے شوہروں کی بابت فکرمند ہو جاتی ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ نتیجہ یہ کہ ایک پتی رکشا کمیٹی، جس کی صدر اعزازی واحد متکلم کی والدہ تھی اور جس کے اراکین میں اس کی بھاوجیں شامل تھیں، معرض وجود میں آجاتی ہے ــــ مگر جب رتی رام جو رشتہ میں رام اوتار کا بھائی تھا منظر پر آتا ہے تو بادل چھٹ جاتے ہیں۔ مطلع صاف ہو جاتا ہے اور فضا پُرسکون ہو جاتی ہے۔ بہو اب مرکھنے بیل کی بجائے ایک شرمیلی لجیلی عورت بن جاتی ہے۔ اس کا گھونگھٹ پھر نیچے سرک آتا ہے۔ اسٹاف کے آدمی اُسے شوخی سے چھیڑتے ہیں تو وہ لجا شرما کر طرح دے جاتی ہے ــــ جب وہ گھونگھٹ کی اوٹ سے رتی رام کو اپنی بھینگی آنکھ سے معنی خیز انداز میں دیکھتی ہے تو وہ مسکراتا، بازو کھجاتا اس کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بڑھیا دہلیز پر بیٹھی نیم باز آنکھوں سے، بڑے اطمینان سے، یہ طربیہ دیکھتی ہے اور گُڑگُڑی پیتی رہتی ہے۔ اب چہار سُو سکون ہی سکون ہے۔ ایسا سکون جو پھوڑے سے مواد نکل جانے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

لیکن جب وہ شاگرد پیشہ لوگ جو بہو کو دل دیئے بیٹھے ہیں اور جن کو وہ اب تک عشوہ و غمزہ و ادا سے رجھاتی اور بھرماتی چلی آئی تھی اس کا تغافل اور بے رُخی دیکھتے ہیں، تو جل بھُن کر کباب ہو جاتے ہیں اور اس کے خلاف باقاعدہ ایک متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں۔ باورچی، دھوبی، چپراسی، بہشتی سب اس کے کام میں کیڑے نکالنے لگتے ہیں اور بات بے بات روڑے اٹکاتے اور ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں مگر بہو ان کی اِس متوقع روش کو نظر انداز کرتی ہوئی اپنی ڈگر پر چلتی رہتی ہے ــــ بہو اور رتی رام کا معاشقہ رنگ لاتا ہے۔ اور وہ پیٹ سے ہو جاتی ہے ــــ رتی رام اپنے گاؤں واپس چلا جاتا ہے ــــ کچھ عرصہ بعد رام اوتار لام سے واپس لوٹ آتا ہے ــــ بہو نئی نویلی دُلہن کی طرح سمٹی سمٹائی کانسی کی تھالی میں پانی بھر کر رام اوتار کے فوجی بوٹ اُتارتی ہے اور اس کے چرن دھو کر پیتی ہے۔

بہو ایک چالاک اور مکار قطامہ کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے جو موقع محل کی مناسبت سے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی رہتی ہے۔ مگر دھیان رہے کہ گو شاگرد پیشہ لوگوں کو ناز و نخرے سے اپنی جانب راغب کرنے میں اس کی جبلّی بے راہ روی اور اخلاق باختگی کو دخل تھا مگر رتی رام سے معاشقے میں اُسے بڑھیا مہترانی کی شہ اور سرپرستی حاصل تھی، جو سب کچھ دیکھتی تھی مگر دیدہ دانستہ اُس سے اغماض برتتی تھی ــــ بلکہ جب بہو کے لڑکا پیدا ہوتا ہے تو وہ فرطِ مسرت سے کھل جاتی ہے۔

بایں ہمہ ہم بھو کے کردار سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔

"دو ہاتھ"، ایک اعلیٰ درجے کا افسانہ ہے۔ عصمت کے بیشتر افسانے ذاتی مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اس قدر موثر، بھرپور اور جاندار ہوتے ہیں۔ یہ افسانہ اُسی زمرے میں آتا ہے ــــ بطور ایک فنکارہ کے عصمت کی تمام تر ہمدردی اس کے مرکزی کرداروں بوڑھی مہترانی اور رام اوتار کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہیں کہ افسانے کے مخصوص سیاق و سباق میں جب "دو ہاتھ" کا معاملہ پیش آتا ہے تو وہ ہاتھ حرامی ہوتے ہیں اور حلالی۔ وہ تو محض "دو ہاتھ" ہوتے ہیں۔ جیتے جاگتے، کام کرنے والے، روزی روٹی دینے والے، حیات بخش ہاتھ۔ اِن دو ہاتھوں پر ہی گرسنہ شکم، برہنہ پا روندے ہوئے طبقے کی زندگی اور بقا کا دار و مدار ہے۔ یہ دو انمول ہاتھ، جو دُنیا کے چہرے کی غلاظت دھوتے ہیں۔ دھرتی کی مانگ کا سیندور ہیں، ماتھے کی بندیا ہیں۔ ہمیں ان کی قدر و قیمت کو پہچاننا ہی ہوگا۔

عصمت سماج کی اُن اقدار سے صرفِ نظر کرتی معلوم ہوتی ہیں، جو انسانی زندگی کی بنیادی حاجات اور ضروریات سے اغماض برتتی ہیں اور محض کھوکھلی، بے حقیقت، ہوائی باتوں پر اکتفا کرتی ہیں۔ وہ اخلاقی قدروں کے ان خودساختہ نام نہاد علم برداروں سے بھی گریز کرتی دکھائی دیتی ہیں جو ہر کس و ناکس سے زور زبردستی سے اپنی بات منوانا چاہتے ہیں ــــ اخلاقی اقدار اگر انسانی ہمدردی، گداز دلی، دل بستگی کے اساسی عناصر سے عاری ہوں تو ان کی افادیت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

"دو ہاتھ"، عصمت کا ایک کامیاب افسانہ ہے۔ مصنف کی نظروں میں کامیاب افسانہ اُسے کہنا چاہیئے جس سے قاری وہی تاثر لے، جو فنکار اُسے دینا چاہتا ہے یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ بشرطیکہ وہ فنی صناعی کے اعتبار سے بھی مکمل ہو اور اس میں کوئی جھول، شکن یا گانٹھ نہ ہو اور دیگر عام افسانوی اسقام سے بھی مبترا ہو۔

اس افسانے کی ایک اہم خوبی عصمت کے بیشتر افسانوں کی طرح اس بات میں مضمر ہے کہ وہ از اوّل تا آخر اس کے تھیم یا مرکزی خیال سے بے طرح جڑی رہتی ہیں اور انھوں نے اس سے کہیں سرمو انحراف نہیں کیا۔ اپنی بات انھوں نے بہت موزوں اور مناسب جزئیات میں لپیٹ کر بڑے قرینے اور سلیقے سے صناعانہ طور پر پیش کی ہے۔ انھوں نے ہمارے کئی دیگر افسانہ نگاروں کی طرح بلند بانگ انداز میں مصلحانہ انداز اختیار نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افسانہ زیادہ موثر، موقر اور دلآویز ہو گیا ہے۔

"دو ہاتھ" کو جن عناصر نے آب و تاب عطا کی ہے ان میں عصمت کے چست درست مکالمے اور تشبیہات شامل ہیں۔ ایک تو عصمت یوں ہی مکالمہ نگاری میں ید طولیٰ رکھتی ہیں اور اس اعتبار سے انھیں اپنے تمام ہم عصر افسانہ نگاروں پر فوقیت حاصل ہے۔ دوسرے انھوں نے مہترانی اور رام اوتار سے انہی کی زبان میں مکالمے ادا

کرائے ہیں، جس نے انھیں جاندار، بھرپور اور پُرحقیقت بنا دیا ہے۔ یہ زبان نچلے طبقے کے اَن پڑھ گنوار لوگوں کی ہے لیکن اس ناتراشیدہ زبان میں بھی ایک اپنا ہی حُسن ہے۔ ملاحظہ ہو:

- "بیگم صاحب آپ جیسی بتاؤ ویسے کرتے سے موئے ناتھوڑی، پر کا کروں۔ کارانڈ کا ٹینٹوا دبانے دیوں؟" (ص ۸)
- "جو رڈھائی تین سو بھر سگائی کے لئے کاں سے لاؤں گا۔ اور برادری جمانے میں سَو دو سَو الگ کھرچ ہو جائیں گے۔" (ص ۱۴)

عصمت کی تشبیہات رنگین یا بلیغ نہیں ہوتیں۔ وہ بالعموم پیش پا اُفتادہ ہوتی ہیں مگر ان میں تشبیہات کی بُنیادی خصُوصیّت یعنی موزونیّت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور وہ اپنے مخصُوص سیاق و سباق میں چمکنے لگتی ہیں۔ دو ایک مثالیں بطور نمونہ پیش ہیں:

- "وہ نام کی گوری تھی۔ پر کمبخت سیاہ بہت تھی۔ جیسے اُلٹے توے، پر کسی پھاوڑیا نے پراٹھے تل کر چمکتا ہُوا چھوڑ دیا ہو۔" (ص ۶)
- "چاروں طرف ٹھنڈا ٹھنڈا سکون چھا گیا۔ جیسے پھوڑے کا مواد نکل گیا ہو۔" (ص ۱۰)

ایجاز عصمت کے فن کا طرّہ امتیاز ہے۔ وہ چند مختصر سے جُملوں میں بہت کچھ کہہ جاتی ہیں جس سے منظر، کیفیت یا احساسات تاباں ہو جاتے ہیں اور تحریر کا حُسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

- "بھلا اس سے زیادہ جیبن بُڑھاپا کیا ہوگا۔ ساری کوٹھیوں کا کام تَرت پھرت ہو رہا ہو۔ مہاجن کا سُود پابندی سے چُک رہا ہو اور کھٹنے پر پوتا سو رہا ہو۔" (ص ۱۳)
- "جب رام او تار لوٹا، مشاگرد پینے میں کھلبلی مچ گئی۔ باورچی نے ہانڈی میں ڈھیر سارا پانی جھونک دیا تاکہ اطمینان سے پینے کا لطف اُٹھائے۔ دھوبی نے کلف کا برتن اتار کر منڈیر پر رکھ دیا اور بہشتی نے ڈھول کنویں کے پاس ٹپک دیا۔" (ص ۱۴)

یہاں شاید "دو ہاتھ" سے کرشن چندر کے شاہکار افسانے "کالو بھنگی" کا اجمالی تقابل غیر موزوں نہ ہوگا۔ بادی النظر میں موضوع کے اعتبار سے دونوں افسانے ایک سے ہیں کہ ان کا تعلق ہمارے معاشرے کے پست ترین طبقے "بھنگی" سے ہے۔ مگر یہاں ان افسانوں کی مشابہت ختم ہو جاتی ہے ـــــ کرشن چندر، کالو بھنگی کے توسّط سے نہ صرف پورے طبقے کے رنج و الم حسرت و یاس اور ارمانوں و آرزوؤں کو نمایاں کرتے ہیں بلکہ ساتھ ہی وہ اس کا متوسط طبقے اور آسودہ حال طبقے سے موازنہ کرتے ہیں تاکہ تقابل سے ان کی تفاوت کھُل کر سامنے آجائے ـــــ یہی نہیں، وہ کالو بھنگی کے ہاتھ سے جھاڑو چھین کر چھوت چھات کی قبیح رسم کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ گویا کرشن چندر کا افسانہ اپنے وجود میں کالو بھنگی کے کرب و عذاب

کو نمایاں کرنے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جس سے اُسے گہرائی اور گیرائی ملتی ہے ——
کرشن چندر نے مختلف قدرتی مناظر اور کرداروں کی جو تصاویر بنائی ہیں اور اپنے موضوع میں ڈوب کر کالو بھنگی کی محرومیوں اور نامرادیوں کا ذکر کرتے ہوئے جس طرح اُس کے جذبات اور احساسات کی عکاسی کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ مزید براں زبان کی رنگینی، شیرینی اور رعنائی جو قدرت نے انھیں ودیعت کی ہے وہ اُردو ادب میں کسی دیگر افسانہ نگار کو نصیب نہیں ہوئی۔ پھر اُن کے افسانے میں موزوں اور موثر جزئیات کی فراوانی بھی حیران کن ہے —— بہرحال کرشن چندر، کرشن چندر ہیں۔

ادھر عصمت نے اپنی تمام تر توجہ کہانی کے مرکزی نقطے یعنی خاکروبوں کی زندگی میں "دو ہاتھ" کی اہمیت اور افادیت پر مرکوز کر دی ہے جس سے ان کی زندگی کا عدم تحفظ اور اقتصادی مشکلات بڑی شدت سے نمایاں ہو جاتی ہیں۔ گویا عصمت کے "دو ہاتھ" کا کینوس "کالو بھنگی" کی نسبت بہت محدود ہے۔ دوسرے "دو ہاتھ" اور "کالو بھنگی" ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے بھی بالکل جداگانہ ہیں عصمت ٹھوس حقائق کو بغیر گوٹ اور پھندنوں کے کم از کم الفاظ میں پیش کرتی ہیں جبکہ کرشن چندر اپنے بے پناہ تخیل، زبان و بیان کی سحر کاری اور جزئیات کی موزونیت اور فراوانی سے اپنے افسانے کو دل پذیر اور قد آور بناتے ہیں۔
—— یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ عصمت نے بھنگی کے تعلق سے "دو ہاتھ" کو بطور استعارہ پیش کیا ہے کہ اس کا واسطہ محض بُڑھیا مہترانی اور رام اوتار سے نہیں بلکہ اُن لاکھوں کروڑوں پسماندہ اور پامال لوگوں سے بھی ہے جو اپنے "دو ہاتھوں" کی کمائی کھاتے ہیں جب تک ان کے "دو ہاتھ" چلتے ہیں انھیں دو وقت کی رُوکھی سُوکھی نصیب ہوتی ہے اور جب وہ بیماری یا ضعیف العمری کے سبب کام کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں تو بھوکوں مرنے لگتے ہیں۔ جب تک ہمارے معاشرے کا خوابیدہ ذہن آنکھ نہیں کھولتا یہ طبقہ یونہی اپنی زبوں حالی پر روتا کراہتا رہے گا اور اپنے مُستقبل کا تحفظ اِسے ستاتا رہے گا۔
"دو ہاتھ" اپنے آپ میں ایک صاف شفاف فکر انگیز افسانہ ہے۔

گیندا

"گیندا" عصمت کی ان کہانیوں میں سے ہے جو عرصۂ دراز تک زندہ رہیں گی۔ ایک ایسی کہانی جو عصمت ایسی حسّاس اور دردمند فنکارہ ہی لکھ سکتی تھی۔ ایک عورت کے نازک ترین جذبات و احساسات کی ایسی جاندار ترجمانی ایک عورت کے بس ہی کی بات تھی۔ یہاں فن کو عورت اور مرد کے تعلق سے دو خانوں میں بانٹنا مقصود نہیں۔ لیکن پھر بھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ایک عورت مرد سے کہیں بہتر سمجھتی اور محسوس کرتی ہے۔ مثلاً ممتا اور عورت کا شوہر یا محبوب کی بے راہ روی کے باوصف اس کے تئیں نرم اور ملائم جذبات رکھنا، محض اس لئے کہ وہ اس کے بچّے کا باپ ہے۔ وہ اس کی تمام قباحتوں اور علتوں کو بالائے طاق رکھ کر اس کی شوہرانہ اور پدری حیثیت کو ہی سامنے رکھتی ہے ——
عصمت کی یہ سادہ سی کہانی اس قدر رنج و غم اور حسرت و یاس کے جذبات سے لبریز ہے کہ قاری ہل جاتا ہے۔ یہ کہانی

ہمارے معاشرے کے ایک بہت گھناؤنے پہلو کو نمایاں کرتی ہے جس میں ایک غریب اور بے بس معصوم بچّی کا جنسی استحصال اس قدر مستور اور ڈھکے چھپے انداز سے ہوتا ہے کہ حرفِ شکایت کے طور پر کوئی لب وا نہیں ہوتا۔ کوئی انگلی نہیں اٹھتی۔ کوئی قانون یہ لاقانونیت دیکھ کر حرکت میں نہیں آتا۔ اور معاملہ یوں رفع دفع ہو جاتا ہے۔ گویا کبھی ہُوا ہی نہ ہو۔

گیندا ایک تیرہ چودہ سال کی معصوم بچّی ہے جو ایک کھاتے پیتے گھرانے میں اُن کے کپڑے وغیرہ استری کرنے کا کام کرتی ہے۔ اس کی شادی کم سنی میں کر دی جاتی ہے۔ لیکن چند ماہ بعد ہی اس کا شوہر چل بستا ہے اور اب وہ بے حس سماج کی نظروں میں وِدھوا ہے اور اُن تمام پابندیوں کا شکار جو وُہ ایک وِدھوا پر صدیوں سے عائد کرتا آیا ہے۔ اب اس کے لئے آرائش و زیبائش کرنا، شوخ بھڑکیلا لباس پہننا، کلائی میں چوڑیاں پہننا، ماتھے پر بندیا لگانا، مانگ میں سیندور بھرنا سب ممنوع ہیں۔ پھر بھی اس کا چنچل مَن چوری چھپے کھیل کھیل میں اُسے یہ سب باتیں کرنے پر اُکساتا ہے۔ اور وہ گھر کے مالک کی بچّی کے ساتھ، جو اس سے عمر میں کچھ چھوٹی ہے اور کھیل کُود میں اس کی ہمجولی اور سہیلی ہے، سب کی نظروں سے بچ کر اپنا دل بہلاتی ہے ــــ مالک کا نوجوان لڑکا، گیندا کی سہیلی کا بھائی، اس پر بُری نظر رکھتا ہے۔ اور کسی طور بہلا پھُسلا کر اس کی غربت، بے بسی اور بیوگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُسے اپنے شہوانی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے ــــ کہانی آہستہ آہستہ کھُلتی ہے۔

گیندا اور اس کی سہیلی (واحد متکلّم) ایک جھاڑی کے نیچے اپنا مرغوب کھیل "دُلہن دُلہن" کھیلنے لگتی ہیں۔ گیندا دُلہن بنی اپنی بدبُودار سُرخ اوڑھنی کا لمبا سا گھونگٹ نکالے، تڑی مُڑی سی جُھک کر بیٹھ گئی۔ رسم کے مطابق اس کی سہیلی نے اُس کا گھونگٹ اُٹھایا تو گیندا کا گول مٹول چہرہ شرم و حیا سے سُرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنی ہنسی دبائے ہُوئے تھی۔ اب اس کی سہیلی کی دُلہن بننے کی باری تھی کہ اتفاق سے بھیّا آ گئے، اور ہڑبڑا کر گیندا نے گھونگٹ پھینک دیا اور خوف سے سہم کر سمٹ گئی۔ یہ بات ابھی واحد متکلّم کی فہم سے باہر تھی کہ دُلہن دُلہن کا کھیل ہمیشہ دُوسروں کی نظروں سے اوجھل کیوں کھیلا جاتا ہے ــــ اور اگر کھیلتے ہوئے پکڑے جاؤ تو مار کیوں پڑتی ہے ــــ بھیّا آ کر ان کے ساتھ ہی جھاڑی کے نیچے بیٹھ گئے۔ گیندا نے اپنا مختصر سا لہنگا سمیٹا اور بھاگنے لگی۔ لیکن بھیّا نے اُسے بڑی ملائمت سے گھسیٹ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور اس کے بھولے بھولے گال پر پیار سے چٹکی لی ــــ یہ بھیّا کا اپنے مقصد کی تکمیل کی جانب پہلا قدم تھا۔ بظاہر معصوم اور بے خبر مگر بڑے خطرناک نتائج کا حامل۔ مگر گیندا کے پاس اس کا توڑ نہ تھا۔ وہ عورت مرد کے رشتے سے واقف تھی مگر وہ بھیّا اور اس کے گھر والوں کے سامنے بے حیثیت اور بے وقعت تھی۔ اس میں صدائے احتجاج بلند کرنے کا دم نہ تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی ــــ اتنے میں گیندا کو بہو نے آواز دی تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ گھبرا کر اس نے بھیّا سے ہاتھ چھڑایا اور بھاگ گئی ــــ دیکھتے ہی دیکھتے اچھا بھلا کھیل درہم برہم ہو گیا۔ بہن بھیّا سے اُلجھ پڑی۔ بھیّا نے اسے چپ کرانے کے لئے گھُٹی ہوئی آواز میں غصّے سے "بھُتنی" کہا۔ ایک دھپ لگائی اور چل دیئے۔

گیندا کو جب بھی اس کی سہیلی "دُلہن دُلہن" کھیلنے کے لئے کہتی، وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں جواب دیتی کہ وہ تو ودھوا ہے۔ بناؤ سنگار تو پتی کے لئے ہوتا ہے۔ چوڑیاں پتی کے لئے پہنی جاتی ہیں اور سیندور بھی اسی کے لئے لگایا جاتا ہے۔ اس کی سہیلی کو اپنی نادانی اور لاعلمی میں ایسا محسوس ہوا جیسے گیندا اپنے ودھوا ہونے کا ذکر احساسِ تفخر سے کر رہی ہے اور اُسے ہیچ و حقیر سمجھتی ہے۔ تھوڑی سی ذہنی کشمکش کے بعد اس نے گیندا سے پوچھ ہی لیا کہ اگر تم ودھوا ہو تو پھر میں کیا ہوں۔ اُس نے جواب دیا "تم۔۔۔ تم کنیا ہو"۔ اس کی سہیلی کو یوں لگا کہ اس کے جواب میں تضحیک و تحقیر مضمر ہے مگر ایسا نہ تھا کہ اپنی کم سنی کی وجہ سے وہ ایسے معاملات کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

اس بار اس نے کھیل کی تیاری میں پتھر سے اینٹ رگڑ رگڑ کر بہت سا سیندور بنایا مگر گیندا اپنی بات کو ہی بار بار دُہراتی رہی کہ جب پتی ہی مر گیا ہو تو بناؤ سنگھار کیسا؟ اس کی سہیلی نے ڈھیر سارا سیندور اپنی انگلی سے سمیٹتے ہوئے پوچھا تو پھر یہ کس کام آئے گا ــــ گیندا نے اینٹ کے پسے ہوئے سفوف کو یوں دیکھا جیسے فی الواقع ایک ودھوا دیکھتی ہے خالی خالی ویران ویران آنکھوں سے ــــ لیکن اپنی سہیلی کو آزردہ اور دل گرفتہ دیکھ کر وہ جلد ہی پسیج گئی ــــ "تو بھابی سے نہ کہنا۔۔۔ اچھا۔۔۔ آؤ" وہ اس کے نزدیک سرک گئی۔ اور دونوں سنگھار کے لئے تیار ہو گئیں۔ اس نے ایک ماہر مشاطہ کی طرح گیندا کے بکھرے ہوئے بالوں کو پانی سے چپکایا اور اس کی مانگ میں سیندور بھر دیا ــــ گیندا اپنی نظروں میں سہاگن ہو گئی۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا اور لجا شرما کر اُس نے اپنا منہ اوڑھنی میں چھپا لیا اور ہنستے ہنستے لوٹ گئی یہی عمل گیندا نے اپنی سہیلی پر دہرایا اور تھوڑی ہی دیر میں دونوں بناؤ سنگھار کئے، اوڑھنیاں اوڑھے، دُلہنیں بنیں، ساتھ ساتھ بیٹھ گئیں۔ وہ ایک دوسرے کو عروسِ نو کی طرح سجی دھجی، بنی سنوری دیکھ کر پھولی نہ سما رہی تھیں ــــ لڑکیوں کو دُلہن بننے اور گھر بسانے کا کس قدر شوق ہوتا ہے: بچپن ہی سے وہ ریت کے گھروندے سجاتی ہیں۔ گڈے گڑیا کا بیاہ رچاتی ہیں اور فرطِ مسرت سے کھل اٹھتی ہیں۔ گویا یہی ان کا مقصدِ حیات ہو۔

سامنے سے بھیا آتے دکھائی دیئے تو گیندا کا چہرہ فوراً سرخ ہو گیا ــــ عورت مرد کی چال کو، آواز کو، نظر کو، ہر ادا اور ہر انداز کو، قلب و جگر کے نہاں خانوں چھپی خواہش کو کیا خوب پہچانتی ہے۔ وہ اس بات میں کبھی دھوکا نہیں کھاتی۔ مرد کو لب وا کرنے کی حاجت نہیں ہوتی کہ وہ اس کے دل کی کہانی بزبانِ بے زبانی جان جاتی ہے۔ بھیا کو آتے دیکھ کر گیندا کے چہرے کے لال ہو جانے کا یہی جواز تھا ــــ بھیا نے آتے ہی بہن کو ایک طرف دھکیل دیا، جو ایک طرح سے کباب میں ہڈی بنی بیٹھی تھی اور گیندا سے لگ کر بیٹھ گئے۔ وہ شرمانے لگی کہ اس کے لئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا ــــ بھیا نے دانت پیس کر اس کے دونوں گالوں میں چٹکی لی ــــ بھائی کا دانت پیسنا ان کے شدّتِ جذبات کا مظہر تھا۔ گیندا "اوُں اوُں" کرتی سمٹ سمٹا کر رہ گئی۔

"بھیا" انگلی سے سیندور سے کھیلنے لگے۔ اور اپنے پیر سے گیندا کا پیر دبایا "میں تیرے لگاؤں"۔

بھیّا نے سیندور لے کر گیندا کے لگا دیا ـــــ "اوں" اور اس نے ہتھیلی سے سیندور چھٹا دیا۔

"بھیّا گیندا تو ودھوا ہے۔ وہ سیندور کب لگاتی ہے؟" واحد متکلّم نے اپنی قابلیت جتائی۔

"لگائے گی کیسے نہیں چڑیل؟" اور انھوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے دھکیلا۔ اس نے اپنا منہ چھپا لیا۔

"گیندا پھر میں تجھ سے بولوں گا بھی نہیں" اور گیندا نے آخر کو منہ کھول ہی دیا۔

"گیندا" بھیّا نے اس کے قریب سرک کر کہا۔ "بیاہ کرے گی؟"

"ہٹ" وہ اور شرما گئی...

"ہٹ کیسی" بھیّا نے کہنی سے ٹھوکا دے کر کہا "کرے گی بیاہ؟"[1]

بھیّا نہایت بے شرمی اور ڈھٹائی سے اپنی بہن کی موجودگی میں ہی حرفِ مدّعا زبان پر لے آئے۔ وہ ایسی باتوں سے پورے طور پر آگاہ نہ تھی مگر اس قدر انجان بھی نہ تھی۔ یوں تو بھیّا کا گیندا کے دونوں گالوں میں چٹکی لینا، اس سے لگ کر بیٹھ جانا، اس کا پیر اپنے پیر سے دبانا اور مانگ میں سیندور بھرنا ہی ان کے ارادوں کو عریاں کر دیتا ہے ـــــ مگر ان کا بار بار گیندا سے پوچھنا کہ "بیاہ کرے گی" اور اس کے انکار پر بھیّا کا کہنا "ہٹ کیسی" ان کے ارادے کی پختگی اور جذبات کی حدّت و شدّت کو آشکار کرتی ہے ـــــ ظاہر ہے کہ گیندا ایک زخم خوردہ پرندے کی طرح اندر ہی اندر پھڑپھڑاتی اور چھٹپٹاتی ہے مگر زور زبردستی کرنے پر تلے بھیّا کے سامنے اس بیچاری کی کیا بساط تھی۔ وہ ان کے گھر میں ایک حقیر اور ناچیز نوکرانی تھی اور اپنی روزی روٹی کے لئے ان پر اس کا دارومدار تھا۔ زندگی کی بعض حقیقتیں کس قدر تلخ و ترش ہوتی ہیں کہ ان سے مفر ممکن نہیں ہوتا اور مصالحت کرتے ہی بنتی ہے ـــــ یہ حیاتِ انسانی کی بے بسی اور بے چارگی کا بہت بڑا المیہ ہے۔

اُسی لمحہ غصّہ میں بھری بہو گیندا کو آواز دیتے ہوئے کہتی ہے:

"اری رانڈ۔ یہاں بیٹھی ہے۔ چل استری دہکا" وہ غرّائی۔ اُس نے لپک کر اسے جا لیا اور بال پکڑ کر دو جھٹکے دیئے۔ "اور یہ مانگ چوٹی تو نے کیسی کری ہے؟" اس نے دھول مار کر کہا ـــــ میں اور بھیّا تڑپ اُٹھے"[2]

گیندا کی سہیلی اس لئے تڑپ اُٹھی کہ وہ بہو کی گیندا سے بدسلوکی پر ہمیشہ نالاں رہتی تھی۔ بہو کے سامنے تو اس کا بس نہ چلتا تھا لیکن انتقاماً چوری چھپے وہ اس کی کلف میں مٹھی بھر راکھ جھونک دیا کرتی تھی تاکہ اس کے کپڑے خراب ہو جائیں۔

---

[1] [2] عصمت چغتائی، "گیندا"، اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) ص ۷۰-۱۶۹، ۱۷۰

— بھیّا اس لئے تڑپے کہ بہو کے گیندا کو بلانے پر ان کا اس سے پیار و محبت کی بات چیت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بھڑ بھڑ کے گیندا کو مارنے پر وہ ضرور برافروختہ ہوئے ہوں گے کہ وہ گیندا سے دل ہی دل میں قربت محسوس کرنے لگے تھے — انسانی جذبات سیمابی کیفیت کے ہوتے ہیں اور ان کا اُتار چڑھاؤ غیر یقینی حد تک غیر معیّن ہوتا ہے۔

○ جب گیندا کے کہنے پر اس کی سہیلی اس کی پھٹی ہوئی کرتی کا گریبان سونگھتی ہے تو اُسے عطر میں بسا ہوا پاکر حیران رہ جاتی ہے کہ بھیّا نے گیندا کے عطر لگایا جس سے اُن کا کوئی رشتہ ناطہ نہیں۔ اور اس کے نہ لگایا جو ان کی سگی چھوٹی بہن ہے۔ بہت سر مارنے پر بھی وہ اس عقدہ کو حل نہ کر پائی — وہ اسی اُدھیڑ بُن میں لکڑی کو ہودی کے پانی میں زور زور سے گھمانے لگتی ہے — دھیان رہے کہ یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔ اس نوع کے عمل سے توجہ بٹ جاتی ہے اور ذہنی اُلجھن کی شدّت کم ہو جاتی ہے۔ ایسا عمل جو انسان کی توجہ ذہن میں اُتھل پتھل مچانے والے موضوع سے ہٹا کر کسی اور طرف منتقل کر دے سکون بخش ہوتا ہے، بھلے ہی وہ سکون وقتی اور لمحاتی کیوں نہ ہو — عصمت نے اس جز کو افسانے کا جزو بنا کر اس کی خوبصورتی اور معنویت میں اضافہ کیا ہے۔

جاتی ہے

گیندا جب خاموشی سے تولیہ میں لپٹے ہوئے کپڑے بھیّا کے کمرے میں رکھنے جا رہی تھی تو اس کی سہیلی کے دل و دماغ میں تلاطم سا برپا تھا۔ وہ بھی دبے پاؤں اُس کے پیچھے ہولی اور دراز میں سے جھانکنے لگی — گیندا فرش پر بیٹھی کپڑے گن رہی تھی اور بھیّا ذرا دور کھڑے سر کھجا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اُلجھن میں ہیں۔ اور مَن ہی مَن میں کسی پختہ فیصلے پر پہنچنے کی اُدھیڑ بُن میں ہیں۔

> "بہت غلط گن رہی ہے۔" بھیّا نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اس نے ایک نظر بھیّا کو دیکھا اور تیوری پر بل ڈال کر ہنس دی۔ انھوں نے اسے کھینچا تو وہ سکڑ کر دری پر اُوندھے منہ لیٹ گئی اور کسی طرح نہ اُٹھی۔ بھیّا نے اس کی کمر میں جو گدگدی کی تو تڑپ اُٹھی۔ بھیّا جو آگے آئے تو اس نے ایک تھپڑ ان کے گال پر رسید کیا۔"[1]

گیندا کی سہیلی کا خیال تھا کہ یہ تھپڑ گیندا کے لئے ایک طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ کیونکہ بھیّا کے غصّہ سے تو تمام گھر کانپتا تھا کہ وہ سخت اور درشت مزاج تھے۔ لیکن اس کا قیاس غلط نکلا۔ بھیّا دانت کچکچاتے ہوئے آگے بڑھے اور گیندا کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا — اور نہ جانے اس نے کیا دیکھا کہ وہ وہاں سے ہانپتی کانپتی سرپٹ بھاگی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور کانوں میں سائیں سائیں کی آواز گونج رہی تھی — وہ سمجھ نہ سکی کہ کیا ہوا ہے۔ لیکن ایسی تو بے شمار باتیں تھیں جو اس کی فہم سے باہر تھیں۔ وہ جتنا غور و فکر کرتی

---

[1] عصمت چغتائی "گیندا" عصمت چغتائی نمبر۔ اردو ماہنامہ "مکالمات"۔ دہلی ص ۱۷۳

اس کے عقدے اتنے ہی اُلجھتے چلے جاتے۔ نہ جانے وہ سب باتوں کو کیوں آدھا ادھورا ہی سمجھ پاتی تھی۔ اوراس کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچی رہتی تھی۔ اور اُسے ذہنی سکون نصیب نہ ہوتا تھا ـــــ شاید قدرت خود بخود اس پر تمام اسرار و رموز کچھ عرصہ بعد آشکار کر دے گی۔

اتنے میں اس نے دیکھا کہ گیندا ایک کر بر آمدے سے نیچے اُتری۔ اب اس کی جان میں جان آئی کہ اس کی دانست میں گیندا ہی اس کے عقدوں کو حل کرنے کی اہل تھی۔ جب اُس نے گیندا سے تمام واردات کی روداد جاننی چاہی تو اس نے اُسے "کچھ نہیں" کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی۔ اور وہ مکاری سے اِترائی۔ مگر فوراً ہی تنہائی میں بیٹھ کر بہت کچھ بتا بھی دیا۔ عجیب عجیب باتیں، بے سر وپا باتیں، اس کی سوچ سمجھ سے ماورا باتیں ـــــ گویا اس کا تجسس تشنۂ کام ہی رہا کہ گیندا خود ان معاملات کے پیچ وخم اور نشیب و فراز سے بخوبی واقف نہ تھی۔ وہ بارہ تیرہ سال کی بچی تھی اور اس کا علم ابھی سطحی اور فروعی تھا۔ گو مشاہدے کی حد سے گذر کر اسے ذاتی تجربے تک رسائی ہو چکی تھی مگر اس کا شعور پختہ اور مستحکم نہ تھا۔

گیندا کی سہیلی اپنی بڑی بہن کے ساتھ چلی جاتی ہے اور کوئی دو سال بعد جب گیندا چودہ برس کی ہو چکی تھی، واپس لوٹتی ہے تو سارا منظر ہی بدلا ہوا پاتی ہے۔ بیوہ مالی نمونیہ سے مر گیا تھا۔ بھیا کو دہلی بھیج دیا گیا تھا۔ اور گیندا کے بچہ ہوا تھا ـــــ بھیا کو دہلی کیوں بھیج دیا گیا تھا؟ یہ بات جلد ہی اِدھر اُدھر سے ٹکڑوں ٹکڑوں میں سُنی ہوئی باتوں سے واضح ہو جاتی ہے:

"اے ہے بہتری تو اس نے کوشش کی . . . مگر وہ تو . . ." آگے میں نے نہیں سُنا کہ شجاتی (نوکرانی) نے کیا کہا۔

"اے ہے وہ تو مارے ڈالتا تھا۔ بڑی آفتیں اُٹھیں" بیوی نے کہا "میں نے فوراً اُسے دہلی چلتا کیا۔ پڑھنے والا بچہ! یہ نیچ ذات کینیاں شریفوں کو یوُ نہی . . ." اور پھر باوجود سانس روک کے سُننے کے میں آگے نہ سمجھ سکی۔

"وہ تو اگر سرکار کو خبر ہو جاتی تو جانے کیا ہوتا۔ اسی لئے تو میں نے جلدی سے اسے دفعان کیا۔" مجھے بیوی کی آواز پھر سُنائی دی۔"[1]

یہ بھیا کے سیاہ کارناموں اور گیندا کی بپتا کی دو حرفی داستان ہے۔ جو دو ایک شکستہ اور ٹوٹے پھوٹے جملے اس نے سُنے، ان سے اس پر پُورا منظر روشن ہو گیا۔ بھیا کے گھر والوں نے امکانی خدشے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُسے دہلی بھیج دیا تھا تاکہ اس پر کوئی حرف نہ آئے ـــــ ان کی نظروں میں بھیا

---

[1] عصمت چغتائی "گیندا"، عصمت چغتائی نمبر۔ اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی ص ۱۷۳

ایک شریف فارغ البال خاندان کا چشم و چراغ تھا جس پر کمینی، بدذات گیندا یونہی کیچڑ اُچھال رہی تھی ـــــ انھوں نے اس امر کو قطعاً نظر انداز کر دیا کہ بھیا نے ایک معصوم بھولی بھالی بچی کو بہلا پھسلا کر، اس کی غربت اور کس مپرسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، تباہی کے کوئیں میں ڈھکیل دیا ہے اور زندگی بھر کے لئے اس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا ہے۔

صبح دم گیندا کی سہیلی چپکے سے کشاں کشاں اُسے اور اس کے بچّے کو دیکھنے کے لئے نکل گئی ـــــ گیندا نے اپنی جگری سہیلی کو اتنے عرصہ بعد اچانک ہی وارد ہوتے دیکھا تو اس کے چہرے پر خوف اور مسرّت کے ملے جُلے جذبات نمُودار ہو گئے ـــــ اور اس نے دیکھا کہ گیندا سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ نہ جانے وہ کس کرب و عذاب سے گذری تھی اور شاید اب بھی گذر رہی تھی۔" ایک مختصر ترین نیم برہنہ انسان اس کے گھٹنے پر پڑا ہوا اپنا کلھیا سا مُنہ پھاڑ رہا تھا"۔ وہ بچّے کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ چھوٹا سا، پیارا سا، گڈّو بچّہ۔ اس کا جی چاہا کہ گیندا اور بچّے دونوں کو اپنی باہوں میں لے کر سینے سے بھینچ لے۔ پھر نہ جانے اس کی آنکھوں سے آنسو کیوں رواں ہو گئے۔ کیا وہ خوشی کے آنسو تھے یا غم کے یا غم اور خوشی دونوں کے ملے جلے ـــــ انسان کئی بار اپنے ہی باطنی احساسات کو بُجھ نہیں پاتا۔

گیندا نے اُسے سینکڑوں عجیب عجیب باتیں بتائیں۔ کس طرح مہینوں بے رحمی سے اسے زدوکوب کیا گیا۔ کئی باتیں تو خود گیندا کی فہم سے باہر تھیں کہ چودہ پندرہ سال کی الھڑ لڑکی تمام باتوں کو پوری طرح کیسے سمجھ سکتی تھی۔ وہ دونوں "کیوں"، "کیسے" اور "ارے" پر آ کر رُک جاتیں ـــــ اُسے یاد آیا کہ جب بہو کے کالا کلوٹا بچّہ پیدا ہوا تھا تو کیسے خوشی کے شادیانے بجائے گئے تھے۔ اور اُسے کس قدر گھی اور گڑ کھلایا گیا تھا۔ لیکن اب جب گیندا کے گورا چٹّا بچّہ پیدا ہوا تو ہر کسی نے اس سے منہ پھیر لیا۔ بلکہ اُلٹا اس کی خوب پٹائی ہوتی رہی اور اسے فاقہ کشی پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ قضا و قدر کو اُسے زندہ رکھنا منظور تھا اس لئے بچ گئی اور تب اس کا ننھا سا للّو وجود میں آیا۔ بہو ہر وقت اس معصوم کو کوستی رہتی تھی کہ مر جائے تو خلاصی ہو۔ لیکن شفقتِ مادری کے ساتھ گیندا نے ایک کالا ڈورا اس کے پیر میں باندھ دیا تھا تاکہ وہ نظرِ بد سے بچا رہے اور جُگ جُگ جئے ـــــ غریب ماں یُوں بھی اپنے بیٹے کو دعائیں دینے میں بڑی فراخ دل ہوتی ہے کیونکہ اس پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔

گیندا نے قبول کیا کہ اسے للّو، بھیّا اور اس کی سہیلی دُنیا میں سب سے عزیز ہیں۔ بھیّا کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں اپنی پُرانی شوخی اور چمک عود کر آئی اور وہ اس کا ذکر بڑی خوش دلی اور پیار بھرے انداز میں کرتی رہی۔

"وہ اب چھٹیوں میں بھی نہیں آتے ؟۔۔"

"تم انھیں چھٹی لکھو گی۔ کیوں بی بی ؟۔۔"

"اور یہ بھی لکھنا کہ اس کے لئے اب کے لال بنیان لائیں، جیسی بسنتی کا چھورا پہنے ہے۔۔"

"اور ۔ ۔ ۔ یہ کہ ۔ ۔ ۔" اس نے شوق بھری نظروں سے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا " اب کی بار

چھٹیوں میں دو چار دن کے لئے ضرور آنا۔" جیسے وہ کسی سے التجا کر رہی ہو۔ اور ہلکے سے ہنس دی۔ وہ نہ جانے کیا بکتی رہی۔"[1]

یہ بالشت بھر کا بچہ ننھی سی ماں گیندا کے جگر کا ٹکڑا تھا اور اس بچّے کا دینے والا بھیّا بھی اُسے از حد پیارا تھا۔ اس کا ذکر آیا تو اسے چوری چھپے اس کی آغوش میں گذارے ہُوئے شب و روز یاد آ گئے۔ عورت اپنے پیار کو بھُول نہیں سکتی اور گیندا تو اس معاملے میں سادہ ہی نہیں سادہ لوح بھی کہ بھیّا کے گھر والوں نے اس کے ساتھ جو بے رحمانہ اور سفّاکانہ سلوک روا رکھا اس کے تصوّر ہی سے دل کانپ جاتا ہے لیکن گیندا نے اُسے ذہن سے جھٹک دیا ۔۔۔ جب گھر والوں کو یقین ہو گیا کہ اس کے پیٹ میں بھیّا کا بچّہ ہے تو اُسے آئے دن مار پیٹ کی جانے لگی اور فاقہ کشی پر بھی مجبور کیا گیا تاکہ وہ مر جائے تو سب کی جان چھُوٹے کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری ۔۔۔ نہ اس کے بچّہ ہوگا اور نہ بھیّا کے اس سے تعلق کا کوئی پختہ ثبوت موجود رہے گا۔ لیکن وہ بہت سخت جان ثابت ہوئی اور اس پر جو جبر و قہر ٹوٹا اسے وہ سہہ گذری۔ یہ موری کے کیڑے بہت ڈھیٹ اور بے شرم ہوتے ہیں اور آسانی سے نہیں مرتے ۔۔۔ یہ اپنی ذات کے ذات بھی نہیں دیکھتے اور اونچے شریف خاندانوں سے ماتھا لگاتے ہیں ۔۔۔ آپ ہی از راہِ انصاف کہئے کہ کیا یہ درست نہیں ۔۔۔ اور غریب گیندا کی خوش فہمی اور خود فریبی دیکھئے کہ وہ اب بھی خوابوں کی دُنیا میں رہ رہی ہے۔ وہ خواب جو سراب ثابت ہو چکے ہیں، جن کی کوئی جڑ بنیاد ہی نہیں۔ وہ لڑکی اپنی سادہ لوحی میں اب بھی بھیّا کے لئے چشم براہ ہے اور اس کے لئے اس کے جسم و جان ترس گئے ہیں ۔۔۔ بھیّا للّو کا باپ ہے اور للّو سردی میں ٹھٹھر رہا ہے ۔۔۔ گیندا کے ارمان کی سادگی دیکھئے کہ بھیّا آئے تو للّو کے لئے لال بنیائن ضرور لیتا آئے جیسی بسنتی کے چھوٹے نے پہن رکھی ہے ۔۔۔ وہ دانستہ طور پر بھیّا کے کردار کے اس پہلو کو بھُول جاتی ہے کہ اس نے دہلی جا کر اس کی طرف مُڑ کر نہ دیکھا اور نہ خط میں اپنے للّو کا حال پُوچھا۔ یہ ایک مخلص شوہر اور شفیق باپ کا کردار تو نہ تھا ۔۔۔ نہ جانے وہ کب تک یونہی انتظار کرتے کرتے ایک دن حسرت و یاس کے بحرِ بیکراں میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے گُم ہو جائے گی۔

○ عصمت لکھتی ہیں "میری پہلی کہانی "گیندا" تھی مگر چھپی بعد میں"[2] ۔۔۔ یہ کہانی بڑی دردناک اور دل سوز ہے۔ اور جس فنّی صنّاعی سے عصمت نے اسے پیش کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ کہانی اُس المیہ کے باوصف جو اس میں پنہاں ہے بڑے دھیمے انداز میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے۔ کوئی بات بلند بانگ انداز میں یا اُونچے سُروں میں نہیں کہی گئی۔ جیسے دھیمی دھیمی پھوار زمین میں سرایت کرتی چلی جاتی ہے۔ ایسے ہی یہ کہانی دھیمے دھیمے میٹھے میٹھے انداز میں قاری کے قلب و جگر میں اُترتی چلی جاتی ہے ۔۔۔ ختم ہو جانے پر بھی وہ چاہتا ہے کہ کہانی کچھ اور آگے سرکتی تو کیا اچھا ہوتا

---

[1] عصمت چغتائی۔ "گیندا"، اُردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) ص ۱۷۹

[2] عصمت چغتائی۔ "عصمت چغتائی سے ایک پُرکیف ملاقات" جلیل باز یدپوری۔ ماہنامہ "شیرازہ" سری نگر۔ ص ۲۷

— یہ فنکار کی کامرانی کی دلیل ہے

○ عصمت نے اس کہانی میں غربت اور امارت کی تفریق اور تفاوت کو بحسن وخوبی نمایاں کیا ہے۔ بھیا گیندا کا بڑی بے باکی سے استحصال کرتا ہے اور صاف بچ نکلتا ہے۔ اور تمام کنبہ اس کی پشت پر ہے۔ ان کی نظروں میں وہ صاف شفاف کوثر وتسنیم میں دُھلا دُھلایا ہے جبکہ نیچ اور کمینی گیندا غلاظت کی پوٹلی ہے جس نے ایک شریف زادے کو خواہ مخواہ ملوّث کیا۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ اس ایلیے پر کمال ہوشیاری، مکّاری اور فریب کاری سے پردہ پوشی کرتے ہیں اور صاحبِ خانہ (سرکار تک کو اس کو بھنک نہیں پڑنے دیتے اور بڑی چالاکی سے بھیا کو منظر سے ہٹا کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اُدھر گیندا ہے جو آہ بھرنے کی بھی روادار نہیں کہ وہ انہی کے ٹکڑوں پر پل رہی ہے۔ انہی کا دیا کھاتی ہے اور بے سہارا ہے — گویا غربت امارت کے آگے دست بستہ سراپا بندگی بنی کھڑی ہے۔

○ کہانی نہ صرف غریب اور امیر کے تضاد اور تفریق کو نمایاں کرتی ہے بلکہ یہ مرد کی بالادستی اور عورت کی زیردستی کو بھی آشکار کرتی ہے۔ یہ مرد کے سماج پر تسلّط اور عورت کے استحصال اور بے قدری کی کہانی بھی ہے۔ ایسے معاملات میں عورت ہمیشہ طعن وتشنیع کا نشانہ بنتی ہے اور عمر بھر کے لئے ملعون اور مطعون قرار دی جاتی ہے۔ گویا اس کا عورت ہونا ہی اس کے جرم اور گناہ کا جواز بن جاتا ہے۔ وہ دادرسی کے لئے فریاد کرتی رہ جاتی ہے اور بالآخر صبر وشکر کر کے اپنے مقدر پر قانع ہو جاتی ہے — ہمارے معاشرے کا خدا مرد ہے اور عورت ایک جملۂ معترضہ — عصمت اس کہانی کے مرکزی نکتہ کا ذکر یوں کرتی ہیں:

> "اس کہانی کا اصلی نکتہ یہ ہے کہ جب کبھی بھی کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے تو مرد صاف نکل جاتا ہے اور عورت اس طوفان میں گھر جاتی ہے۔ حرام کے بچّے کی ساری لعنت ملامت بے چاری عورت کو ملتی ہے۔ اس عورت کے ذہن پر سماجی برتاؤ کا کتنا غلط اثر پڑتا ہے۔"[1]

○ "گیندا" کی فنّی خوبیاں ہمیں چونکا دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر گیندا جن تجربات سے گزرتی ہے۔ ان سے از راہِ تجسّس اس کی سہیلی بھی گزرنا چاہتی ہے گو وہ صغر سنی کی وجہ سے ان کی صحیح نوعیّت اور ماہیّت سمجھنے سے قاصر ہے — وہ میوہ (مالی) سے کہتی ہے کہ وہ اس کی مانگ میں سیندور بھر دے۔ (ایسے ہی جیسے بھیّا نے اس کی موجودگی میں گیندا کی مانگ میں بھرا تھا) — وہ اس سے پوچھتی ہے کہ "بیاہ کرے گا؟" (ایسے ہی جیسے بھیّا نے بار بار گیندا سے پوچھا تھا) — وہ میوہ کے سامنے اوندھے منہ ریتلی زمین پر لیٹ جاتی ہے اور اس کا تخیّل اُسے یہ احساس عطا کرتا ہے کہ اسے کوئی گدگدی کر کے اُٹھا رہا ہے۔ (ایسے ہی جیسے اُس نے بھیا کو گیندا کو گدگداتے دیکھا تھا) درز میں

---

[1] عصمت چغتائی "عصمت چغتائی سے ایک ملاقات" (انٹرویو) از جلیل بازید پوری۔ ماہنامہ "شیرازہ" سری نگر، جلد ۳، شمارہ ۱۰-۸

سے دیکھا تھا)۔۔۔ مگر اس کا عمل عقلی اور منطقی نہیں، محض تقلیدی ہے تاکہ وہ بھی اس کیفیت سے دوچار ہو جس سے گیندا ہوئی تھی۔ اپنی کم سنی اور کم فہمی میں وہ یہ بات یکسر نظر انداز کر گئی کہ بھیا تو جُست، چالاک، ذہین اور شاطر تھا۔ جبکہ میوہ ایک جاہلِ مطلق ہے۔ پھر بھیا کی ہر روش کے پیچھے گیندا کے جسم تک پہنچنے کا عزم تھا، جبکہ میوہ اس طرح کے جذبات اور احساسات سے بیگانہ اور بے نیاز ہے۔۔۔ بدیں وجہ اس کی سہیلی ناکام اور نامراد رہی۔ وہ ابھی کچّی عمر کی، ناپختہ لڑکی تھی۔ اور جنسی معاملات کو سمجھنے سے قاصر تھی مگر اس کا تجسّس بیدار تھا۔۔۔ فنّی لحاظ سے یہ ایک "ماسٹر اسٹروک" ہے جو اس افسانے کو وقیع اور گرانقدر بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

○ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ اظہارِ مطالب ملٹو کا ہی نہیں عصمت کے فن کا بھی خاصہ ہے۔ اشارے، کنائے اور استعارے کی زبان میں بات کہنا اُن کے فن کا حُسن ہے۔ ابرُو سے ہلکا سا اشارہ کر کے وہ آگے نکل جاتی ہیں اور قاری سر کھُجاتا رہ جاتا ہے۔۔۔ مثال کے طور پر وہ دو لوٹے پھوٹے جملے پھر سے ملاحظہ فرمائیے جن سے بھیّا کی بہن کو پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس کی غیر موجودگی میں کیا کیا گُل کھلائے اور گیندا پر کیا گذری۔۔۔ ان دو آدھے ادھورے جملوں میں ساری کہانی کے المیے کی داستان مضمر ہے۔

○ عصمت کا یہ افسانہ کئی نازک نفسیاتی نکات کا حامل ہے جو اسے عمق عطا کرتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کا موجب ہوتے ہیں۔ مثلاً جب بھو عادتاً گیندا کو بُرا بھلا کہتی ہے اور اس پر ہاتھ بھی اُٹھا دیتی ہے، تو اس کی سہیلی انتقامی جذبات کے تحت خاموشی سے اس کی کلف میں راکھ جھونک دیتی ہے جس سے اُسے ذہنی سکون ملتا ہے۔۔۔ جب میوہ اس کی ہر بات کا جواب نفی میں دیتا ہے تو وہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی مونیا کی ساری قلمیں کھسوٹ ڈالتی ہے۔ اس سے بھی اسے قلبی اطمینان ملتا ہے۔۔۔ اس طرح جب اسے ذہنی الجھن ہوتی ہے اور کوئی عقدہ حل نہیں ہو پاتا تو وہ پانی کی ہودی میں زور زور سے لکڑی گھماتی ہے اور توجہ بٹ جانے سے اُسے چین ملتا ہے۔ اس طرح کے کئی دیگر نفسیاتی جواہر ریزے اس افسانے میں بکھرے پڑے ہیں جو اس کے حسن کو آب و تاب عطا کرتے ہیں۔

○ اس کہانی میں ایک افسانے کے تمام روایتی لوازم موجود ہیں۔ ایک دلچسپ آغاز جو قاری کی تمام تر توجہ سمیٹ لیتا ہے اور وہ بیساختہ افسانہ نگار کی انگلی پکڑے اس کے ساتھ ساتھ پیش رفت کرنے لگتا ہے۔ "جنے یہ جھونپڑی ہے، ہے نا؟" اس مختصر سے جُملے کی جاذبیت قاری کو دائیں بائیں دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ عصمت نے اس جُملے میں ہی گویا کہانی کی "آدھی جنگ" جیت لی ہے۔۔۔ انجام بھی بہت مناسب و موزوں ہے کہ عصمت نے تمام کہانی کو بحُسن و خوبی سمیٹتے ہوئے اسے اپنے منطقی انجام پر پہنچا دیا ہے۔۔۔ آغاز اور انجام کے درمیان جو جزئیات مہیّا کی گئی ہیں وہ بے حد دلچسپ، موزوں اور قابلِ قبول ہیں۔ کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے اور بالآخر تمام کہانی ایک اکائی کی صورت میں اُبھرتی ہے اور بے اختیار متاثر کرتی ہے۔۔۔ دھیان رہے کہ عصمت کی کہانیوں کی جزئیات بامقصد اور بامعنی ہوتی ہیں اور

وہ کہانی کے چوکھٹے سے سرِمُو انحراف نہیں کرتیں اور ازاوّل تا آخر اپنے موضوع سے بے طرح جڑی رہتی ہیں، جو فنی اعتبار سے بہت بڑی بات ہے۔

○ آخر میں ایک بات جو وثوق سے کہی جاسکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ کہانی عصمت کی ذاتی زندگی سے متعلق ہے۔ کہانی کی راوی (گیندا کی سہیلی) عصمت خود ہیں، جو تب کم سن تھیں ــ "بھیا" ان کا بڑا بھائی ہے ــ گیندا ان کی ملازمہ ہے جسے انھوں نے اپنی سرکاری کوٹھی کے احاطہ میں رہائش کے لئے کوٹھری دے رکھی تھی ــ "بیوی" ان کی والدہ ہے جس نے گھر میں آنے والے امکانی "طوفان" کے پیشِ نظر بھیا کو دہلی بھیج دیا تھا ــ "میوہ" ان کا مالی ہے جو ان کی کوٹھی کے باغیچہ کی دیکھ بھال کرتا تھا ــ "سرکار" ان کے والدِ بزرگوار ہیں جن کے خوف سے یہ معاملہ اُن سے مخفی رکھا گیا تھا ــ عصمت کے گھر کے تمام افراد انھیں فی الواقع "سرکار" کے لقب سے ہی خطاب کیا کرتے تھے ــ عصمت نے ایک حقیقی واقعہ کو جس خوبی اور نفاست سے ایک کہانی کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ یہ ان جیسی عظیم افسانہ نگار کا ہی کام تھا۔ خوبی یہ ہے کہ اصل واقعہ کی POIGNANCY کہانی میں بھی در آتی ہے اور یہی عصمت کا فنی کمال ہے۔

جڑیں

"جڑیں" عصمت کا مشہور افسانہ ہے جس کا تعلق تقسیمِ ملک کے فسادات سے ہے ــ تقسیمِ ملک کا دَور ایک طوفانی اور ہیجانی دَور تھا جس نے برِّصغیر کو بُری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہر چیز زیروزبر دکھائی دیتی تھی۔ لاکھوں لوگ جو سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے، اپنے آبائی اور پشتینی گھر بار ترک کر کے، انتہائی بے بسی اور بے سروسامانی کے عالم میں اہل و عیال سمیت ایسے انجانے، اَن دیکھے دُور دراز علاقوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے جو اب ایک دوسرا ملک تھا ــ ملک کے طول و عرض میں قتل و غارت، لوٹ مار، آتش زنی اور عصمت دری کا بازار گرم ہو گیا۔ یہ بربریت اور شیطنت کا کھلا اور ننگا ناچ تھا، جس پر انسانیت نے شرم و حیا سے منہ ڈھانپ لیا ــ ترقی پسند ادیبوں کے لئے فرقہ وارانہ فسادات خاص طور پر اس لئے بھی سوہانِ رُوح تھے کہ انھوں نے ایک ایسی مشترکہ انسانی تہذیب کا خواب بُنا تھا جس میں مذہب کو کوئی برتری حاصل نہ تھی۔ سیاسی نقطۂ نظر سے ان کا مقصد ایک قوم، ایک ملک اور ایک تہذیب و تمدّن تھا۔ وہ تہذیب کو ہندو اور مُسلم خانوں میں بانٹ کر دیکھنے کے قائل نہ تھے۔ بلکہ وہ ہندوؤں اور مُسلمانوں کے صدیوں کے باہمی اشتراکِ عمل، اختلاط اور ارتباط سے بنی "ہندوستانی تہذیب" کے پیرو تھے۔ لیکن اب ملک کی ناقابلِ تنسیخ تقسیم اپنے بھیانک رُوپ میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔ شاعروں، ادیبوں اور مفکروں کا ان جانگداز واقعات سے متاثر ہو کر اپنے جذبات، احساسات اور نظریات کو فن کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا ایک قدرتی امر تھا۔ اس سلسلے میں کرشن چندر کے چھ افسانوں کا مجموعہ "ہم وحشی ہیں"، خواجہ احمد عبّاس کا "سردارجی"، راجندر سنگھ بیدی کا "لاجونتی"، فکر تونسوی کا "چھٹا دریا"، رامانند ساگر کا "اور انسان مر گیا"

ایسی تخلیقات ہیں جو فوراً ذہن میں آتی ہیں۔ اُن کے علاوہ بلونت گارگی اور اوپندر ناتھ اشک نے بھی فسادات پر اپنے قلم کو جنبش دی ــــ پاکستان میں منٹو نے حسبِ معمول روشِ عام سے ہٹ کر اپنا نفسیاتی افسانہ "ٹھنڈا گوشت"، "کھول دو" اور "سیاہ حاشیے" کے افسانچے لکھ کر اپنی انفرادیت قائم رکھی ــــ اس سلسلے میں عصمت نے اپنا مشہور افسانہ "جڑیں" لکھا جس کا یہاں تجزیاتی مُطالعہ پیش ہے۔

آج پندرہ اگست تھا جب ملک کے سیاستدانوں نے مذہب کے نام پر عوام کو اپنی بساط کے مہرے بنا کر ملک کی تقسیم کر ڈالی تھی۔ وہ ایسا نہ کر پاتے اگر سمندر پار سے آئے انگریز جنھوں نے اس ملک میں "پھُوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصُول پر دو سو سال تک حکومت کی تھی، تقسیمِ ملک کی مانگ کرنے والوں کی سرپرستی نہ کرتے اور انھیں درپردہ شہ نہ دیتے۔ گویا جاتے جاتے بھی شاطر انگریز حکمراں اس بدنصیب ملک کو ایک ایسا گہرا گھاؤ دے گئے، جو آج تک رِس رہا ہے اور خُدا جانے کب تک رِستا رہے گا ــــ ملکوں کی تقسیم کے زخم آسانی سے نہیں بھرتے اور بھر بھی جائیں تو اُن کے نشان کبھی مندمل نہیں ہوتے۔

مارواڑ کے ایک فارغ البال مسلم گھرانے کے لوگ اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے اور پاکستان ہجرت کرنے کے خیال سے ہی اُن کی رُوح قبض ہو رہی تھی۔ اُن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ دل دہلے ہوئے تھے اور گھر میں چولھا چھ روز سے ٹھنڈا پڑا تھا ــــ مگر بچے جو کئی روز سے اسکول چھوڑے، گھر بیٹھے اُودھم مچا رہے تھے ان تفکرات سے آزاد معلوم ہوتے تھے کہ انھیں شاید پندرہ اگست کے سانحے کی المناکی اور ہجرت کے امکانی خدشات اور خطرات کا اندازہ نہ تھا۔

سارا شہر بھری بندوق بنا بیٹھا تھا کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔ اقلیتی فرقے کے لوگ گھروں میں دُبکے، سہمے بیٹھے تھے اور باہر گلی کوچوں میں پولیس گشت کر رہی تھی۔ بظاہر سول لائینز کے علاقے میں جہاں وہ رہائش پذیر تھے امن و اماں دکھائی دیتا تھا۔ شہر کے ان علاقوں میں جہاں غریب اور پسماندہ لوگ رہتے تھے دنگائی اور بلوائی اپنا کام کر چکے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب فسادات آہستہ آہستہ سول لائینز کے علاقے کو لپیٹ میں لینے کے لئے پیش رفت کر رہے ہیں ــــ ادھر خستہ حال، بے سر و سامان پناہ گزینوں کا نا مختتم سیلِ رواں اُمڈا چلا آ رہا تھا جس سے حالات تیزی سے بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے کہ ان کی جگر پاش داستانیں اکثریت کے جذبات کو مشتعل کر رہی تھیں اور وہ انتقام پر تلی بیٹھی تھی ــــ مارواڑ کے دونوں فرقوں کے لوگ صدیوں سے اس طرح گھُل مل کر رہ رہے تھے کہ شکل و صُورت اور لباس وغیرہ کے اعتبار سے ان میں امتیاز کرنا چنداں آسان نہ تھا۔ بدیں وجہ ریاست کے اربابِ بست و کُشاد اقلیتی فرقے کے لوگوں کو چُن چُن کر نکالنے سے معذور تھے ــــ اقلیت کے وہ لوگ جن کی شناخت بآسانی ہو سکتی

تھی پہلے ہی خطرے کی بُو پاکر سرحد پار کر گئے تھے ـــــ مسلم عوام کی اکثریت خود کو بے دست و پا پاتی تھی کہ آخر وہ جائیں بھی تو کہاں۔ انھیں سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ بٹوارے کے نتائج کا علم اور نہ ہی گھر بار چھوڑ کر دُور دراز علاقوں میں جانے کے لئے انھیں وسائل مہیا تھے۔ ان حالات میں انھوں نے جہاں کے تہاں پڑے رہنے کو ہی قرینِ مصلحت جانا ـ کچھ ایسے بھی تھے جو روپے کی چار سیر گندم کے لالچ میں بہ عجلت تمام اُس پار چلے تو گئے مگر یہ دیکھ کر اُلٹے پاؤں لوٹ آئے کہ روپیہ کہاں سے لائیں ـــــ واحد متکلم کا خاندان یوُں تو نہ جانے کب سے ہجرت کرنے کا ارادہ کئے ہوئے تھا مگر وقت کا تعین نہ تھا اور یہ معاملہ خدا جانے کب تک یوُنہی التوا میں رہتا کہ ان کے بھائی اجمیر سے آئے تو انھوُں نے ہلچل سی پیدا کر دی اور بار بار سب کو چلنے کی انگیخت کی گو ان کی باتوں پر کسی نے کان نہ دھرے ـــ مگر ایک دن نہ جانے چھبّا میاں کو کیا سوُجھی کہ اُس نے اسکول کی دیوار پر "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لکھ دیا۔ اس پر اُن کے پڑوسی رُوپ چند کے بچّوں نے مشتعل ہو کر "پاکستان" بگاڑ کر "اکھنڈ ہندوستان" کر دیا۔ اور یوُں بیٹھے بٹھائے اتنی سی بات پر اس علاقے میں فساد کی بنُیاد پڑ گئی اور دونوں ایک دوسرے کو تہہ تیغ کرنے پر کمر بستہ ہو گئے۔ اور امنِ عامہ میں خلل پڑنے کا خدشہ اُٹھ کھڑا ہوُا۔ نتیجہ یہ کہ پولیس کو دخل اندازی کرنی پڑی اور حالات پر قابو پا لیا گیا۔

رُوپ چند ابّا میاں کے پڑوسی ہی نہیں، دوست، ڈاکٹر اور ہم نشین بھی تھے۔ دونوں خاندانوں کی تین پیڑھیاں باہم شیر و شکر تھیں۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ملک کی تقسیم ان کی محبت میں دراڑ پیدا کر دے گی اور ان کے مراسم دیکھتے ہی دیکھتے بگڑ جائیں گے۔ حالانکہ دونوں خاندانوں میں مسلم لیگی، کانگریسی اور مہاسبھائی موجوُد تھے۔ مذہبی اور سیاسی معاملات پر بھی پُر جوش مباحث ہوتے رہتے تھے مگر دلوں میں رنجش اور کدورت نہ تھی۔ بغض اور عناد نہ تھا۔ ایک دوسرے کے تئیں پُرخلوص، بے لوث محبّت کے جذبات موجزن رہتے تھے۔ ابّا میاں اور ڈاکٹر صاحب دونوں کانگریسی تھے۔ بڑے بھائی مُسلم لیگی تھے تو چھوٹے بھائی اشتراکی۔ ادھر گیان چند مہاسبھائی تھے تو گلاب چند سوشلسٹ۔ گویا دونوں خاندانوں میں ہر قسم کے سیاسی عقائد کے قائل موجود تھے۔ مگر ان کے سیاسی نظریات کا سایہ کبھی ان کے ذاتی تعلّقات پر نہ پڑا تھا ـــ اور سب کے بیوی بچّے بھی اپنے اپنے مقام پر ان کے نظریات کے تھے ـــ جب بحث میں حدّت اور شدّت در آتی تو بالعموم کانگریس کا پلّہ بھاری رہتا۔ مُسلم لیگی اور مہاسبھائی باہم مل کر کانگریس پر پل پڑتے مگر یوُں وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے ـــــ مگر یہ تب کی بات ہے جب حالات معمُول پر تھے اور بٹوارے اور ہجرت کے طبل کی آواز ابھی سُنائی نہیں دی تھی۔

اور پھر حالات تیزی سے غیر متوقع طور پر ناخوشگوار موڑ لینے لگے۔ اِدھر مسلم لیگ کا زور بڑھنے لگا تو اُدھر مہاسبھا کی سرگرمیاں بھی تیز ہو گئیں۔ ابّا میاں کے بیٹے پوتے نیشنل گارڈ کی طرح تن کر کھڑے ہو گئے اُن کے

مقابل گیان چند کی قیادت میں سیوک سنگھ کا مختصر سا دَل بن گیا۔ مگر پھر بھی ان کے دلوں میں میل نہ آیا۔ امن، صلح و آشتی کا ماحول برقرار رہا۔ سیاسی نظریات اور مذہبی عقائد اپنی جگہ تھے اور آپسی نجی تعلقات کو ان پر برتری حاصل تھی۔ ملاحظہ ہو:

"اپنے للو کی شادی تو منی ہی سے کروں گا۔" مہا سبھائی گیان چند منی کے لیگی باپ سے کہتے۔

"سونے کی پازیب لاؤں گا۔"

"یار ملمع کی نہ ٹھونک دینا۔" یعنی بڑے بھائی گیان چند کی ساہوکاری پر حملہ کرتے ہیں۔[1]

غور فرمائیے کہ اس چہل میں کتنا پیار، کتنی اپنائیت اور کتنی انسیت جھلکی پڑتی ہے۔ یہی باہمی یگانگت اور رواداری کا احساس تھا جس نے صدیوں میں ایک مشترکہ تہذیب کا تانا بانا بُنا تھا اور نہ جانے کتنے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد ایک مربوط اور منظم ہندوستانی تہذیب نے جنم لیا تھا۔

دو گھرانوں میں اماں اور رچا چی ہی تھیں جو سیاسی معاملات کی بحثا بحثی سے کوسوں دُور رہیں۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھی آپس میں مرچ مصالحوں کی باتیں کرتیں بیٹیوں کے جہیز کا ذکر چھیڑتیں اور ان کی بہوئیں ایک دوسرے کے فیشن چُرانے کی تاک میں رہتیں۔ اماں ڈاکٹر صاحب کے ہاں سے نہ صرف نمک مرچ بلکہ دوائیاں بھی منگواتی رہتیں۔ کسی کو چھینک بھی آتی تو وہ دوائی لینے ڈاکٹر صاحب کے پاس دوڑتا اور جب کوئی بیمار ہوتا تو ڈاکٹر صاحب خود دوڑتے آتے۔ اماں تب دال بھری روٹی یا دہی بڑے بنوانے شروع کر دیتیں اور ڈاکٹر صاحب کو کہلوا دیتیں کہ کھانا ہو تو آجائیے۔ یہ ایک طرح سے بخاطر خوش دلی سے ڈاکٹر صاحب کی فیس ادا کرنے کا خوبصورت بہانہ تھا۔

"اب ڈاکٹر صاحب اپنے پوتوں کا ہاتھ پکڑے آپہنچتے۔

چلتے وقت بیوی کہتیں "کھانا نہ کھانا۔ سُنا!"

"ہوں، تو پھر فیس کیسے وصول کروں۔ دیکھو جی لالہ اور چُنی کو بھیج دینا۔"

"ہائے رام تمھیں تو لاج بھی نہیں آتی۔" چاچی بڑبڑاتیں۔[2]

مگر ان ہمسایانہ، برادرانہ، خواہرانہ تعلقات کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ جب دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر پر فسادات کی مسموم فضا چھانے لگی۔ جب اخلاقی اور روحانی قدریں مٹنے لگیں۔ جب انسان تہذیب و تمدن کا لبادہ، جو اس نے ہزاروں لاکھوں سالوں میں بُنا تھا، اُتار پھینک اپنی جبلی بربریت اور بہیمیت پر اُتر آیا اور جب ماں بہنوں کے

---

[1][2] عصمت چغتائی "جڑیں" سہ ماہی "ذہن جدید" (فسادات کے افسانے) نئی دہلی (دسمبر ۹۳ء تا فروری ۹۴ء) ص ۵۷

تقدس کا تصور خواب وخیال ہو کر رہ گیا، تو پشتوں میں اُستوار ہوئے سب رشتے ناتے چرمرا کر رہ گئے ___ آج جب چھبّا میاں لڑکر آیا تو گھر والوں نے اس کی خاطر مدارات یوں گرمجوشی اور تپاک سے کی جیسے کوئی مردِ مجاہد میدان جنگ میں فتح یاب ہو کر لوٹا ہو۔ عام حالات میں چھبّا ڈاکٹر صاحب کے خاندان کے کسی فرد سے لڑ جھگڑ کر آتا تو مار مار کر اس کا بُھرکس نکال دیا جاتا، مگر آج وہ مردِ غازی تھا۔ اسلام کا ہیرو۔ اپنے مذہب کا پاسبان اور نگہبان ___ ہر کوئی آج رطب اللسان تھا اور اگر کسی کے لبوں پر مہرِ سکوت ثبت تھی تو وہ اماں تھیں۔ درحقیقت جب ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ترنگا اور آبا میاں کے گھر پر لیگ کا جھنڈا لہرانے لگا تھا، جبھی سے اماں کی زبان پر تالا لگ گیا تھا۔ اور ان جھنڈوں نے دونوں خاندانوں کے درمیان ذہنی طور پر ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل کر دی تھی۔ اماں غمگین آنکھوں اور بھرے دل سے اس منظر کو دیکھتیں تو لرز جاتیں ___ اور جب بڑی بہو کے میکے والے بہاول پور سے اپنا مال اسباب لُٹا کر اور جانِ عزیز بچا کر آئے تو خلیج اور وسیع ہو گئی ___ اور پھر جب راولپنڈی سے نرملا کی سسرال والے نیم جان حالت میں پہنچے تو معاملہ مزید دگرگوں ہو گیا ___ اور جب چھوٹی بھابی نے اپنے بچے کو پیٹ دکھانے کے لئے ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجا اور شیلا نے نوکر کو دھتکار دیا تو وہ اُونٹ کی پیٹھ پر روایتی آخری تنکا ثابت ہوا ___ کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔ کسی نے بحث مباحثہ نہ کیا اور سب نے سر جھکا کر حالات سے سمجھوتا کر لیا اور بڑی بھابی اپنے ہسٹریائی دَوروں کو بھُول کر اسباب باندھنے میں جُٹ گئیں۔ جب دیکھا دیکھی سب سامان باندھ کر رُخصت ہونے کے لئے تیار ہو گئے تو خلافِ توقع اماں نے ان کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا کہ میں تو یہیں جیوں مروں گی کہیں اور میرا ٹھکانہ نہیں۔ تم جاؤ۔ اللہ تمہارا نگہبان ___ اور یہ بات انھوں نے اس قدر تیقن اور پُراعتماد انداز میں کہی کہ سب کے دل دھک سے ہو گئے ___ اور وہ ہزار منتوں سماجتوں کے باوجود ٹس سے مس نہ ہوئیں ___ اور اماں اتنے بڑے اُجاڑ، ویران، بھائیں بھائیں کرتے گھر میں تنہا رہ گئیں۔

سامنے کھڑے رُوپ چند اپنے گھر سے یہ دردناک منظر خاموشی سے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے مگر دَم نہ مار سکے۔ وہ اپنے برآمدے میں زور زور سے ٹہل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں اور ان کے دل و دماغ میں ایک طوفان سا مچا ہوا ہے۔ کوئی خیال ہے جو انھیں رہ رہ کر جھنجھوڑ رہا ہے۔ کچوکے دے رہا ہے ___ اور وہ وارفتگی کے عالم میں گالیاں دے رہے تھے۔ اس کو، اُس کو، ہر کسی کو، اپنے آپ کو بھی۔ اور سڑک کے اس پار سامنے والے مکان کو بھی جس کے مکیں رُخصت ہو چکے تھے اور جو اُداس کھڑا اُن کا منہ چڑا رہا تھا، تمسخر اُڑا رہا تھا۔ شاید دل ہی دل میں وہ اس صورتِ حال کے لئے خود کو بھی ذمہ دار گردان رہے تھے ___ انسان کا ضمیر خود جب اپنے مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے تو اس کا کرب و عذاب بڑا گھناؤنا اور ناقابلِ برداشت ہوتا ہے ___ رُوپ چند کسی خیال کو اپنے مضطرب ذہن سے جھٹک دینا چاہتے تھے۔ اپنے متلاطم دل سے نکال باہر

کرنا چاہتے تھے مگر تلملا کر رہ جاتے تھے ــــ آخر بہت کشمکش کے بعد وہ نڈھال ہو کر پُرسکون سے ہو گئے۔ انھوں نے اپنی موٹر باہر نکالی اور چل دیئے۔

دوسرے دن صبح اماّں ابھی نیم بیداری کی حالت میں ہی تھیں کہ انھیں دُور کہیں ایک مدّھم سی، مبہم سی آواز سُنائی دی جو شاید ان کے بڑے بیٹے کی تھی یا چھوٹے کی یا شاید منجھلے کی یا ان سب کی۔ انھوں نے دیکھا کہ وُہ بھی ان کے پاس کھڑے ہیں۔ اپنی اپنی بہوؤں اور بچّوں سمیت ــــ یکایک اندھیرا چھٹ گیا اور چراغ جل اُٹھے۔ اماّں فرطِ مسرت سے کھل اٹھیں اور مادرانہ محبّت نے ان کی رُوح تک کو سیراب کر دیا ــــ اماّں پوُرے طور پر بیدار ہُوئیں تو ان کی نبض پر جانی پہچانی، دیکھی بھالی اُنگلیاں رینگ رہی تھیں۔ رُوپ چند کہہ رہے تھے:

"ارے بھابی آج تو فیس دلوادو۔ دیکھو تمھارے نالائق لڑکوں کو لونی جنکشن سے پکڑ کر لایا ہوُں۔ بھاگے جاتے تھے بدمعاش کہیں کے۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ کا بھی اعتبار نہیں کرتے تھے"[1]

اماّں کے عمر رسیدہ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوُئی۔ اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پھر اظہارِ تشکّر اور ممنونیت کے دو گرم گرم آنسو لڑھک کر رُوپ چند کے شکن زدہ ہاتھ پر گر پڑے۔

اس افسانے میں اماں اور رُوپ چند کا کردار یکساں اہمیّت کا حامل ہے اور ان میں سے کسی ایک کو مرکزی کردار کہنا چنداں آسان نہ ہوگا کہ افسانے کی تشکیل، تعمیر اور تکمیل میں دونوں کا حصّہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے اور افسانہ ان دونوں کے محور کے گرد گھُومتا دکھائی دیتا ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے کردار کو بالیدگی اور استحکام عطا کرتے ہیں ــــ مگر ان میں سے کسی ایک کو بطور مرکزی کردار چُننا ہی ہو تو ہمارا انتخاب اماّں ہوگی کہ فاضل فنکارہ نے خود اس افسانے کا عنوان اماّں کے کردار سے منسُوب کیا ہے۔ اگر اماّں اپنی جڑوں سے نہ جُڑی رہتیں تو یہ افسانہ معرضِ وجود میں ہی نہ آتا ــــ مگر یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ اگر رُوپ چند افسانے کے اختتامیہ حصّے میں لڑکوں اور ان کے بیوی بچّوں کو واپس لے کر نہ آتے تو شاید افسانہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا اور نہ خود اماّں کا کردار اُبھرتا، نکھرتا ــــ آئیے دونوں کے کردار پر ذرا گہرائی سے نظر ڈالیں۔

رُوپ چند کا کردار بے اختیار دل کو چھُو لیتا ہے۔ اماّں اُن سے پردہ کرتی ہیں مگر پردے کے پیچھے سے وہ سب باتیں کہہ سُن لیتی ہیں جو رُو برو ہوتی ہیں۔ ایسا معُلوم ہوتا ہے کہ دونوں خاندانوں کے درمیان مذہب کی دیوار حائل ہی نہیں کہ وہ سب بے تعصّب اور ذہنی محفوُظات سے پاک ہیں۔ ایک دوسرے سے یوُں بلا تکلّف گھُل مل کر رہتے ہیں جیسے وہ سب ایک ہی کُنبے کے افراد ہوں ــــ ایسی خوشگوار، حیات افزا

---

[1] عصمت چغتائی۔ "جڑیں" "فسادات کے افسانے" سہ ماہی "ذہنِ جدید" نئی دہلی (دسمبر ۹۳ء تا فروری ۹۴ء) ص ۶۱

فضاحیاتِ ارضی کی سختیوں کو کتنا آسان بنا دیتی ہے۔

روپ چند بہت مہذب، شائستہ اور سلجھے ہوئے دل و دماغ کے مالک ہیں۔ وہ بہت نرم خو، فرض شناس اور دوسروں کے دکھ درد میں ہاتھ بٹانے والے ہیں۔ ان کا کردار بے لوث، پُرخلوص اور پُر تپاک ہے کہ اس میں انسان دوستی کی نرم نرم آنچ ہے۔ پھر اُن میں حسِ مزاح بھی بدرجہ اتم موجود ہے، جو بے اختیار سُننے والے کے لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرتی ہے ــــ اماں سے اُن کی چہل چلتی ہی رہتی ہے اور اماں بھی ان سے پُرخلوص اور پیار بھرے انداز میں باتیں کرتی ہیں جن سے خواہرانہ محبت جھلکتی محسوس ہوتی ہے ــــ گھر میں کوئی بیمار ہوتا اور ڈاکٹر صاحب آتے تو پورا خاندان اکٹھا ہو جاتا۔ کسی کے پیٹ میں درد ہے، تو کسی کو پھنسیاں نکلی ہوئی ہیں تو کسی کو نزلہ زکام ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب ابا میاں سے خوش دلی سے کہتے:

"کیا مصیبت ہے ڈپٹی صاحب! ایک آدھ کو زہر دے دوں گا۔ کیا مجھے سلوتری سمجھا ہے کہ دُنیا بھر کے جانور ٹوٹ پڑے۔" وہ مریضوں کو دیکھتے جاتے اور بڑبڑاتے۔[1]

اور گھر میں کسی نئے "بچے" کی آمد کی اطلاع ہوتی تو اُن کے مُنہ سے پیار بھری گالیاں جھڑتیں:

"ہونہہ! مُفت کا ڈاکٹر ہے۔ پیدا کئے جاؤ۔ کمبخت کے سینے پر کودوں دلنے کے لئے۔"[2]

مگر اِدھر دردِ زہ شروع ہوتا، اُدھر وہ بے قراری میں اپنے برآمدے سے ابا میاں کے برآمدے کے چکر کاٹنے لگتے اور اپنی چیخ پکار سے سب کو بوکھلا دیتے۔ اور بننے والے باپ کو آتے جاتے چپتیں رسید کرتے اور اس کی حماقت پر لتاڑتے، پھٹکارتے ــــ یہ اُن کا خاص انداز تھا ــــ مگر اُدھر بچے کے رونے کی پہلی آواز ان کے کان میں پہنچتی، وہ اپنے برآمدے سے ابا کے برآمدے میں اور وہاں سے سیدھے زچہ کے کمرے میں آجاتے۔ پردہ نشین عورتیں اس "مداخلت بے جا" پر بوکھلا کر انھیں کوستی وہاں سے ہٹ جاتیں۔ ڈاکٹر صاحب زچہ کی نبض دیکھ کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہتے "واہ میری شیرنی" اور بچے کی نال کاٹ کر اسے نہلانا شروع کر دیتے۔

اماں کبھی بیمار ہوتیں تو روپ چند کے سامنے پردہ ترک کرنے کے خیال سے ہی لرز جاتیں۔ نسوانی شرم و حیا اور سماجی رسوم و قیود ان پر غالب آجاتے اور وہ کہتیں "نا بھئی میں اس مسخرے سے علاج نہیں کراؤں گی۔" مگر گھر کے ڈاکٹر کو چھوڑ کر کون دُور کے علاقے سے کسی کو بلانے جاتا۔ ڈاکٹر صاحب سُنتے تو کشاں کشاں چلے آتے اور اماں سے ازراہِ مذاق کہتے "اکیلی اکیلی پلاؤ زردہ اڑاؤ گی تو آپ بیمار پڑو گی" ــــ اور اماں جو لوگوں بہت کم گو تھیں، اسی انداز میں ذرا بھنا کر کہتیں "جیسے تم کھاؤ ہو ویسے ہی اوروں کو سمجھتے ہو" ــــ غور کیجئے اس جواب میں کتنی

---

[1] [2] عصمت چغتائی "جڑیں" "فسادات کے افسانے" سماہی "ذہنِ جدید" نئی دہلی (دسمبر ۹۳، تا فروری ۱۹۹۴ء) ص ۵۷

اُنسیت، کتنی اپنائیت تھی ـــــ پھر ڈاکٹر صاحب خوش دلی سے چہکتے ـــــ "ارے یہ بیماری تو بہانہ ہے۔ بھائی تم ویسے ہی کہلوا دیا کرو، میں آجایا کروں گا۔ یہ ڈھونگ کاہے کو رچاتی ہو"۔ اور اماں ناراض ہو کر نبض دکھانے کے لئے بڑھایا ہوا ہاتھ کھینچ لیتیں۔ اور انھیں اس شوخ سے مذاق پر کھری کھوٹی سُناتیں۔ ابا جان پاس کھڑے سُنتے تو مُسکرا کر رہ جاتے ـــــ ان چہلوں میں، اس خوش مذاقی میں، کس قدر محبت مترشح ہے۔ اس سے ان کی رُوح کو کتنی بالیدگی اور آسُودگی ملتی ہوگی۔ کتنی مذہب اور تعصب کی دیواریں ڈھ جاتی ہوں گی۔ ایک دوسرے کے تئیں کس قدر بھروسے اور اعتماد کا احساس جاگ اُٹھتا ہوگا اور وہ ذہنی اور قلبی طور پر ایک دُوسرے کے کس قدر قریب آجاتے ہوں گے۔

ابا میاں پر فالج گرتا ہے اور رُوپ چند کے ساتھ اور بھی کئی ڈاکٹران کے علاج معالجے میں جُٹ جاتے ہیں۔ مگر جو دو افراد شبانہ روز ان کی تیمارداری اور خدمت گذاری کرتے ہیں وہ اماں اور ڈاکٹر صاحب ہیں۔ وہ اُن کی نگہداشت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ مگر قضا و قدر کو ان کی صحت یابی منظور نہ تھی اور وہ چل بسے۔ اس پر رُوپ چند کو اپنے آپ پر کچھ زیادہ ہی ذمّہ داری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ بہت سے کام جو ابا زندہ ہوتے تو کرتے، اب وہ ان کی جگہ اپنا فرض سمجھ کر کرنے لگتے ہیں۔ اب وہ اپنے مرحوم دوست کے کُنبے کے سرپرست مشیر اور معتمد ہیں۔ گھر کا کوئی کام ان سے صلاح مشورہ کئے بغیر نہیں ہوتا۔ بچّوں کی فیس معاف کرانا، لڑکیوں بالیوں کے جہیز کی تیاری کرنا اور بیسیوں چھوٹے بڑے کام وہ مرحوم کے تئیں مقدس فریضہ سمجھ کر سرانجام دیتے۔ ـــــ گویا جہاں تک ہو سکا انھوں نے مرحوم کے کُنبے کو احساس ہی نہ ہونے دیا کہ وُہ بے یار و مددگار ہیں کہ وہ خود ان کا سہارا اور ممد و معاون بن گئے۔ خود ان کے پاسبان اور نگہبان بن گئے ـــــ ایسا انسان دوست، انسانیت پرست، بے لوث شخص کس قدر پاکیزہ رُوح اور فرشتہ خصلت ہوگا۔

○ اماں پیار اور محبت کا سرچشمہ ہیں۔ کم گو ضرور ہیں مگر کم فہم نہیں۔ وہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات پر نظر رکھتے ہوئے ہیں۔ وہ سب کی سُنتی ہیں مگر اپنی رائے کا اظہار کم ہی کرتی ہیں۔ مگر جب لب وا کرتی ہیں تو اپنے مخصُوص انداز میں بڑے پتے کی بات کہتی ہیں کہ ان کی ہر بات سوچی سمجھی، سُوجھی بُوجھی ہوتی ہے ـــــ اماں پُرانی اخلاقی اور رُوحانی اقدار کی بیرد ہیں۔ ابا میاں اور بچّوں پر جان چھڑکتی ہیں۔ ابا میاں کی بیماری میں ان کی تیمارداری اور نگہداشت میں دن رات ایک کر دیتی ہیں ـــــ اپنے مذہبی عقائد کے مطابق رُوپ چند سے پردے کے پیچھے سے ہی بات کرتی ہیں۔ رُوپ چند ازراہِ مذاق کوئی جملہ کستے ہیں تو وہ بھی چستی اور حاضر دماغی سے اس کا موزوں جواب دیتی ہیں ـــــ ہجرت کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ وطنِ عزیز چھوڑ کر، "دیارِ غیر" کو جانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ گھر کے سب افراد انھیں ساتھ چلنے پر اصرار کرتے ہیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ گویا وہ گھر کی چار دیواری میں پسِ پردہ رہتی ہوئی بھی بڑی

با شعور، ہوشیار اور پُر اعتماد ہیں۔

اماں جب اپنے کُنبے کے تمام افراد کے چلے جانے پر، اُجاڑ اور ویران گھر میں تنہا رہ جاتی ہیں تو تنہائی اور اُداسی انھیں ڈسنے لگتی ہے۔ در و دیوار کھانے کو دوڑتے ہیں۔ ماضی کی یادیں اُمڈ گھمڈ کر انھیں گھیر لیتی ہیں۔ اور وہ ان کی یلغار میں یوں کھو جاتی ہیں جیسے ایک بچّہ بھیڑ بھاڑ میں کھو جاتا ہے۔ یہ یادیں کتنی سہانی اور دل خوش کُن تھیں اور ساتھ ہی کتنی دُکھ بھری اور اذیت ناک بھی۔ یادیں ایسی ہی کھٹی میٹھی ہوتی ہیں، شیریں اور کڑوی کسیلی بھی۔ اور انہی کے امتزاج سے زندگی عبارت ہے۔ اماں کے ذہن کے پردے پر ایک ایک گذرا ہوا واقعہ آنکھیں ملتا ہوا بیدار ہو جاتا ہے — ان کے سامنے وہ کمرہ تھا جہاں ابا میاں نے ان کے خوبصورت معصوم چہرے پر سے پہلی بار گھونگھٹ اُٹھایا تھا اور قضا و قدر نے انھیں عمر بھر کے لئے اُن کے دامن سے باندھ دیا تھا — اِس بازو والے کمرے میں انھوں نے یکے بعد دیگرے دس بچّوں کو جنم دیا تھا، جن کے نال اب بھی وہیں زمین میں گڑے تھے۔ اور آج وہ تمام اُس بد نصیب کوکھ کو اکیلا چھوڑ کر امن اور سکون کی تلاش میں ایک دُور دراز انجانے، اَن دیکھے مُلک کو چلے گئے تھے — اور یہ وہ کمرہ ہے جہاں اُن کے رفیقِ حیات نے پچاس سال کی رفاقت کے بعد اُن سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لیا تھا — اور یہیں اس دروازے کے باہر ان کی کفن میں لپٹی ہوئی میّت رکھّی تھی اور سارا کُنبہ حرمان و یاس میں ڈوبا اس کے گرد سرنگوں کھڑا تھا — اور یہاں میّت کے سرہانے دس برس تک اُن کے بوڑھے رعشہ زدہ ہاتھوں نے چراغ جلایا تھا — اور آج وہ چراغ بُجھ چکا تھا اور شاید اب وہ کبھی روشن نہ ہوگا — اماں کی کتابِ زندگی کا ورق ورق اُن کے سامنے کھلتا چلا جاتا ہے اور ان کے قلب و ذہن کو ہلا دیتا ہے۔ جہاں وہ ماضی کی راکھ کو کُرید تی ہیں، وہیں وہ اپنے مستقبل پر بھی نظر ڈالتی ہیں تو وہ انھیں تیرہ و تار دکھائی دیتا ہے۔

اماں کی اپنے بچّوں اور اُن کی بہوؤں کے تئیں محبّت اور شفقت اُن کے کردار سے چھلکی پڑتی ہے جب تمام لوگ گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو انھیں یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ نہ جانے وہ اس بد نظمی اور افرا تفری کے دَور میں کس حال میں ہوں گے۔ ان کی بہوؤں کی عصمت و عفّت کی حفاظت کون کرے گا؟ ایک بہو پر جس کے بچّہ ہونے والا تھا نہ جانے سفر میں، بے سرو سامانی کی حالت میں، کیا گذرے گی؟ کیا ان کے کوکھ جنوں کو اپنے نئے ملک کی سرزمین راس آئے گی؟ اور کیا ان کے قدم وہاں جم پائیں گے؟ اگر نہیں تو کیا وہ اپنے کھونٹے پر واپس لوٹ آئیں گے؟ اور اگر وہ فی الواقع آ گئے تو کیا ان کی کٹی ہوئی جڑیں پھر سے بحال ہو پائیں گی؟ یہ اور کئی اور سوال رہ رہ کر انھیں کچوکے دیتے ہیں مگر انھیں ان کا کوئی معقول اور تسلّی بخش جواب نہیں ملتا اور وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی ہیں کہ وہ ایک حسّاس، نیک خو، دردمند ماں ہیں۔

○ جب تمام کُنبہ روانہ ہونے لگتا ہے اور اماں اُن کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیتی ہیں تو ان کے عزم کے سامنے گھر والوں کے سب دلائل بے معنی اور بے حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے موقف کا اظہار کمال مضبوطی اور خود اعتمادی سے کرتی ہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اکیلے رہ کر ان کی گذر بسر آسان نہ ہوگی، مگر وہ ہر صعوبت جھیلنے کو تیار ہیں، گھر چھوڑنے کو تیار نہیں۔ جس دھرتی سے ان کی نمود و نمو ہوئی ہے وہ دھرتی انھیں جان سے زیادہ عزیز ہے اور اس سے جُدائی انھیں کسی صورت گوارا نہیں ــــ اماں سے جو کلیجے پر پتھر رکھ کر خاموشی سے صورتِ حال کو دیکھ رہی تھیں، جب رہا نہ گیا تو انھوں نے لب وا کئے:

"میرے ٹرنک کو ہاتھ نہ لگانا" اماں کی زبان آخر کو کھلی اور سب ہکا بکا رہ گئے۔

"کیا آپ نہیں جائیں گی؟" بڑے بھیا تُرشی سے بولے۔

"نوج موئی میں سندھوں میں سرنے جاؤں۔ اللہ ماریاں۔ بڑے پاجامے پھڑکاتی پھرے ہیں۔"

"تو راولپنڈی چلو زبیدہ کے یہاں۔" خالہ بولیں۔

"توبہ میری۔ اللہ پاک پنجابیوں کے ہاتھوں کسی کی مٹی پلید نہ کرائے۔ مٹ گئی دوزخیوں کی تو زبان بولے ہیں۔"

آج میری کم سخن ماں پٹاپٹ بولیں[1]۔

اس بڑھاپے میں جب اُن کے سر سے شوہر کا سایہ اُٹھ چکا تھا اور وہ بے سہارا سی رہ گئی تھیں، اماں کی ثابت قدمی اور مُستقل مزاجی قابلِ داد تھی۔ اُنھیں یقین تھا کہ انھیں اپنی دھرتی سے جُڑے رہنا چاہیئے اور جہاں ان کی جڑیں ہیں وہیں ان کا وطن ہوگا ــــ نیشنل گارڈ کے سردار علی نے اُنھیں کہا کہ ہندوستان میں رہ کر وہ کٹ مریں گی مگر انھوں نے کہا کہ زندگی کے آخری ایام میں، میں کہاں دوسرے ملک میں در در کی ٹھوکریں کھاتی پھروں گی میرا یہیں ٹھکانہ ہے تم لوگ جاؤ ــــ رخصت ہونے سے پیشتر منجھلے بیٹے نے بھی سرگوشی کے انداز میں کہا کہ اماں تو سٹھیا گئی ہیں اور انھوں نے ذہنی توازن کھو دیا ہے۔ یہ نہیں جانتیں کہ کافروں نے ہمارے لوگوں پر کیا ظلم ڈھائے ہیں۔ "اپنا ملک ہوگا تو جان و مال کا اطمینان رہے گا" ــــ اماں کم گو تھیں تیز زبان ہوتیں تو ضرور کہتیں کہ اپنا وطن کس شے کا نام ہے؟ جس دیش میں ہم چغتائی صدیوں سے رہتے آئے ہیں جب وُہی اپنا نہ ہُوا تو وُہ دیس اپنا کیسے ہو جائے گا جس میں جا کر وہ چار دن کے لئے بس جائیں گے اور پھر یہ کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ وہ وہاں سے بھی نکال باہر نہ کئے جائیں گے۔ "وطن نہ ہُوا پیر کی جُوتی ہو گئی۔ ذرا تنگ ہوئی، پھینکی، دوسری لے لی۔"

---

[1] عصمت چغتائی۔ "جڑیں"۔ "فسادات کے افسانے"۔ سہ ماہی "ذہنِ جدید"۔ نئی دہلی (دسمبر ۹۳ء تا فروری ۱۹۹۴ء) ص ۵۸

عصمت لکھتی ہیں:

"سر آنے پیر گئے۔ مگر اماں جگہ پر ایسے جمی رہیں جیسے بڑ کے پیڑ کی جڑ، آندھی طوفان میں کھڑی رہتی ہے"۔

اور یہ اماں ہی نہیں خود عصمت بھی تھیں جو تقسیمِ ملک کے فرقہ وارانہ فسادات کے طوفانی دور میں "بڑھ کے پیڑ" کی جڑ کی طرح اٹل رہیں۔ اور یہی جذبہ تھا جس نے اُن سے یہ خوبصورت افسانہ لکھوایا۔ انھیں اس کلچر پر بڑا فخر تھا جو اُن کے آباواجداد نے انھیں ورثہ میں دی تھی اور یہ وہ کلچر ہے جو مختلف مذاہب کے صدیوں کے اشتراکِ عمل سے وجود میں آیا ہے۔ وہ مذہب کو کلچر سے الگ مانتی تھیں اور دونوں کے اختلاط کو ملک کے حق میں سمِ قاتل گردانتی تھیں۔ ان کا موقف تھا کہ کلچر، بلا لحاظ مذہب، سب کا ایک ہے۔ مذہب الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں، مگر کلچر ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے جس کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان کے کلچر جس سے اس کی سالمیت اور یک جہتی جڑی ہوئی ہے، میں یقین رکھتے ہوئے یہاں سے ہجرت کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں اور اپنی "جڑوں" سے بے طرح جڑی رہیں۔ ان کے تمام بھائی، بہن اور ان کے کنبوں کے سب افراد پاکستان ہجرت کر گئے، مگر وہ نہ گئیں ـــــ ان کے مُنہ بولے بھائی منٹو نے انُ سے بار بار کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ پاکستان چلیں مگر کیونکہ یہ ان کے موقف کے خلاف تھا، انھوں نے صاف انکار کر دیا۔

"منٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا۔ پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوٹھیاں ملیں گی۔ وہاں ہم ہی ہوں گے۔ بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر منٹو مجھ سے واقعی بد دل ہو گیا۔ . . . اور مجھے اُس سے نفرت ہو گئی"[1]۔

سیاسی موقف عصمت اور منٹو دونوں کا ایک سا تھا مگر منٹو اُس رو میں بہہ گئے اور عصمت اپنی دھرتی، اپنی "جڑوں" سے جڑی رہیں ـــــ عصمت کا موقف جو اس افسانے کا محرک ہے پوری وضاحت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس افسانے کا تھیم منفرد نہیں کہ منٹو اسی افسانے کے مرکزی خیال کو لے کر اپنا ابدی شاہکار "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اس افسانے کی اشاعت سے پیشتر لکھ چکے تھے جس کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ایک عام ہندوستانی خواہ وہ بشن سنگھ کی طرح پاگل ہی کیوں نہ تھا، ملک کے بٹوارے اور ہجرت کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اس دھرتی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا جہاں اُس کے آبا و اجداد صدیوں سے پُرامن زندگی بسر کرتے آئے تھے۔ پاگل خانے میں، پاگلوں کے تبادلے سے پیشتر بشن سنگھ اپنے ہر ملنے والے سے ایک ہی سوال کرتا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ

---

[1] عصمت چغتائی "میرا دوست میرا دشمن" (خاکہ) "منٹو، شخصیت اور فن" موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ص ۴۶

کہاں ہے اور یہی سوال آخری بار وُہ تبادلہ کے وقت متعلقہ افسر سے کرتا ہے تو وہ مسکرا کر نہایت خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیتا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے۔ اس پر بشن سنگھ اپنے بے معنی سے جُملے میں جو وہ پچھلے پندرہ سال سے دُہراتا چلا آ رہا تھا معمُولی سی تبدیلی کر کے کہتا ہے "اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان" یعنی اگر میرا ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے تو میں پاکستان میں ہی رہوں گا۔ اور یہ کہہ کر وہ ہندوستان جانے سے انکار کر دیتا ہے ـــــ صاف ظاہر ہے کہ دونوں افسانوں کے بنیادی خیال میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ گویا "جڑیں" کی اماں اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کا بشن سنگھ اپنے اپنے مقام پر ہی جینا مرنا چاہتے ہیں اور انھیں ہجرت کسی طور منظور نہیں۔

○ دھیان رہے کہ عصمت نے اس افسانے کو فسادات کے سانحہ کے فوری ردِ عمل کے طور پر قلم بند نہیں کیا اس لئے اس میں وہ شدّت اور حدّت نہیں، وُہ بلند آہنگی نہیں، وُہ جذباتیت نہیں جو اس نوع کے ہمارے بیشتر فنکاروں کے افسانوں ملتی ہے۔ عصمت نے یہ افسانہ فسادات کے کافی عرصہ بعد خلق کیا۔ شاید اسی وجہ سے اس میں بہت سنبھلی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ ہر بات دھیمے اور متین انداز میں ہے۔ جا بجا مزاح کی چاشنی بھی ہے جو بہار دے جاتی ہے ـــــ فسادات کے دَوران یا فوراً بعد لکھے گئے افسانے اکثر و بیشتر اس اعتبار سے غیر متوازن ہیں جب کہ بعد میں لکھے گئے افسانوں میں خوشگوار توازن ملتا ہے، جو ان کی قدر و قیمت میں اضافے کا موجب ہوتا ہے۔ جب گرد و غبار چھٹ جاتا ہے، جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں تو بُعدِ زمانی فنکار کو معروضیت عطا کرتا ہے۔

○ فسادات کے قریب قریب تمام افسانوں کا انجام ان کے موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے المیہ ہے مثال کے طور پر کرشن چندر کے "ہم وحشی ہیں" کے چھوٹوں افسانوں کا انجام قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے ـــــ یہی کیفیت منٹو کے فسادات کے افسانوں "کھول دو"، "ٹھنڈا گوشت" اور "سیاہ حاشیئے" کے افسانچوں میں ملتی ہے۔ ہمارے چوٹی کے فنکاروں میں عصمت شاید واحد افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے "جڑیں" کا انجام خوشگوار ہے اور وہ اپنے دامن میں مسکراہٹیں اور مسرّتیں سموئے ہوئے ہے۔ ملاحظہ ہو:

"اور بھابی آج تو فیس دلوا دو۔ دیکھو تمھارے لڑکوں کو لونی جنکشن سے پکڑ لایا ہوں۔"

یہ اس افسانے کا حسُن ہے۔

آئیے ذرا افسانے کے فنّی محاسن پر ایک سرسری سی نظر ڈالیں:

○ عصمت کا خاصہ ہے کہ وہ افسانے کے آغاز اور انجام پر خصُوصی توجّہ دیتی ہیں۔ آغاز پر اس لئے کہ وہ قاری کی توجّہ کو باندھ لے اور اس کے تجسّس کو بیدار کر کے افسانے کے سفر پر اپنے ساتھ لے لے۔ اور انجام پر اس لئے

کہ وہ قاری کے قلب و ذہن پر اپنا دائمی نقش ثبت کر دے عصمت نے اس افسانے میں بھی اس روایت کو قائم رکھا ہے۔ افسانے کا آغاز ملاحظہ ہو :

"سب کے چہرے فق تھے۔ گھر میں کھانا بھی نہ پکا تھا۔ آج چھٹا روز تھا۔ بچے اسکول چھوٹے گھروں میں بیٹھے اپنی اور سارے گھروالوں کی زندگی وبال کئے دے رہے تھے۔ وہی مارکٹائی، دھول دھپا، وہی اُودھم اور قلابازیاں جیسے پندرہ اگست آیا ہی نہ ہو۔"[1]

متجسس قاری یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کُنبے پر کیا گذری۔ پندرہ اگست اس کے لئے کیا مصیبتیں اور صعوبتیں لے کر آیا۔ وہ اس کی داستانِ غم سننے کے لئے بیقرار ہو جاتا ہے اور یہی فنکار کا مقصد ہے ـــــ اور انجام جیسا کہ اُوپر تحریر کیا گیا ہے بہت موزوں، موثر اور مسرّت زا ہے۔ اور رُوپ چند کے امّاں سے مخاطب ہو کر کہے گئے الفاظ مدّتوں ذہن کو گدگداتے اور لبھاتے رہتے ہیں۔

○ یہ افسانہ انسان دوستی اور وطن پرستی کے مطہر جذبات سے لبریز ہے۔ از اوّل تا آخر زور فرقہ وارانہ مفاہمت اور یگانگت پر ہے نہ کہ تنازعات اور تفرقات پر۔ دو مختلف مذاہب سے وابستہ گھروں کے بُزرگ، ابّا میاں اور رُوپ چند، کانگریس کے پیرو ہونے کے ناتے مُلک کی سالمیّت اور یک جہتی کے علمبردار ہیں ـــــ ملک کے بٹوارے کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں یہ فکر انگیز پیرا ملتا ہے جو جذبۂ وطن پرستی سے چھلکا پڑتا ہے :

"انگریز چلے گئے اور چلتے چلتے ایسا گہرا گھاؤ مار گئے جو برسوں رِستے گا۔ ہندوستان پر عملِ جرّاحی کچھ ایسے بُھنڈے ہاتھوں اور کُھٹل نشتروں سے ہوا ہے کہ ہزاروں شریانیں کٹ گئی ہیں۔ خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ کسی میں اتنی سکت نہیں کہ ٹانکہ لگا سکے۔"[2]

یہ ایک دردمند، انسان دوست، وطن پرست دل کی آواز ہے۔

○ گو اس افسانے کی عام فضا گمبھیر سنجیدگی میں لپٹی ہوئی ملتی ہے پھر بھی جا بجا طنز و مزاح کے چھینٹے ملتے ہیں جو دل و دماغ پر بڑا خوشگوار اثر چھوڑتے ہیں۔ مثلاً :

"جو یہ سُن کر گئے تھے کہ چار سیر کا گیہوں اور چار آنے کی ہاتھ بھر لمبی نان پاؤ ملتی ہے، وہ لوٹ رہے تھے کیونکہ وہاں جا کر انھیں یہ بھی پتہ چلا کہ چار سیر کا گیہوں خریدنے کے لئے ایک روپے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ہاتھ بھر لمبی نان پاؤ کے لئے پُوری چونی دینی پڑتی ہے۔ اور یہ روپیہ اٹھنیاں نہ ہی کسی دُکان پر ملیں اور نہ کھیتوں میں اُگیں۔ انھیں حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا زندہ رہنے کے لئے تگ و دو۔"[3]

[1، 2، 3] عصمت چغتائی، "فسادات کے افسانے" سہ ماہی 'ذہنِ جدید' نئی دہلی (دسمبر ۹۳ء تا فروری ۱۹۹۴ء) ص ۵۵

اور اب یہ دوسری مثال:

"اے بوا تمھاری تو وہی مثل ہوگئی کہ اُونچے نیچے بھیرلیے کے پیڑ تلے میٹھی تیرا الگرنہ جانو۔
اے بی یہ کٹو گلگہری کی طرح غمزہ مستیاں کہ بادشاہ نے بلایا ہے۔ لو بھی جھم جھم کرتا ... ہاتھی
بھیجا کہ چک چک یہ تو کالا کالا کہ گھوڑا بھیجا چک چک یہ تو لاتیں جھاڑے کہ ...
باوجود کہ فضا مکدر رہی پھر بھی قہقہہ پڑ گیا۔ میری اماں کا منہ اور پھول گیا۔"[۲]

مزاح کے اس طرح کے چھینٹوں سے افسانے کے چہرہ پر رونق آجاتی ہے۔

مختصر، موثر آغاز اور انجام، دلچسپ اور جاذب کردار نگاری، طنز و مزاح کی چاشنی اور عصمت کی زبان و بیان کا حسن اس افسانے کے فنی محاسن میں شامل ہیں — یہ افسانہ عصمت کے بیشتر افسانوں کی طرح ایک صاف، شفاف، آبدار افسانہ ہے جسے فسادات سے وابستہ افسانوں میں اہم مقام حاصل ہے۔

لحاف

"لحاف" عصمت کا ایک بدنام لیکن شاہکار افسانہ ہے، جس کا موضوع ہم جنسیت (LESBIANISM) ہے، جس زمانے میں یہ افسانہ تخلیق ہوا اس وقت ہم جنسیت کا موضوع شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن عصمت نے اس پُر خطر تھیم پر اپنے افسانے کی بنا رکھی اور اسے بحُسن و خوبی نبھایا۔

بیگم جان کے غریب والدین نے ان کی شادی نواب صاحب سے ان کی ادھیڑ عمر کے باوصف اس لئے کر دی تھی کہ وہ نہایت نیک تھے۔ اور رنڈیوں اور بازاری عورتوں سے بھی انھیں کوئی رغبت نہ تھی اور پھر نہ صرف وہ خود حج کا ثواب کما چکے تھے بلکہ اپنی بہنوں کو بھی اس سعادت سے بہرہ ور کرا چکے تھے — لیکن نواب صاحب کو کنوارے، گورے گورے، پتلی کمر والے طالب علموں سے بڑا شغف تھا، جن کے تمام اخراجات وہ خود اُٹھاتے تھے — بیگم جان سے شادی کر کے نواب صاحب نے انھیں بڑے اطمینان سے طاق میں رکھ دیا اور ان سے بے نیاز ہو گئے — نواب صاحب کی نام نہاد 'پارسائی' کا پول اس بات سے ہی کھل جاتا ہے کہ وہ نوخیز، چکنے چپڑے لڑکوں سے جنسی طمانیت حاصل کرتے تھے۔ بدیں وجہ انھیں طوائفوں سے کوئی وابستگی نہ تھی۔ بلکہ ان کی بے راہ روی کی بدولت عورت کا وُجود ہی اُن کے لئے بے معنی اور بے مقصد ہو گیا تھا — عصمت، بیگم جان سے نواب صاحب کے 'تغافل اور بے اعتنائی' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"بیگم جان سے شادی کر کے تو وہ انھیں کل ساز و سامان کے ساتھ ہی گھر میں رکھ کر بھول گئے
اور وہ بیچاری دُبلی، پتلی، نازک سی بیگم تنہائی کے غم میں گھلنے لگی۔"

گویا گھر کی بیسیوں بے جان چیزوں میں ایک اور "چیز" کا اضافہ ہو گیا اور بیگم جان بے مصرف اور بے مقصد ہو کر رہ گئیں۔ وہ عورت جو گھر کو رونق اور رنگ و بُو عطا کرتی ہے، دھول میں مل گئی ــــ کیونکہ نواب صاحب نے بیگم جان کے گھر سے باہر اپنے اعزا و اقارب کے ہاں جانے پر پابندی لگا دی تھی اس لئے وہ چار و ناچار گھر کی چار دیواری میں ہی محصور ہو کر رہ گئیں اور چھپر کھٹ کی زینت بن گئیں ــــ ظاہر ہے کہ جب بیگم جان کے نعمت خانے سے لچکتی کمر والے لڑکوں کے لئے مرغن حلوے اور لذیذ کھانے بھیجے جاتے ہوں گے اور وہ دیوان خانے کی دیواروں میں سے ان کی سڈول پنڈلیاں اور عطر میں بسے شبنم کے باریک کُرتے پہنے دیکھتی ہوں گی تو ان کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہو گا۔ درحقیقت وہی لڑکے تصور میں اُن کی سوتیں بن جاتے ہوں گے جنھوں نے ان کے شوہر کو ان کے سامنے ہی ان سے چھین لیا تھا۔

بیگم جان صبر و تحمل سے طویل عرصے تک منتظر رہیں کہ شاید حالات خوشگوار موڑ لیں اور نواب صاحب ان کی طرف ملتفت ہوں لیکن وہ انتظار کرتے کرتے تھک ہار کر مایوس ہو جاتی ہیں ــــ تو خدا کے حضور میں دست بدعا ہوتی ہیں، نیاز دیتیں اور منتیں مانتی ہیں، وظیفے پڑھتیں اور چلے کھینچتی ہیں، لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا ــــ نواب صاحب ٹس سے مس نہیں ہوتے تو بیگم جان سمجھ جاتی ہیں کہ ان تلوں میں تیل نہیں اور انھیں اپنا دُکھ اکیلے ہی جھیلنا ہو گا۔ انھیں زندگی ایسے ہی بہر طور کاٹنی ہو گی۔ ویران، بنجر اور بے آب و گیاہ زندگی جو کاٹے نہ کٹے گی۔ ــــ وہ سستے عشقیہ ناولوں اور جذبات کو مشتعل کرنے والے شعروں میں اپنی تنہائی کی بے کیفی اور بے رنگی کو ڈبونے کی کوشش کرتیں مگر سب بیکار و بے نتیجہ۔ وہ رات رات بھر آہیں بھرتے، کروٹیں بدلتے، اپنے سُلگتے ہوئے ارمانوں کی چتا پر کاٹ دیتیں، مگر ان کی تشنگی اور گرسنگی بڑھتی ہی جاتی۔ اور کبھی کبھی پست حوصلگی سے زندگی ان پر اس قدر بوجھل ہو جاتی کہ اُس کا بارِ گراں اُن سے اُٹھائے نہ اُٹھتا۔

جب انسان مستقبل سے نا امید ہو جاتا ہے اور اُسے چاروں طرف گھُپ اندھیرا دکھائی دیتا ہے تو وہ شکست خوردہ اور مضمحل ہو کر اپنے آپ کو قدرت کے رحم و کرم پر ڈال دیتا ہے اور دل ہی دل میں شاید کسی غیبی طاقت کا منتظر رہتا ہے جو فرشتۂ رحمت بن کر نازل ہو اور اسے ناسازگار حالات کے بھنور سے نکال دے ــــ ایسے میں ان کی ملازمہ ربّو نازل ہوتی ہے، جو گرتی بیگم جان کو تھام لیتی ہے۔ پست ہوتی کو سنبھالا دیتی ہے۔ اور ان کے لئے زندگی واپس لوٹ آتی ہے اور پھر وہ ایسے جیتی ہیں کہ جینے کا حق ادا کرتی ہیں۔

اگر نواب صاحب جنسی اعتبار سے گمراہ تھے اور خلافِ وضع فطری جنس میں آسودگی کا سامان ڈھونڈتے تھے تو بیگم صاحبہ کو بھی ربّو میں جنسی طمانیت ملنے لگتی ہے۔ ربّو نے بیگم جان کی نبض پہچانی، ان کے کرب و عذاب کا راز جانا اور انھیں اپنی ہم آغوشی سے راہ پر لگا دیا ــــ لیکن اس بے راہ روی نے بیگم جان کو حیاتِ نو عطا کی اور ان کے

متلاطم اور مشتعل جذبات کو سکون بخشا۔ ان کے مخصوص حالات میں خوش دلی سے زندہ رہنے کا شاید یہی ایک واحد راستہ تھا۔ ان کے لئے ہر روز مر مر کر جینے سے ایسے جینا ہی بھلا تھا ــــــ جنسی آسودگی نے بیگم جان کے رگ و پے میں بجلیاں دوڑا دیں۔ اُن کی بے آب و رنگ صورت کھل کر سرسبز و شاداب ہو گئی۔ ان کا دُبلا پتلا جسم بھرنے لگا اور جلد چکنی ہو کر چمکنے لگی ــــــ اور اس طرح نواب صاحب کی مسلسل بے حسی اور بے رُخی سے زندگی کا حصار جو اُن پر روز بروز تنگ ہوتا جا رہا تھا، از خود معدوم ہو گیا۔

بیگم جان تب چالیس بیالیس سال کی ہوں گی۔ ان کی شکل و صورت بہت پُرکشش اور پُر رعب تھی۔ لمبا قد، بھرا پُرا جسم، بہت سفید رنگ جس میں سُرخی کا شائبہ نہ تھا۔ بڑے بڑے چکنے سفید ہاتھ، سڈول کمر، ان کا ہر عضو متوازن متناسب اور سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ جلد بے حد کسی ہوئی اور بھویں تنی ہوئی تھیں۔ لمبے کالے بال، تیل میں ڈوبے قرینے اور سلیقے سے کنگھی کئے رہتے تھے۔ ان کے چہرے مہرے پر سب سے جاذبِ نظر چیز اُن کے سُرخی لگے ہونٹ تھے۔ اُوپر کے ہونٹ پر ہلکا سا بالوں کا غبار رہتا ــــــ وہ مسند پر ایک خاص ادا سے نیم دراز ہوتیں، تو کوئی ملکہ معلوم دیتیں۔

ربّو ہمہ وقت چھپرکھٹ پر چڑھی ان کی مالش میں مصروف رہتی۔ اُسے گھر کے دوسرے کام کاج سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ صرف بیگم جان کی خدمت پر مامور ان کے انگ انگ کی مالش کرتی رہتی ــــــ بیگم جان کو شاید کھجلی کی شکایت تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اُن کو جلد کی کوئی بیماری نہیں۔ مگر رمز شناس ربّو بیگم جان کی بیماری کی حقیقی نوعیت سے خوب آگاہ تھی۔ وہ ان سے کہتی کہ ان کے خون میں گرمی ہے اور یہ کہہ کر وہ مُسکراتی اور مہین مہین معنی خیز نظروں سے انھیں دیکھتی گویا اس نے مکمل وثوق کے ساتھ ان کی بیماری کی شناخت کر لی ہو۔ بیگم جان کے گھُٹے گھُٹے، دبے دبے، مقید جذبات نے ان میں غیر معمولی حدّت اور شدّت پیدا کر دی تھی جس سے مالش سے انھیں راحت ملتی تھی ــــــ ربّو جسمانی لحاظ سے بیگم جان کی ضد تھی۔ کالی بھجنگ، تپے ہوئے لوہے کی طرح سرخ، ٹھوس گٹھا ہوا جسم، چُست پھرتیلے چھوٹے چھوٹے ہاتھ، کسی ہوئی چھوٹی سی توند، بڑے بڑے پھولے ہوئے ہونٹ اور ایک عجیب سی بُو چھوڑتا ہوا جسم ــــــ ربّو کے ہاتھوں میں بلا کی پھُرتی تھی۔ وہ بیگم جان کے جسم پر بڑی تیزی سے پھسلتے اور چشم زدن میں ان کے انگ انگ پر محیط ہو جاتے ــــــ ربّو درحقیقت بیگم جان کی ہمراز اور معتمدِ خاص تھی۔ وہ انہی کے ساتھ اُٹھتی بیٹھتی، کھاتی پیتی اور سوتی۔ گویا بیگم جان کے وجود کا جزو ہو۔

رات کو کمرے کے گھُپ اندھیرے میں واحد متکلم کی آنکھ کھُلی تو اُس نے دیکھا کہ بیگم جان کا لحاف یوں ہل رہا ہے گویا اس میں ہاتھی بند ہو۔ اس نے گھبرا کر بیگم جان کو آواز دی تو ہاتھی ہلنا جُلنا بند ہو گیا ــــــ اس نے بیگم جان سے بات کرنی چاہی تو انھوں نے اُسے سختی سے چپ کرا دیا ــــــ پھر اُسے دو آدمیوں کی کھُسر پھُسر کی آواز سنائی

دینے لگیں لیکن معاملہ اس معصوم اور متجسس بچی کی فہم و فراست سے بعید ہی رہا ـــــ صبح لحاف بالکل معصوم تھا۔ رات کا واقعہ آیا گیا ہو گیا ـــــ مگر اگلی رات پھر آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ربّو اور بیگم جان میں چھپر کھٹ پر ہی کوئی جھگڑا طے ہو رہا ہے۔ ربّو ہچکیاں لے لے کر روئی۔ پھر بلّی کی طرح سپر سپر رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں ـــــ صبح ربّو بیگم جان کی اجازت سے اپنے لڑکے سے ملنے چلی گئی، تو بیگم جان بے حال ہو گئیں۔ ان کا عضو عضو ٹوٹنے لگا اور وہ بغیر کچھ کھائے پئے سارا دن اُداس اُداس، ویران ویران سی پڑی رہیں۔

لحاف کا اُس میں بند ہاتھی کی شکل میں اُبھرنا اور آواز دینے پر بیٹھ جانا۔ بلّی کی طرح سپر سپر رکابی چاٹنے کی سی آوازیں آنا، لحاف کے اندر بیگم جان اور ربّو کا آپس میں کھسر پھسر کرنا۔ یہ تین مبہم سے اشارے کنائے ہیں جو ہمیں اُس عمل سے روشناس کراتے ہیں جو لحاف کے اندر بروئے کار آتا ہے ـــــ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّت اوست کے مصداق ہم اپنی اپنی بساط اور فکر و فہم کے مطابق اپنے اپنے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

ربّو وقتِ مقرّرہ پر نہیں لوٹتی تو بیگم جان کی طبیعت اور بگڑ جاتی ہے۔ مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے اور وہ چائے پر چائے پئے جاتی ہیں ـــــ واحد متکلّم انھیں اداس دیکھ کر کھجانے کی پیش کش کرتی ہے تو وہ اسے بخوشی قبول کر لیتی ہیں ـــــ وہ آہستہ آہستہ پیٹھ کھجاتی ہے تو وہ ذرا زور سے کھجانے اور بند کھول دینے کے لئے کہتی ہیں۔ انھیں جہاں جہاں کھجلی ہوتی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں رکھ دیتیں۔ بیگم جان کو کھجانے سے بڑا حظ، بڑی لذّت ملی۔ اور پھر انھوں نے اسے بازو پر سر رکھ کر اپنے ساتھ لٹا لیا۔ وہ وحشت زدہ ہو کر بھاگنے لگی تو انھوں نے اُسے زور سے بھینچا۔ اس وقت بیگم جان کی عجیب حالت تھی جسے دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے اور وزنی ہو گئے سردیوں کے باوجود اُن کے ہونٹوں، چہرے اور ناک پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے چمکنے لگے۔ انھوں نے شال اُتار دی اور کارگر کے مہین کرتے میں سے ان کا گورا گورا جسم جھلکنے لگا ـــــ اور وہ دیوانہ وار مٹی کے کھلونے کی طرح اُسے بھینچنے لگیں گویا اُن پر کوئی بھوت سوار ہو گیا ہو ـــــ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ نڈھال ہو کر لیٹ گئیں۔ ان کا چہرہ پھیکا اور بے رنگ ہو گیا۔ اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں ـــــ اس لڑکی نے اُن کا یہ حال دیکھا تو چاہا کہ کسی طرح وہاں سے بھاگ کھڑی ہو۔

اس واقعہ سے اشارہ ملتا ہے کہ جب بیگم جان کو کھجاتے کھجاتے بے حد لذّت ملتی، تو ساتھ ہی ان کے جذبات بھڑک اُٹھتے۔ اور وہ صبر و قرار کھو کر ایک مٹّی کے کھلونے کی طرح پوری قوّت سے بھینچنے لگتیں اور یوں ان کے برافروختہ جذبات کی تیزی اور تندی بھی بڑھتی چلی جاتی، حتیٰ کہ وہ بھینچتے بھینچتے نڈھال ہو کر بے سُدھ سی ہو جاتیں اور اپنے انجام کو پہنچتیں۔ تب اُن کی حالت غیر ہو جاتی اور وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگتیں۔

بیگم جان نے کپڑے بدلے اور سج سنور کر دہکتا ہوا انگارہ بن گئیں۔ انھوں نے پھر واحد متکلّم پر لاڈ پیار

دکھانا چاہا لیکن وہ بدک گئی اور گھر واپس جانے پر بضد ہو گئی ــــ اور تھوڑی ہی دیر میں بیگم جان کو پھر شدید دورہ پڑا۔ اور ان کا سونے کا ہار ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور مہین جالی کا دوپٹہ تار تار ہو گیا۔ اچھی بھلی مانگ بگڑ کر جھاڑ جھنکار ہو گئی۔ اوہ ــــ اوہ ــــ اوہ ــــ وہ جھٹکے لے کر چلانے لگیں۔ بہت کوششوں کے بعد انھیں ہوش آیا ــــ واحد متکلم رات کو اندر آئی تو اس نے دیکھا کہ ربو ان کی کمر سے لگی جسم کو دبا رہی ہے۔ ــــ رات اس کی آنکھ کھلی تو اسے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیں "سر سر۔ پھٹ۔ کچ" لحاف اندھیرے میں ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا ــــ اس کے منہ سے بے اختیار آواز نکلی تو لحاف میں ہاتھی پھدکا اور پھر بیٹھ گیا ــــ ہاتھی پھر سرگرم ہوا۔ اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اس نے ٹھان لیا کہ آج جرأت سے کام لے کر سرہانے لگا ہوا بلب جلا دے گی ــــ ہاتھی پھڑپھڑ کر رہا تھا اور جیسے اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چپڑ چپڑ کھانے کی کچھ آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی مزیدار چٹنی چکھ رہا ہو ــــ لحاف پھر ابھرنا شروع ہوا اور اس نے عجیب عجیب شکلیں بنانی شروع کیں معلوم ہوتا گوں گوں کر کے کوئی بڑا سا مینڈک پھول رہا ہے ــــ لڑکی نے پلنگ کی دوسری طرف پیر اتارے اور سرہانے ٹٹول کر بجلی کا بلب جلایا۔ "ہاتھی نے لحاف کے اندر ایک قلابازی لگائی اور پچک گیا۔ قلابازی لگانے سے لحاف کا کونا فٹ بھر ابھرا۔ اللہ میں غڑاپ سے اپنے بچھونے میں"

بات صاف ہو جاتی ہے۔ پہلے "سر سر، پھٹ، کچ" کی سی آوازیں آتی ہیں۔ ہاتھی بار بار ابھرتا ہے، جھومتا ہے، اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے اور چپڑ چپڑ کھانے کی آوازیں آتی ہیں جیسے کوئی مزیدار چٹنی کھا رہا ہو ــــ مختصراً اس ہم جنسی کا بھید ایک تو ان آوازوں میں ہے جو جنسی عمل کے دوران پیدا ہوتی ہیں اور دوسرے ان POSES میں جو لحاف کے اندر اختیار کئے جاتے ہیں اور جن کے مطابق لحاف مختلف شکلیں بناتا ہے۔

یہ افسانہ کردار نگاری کا اچھا نمونہ ہے ــــ کردار نگاری کسی شخصیت یا شخصیت کے کسی مخصوص پہلو کو افسانے کے سیاق و سباق میں یوں نمایاں کرنا ہے کہ اس کے خدوخال ابھر کر سامنے آجائیں ــــ "لحاف" میں چار کردار ہیں۔ نواب صاحب، بیگم جان، ربو اور واحد متکلم، جو اس افسانے کی راوی ہے۔

○ نواب صاحب کا کردار مختصر سا ہے اور وہ کہیں بھی کھل کر سامنے نہیں آتے۔ درحقیقت انھیں منظر پر لانے کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ ان کے کردار کو افسانے کے سیاق و سباق میں جس حد تک نمایاں کرنا مقصود تھا، عصمت افسانے کے آغاز میں ہی کر دیتی ہیں۔ دراصل پورا افسانہ ان کے کردار کے پس منظر میں ابھرتا ہے ــــ وہ امیر کبیر، عیش پسند، نوخیز لڑکوں کے دلدادہ ہیں۔ اور ان کی یہ کجروی ہی ان کے کردار کی نمایاں خصوصیت ہے ــــ مگر ان کی نگاہ عاقبت پر بھی رہتی ہے اس لئے کہ وہ نہ صرف خود حج کر چکے ہیں بلکہ اپنی بہنوں کو بھی حج کرا چکے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ساتھ ساتھ بھرتے جاتے ہیں ــــ اس سے یہ ظاہر ہوتا

ہے کہ انھیں احساسِ گناہ بھی ہے۔ بھلے ہی یہ احساس کتنا ہی سطحی اور فروعی کیوں نہ ہو —— پھر وُہ ایک بے حس، بے رُوح، دوسروں کے جذبات اور احساسات سے بالکل بیگانہ و بے نیاز انسان ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ شادی کے بعد اپنی رفیقۂ حیات کو دوسرے ساز و سامان کے ساتھ رکھ کر نہ بھول جاتے۔ انھیں اس بات کا قطعاً احساس نہیں کہ ان کی بیگم بھی ان ہی کی طرح گوشت پوست کی بنی ہے۔ اس کی بھی کچھ اُمنگیں ترنگیں ہیں۔ کچھ جسمانی اور رُوحانی ضروریات ہیں اور وہ بھی ان سے کچھ توقعات باندھے ہوئے ہے۔ بیگم ایک طویل عرصہ تک اُن کی نظرِ التفات کی منتظر رہتی ہیں مگر جب وہ ان پر نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالتے تو وہ صبر و قرار کھو کر انہی کے نقشِ قدم پر چل دیتی ہیں۔ فنی اعتبار سے نواب صاحب کا کردار انفعالی PASSIVE ہے، حرکت و حرارت سے عاری یہی وجہ ہے کہ وہ بے کیف اور بے آب و رنگ ہے۔

○ بیگم جان اس افسانے کی رُوح رواں ہیں۔ اور از اوّل تا آخر اس پر چھائی رہتی ہیں۔ بیگم جان نواب صاحب کی بے اعتنائی اور تغافل کی ماری ہیں۔ ان کے قلب و جگر میں وہی آرزوئیں اور ارمان کروٹیں لے رہے ہیں جو ہر اَنچھوئی بیاہتا عورت کے مَن میں لیتے ہیں۔ ان کی جو اُمیدیں نواب صاحب سے بیوی ہونے کے ناطے وابستہ ہیں جب تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں تو بیگم صاحبہ پر نااُمیدی چھا جاتی ہے مگر وہ متحمّل اور بُردبار ہیں اور ایک طویل عرصے تک انتظار کرتی ہیں اور وہ تمام حربے استعمال کرتی ہیں جو ان کے مخصوص حالات میں ایک حرماں نصیب عورت کرتی ہے۔ وہ اس مافوق الفطرت، غیبی طاقت کے سامنے سربسجود ہوتی ہیں جو قاضی الحاجات ہے، مگر ان کے سجدے، ان کی دُعائیں سب رائیگاں جاتی ہیں۔ وہ منتیں مانگتی ہیں، نذر و نیاز دیتی ہیں مگر بے سود —— ایسے میں بھی وہ دامنِ امید ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں کہ شاید پردۂ غیب سے کچھ ظہور میں آئے اور ان کا کرب و عذاب ختم ہو —— تب بیگم جان کی نوکرانی ربّو منظر پر آتی ہے۔ وہ رمز شناس اور معاملہ فہم ہے۔ اور رازِ درونِ خانہ سے واقف ہے۔ وہ بیگم جان کو نواب صاحب کے نقشِ قدم پر ڈال دیتی ہے اور وہ مُڑ کر نہیں دیکھتیں۔

دھیان رہے کہ بیگم جان کا ربّو کے توسط سے جنسی تسکین حاصل کرنا ہی کرب و عذاب سے نجات پانے کا واحد وسیلہ تھا۔ اس لئے قاری انھیں مُوردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ مگر وہ نواب صاحب کو بَری الذمّہ قرار نہیں دے سکتا کہ وہ اپنی اور بیگم جان دونوں کی بے راہ روی کے ذمّہ دار ہیں۔ بیگم جان کا جنسی رُجحان فطری اور جبلی نہیں بلکہ وہ اُن کے مخصوص حالات کا زائیدہ ہے۔

ایک اور بات قابلِ توجہ ہے۔ بیگم جان بہت چاہتی ہیں کہ کسی طرح ربّو کا بیٹا اُن کے قابو میں آجائے تو ان کی زندگی راہِ مستقیم پر ہو لے۔ مگر وہ ان کی دسترس سے باہر رہتا ہے۔ بیگم جان ہر تدبیر آزماتی ہیں۔ اسے دوکان کراتی ہیں۔ گاؤں میں کام دلواتی ہیں۔ وہ ان کے ہاں چند روز قیام کرتا ہے تو وہ اُسے جوڑے جامے

بنوا کر دیتی ہیں مگر نہ جانے کیوں وُہ انھیں پیٹے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ بیگم جان اب بھی کوشاں ہیں کہ کسی طرح ان کی زندگی پگڈنڈی چھوڑ شاہراہ پر رواں دواں ہو جائے مگر انھیں راستہ نہیں ملتا۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ بیگم جان اب اس حد تک اس بدعت کی عادی ہو چکی ہیں کہ جب ربّو دو دن کے لئے غیر حاضر رہتی ہے تو ان کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اور وہ واحد متکلم کو، جو چھوٹی سی بچی ہے، مالش کرنے کو کہتی ہیں اور اسے خود ہی اس عمل سے روشناس کراتی ہیں ــــــ ربّو واپس آجاتی ہے تو بھی وہ اُسے پیار چمکار سے بھرمانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ربّو جو یہ دیکھ کر جلی بھُنی بیٹھی تھی اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہے۔ "بچّی امیا کھٹی ہوتی ہیں بیگم جان۔"

ربّو کا کردار بیگم جان کے تعلق سے خاصہ اہم ہے۔ وہ بیگم کے کردار کو استحکام عطا کرتی ہے۔ درحقیقت بیگم کے کردار کی چکا چوند اور تام جھام ربّو کے دَم سے ہے۔

واحد متکلم، اس افسانے کی راوی لڑکی شاید خود عصمت چغتائی ہیں، جنھوں نے کم سنی کے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر اس کہانی کی تخلیق کی۔ وہ چند روز جو انھوں نے بیگم جان کی صحبت میں گذارے ان پر اپنی دائمی چھاپ چھوڑ گئے۔ اور جب انھوں نے قلم سنبھالا تو وہ "لحاف" کی تخلیق کئے بغیر نہ رہ سکیں ورنہ ہم جنسی پر اس قدر باریک بینی اور تیقن کے ساتھ لکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ گو فنّی اعتبار سے "لحاف" عصمت کا ارفع ترین افسانہ نہیں ہے اور عصمت کے کئی دیگر افسانے اس لحاظ سے اس کے ہم پلّہ یا اس سے اعلیٰ اور افضل ہیں، اس افسانے کی تشہیر اُن کے باقی سب افسانوں سے کہیں زیادہ ہُوئی اور اس نے انھیں صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا ــــــ اس افسانے کی غیر معمولی تشہیر کی کئی وجوہات تھیں ــــــ یہ افسانہ ایک ایسے موضوع پر لکھا گیا جو اس وقت تک شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس وجہ سے اسے ایک انوکھی اور نادر ادبی تخلیق گردانا گیا۔ بیشتر قارئین اور ناقدین عورتوں کے درمیان ہم جنسیت کے عمل کی نوعیت سے بے بہرہ تھے۔ (اور یقین جانئے آج بھی ہیں)۔ اس نے بھی ان کی آتشِ شوق کو ہوا دی۔ اور برِّ صغیر میں افسانے (اور عصمت) کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی ــــــ دوسرے ہم جنسی کے ادبی اعتبار سے بے حد نازک موضوع کو اپنے افسانے کا تھیم بنانے والی ایک مسلم متوسط گھرانے کی اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ادیبہ تھی جس سے اس قسم کی فنّی کاوش قطعاً غیر متوقع تھی۔ اس عنصر نے بھی قارئین کے تجسّس کو اُبھارا، جس سے افسانے کو مقبولیت ملی ــــــ پھر یہ افسانہ ایک ایسی فنکارہ کے زورِ قلم کا نتیجہ تھا جو "ترقّی پسند" تھی اور ترقّی پسند تحریک سے گہرے طور پر وابستہ تھی اور جسے ترقّی پسندوں کی ہم خیال، ہم سفر

ہونے کے سبب اُن کی پُشت پناہی حاصل تھی۔ بدیں وجہ اس افسانے نے جہاں عصمت کی فن کارانہ شخصیت کو مجروح کیا وہیں ترقی پسند تحریک پر بھی لے دے ہُوئی اور اس افسانے سے عصمت ادبی حلقوں میں بحث و تمحیص کا موضوع بن گئیں۔ اس عمل سے بھی جہاں عصمت کو شہرت یا بدنامی ملی وہیں افسانے کا نام ہر اُردو دوست کی نوکِ زبان پر آگیا ——— مزید براں لاہور کی عدالت میں فحاشی کے الزام میں عصمت پر چلائے گئے مقدمے نے اس افسانے کو ڈیڑھ دو سال تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنائے رکھا۔ اور ادبی مجالس میں اسے زیرِ بحث لانا اور اس پر اظہارِ رائے کرنا معمول سا بن گیا ——— اور یوں "لحاف"، برصغیر میں ایک طرح سے اُردو داں طبقے کے دل و دماغ پر چھا سا گیا۔

اس افسانے کا حُسن اس بات میں مضمر ہے کہ عصمت نے ایک بے حد نازک اور ناگفتنی موضوع پر اس کی تشکیل و تعمیر یُوں فنی چابکدستی سے کی ہے کہ یہ کہیں بھی مبتذل نہیں ہوتا۔ گو یہ ہم جنسیت سے متعلق ہے مگر اس میں جنسی تلطف اور تلذذ کا شائبہ نہیں ملتا۔ اور نہ ہی اس سے اُکساہٹ اور انگیخت ہوتی ہے۔ ہر بات اس قدر قرینے سلیقے، اشارے کنائے سے متین اور مہذب انداز میں بغیر کوئی فحش لفظ استعمال کئے کہی گئی ہے، گویا فاضل مصنفہ نے سب کچھ کہہ کر بھی کچھ نہ کہا ہو ——— یہی وجہ ہے کہ منٹو نے اس افسانے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے عصمت سے ستائشی انداز میں کہا:

"آپ کا افسانہ "لحاف" مجھے بہت پسند آیا۔ بیان میں الفاظ کو بقدرِ کفایت استعمال کرنا آپ کی نمایاں خصوصیت رہی ہے" ——— دھیان رہے، کہ اس نوع کے افسانے پر کوئی ان جیسی خاتون افسانہ نگار ہی قلم اٹھا سکتی تھی کہ اس کا موضوع مرد افسانہ نگاروں کے تجربات اور مشاہدات کے دائرہ سے باہر تھا۔

اس افسانے کی ادبی قدر و قیمت خاص طور پر اس کے انجام کی بابت مختلف رائیں ہیں ——— جب یہ افسانہ اپنی معراج کو چھونے لگتا ہے تو اس کی راوی لڑکی ان ؟؟ کا ذکر کرتی ہے جو لحاف کے اندر بنتے بگڑتے ہیں اور ساتھ ہی اُن آوازوں کا پتہ دیتی ہے جو اسے لحاف کے اندر سے جنسی عمل کے دوران آتی ہیں۔ اس سے اس کے تجسس کو ہوا ملتی ہے اور وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ لحاف کے اندر کیا ہو رہا ہے ——— قاری کا تجسس بھی جو اس لڑکی کے ساتھ قدم بقدم پیش رفت کئے جا رہا ہے، بڑھتا چلا جاتا ہے ——— لڑکی بجلی کی روشنی میں جو کچھ دیکھتی ہے اسے دیکھ کر بچھونے میں دبک جاتی ہے اور اس کا تجسس ناپید ہو جاتا ہے کہ صورتِ حال کھُل کر اس پر واضح ہو جاتی ہے ——— مگر متجسس قاری حیران دیکھتا رہ جاتا ہے کہ لڑکی اس بارے میں لب وا نہیں کرتی ——— قاری کی تشنگی اس افسانے کی تشنگی پر دلالت کرتی ہے ——— اس اعتبار سے عصمت کا یہ افسانہ ایک بہت "بولڈ" مگر ادھورا تجربہ لگنے لگتا ہے کہ ان کا مشاہدہ جھُولتے ہوئے لحاف تک ہی محدود رہ جاتا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر اپنے منطقی انجام کو نہیں پہنچتا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اے۔ ایس۔ بخاری پطرس کی رائے میں عصمت فنی اعتبار سے اپنے موضوع سے

بخوبی عہدہ برآ نہیں ہو پائیں ۔ ملاحظہ ہو:

"اس کہانی کی قیمت یوں گھٹ جاتی ہے کہ اس کا مرکزِ ثقل کوئی دل کا معاملہ نہیں۔ بلکہ ایک جسمانی حرکت ہے۔ شروع میں یہ خیال ہوتا ہے کہ بیگم جان کی نفسیات کو بے نقاب کریں گی۔ پھر امید بندھتی ہے کہ جس لڑکی کی زبانی کہانی سنائی جا رہی ہے، اس کے جذبات میں دلچسپی ہوگی۔ لیکن ان دونوں سے ہٹ کر کہانی آخر میں ایک اور ہی سمت اختیار کر لیتی ہے اور اپنی نظریں اُمنڈتے ہوئے لحاف پر گاڑ دیتی ہے۔ چنانچہ پڑھنے والا بیچارہ اپنے آپ کو اس قسم کے لوگوں میں شامل پاتا ہے جو مثلاً جانوروں کے معاشقے کا تماشہ کرنے کے لئے سڑک کے کنارے اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں۔"[1]

پطرس نے بجا لکھا ہے کہ اس افسانے کا مرکزِ ثقل کوئی دل کا معاملہ نہیں بلکہ محض ایک جسمانی حرکت ہے ـــــــ دیکھا جائے تو "دل کا معاملہ" دو عورتوں کے درمیان شاید ہو بھی نہیں سکتا۔ ان کا فعل ایک غیر فطری فعل ہے اور ان کا تلطف بھی اصلی اور حقیقی نہیں۔ ان کا مقصد وہ تلذذ حاصل کرنا ہے جو عورت اور مرد کو حقیقی عمل سے حاصل ہوتا ہے مگر یہ ممکن نہیں کہ ان کا اختلاط محض دو عورتوں کے جسموں کا تصادم یا ٹکراؤ ہے ـــــ بلاشبہ متجسس قاری اس لڑکی کے ساتھ منتظر رہتا ہے کہ وہ بھی صورتِ حال کو اس کے توسط سے جان لے مگر انجام کار اس کا تجسس جوں کا توں برقرار رہتا ہے اور معاملہ کچھ پھیکا اور بے رنگ سا لگنے لگتا ہے۔

مگر اس معاملے کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے ـــــــ یہ ضروری نہیں کہ مصنف ریاضی کے سوال کی طرح افسانے کی تکمیل کرے۔ بعض اوقات وہ افسانے کے انجام کو پوری طرح سمیٹے بغیر یہ عمل قاری کی سوجھ بوجھ پر بھی چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ خود اپنی بساط کے مطابق نتیجہ اخذ کرے۔ اس کا یہ عمل ستار کے اس آخری سُر کی طرح ہوتا ہے جسے فنکار دانستہ طور پر فضا میں لرزاں چھوڑ دیتا ہے اور سامعین سر دُھنتے رہتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جو کچھ اس لڑکی نے دیکھا عصمت اگر اُسے عین مین بیان کر دیتیں تو افسانہ مبتذل ہو کر فحاشی کی زد میں آ جاتا اور فنی اعتبار سے اپنی قدر و قیمت کھو دیتا ـــــــ دیکھا جائے تو یوں بھی عصمت کا فن اشارے کنائے کا فن ہے۔ بدیں وجہ انھوں نے فنی اعتبار سے اس کی پردہ پوشی کو ہی قرینِ مصلحت جانا۔

"لحاف" موضوع کی انفرادیت اور ٹریٹمنٹ کی ندرت، دونوں اعتبار سے ایک قابلِ قدر افسانہ ہے۔

---

[1] اے۔ ایس۔ بخاری پطرس: "کچھ عصمت کے بارے میں"۔ ماہنامہ "ساقی" دہلی۔ فروری ۱۹۴۵ء

ننھی کی نانی

نانی تمام عمر اپنی خستہ حالی اور بدنصیبی پر ماتھا پیٹتی رہی، ایڑیاں رگڑتی رہی مگر اس کی آہ و بکا پر نہ قضا و قدر نے کان دھرے اور نہ ہی خدا کے نیک بندوں نے۔ اور اس نے یوں ہی گرتے پڑتے، روتے دھوتے لشتم پشتم زندگی گذار دی۔

نانی نے زندہ رہنے کے لئے بہت پاپڑ بیلے۔ گھروں میں اُوپر کے کام پر لگی رہی اور اُوپر کے کام کتنے نیچے ہوتے ہیں یہ ہم سب جانتے ہیں ـــــ کچھ سال ماماگیری بھی کی پر جب اس نے دال میں چھپکلی بگھار دی اور روٹیوں میں مکھیاں پرودیں تو یہ پیشہ بھی چھوٹ گیا ـــــ پھر اس نے محلے میں مخبری کا کام شروع کیا۔ اِدھر کی بات اُدھر کرتی اور اُدھر کی اِدھر۔ اور اس طرح لگائی بجھائی میں وہ دو وقت کی روٹی پیدا کرلیتی۔ مگر یہ بھی کوئی مستقل کام نہ تھا ـــــ جب سب حیلے وسیلے ختم ہو گئے تو اس نے بھیک مانگنے کا "مہذب" طریقہ اختیار کرلیا ـــــ وہ کھانے کے وقت ناک پھیلا کر سونگھتی اور جس گھر سے بہترین خوشبو آتی، اُس میں گھس جاتی، اور اِدھر اُدھر کی چکنی چپڑی باتوں اور خوشامد درآمد سے دو لقمے مار لیتی ـــــ نانی ہر فن مولیٰ تھی۔ وہ ہاتھ کی صفائی میں بھی ماہر تھی۔ اِدھر کسی کی آنکھ بچی اور اس نے پتیلی منہ سے لگا کر دُودھ کے دو گھونٹ غٹا غٹ پی لئے۔ گڑ کی ڈھیلی لی اور مُنہ میں ڈال کر چوستی رہی۔ دو چپاتیاں لیں اور سینے میں اڑس لیں اور تنہائی میں مزے سے کھاتی رہی اور اُسے بن چبائے نگل جاتے میں بھی عار نہ تھا۔ نانی کی چالبازیوں اور مکاریوں سے سب واقف تھے مگر کسی نے منہ کھولنا قرینِ مصلحت نہ جانا۔ اور اگر کوئی انگشت نمائی کرتا تو وہ آسمان سر پر اُٹھا لیتی۔ وہ شور غل مچاتی، جھوٹی سچی قسمیں کھاتی کہ توبہ ہی بھلی۔

نانی بے بس تھی۔ اس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا جو آڑے وقت میں کام آتا۔ اس کا شوہر مر چکا تھا اور اس کی بیٹی بسم اللہ بھی ننھی کو چھوڑ کر جاپے میں ہی چل بسی تھی۔ ننھی اب نو سال کی ہو چکی تھی اور نانی نے بہت غور و فکر کے بعد اسے ڈپٹی صاحب کے ہاں اُوپر کے کام پر نوکر رکھوا دیا تھا۔ ننھی اس کے جگر کا ٹکڑا تھی۔ وہ اس کی نگاہوں سے تھوڑی دیر کے لئے بھی اوجھل ہو جاتی تو وہ بلبلانے لگتی۔

ذرا ان فرشتہ صورت شیطان سیرت، ڈپٹی صاحب کی کرتوت پر غور فرمائیے۔ وہ ایک پُر وقار عہدے پر فائز ہیں۔ پوتوں نواسوں والے ہیں۔ محلے بھر کی ناک ہیں۔ سب انھیں تعظیم و تکریم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور وہ زاہد پاکباز بھی بنتے ہیں کہ پانچ وقت کے نمازی ہیں۔ مسجد میں چٹائیاں اور لوٹے بھی بھجواتے رہتے ہیں۔ ـــــ مگر ایک نو سالہ بے بس بے کس بچی کو جو عمر میں ان کی پوتیوں کے برابر ہے، گھر میں تنہا پا کر اپنی شہوانیت

کا شکار بناتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ بچّی بے سہارا اور بے یار و مددگار ہے اور محلّہ بھر میں کسی کو ان کے خلاف مُنہ کھولنے کی جرأت نہ ہوگی۔ ایک نانی ہے جو خود ان لوگوں کے ٹکڑوں پر پلتی ہے ــــ ڈپٹی صاحب بھیڑ کے لباس میں بھیڑیے ہیں اور معاشرے کے چہرے پر بدنما داغ۔ ان کا ضمیر مر چکا ہے اور ان کے احساسات منجمد ہو گئے ہیں۔ وہ اس احساس سے ہی عاری ہیں کہ انھوں نے اپنے قبیح فعل سے ایک معصوم لڑکی کی زندگی برباد کر دی ہے۔ اب وہ کلی کھل کر کبھی پھول نہ بن سکے گی۔ اور پتی پتی ہو کر بکھر جائے گی۔ عصمت طنز کے زہر میں بجھا تیر چھوڑتے ہوئے لکھتی ہیں:

"کہتے ہیں بڑھاپے کے آسیب سے بچنے کے لئے مختلف ادویات اور طلاؤں کے ساتھ حکیم، بید، چوزوں کی یخنی بھی تجویز فرماتے ہیں۔ نو برس کی ننھی چوزہ ہی تو تھی۔"[1]

نانی ننھی کو غائب پا کر ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے۔ مگر بہت دوڑ دھوپ کے باوجود اس کا اتہ پتہ نہیں ملتا۔ رات گئے ننھی آتی ہے تو وہ ایک زخمی پرندے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ بجھی بجھی بے نور سی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور لب وا کرنے سے قاصر ہے مگر آخر تا کے۔ بات کھل جاتی ہے اور نانی سر پیٹ لیتی ہے۔ لیکن وہ ایک بے معنی، بے حقیقت سی عورت ہے، جو ڈپٹی صاحب سے باز پُرس کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتی اور معاملہ رفت گزشت ہو جاتا ہے۔ اور یوں ایک غریب، بے ضرر، بے سہارا لڑکی سماج کی بہیمیت اور استحصال پسندی کا شکار ہو جاتی ہے۔

ننھی کو دیکھ کر اب بہتوں کی رال ٹپکنے لگتی ہے کہ وہ اب شاخِ شجر سے ٹوٹا ہوا پھل تھی۔ وہ اب سب کی نظروں میں ایک تر نوالہ تھی، جو چاہے ہاتھ بڑھائے، منہ میں ڈالے اور نگل جائے ــــ لوگ راہ چلتے فقرے کستے، بھونڈے اشارے کرتے، چٹکیاں لیتے اور مٹھائی کے دونے پیش کرتے ــــ اور افلاس زدہ، بھوکوں ماری ننھی پھسل جاتی۔ نتیجہ یہ کہ دیکھتے ہی دیکھتے ننھی کے چہرے مہرے پر خوست اور پھٹکار برسنے لگی۔ وہ ننھی بچّی سے لڑکی نہیں، ایک ہی جست میں عورت بن جاتی ہے ــــ ننھی کا نام اب کئی لوگوں سے وابستہ ہے۔ کوئی ڈپٹی صاحب اور ان کے صاحبزادے کا نام لیتا ہے تو کوئی مسجد کے مولوی کا۔ اور پھر پتہ چلتا ہے کہ صدیق پہلوان کے بھانجے نے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرا لئے ہیں ــــ اور پھر ایک دن سب کی آنکھوں میں دھول جھونک وہ اس کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ نانی اس کی یاد میں آہیں بھرتی ہے، آنسو بہاتی ہے اور ہر کس و ناکس سے پوچھتی پھرتی ہے کہ میری ننھی کہاں گئی۔ کوئی کہتا اسے بڑے نواب صاحب نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ہے اور اب اسے دُنیا جہان کی نعمتیں میسّر ہیں تو کوئی کہتا کہ اسے لاہور کے بازارِ حسن ہیرا منڈی میں دیکھا تھا۔ ایسے بھی تھے جو اسے بمبئی کی فارس روڈ اور کلکتہ کے سوناگاچی

---

[1] عصمت چغتائی "ننھی کی نانی"، اُردو ماہنامہ "مکالمات" (عصمت چغتائی نمبر۔ دسمبر ۱۹۹۱ء) ص۔ ۱۹۰

میں دیکھنے کا دعویٰ کرتے تھے ـــــ قصّہ کوتاہ، ننھی اب ایک ایسے راستہ پر ہولی تھی جو سیدھا جہنم کو جاتا ہے اور جہاں جاکر کبھی کوئی عورت واپس نہیں آتی ـــــ نانی جو پہلے ہی گردشِ دوراں سے نڈھال تھی۔ اس جانکاہ صدمے سے خبطی ہو جاتی ہے ـــــ قدرت بڑی ستم ظریف ہے۔

○ یہ افسانہ کردار نگاری کا بہت جاندار اور ارفع نمونہ پیش کرتا ہے۔ عصمت نے ننھی کی نانی کے کردار کو جس خوبصورتی سے اُبھارا اور نکھارا ہے یہ انھیں کا حصہ ہے۔ عصمت کے افسانوں کی تشکیل و تعمیر میں بالعموم تخیل اور تصوّر کو زیادہ دخل نہیں ہوتا کہ وہ ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں اور ٹھوس دیکھے بھالے، جانچے پرکھے کرداروں اور واقعات کو افسانے کے قالب میں ڈھالنے میں انھیں یدِطولیٰ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں کردار نگاری فن کے محدود دائرے میں بھی اپنی معراج پر ملتی ہے۔ "محدود" اس لئے کہ ان کے موضوعات کا تنوع اور گونا گونی مسلم متوسط طبقے تک ہی محیط ہے ـــــ کردار نگاری کے تعلق سے ننھی کی نانی کا کردار بڑا بھرپور اور مؤثر ہے۔ نمونہ پیش ہے:

> "لٹّی، چور اور چلمہ باز ہونے کے علاوہ نانی پرلے درجے کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو ان کا وہ بُرقع تھا جو ہر دم ان کے اُوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس بُرقع میں نقاب بھی تھی۔ پر جُوں جُوں محلّے کے بڑے بوڑھے چل بسے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے نقاب کو خیرباد کہہ دیا۔ مگر کنگوروں دار فیشن ایبل بُرقع کی ٹوپی اُن کی کھوپڑی پر چپکی رہتی۔ آگے چاہے مہین کُرتے کے نیچے بنیان نہ ہو پر پیچھے بُرقع بادشاہوں کی جھول کی طرح لہراتا رہے اور یہ بُرقع صرف ستر ڈھانکنے کے لئے ہی نہیں تھا بلکہ دُنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی سے لیا جاتا تھا اور گٹھری مڑی کرکے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اسے تولیہ کے طور پر استعمال کرتیں۔ پنج وقتہ نماز کے لئے جائے نماز اور جب محلّے کے کُتّے دانت نکوسیں تو ان سے بچاؤ کے لئے اچھی خاصی ڈھال۔ کُتّا پنڈلی پر لپکا اور نانی نے بُرقعے کا گھیرا اُس کے مُنہ پر پھٹکارا۔ نانی کو بُرقع بہت پیارا تھا۔ فرصت میں بیٹھ کر حسرت سے اس کے بڑھاپے پر بسورا کرتیں۔ جہاں کوئی چندی کترلی اور احتیاطاً پیوند چپکا لیا۔ وُہ اس دن کے خیال سے ہی لرز اٹھتی تھیں جب یہ بُرقع بھی چل بسے گا۔ آٹھ گز لٹّھا کفن کو جُڑ جاوے یہی بہت جانو۔"[1]

---

[1] عصمت چغتائی، "ننھی کی نانی"۔ اُردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۹۰

یہ نانی کی شخصیت کا ایک مخصوص پہلو ہے جو اس مختصر سے اقتباس میں اُجاگر ہو کر متاثر کرتا ہے۔ نانی بے نقاب کنگوروں دار بُرقعہ پہنے، گلی کوُچے میں گھومتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ بُرقع ہمہ صفت موصوف ہے، جو بیک وقت تکیے، تولیے، جائے نماز اور کتّے بھگاتے کا کام دیتا ہے۔ یہ بُرقعہ عمر رسیدہ ہے اور نہ جانے نانی کا کب سے ساتھ دے رہا ہے یہی وجہ ہے کہ بُرقعہ نانی کو جان سے زیادہ عزیز ہے ــــــ قاری چاہتا ہے کہ ان جزئیات کو ایک بار پھر آہستہ آہستہ پڑھے، قلب و ذہن میں جذب کرے اور تلطّف اور تلذّذ حاصل کرتا ہُوا آگے بڑھے۔ یہ کردار نگاری کا کمال ہے۔

○ "ننھی کی نانی" منظر نگاری کے بھی دو ایک ناقابلِ فراموش نمونے پیش کرتا ہے۔ منظر نگاری، کسی منظر کو یوں پیش کرنا ہے کہ اُس کا جزو جزو اپنے ہر رنگ، ہر انداز کے ساتھ اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں چمک اُٹھے۔ اور دل و دماغ کو بے اختیار چھوُلے۔ منظر نگاری کے لئے فنکار کا دُور رس اور باریک بین ہونا لازم ہے تاکہ موُئے قلم سے جو صفحۂ قرطاس پر اُبھرے وہ حقیقت سے ہمکنار ہو جائے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

"بندروں کا قاعدہ ہے کہ آنکھ بچی اور کٹورا گلاس لے بھاگے اور چھجے پر بیٹھے دونوں ہاتھوں سے کٹورا دیوار پر گھس رہے ہیں۔ کٹورے کا مالک نیچے کھڑا چمکار رہا ہے۔ پیاز دے، روٹی دے، جب بندر میاں کا پیٹ بھر گیا، کٹورا پھینک اپنی راہ لی۔ نانی نے مٹکی بھر ٹکڑے لٹا دیئے۔ پر حرامی بندر نے تکیہ نہ چھوٹنا تھا نہ چھوڑا۔ سو جتن کئے گئے مگر اس کا جی نہ پگھلا۔ اور اس نے مزے سے تکیہ کے غلاف پیاز کے چھلکوں کی طرح اُتارنے شروع کئے۔ وہی غلاف جنھیں نانی نے چندھی آنکھوں سے گھور گھور کر بگّے ٹانکوں سے گونتھا تھا۔ جوُں جوُں غلاف اُترتے جاتے، نانی کی بدحواسی اور بلبلاہٹ میں زیادتی ہوتی جاتی۔ اور آخری غلاف بھی اُتر گیا اور بندر نے ایک ایک کرکے چھجہ پر سے ٹپکانا شروع کئے۔ روئی کے گالے نہیں بلکہ شبن کی فتوئی ــــ بنو ستّے کا انگوچھا ــــ حسینہ بی کی انگیا ــــ مُنّی بی کی گڑیا کا غرارہ ــــ رحمت کی اوڑھنی اور خیراتی کا کچھا ــــ خیرن کے لونڈے کا طمنچہ ــــ منشی جی کا مفلر اور ابراہیم کی قمیض کی آستین مع کف[1]!"

یہ جیتا جاگتا، سانس لیتا منظر ہمارے ذہن پر ثبت ہو جاتا ہے۔

محلّہ والے یہ منظر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں، جو بھانت بھانت کی سرقہ کی ہوئی چیزیں نانی

---

[1] عصمت چغتائی "ننھی کی نانی" اُردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء - ص ۱۹۳

سے ملیں انھیں انھوں نے نظرانداز کردیا مگر اس بات کو ذہن سے نہ جھٹک سکے کہ نانی فطرتاً چور اور چکمہ باز ہے اور محلّے کے لئے مستقل خطرہ۔ فوری ردِّعمل کے طور پر وہ اُسے بُرا بھلا کہتے ہیں۔ چور، بے ایمان، کمینی کہتے ہیں۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اسے محلّے سے نکال باہر کرنا چاہیئے اور بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اسے پولیس کے حوالے کر دینے کا مشورہ دیا۔ غرضیکہ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّت اوست کے مصداق جو کسی کے جی میں آئی کہہ گذرا —— پھر نانی کی چیخیں ایک دَم رُک گئیں۔ آنسو خشک ہو گئے، سر جھک گیا اور زبان گنگ ہو گئی۔ ہجومِ رنج وغم نے اُسے اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔ رات بھر اس نے ہچکیاں سِسکیاں لیتے پَل پَل کر کے گذار دی۔ کبھی بدحواس ہو کر وہ اپنے ماں باپ کا نام لے لے کر آوازیں دیتی۔ کبھی اپنے مرحوم میاں کو پکارتی۔ کبھی نحتی اور بسم اللہ کو یاد کرکے بین کرتی۔ کبھی آپ ہی آپ رونے لگتی۔ کبھی مُسکرانے لگتی اور کبھی حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مخبوط الحواس ہو گئی ہے۔ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ اس حالت میں بھُوکی پیاسی اس نے دو دن گذار دیئے تو محلّے والے "دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت" کے مصداق پسیج گئے۔ اور آہستہ آہستہ اُنھیں احساسِ ندامت ہونے لگا کہ آخر جو چیزیں نانی سے ملی تھیں وہ اُن کے لئے بالکل بیکار تھیں۔ اور یُوں دیکھا جائے تو وہ نانی کے لئے بھی چنداں کار آمد نہ تھیں کہ گڑیا غرارہ، گلٹ کا تمغہ، تسبیح کا امام، ہلدی کی گانٹھ، سُرمہ دانی، کھلونی، تہمد کا ٹکڑا وغیرہ سب چیزیں بے مصرف تھیں —— آہستہ آہستہ جذبات پُرسکون ہو جاتے ہیں۔ مطلع صاف ہونے لگتا ہے۔

یہاں ایک نفسیاتی نکتہ ملحوظ رہے۔ نانی کا انواع واقسام کی بے مصرف اور بیکار چیزوں کو چُرانا اور انھیں تکیہ میں سینہ سے لگائے لگائے پھرنا انسان کی POSSESSIVE NATURE کا مظہر ہے۔ زردار اپنی تجوریاں بھر کر بھی مطمئن نہیں ہوتا اور زیادہ سے زیادہ سیم وزر سمیٹنے کی نامختتم ہوس میں دیوانہ وار جُٹا رہتا ہے۔ اس سے اُسے اپنی اہمیّت کا احساس ہوتا ہے، اس کی اَنا کو بالیدگی ملتی ہے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اتنی دولت اُس کے کام نہیں آئے گی مگر دولت کے لئے اس کی تشنگی اور گرسنگی کم نہیں ہوتی —— ایسے ہی ہم اپنے گرد وپیش آئے دن دیکھتے ہیں کہ بھکاری لوگوں کی بھانت بھانت کوڑے کرکٹ کے طور پر پھینکی ہوئی چیزیں اُٹھا کر کے اپنی گٹھڑی میں سمیٹے پھرتے ہیں، حالانکہ وہ اُن کے مصرف کی نہیں ہوتیں مگر انھیں اُن سے ایک طرح کی قلبی تسکین ملتی ہے کہ وُہ ایسے بے مایہ اور بے وقعت نہیں۔ وہ بھی کسی چیز کے مالک اور مختار ہیں۔ انسان کی POSSESSIVE NATURE نہ جانے کیا کیا گُل کھلاتی ہے۔

نانی کو اپنی جمع کردہ چیزوں کے چلے جانے کا غم کھا جاتا ہے کہ وہ اس کے لئے حاصلِ حیاتِ فانی تھیں۔ قارون کا خزانہ تھیں۔ نانی نے اپنی زندگی میں بے شمار صدمے اُٹھائے اور ہر صدمے نے اسے بُری طرح جھنجھوڑ دیا اور ہر صدمے کو اُس نے آخری صدمہ تصوّر کیا مگر صدمے تھے کہ تواتر سے نازل ہوتے گئے۔ مگر یہ صدمہ فی الواقع اُونٹ

کی بیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہُوا، جس نے اس نیم جان کو بیجان سا کر دیا ـــــ جب نانی کا میاں مرا تو نانی اپنی زندگی سے ہی نا اُمید ہوگئی تھی۔ بسم اللہ فوت ہوئی تو صدمہ سے نانی بمشکل جانبر ہو پائی۔ اور جب ننھی اس کے مُنہ پر کالک پوت کر چل دی تو اس نے سمجھا کہ یہ آخری صدمہ ہے جو اسے سہنا پڑ رہا ہے۔ مگر اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی عُمر بھر کی "کمائی" یوں ایک بندر کے ہاتھوں برباد ہو جائے گی۔ اس صدمہ نے تو اس کی رُوح ہی قبض کر لی۔ اُسے اپنی ذات میں ہی کوئی دلچسپی نہ رہی۔ یہ وہ مقام ہے جب انسان زندہ درگور ہو جاتا ہے۔ جیتے جی مر جاتا ہے۔

نانی اپنی زندگی میں نہ جانے کس کرب و عذاب سے گذری"۔ اسے سات بار چیچک ہُوئی۔ اس کی انگلیوں کے پورے لوگوں کا گوموت دھوتے سڑ گئے اور ہتھیلیاں برتن مانجھتے مانجھتے چھلنی ہوگئیں۔ ہر سال برسات کے موسم میں وہ ہیضہ کا شکار ہو جاتی اور ہر سال اندھیرے اُجالے وہ اُونچی نیچی سیڑھیوں سے لڑھک پڑتی اور دو چار دن لوٹ پوٹ کر پھر گھسٹنے لگتی"۔ وہ بڑی سخت جان تھی۔ جبھی تو اتنی محنت مشقت اور مصائب کی یورش کے باوصف زندہ رہی ـــــ ایک صبح بہشتی مشک ڈالنے گیا تو اس نے دیکھا کہ نانی کھپریل کی سیڑھیوں اکڑوں بیٹھی ہے۔ اس کا مُنہ کھلا ہے اور نیم باز آنکھوں کے کونوں میں مکھیاں گھُس رہی ہیں۔ اس دن نانی دنیا کو ایک مُستقل گالی دے کر چل بسی ـــــ مر کر نانی زندہ ہوگئی۔

کئی بار خیال آتا ہے کہ ننھی کی نانی کو کس تقصیر کی پاداش میں زندگی بھر اس قدر دُکھ درد جھیلنا پڑا۔ روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کے لئے ترسنا پڑا۔ چیتھڑے پہننے پر مجبُور ہونا پڑا ـــــ وہ کیوں گلی کوچوں میں ماری ماری پھرتی رہی اور جو گری پڑی چیزیں ملتیں انھیں حرزِ جان بنا کر سمیٹتی رہی ـــــ کیوں اس کی معصُوم "ننھی" کو ایک شیطان سیرت انسان کے استحصال کا شکار ہونا پڑا؟ کیوں سماج کے بھیڑیے اُسے بے یار و مددگار پا کر اس پر پل پڑے۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ ـــــ آپ چُپ کیوں ہوگئے؟ بولتے کیوں نہیں؟ کچھ تو بولئے نا! ـــــ یہ سماج کا دستُور ہے کہ جواب بن نہ پڑے تو لوگ چُپ سادھ لیتے ہیں۔ نہ کوئی اقبالِ جرُم کرتا ہے اور نہ کسی کے دُکھ درد کا مداوا کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ننھی کی نانی بھُوکی پیاسی، ننگی مدام تڑپتی رہتی ہے۔

"ننھی کی نانی" کردار نگاری کے اعتبار سے ایک قابلِ قدر افسانہ ہے۔

بھُول بھلیاں

صلاح الدین (صلّو میاں) واحد متکلم (باجی یا بجّو) کے چچا کا اکلوتا بیٹا ہے جو کئی بہنوں کے بعد پیدا ہُوا تھا۔ سب گھر والے اس پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ اس کے ناز اُٹھاتے ہیں۔ ذرا اس کی طبیعت ناساز ہو تو منتیں مانگی جاتی ہیں، دُعائیں مانگی جاتی ہیں۔ کوئی اُونچا تک نہیں بولتا کہ صاحبزادے کے آرام میں خلل نہ پڑے ـــــ مگر اس قدر لاڈ چاؤ اور پیار دُلار سے بھی وہ کچھ اُوب سا جاتا ہے۔ شاید غیر معمولی توجّہ بھی طبیعت پر گراں گزرنے لگتی ہے

——— وہ چاہتا ہے کہ کسی سے چھیڑ چھاڑ کرے۔ اس لئے وہ خود ہی بے وجہ باجی سے بار بار اُلجھتا ہے، جو قریب قریب اس کی ہم عمر ہے۔ وہ تنگ آکر کبھی کبھی اسے بُری طرح ڈانٹ دیتی ہے اور وہ باز نہیں آتا تو اُسے پیار سے ہلکی سی چپت بھی لگا دیتی ہے ——— باجی سے وہ اس قدر ہل مل گیا ہے کہ اُس کے بغیر اُسے چین نہیں آتا۔ کالج سے آتا تو سیدھا باجی پر نازل ہوتا۔ اس کی بوٹی بوٹی پھڑکتی۔ نچلا بیٹھنا اسے ہرگز گوارا نہ تھا۔ بہنوں کو چھیڑنا، گُدگُدی کرنا، کسی کے گلے میں جھولنا، کسی کے کندھے میں ہنسی ہنسی میں کاٹ لینا اس کا معمول ہو گیا تھا ——— باجی کے پاس آکر وُہ اس سے چمٹتا، لپٹتا، گدگدی کرتا، اور اس کے ہزار کوشش کرنے پر بھی ٹالے نہ ٹلتا ——— باجی سے اُسے کچھ زیادہ ہی لگاؤ تھا۔

کبھی کبھی باجی کو خیال آتا کہ کاش اس کے اتنے ڈھیر سارے بھائیوں کی جگہ صلّو میاں کی طرح ایک ہی دُبلا پتلا، جھگڑالو اور لڑاکو بھائی ہوتا تو کتنی رُومانی بات ہوتی ——— یہ ایک طرح سے باجی کا صلّو میاں کے تئیں چاہت کا مُبہم سا، خاموش سا اظہار تھا، جو اُس کے دل کے کسی تاریک سے کونے میں غیر شعوری طور پر بیدار ہو رہا تھا ——— صلّو میاں کی ہر بات میں پیار کی، لگاؤ کی چاشنی تھی۔ اس کے ہاتھ چلتے تھے، زبان چلتی تھی اور چُپ بھی رہتے تو اس کی خاموشی بولتی۔ وہ موجود ہوتو گھر بھرا بُرا لگتا تھا اور اُس کی غیر موجودگی میں فضا اُداس اُداس ہو جاتی تھی ——— باجی کے تعلق سے وہ بلا کا ضدی اور ہٹیلا تھا۔ وہ باجی سے کسی بات کا تقاضا کرتا تو اس کے انکار پر ضد پر اُڑ جاتا۔ اور باجی ہزار کوشش کرے، وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ اس کی ضد میں بھی دل جوئی تھی اور دل بستگی تھی۔ قربت کی چاہ تھی۔ ملاحظہ ہو:

"باجی ذرا کرتے میں یہ بٹن ٹانک دو۔" وہ اپنی پتلی گردن آگے بڑھا کر بولا "جھٹ پٹ ٹانکو، مجھے میچ میں جانا ہے۔"[1]

مگر باجی اپنے ناول کے ایک بڑے دلچسپ اور پُرکشش موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ اس لئے اُسے پڑھنا چھوڑ کر صلّو کی قمیص میں بٹن ٹانکنا گوارا نہ تھا ——— باجی صلّو سے کہتی ہے کہ وہ رابعہ سے کہے کہ وُہ بٹن ٹانک دے۔ مگر صلّو اصرار سے کہتا ہے کہ وہ بٹن اس سے ہی ٹنکوائے گا ——— باجی یہ بھی کہتی ہے کہ اس کے پاس اتفاق سے سوئی بھی تو نہیں۔ مگر صلّو لپک کر اماں کی بقچی سے سوئی نکال کر اُسے دے دیتا ہے اور اسے تاگہ پرونے کو کہتا ہے ——— اس کی اماں اپنا سروتا چھوڑ کر اس کا بٹن ٹانکنے پر آمادگی ظاہر کرتی ہے، مگر صلّو کو یہ ضد ہے کہ وہ بٹن بہرصورت باجی سے ہی ٹنکوائے گا ——— اب باجی صلّو کی بے جا اور بے معنی ضد پر خود بھی ضد پکڑ لیتی ہے

---

[1] عصمت چغتائی "بھول بھلیاں" مجموعۂ "چوٹیں" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۸۸

اور اُسے راشدہ سے بٹن ٹکوانے کو کہتی ہے مگر صلّو اب جارحانہ رویّہ اختیار کرتا ہے اور باجی کو کتاب ایک طرف رکھ دینے کو کہتا ہے اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دیتا ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گی تو وہ اس کی کتاب پھاڑ دے گا۔ اس پر باجی بھی ذرا تنک کر کہتی ہے کہ "جاؤ ہم نہیں ٹانکتے" ــــــ صلو یہ سُن کر ظاہرہ طور پر برہم ہو جاتا ہے کہ وہ آج یا تو بٹن اس سے ٹکوائے گا یا اس کا خوُن بہا دے گا ــــــ بات بگڑتی دیکھ کر راشدہ اپنے بھائی کو بٹن ٹانکنے کی پیش کش کرتی ہے :

"صلّو لاؤ میں ٹانک دُوں ذرا سی دیر میں۔" راشدہ بولی۔

"کہہ دیا صلاح الدّین اعظم ایک جو کہہ دیتے ہیں وہ ٹلتی نہیں ــــــ دیکھو باجی ٹانکتی ہو یا۔۔"

"یا کیا؟" میں نے تیوریاں چڑھائیں۔

"یہی کہ میچ دیکھنے نہیں جاؤں گا۔ اور ایک لفظ کتاب کا نہیں پڑھنے دُوں گا۔ اور موقع ملنے پر کتاب پار کر دوں گا۔"

اس پر باجی کو ہنسی آجاتی ہے اور اُسے ہنستا دیکھ کر صلّو اُسے مٹھاس بھرے انداز میں منّت سے کہتا ہے۔

"او ہو۔ لو بس تو پھر پیاری سی بجّو (باجی) کی طرح ٹانک دو۔"[1]

باجی وبال ٹالنے کے لئے پسیج کر بٹن ٹانکنا شروع کرتی ہے تو صلّو اُسے حسبِ معمول گُدگُدانے لگتا ہے۔ باجی نے صلّو کو منع کیا کہ اگر وُہ اس سے چھیڑ چھاڑ کرے گا تو اس کا ہاتھ ہل جائے اور سُوئی اس کے چبھ جائے گی ــــــ صلّو نے جواب دیا کہ بیشک سُوئی اس کے جسم میں اُتر جائے اور وہ گدگدانے سے باز نہ آیا ــــــ باجی نے مذاق میں اُسے سُوئی چبھونا چاہی، صلّو ہٹا تو نہ جانے اُسے سوئی کیسے چبھ گئی اور اس کی نوک ٹوٹ گئی اور خوُن نکل آیا۔ سب کو معلوم تھا کہ سُوئی اگر خوُن میں کھو جائے تو دل میں جا پہنچتی ہے اور جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے ــــــ اب صلّو بڑے ڈرامائی انداز میں اپنی امّاں کو آواز دے کر کہتا ہے :

"سوئی میرے سینے میں اُتر گئی اور اب خون میں چلی جائے گی اور پھر۔۔۔ پھر دل میں آجائے گی۔ لو امّاں جان ہم تو چلے۔"[2]

گھر میں کہرام مچ جاتا ہے۔ امّاں کو سکتہ ہو جاتا ہے۔ بہنیں چیخنے چلّانے لگتی ہیں۔ صلّو سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ باجی کا دل دھک سے رہ جاتا ہے اور اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے ــــــ وہ ہڑ بڑ مچاتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

[1،2] عصمت چغتائی: "بھول بھلیاں" مجموعہ "چوٹیں" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۸۹، ۹۰۔

——ایکس رے ہوتا ہے مگر سوئی کا نام و نشان نہیں ملتا۔ گھر والے سجدے کرتے ہیں۔ دعائیں مانگتے ہیں۔
اور باجی فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر رونے لگتی ہے—— اور صلّو اس کی طرف دیکھ کر مُسکرانے لگتا ہے:

"اب تو چین آگیا ہے آپ کو۔"

"میں نے سر جُھکا لیا۔

"اچھا یہاں آئیے، ذرا میرے سر میں تیل تھپک دیجئے۔"

بھلا اب مجھ میں ہمت کہاں تھی جو انکار کروں۔ چُپ چاپ سر میں تیل ڈالنا شروع کیا۔ صلّو فتحمندانہ انداز سے مُجھے آنکھیں چڑھا چڑھا کر دیکھتا اور مُسکراتا رہا۔

"دیکھا میرا حکم نہ ماننے کا نتیجہ!" وہ میری انگلی میں چٹکی نوچ کر بولا "سوئی تو میرے گریبان ہی میں رہ گئی تھی۔"

غصّے کے مارے میرا خون کھول گیا۔[1]

ظاہر ہے کہ جب سوئی کی نوک ٹوٹ کر اس کے گریبان میں ہی رہ گئی تو اس نے اس کی بابت خاموش رہنا ہی قرینِ مصلحت جانا اور رو او یلا مچا کر گھر میں طوفان سا برپا کر دیا۔ اُس نے یہ ڈھونگ باجی کو ستانے، رُلانے اور اُسے پریشان دیکھ کر حظ اُٹھانے کے لئے رچا تھا۔ یہ اس کا باجی سے اپنے لگاؤ کے اظہار کا ایک مخصوص انداز تھا—— اور باجی اس سے خوب واقف تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لگاؤ یک طرفہ نہ تھا۔

○ مگر صلّو جو اب تک اشاروں کنایوں میں، دبے دبے انداز میں باتیں کر رہا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ کھلتا جاتا ہے۔ اس کی جھجک، شرم معدوم ہوتی جاتی ہے۔ اور اس کی باتیں زیادہ واضح اور بلند آہنگ ہوتی جاتی ہیں۔ اس کے جذبات میں حدّت اور شدّت در آتی ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ ابھی وہ کم عمر ہے، مگر باجی سے وہ اپنی شیفتگی کا برملا اظہار کرتے سے نہیں جھجکتا:

"مجھے تم سے کام کروانے میں مزا آتا ہے۔ جب میں نوکر ہو جاؤں گا تو تمھیں اپنے پاس رکھوں گا۔"

"ہوش میں، میری جوتی رہتی ہے تیرے پاس۔"

"دیکھ لینا، میں تمھیں لے لوں گا—— گود لے لوں گا—— ہنستی کیوں ہو۔"

مجھے ہنسی آگئی۔

"اور پھر تمھیں ہوائی جہاز میں بٹھاؤں گا۔ ہاں۔۔۔" وہ آنکھیں گھما کر بولا۔[2]

---

[1] [2] عصمت چغتائی، "بھول بھلیاں"، مجموعہ "چوٹیں"، روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۹، ۹۱

یہ صلّو کا باجی سے اپنی محبت کا بڑا کھلا اظہار تھا ـــــ صلّو کو باجی سے کام کروا کر مزا اس لئے آتا ہے کہ اس سے اُسے باجی سے قربت کا احساس ہوتا ہے ـــــ اور لُطف یہ ہے کہ باجی اس کی بات کا بُرا نہیں مانتی۔ اس کا صلّو کی بات سُن کر "میری جوتی رہتی ہے تیرے پاس" کہنا بھی محض ایک اضطراری فعل تھا جو اس کے دلی جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا کہ اس میں تصنّع اور بناوٹ تھی ـــــ پھر باجی کا اس کی بات سُن کر ہنس دینا اس بات کا مظہر ہے کہ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی ـــــ صلّو کے ان الفاظ سے کہ "دیکھ لینا ـــــ میں تمھیں لے لوں گا" اس کے ارادے کی پختگی ٹپکتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی سے مُستقبل میں اُسے پانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ خیالات ایسے ہی دبے پاؤں انسان کے قلب و ذہن میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ پھر وقت پاکر کونپل پھوٹتی ہے اور آہستہ آہستہ تنا اور شجر کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یوں مبہم، غیر واضح خیالات بالیدگی حاصل کر کے حقیقت کا جامہ اوڑھ لیتے ہیں۔ بظاہر اَن ہونی سی بات ٹھوس سچائی بن کر سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ انسانی ذہن بڑی انوکھی، بڑی کرشماتی چیز ہے ـــــ نہ جانے ہمارے تحت الشعور میں کیا کیا خیالات پلتے رہتے ہیں اور اکثر ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔

○ وقت اپنی روایتی برق رفتاری سے پیش رفت کئے جاتا ہے ـــــ بات آگے بڑھتی ہے۔ باجی امتحان کی تیاری میں مصروف ہے۔ وہ کمرہ بند کر کے پڑھنے بیٹھتی ہے تو صلّو اُسے تنگ کرنے آدھمکتا ہے۔ باجی اُسے سنجیدگی سے تنبیہہ کرتی ہے کہ اگر اس نے اپنا رویّہ جاری رکھا تو وہ بورڈنگ میں داخل ہو جائے گی ـــــ اس پر صلّو خاموشی سے الگ پڑھنے لگتا ہے مگر ایک آدھ گھنٹہ بعد ہی اُوب کر پھر باجی کے پاس آن گھُستا ہے ـــــ اب اُسے ہنسی مذاق میں کاٹنے کا مرض لاحق ہو جاتا ہے:

"بات یہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ تمھیں کھا جاؤں" وہ ہنس کر دانت پیستا ہے۔"

"خود اپنی بوٹیاں چباڈالو۔" مگر وہ بُری طرح لپٹ جاتا۔ اور باوجود دھکیلنے کے تنگ کئے جاتا۔"[1]

صلّو کی باجی کو کھا جانے کی خواہش اور اس کا دانت پیس کر بات کرنا، اس کے شدّتِ جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اور باجی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ دراصل اب باجی خود صلّو کی جانب کھنچی جا رہی ہے۔ اگر صلّو موجود نہ ہوتا تو اسے گھُٹن سی محسوس ہونے لگتی۔ فضا میں اُداسی سی چھا جاتی اور اُسے کسی چیز کی کمی کا احساس ہونے لگتا ـــــ درحقیقت گھر کی تمام رونق اس واحد شخص کی ذات سے تھی کہ اس کی آواز ہمہ وقت گھر کے چاروں کونوں میں گونجتی رہتی تھی ـــــ جب کوئی اس کے چڑانے، رُلانے، چھیڑ چھاڑ کرنے پر رُوٹھ جاتا

---

[1] عصمت چغتائی "بھول بھلیاں" مجموعہ "چوٹیں" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۹۲

تو وُہ چمکار کر منالیتا اور رفعتا پھر سے مسکرانے لگتی۔

○ باجی کے امتحان ختم ہو جاتے ہیں اور وہ گھر جانے کی تیاری کرنے لگتی ہے اور اُسے "خوشی کے ساتھ دُکھ بھی ہو رہا ہے" ـــــ "خوشی" اُسے گھر واپس جانے کی ہے اور "دُکھ" اُسے صلّو سے بچھڑنے کا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر اس کی زندگی کا حصّہ بنتا جا رہا ہے۔ اس کے خیالوں میں رچنے بسنے لگا ہے۔ گو اس نے ابھی تک صلّو سے اپنی محبّت کا برملا اظہار نہیں کیا مگر محبّت میں اکثر بہت سی باتیں اَن کہی بھی رہ جاتی ہیں۔ اور پھر خاموشی کی بھی تو ایک اپنی ہی زبان ہوتی ہے، جو بزبانِ بے زبانی بہت کچھ کہہ ڈالتی ہے ـــــ صلّو نہیں چاہتا کہ باجی اپنے گھر واپس جائے اور باجی کے برعکس وہ اپنے جذبات کا برملا اظہار کرتا ہے :

"کیوں جا رہی ہو چھٹیوں میں" وہ ایک دن بولا۔

"واہ میری اماں بیچاری اکیلی نہیں"

"اکیلی! جیسے انھیں بڑی تمھاری پروا ہے"

"ہوں، اور نہیں تو تمھیں پروا ہوگی"

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ "سچ کہتا ہوں بجو۔۔۔ سچ کہتا ہوں تم نہ جاؤ" اس نے پیار سے میرے کندھے پر سر رکھ دیا اور اپنی سوکھی باہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں[1]

صلّو کے اس اُمڈتے ہوئے پیار میں، اس جھکتی ہوئی التجا میں باجی کے تئیں اس کے جذبات چھلکے پڑتے ہیں۔ وہ اپنی کم فہمی میں سمجھتا ہے کہ باجی کی مادرِ مہربان بھی اُس سے اِس قدر محبّت نہ کرتی ہوگی جتنی وہ باجی سے کرتا ہے ـــــ اور پھر دیکھئے کہ وہ کس قدر نرم اور ملائم انداز میں، کس قدر عاجزی اور انکساری سے، اسے منانے کی کوشش کرتا ہے۔ "سچ کہتا ہوں بجو۔۔۔ سچ کہتا ہوں تم نہ جاؤ" اور پیار سے اس کے شانے پر سر رکھ کر اپنے بازُو اس کے گلے میں ڈال دیتا ہے۔ اس کی اس ادا میں کتنی معصومیت، کتنا خلوص، کتنی چاہت ہے۔ انسانی زندگی میں ایسا پیار بلوغ کی آمد پر ہی گھٹا بن کر آتا ہے اور سر سے پاؤں تک شرابور کر دیتا ہے۔ تب انسان نے زندگی کے اس پہلو کو نزدیک سے دیکھا پرکھا نہیں ہوتا اور وہ ہواؤں کے دوش پر نہ جانے کن دُنیاؤں میں پرواز کرتا پھرتا ہے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ دوسرے روز ہی صلّو کو بخار چڑھتا ہے۔ معمولی ملیریا بخار تھا مگر سب لوگ بے چین ہو جاتے ہیں۔ صلّو اب کے امّاں جان کو بے حد اصرار سے کہتا ہے کہ وہ باجی کو جانے سے روک لیں۔ رابعہ نے بھی باجی سے

---

[1] عصمت چغتائی: "بھُول بھُلیاں" مجموعہ "چوٹیں"۔ روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۹۲

تقاضا کیا کہ جب صلّو اس قدر ضد کر رہا ہے تو وہ رُک جائے اور اُسے رُکتے ہی بنی ـــــ یہ صلّو کی فتح تھی اور اُسے اِس امر کا احساس تھا۔

"صلاح الدین اعظم کا حکم" وہ شرارت سے مسکرایا۔ "میرے مونچھیں نکل آئیں تب تم پر اصلی رُعب پڑے گا۔ لو اس بات پر ذرا سی برف کُٹی کر تو کھلا دو"[1]

صلّو چاہتا ہے کہ وہ باجی پر پُوری طرح چھا جائے۔ وہ جیسا کہے باجی بے چُون وچراں ویسا ہی کرے۔ گویا وہ کُلیتاً اس کے زیر اور تابع ہو۔ اس کے تصرّف میں ہو۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی یہ خواہش قبل از وقت ہے۔ ہاں جب اس کے مُونچھیں نکل آئیں گی اور وہ پُورا مرد بن جائے گا تو باجی خود بخود اُس سے مرعُوب ہو جائے گی۔ اس کی ہی ہو جائے گی ـــــ رات کو "بجّو ـــــ بجّو" کہہ کر صلّو باجی کو پکارتا ہے اور اس سے پانی مانگتا ہے۔ باجی گلاس میں اُسے پانی دیتی ہے تو وہ اُسے اپنے سرہانے بٹھا لیتا ہے۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں اور وہ پانی پی کر اپنا سر اُس کی گود میں رکھ کر لیٹ جاتا ہے۔ باجی چاہتی ہے کہ وہ چچی جان کو جگائے مگر وہ منع کر دیتا ہے۔ اور اُسے اپنے پاس سے ہلنے نہیں دیتا اور اپنا پتلا سا بازو اس کی کمر میں ڈال دیتا ہے ـــــ صلّو گہری گہری اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لینے لگتا ہے۔ باجی کا نام لے کر بڑبڑاتا ہے۔ سسکیاں بھرتا ہے ـــــ اور باجی اس کی یہ کیفیت دیکھ کر وحشت زدہ ہو جاتی ہے اور سمجھ نہیں پاتی کہ اُسے کیا ہو گیا ہے ـــــ "بجّو مت جاؤ ... میں مر جاؤں گا" اور وہ بچّوں کی طرح اس سے لپٹ جاتا ہے۔

ـــــ آج باجی کو پہلی بار صلّو کی آنکھیں بہت عجیب سی لگتی ہیں۔ وہ پہلے کی طرح روشن اور شوخ آنکھیں نہ تھیں۔ وہ چڑھی ہوئی، گہری اور وحشی آنکھیں تھیں۔ نہ جانے ان آنکھوں سے کونسا انجانا جذبہ جھانک رہا تھا ـــــ جب قریب کے پلنگ سے کوئی کلبلاتا ہے تو وہ جلدی سے چونک کر باجی کو پرے دھکیلتے ہوئے کہتا ہے۔ "جاؤ ـــــ رابعہ جاگ گئی" ـــــ صلّو کے یہ الفاظ باجی کی فہم سے بعید ہیں۔ وہ "جاؤ، رابعہ جاگ جائے گی" کی ماہیت سمجھ نہیں پاتی۔ اس کی بات باجی کے لئے پہیلی سی بن جاتی ہے۔ مگر یُوں دیکھا جائے تو وہ کوئی پہیلی بھی نہیں تھی۔ بہر حال صلّو کے یہ الفاظ بہت اہم اور پُر معنی ہیں کہ اب صلّو عمر کے اعتبار سے نیم بلوغت یا بلوغت کے دوراہے پر پہنچ چکا تھا۔ ایک طرح سے اس نے اپنی "معصُومیت" کھو دی ہے۔ اسے احساس ہے کہ رات کو اس کا باجی کی گود میں یُوں سر رکھ کر اور بازو اس کی کمر میں ڈال کر لیٹنا گھر والوں کی نظر میں، جو پاس ہی سوئے پڑے ہیں، ایک قابلِ مذمّت فعل ہو گا۔ اس لئے وہ گھبرا کر باجی کو پرے دھکیل دیتا ہے۔ اس کا یہ فعل جنسی احساس کا مظہر ہے ـــــ اور پھر

---

[1] عصمت چغتائی، "بھول بھلیاں"، مجموعہ "چوٹیں"، روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۹۳

اس کی آنکھوں کا چڑھ جانا اور گہرا ہو جانا اپنے اندر کئی بھید چھپائے ہوئے ہے۔ اس کی آنکھوں میں اب "آرزو" اور "اُمنگ" جھلکنے لگی ہے ــــ لڑکپن رخصت ہُوا، اب جوانی دیوانی کی آمد آمد ہے۔ جب جنسی جذبہ آپ ہی آپ انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا ہے ــــ یہ احساس کس قدر پُر لطف، مسرت زا اور جانفزا ہوتا ہے۔

اب صلّو میں ایک غیر معمولی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ وہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی شوخ و شنگ اور جارح ہو جاتا ہے۔ باجی سے پہلے سے بھی زیادہ کھُل کر چھیڑ چھاڑ کرنے لگتا ہے۔ ہر حیلے بہانے اُس کے پاس گھُستا ہے اور گدگدگاتا ہے۔ اور اس ضرورت سے زیادہ توجہ سے باجی کا پُرسکون ذہن متلاطم ہو جاتا ہے ــــ کبھی کبھی اُسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک معصوم الھڑ لڑکے کی شوخیاں ہیں مگر یہ اس کی کم فہمی ہے کہ اب صلّو کی ہر حرکت، ہر شرارت بامعنی اور بامقصد ہے۔ ارادی اور دانستہ ہے۔ وہ شباب کی وادی میں قدم رکھ چکا ہے اور وہ جذبہ جو کشاں کشاں ایک مرد کو صنفِ نازک مائل کرتا ہے، اس میں پُوری آب و تاب کے ساتھ ہو یدا ہو چکا ہے۔
ــــ باجی پر بھی یہ کیفیت طاری ہو چکی ہے مگر قول و فعل سے اس کے برملا اظہار میں شاید اس کی فطری نسوانی شرم و حیا مانع ہے۔ وہ بھی صلّو کی طرف مائل ہے۔ مائل نہ ہوتی تو اس سے رشتہ ناتا توڑ لیتی اور اُسے مُنہ نہ لگاتی۔ مگر وہ بہ رضا اور رغبت خاموشی سے اس کا کہا مانتی ہے۔ اس کی ہر خواہش کی تکمیل کرتی ہے۔ وہ کہیں صلّو کے بڑھتے ہوئے جارحانہ رویّے کے خلاف مزاحمت نہیں کرتی۔ آواز تک نہیں اُٹھاتی۔ پھر وہ صلّو کی ہم عمر ہے اور زندگی کے اسی ہیجانی دَور سے گُزر رہی ہے جس سے کہ وہ گذر رہا ہے۔ جب انسان پر یہ دَور نازل ہوتا ہے تو اس کا سیلِ رواں اُسے اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے اور ہزار کوشش کرنے پر بھی اس کے قدم اُکھڑ جاتے ہیں اور یہ دَور اپنے دامن میں زمانے بھر کا تلطّف و تلذّذ سمیٹے ہوتا ہے۔

○ دو سال بعد جب باجی رابعہ کی شادی پر آئی ہے تو صلّو بھر پُور جوان ہو چکا تھا۔ اب وہ پُرانا دھان پان صلّو نہ تھا۔ وہ فی الواقع اس کے اپنے کہنے کے مطابق "صلاح الدّین اعظم" میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اُس کی مُونچھیں نکل آئی تھیں۔ گرم خُون کی حدّت سے اس کا رنگ سنولا گیا تھا۔ دُبلے پتلے بازُو مضبُوط اور توانا ہو کر بالوں سے ڈھک گئے تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کچھ زیادہ ہی بڑے بڑے سے لگتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی شوخی، شرارت اور وحشت سی دَر آئی تھی اور جو انھیں دیکھتا بس آنکھیں جھپکتا رہ جاتا ــــ اس نے زبردستی اپنا کھُردرا گال باجی کے ہاتھ پر زور سے رگڑ دیا تو اسے یوُں لگا جیسے لوہے کا برش ہو۔ یہ بھی اس کی مردانگی کی علامت تھی، مبہم ہی سہی ــــ شادی والے گھر کی گہما گہمی میں باجی جہاں جاتی صلّو موجود ہوتا۔ ہر وقت باجی کی ٹوہ میں رہتا اور جہاں پاتا اس کے پاس گھُستا۔ یہاں تک کہ وہ رابعہ کے ساتھ رضائی اوڑھے ہوتی تو وہاں بھی آن گھُستا۔ گُدگُدیاں کرتا۔ اپنی شوخیوں اور شرارتوں سے اُسے تنگ کرتا، ہنساتا، رُلاتا اور پھر منا بھی لیتا ــــ

باجی کو احساس ہو جاتا ہے کہ صلاح الدّین کی حد سے تجاوز کرتی ہوئی حرکتیں آخر رنگ لائیں گی۔ سب کی انگلی اس پر اُٹھے گی اور وہ کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔ صلّو تو مرد ہونے کے ناطے معصومیت اور بے گناہی کے انداز میں کپڑے جھاڑ کر الگ کھڑا ہو جائے گا۔ مگر اس کی عاقبت خراب ہو جائے گی۔ ہندوستانی معاشرے کا دستور ہے کہ سارا گناہ عورت کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔ مگر وہ اُسے تنبیہہ کرنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہی تھی کہ صلاح الدّین اس کی ہر بات ہنسی مذاق میں اُڑا دیتا ہے ـــــ آخر ایک دن وہ طبیعت پر جبر کر کے حرفِ شکایت زبان پر لے ہی آتی ہے:

"ہٹ جاؤ صلاح الدّین۔ حد ہوتی ہے بے ہودگی کی۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔"

"ایں۔۔" اس کا منہ اُتر گیا۔ "کیا ہُوا بجّو؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ تمھیں معلوم ہے لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"میرا بولنا۔۔۔ میرا۔۔۔ آپ کو بُرا لگتا ہے؟"

"ہاں مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔ اچھی بات نہیں۔ لوگ۔۔۔"

"لوگ؟ کون لوگ؟ کون لوگ ہیں وہ؟ مجھے بھی بتاؤ ذرا۔۔"

"کوئی بھی ہوں وہ میری اور تمھاری بہتری چاہنے والے۔"

"بہتری؟" وہ سرخ ہو گیا۔

"ہاں اسی میں بہتری ہے۔۔" اور میں تیزی سے چلی آئی۔[1]

آج باجی کو یوں لگا جیسے اُس کے دل و دماغ سے کوئی بھاری بھرکم بوجھ اُتر گیا ہو۔ ایک خدشہ سا جو اُسے ایک عرصے سے مضطرب کئے ہوئے تھا، ہمیشہ کے لئے معدُوم ہو گیا ہو۔ وہ دل ہی دل میں خدائے بُزرگ و برتر کا شکر بجا لاتی ہے کہ اس کی آنکھیں بروقت کھُل گئیں اور اس کی عاقبت خراب ہونے سے بچ گئی ـــــ وہ مسرت سے اندر ہی اندر مُسکرا دیتی ہے ـــــ مگر یہ باجی کی نادانی تھی کہ فوری ردِّعمل کے طور پر جب صلاح الدّین نے باجی سے آنکھ چُرانی شروع کی اور اسے دیکھ کر اَن دیکھی کرنے لگا تو اسے سخت دھکّا سا لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اُس کی دُنیا ہی اُجڑ گئی ہو۔ جیسے شادی بیاہ والے گھر میں ماتم چھا گیا ہو۔ اس نے چاہا کہ شادی بیچ میں ہی چھوڑ کر گھر واپس چلی جائے ـــــ گویا اُس کے صلاح الدّین کو ایک مخصُوص فاصلے پر رکھنے کے ارادے ہَوا میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ اور اُس کے حقیقی جذبات اُبھر کر سامنے آ گئے اور وہ پریشان ہو گئی ـــــ انساں دوسروں کو دھوکا

---

[1] عصمت چغتائی: "بھُول بھُلیاں" مجموعہ "چوٹیں"۔ روہتاس بُکس۔ لاہور۔ ص ۹۷

دے سکتا ہے مگر خود کو دھوکا نہیں دے سکتا۔

باجی کے دل و دماغ میں جو اُتھل پتھل مچی۔ اُس نے اُسے نڈھال کر دیا۔ رمز شناس تاڑ گئے کہ ضرور کوئی بات ہے۔ چچی نے باجی سے پوچھ ہی لیا کہ کیا صلّو سے اس کی اَن بَن ہو گئی ہے؟ باجی نے انکار کیا تو صلّو بول اٹھا کہ ہماری تو لڑائی ہے۔ چچی نے اسے باجی سے معافی مانگنے کو کہا تو وہ بولا کہ معافی تو باجی کو مانگنی چاہیئے۔ چچی نے مُصر ہو کر پوچھا کہ آخر ہُوا کیا؟ صلّو نے بات لپک لی :

"ہُوا یہ کہ۔۔۔ خواہ مخواہ ڈانٹنے لگیں۔۔"

"کچھ بھی نہیں چچی جان۔ یہ مجھے چھیڑ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا مجھ سے مت بولو۔ بھلا میں اس سے لڑوں گی"۔ میں جلدی سے بولی۔

"نہیں اماں جان۔ کیسی بھولی بن رہی ہیں۔ ایسے اُنھوں نے نہیں کہا تھا۔[1]"

گویا صلّو کے نزدیک باجی نے کہا تو یہی تھا مگر "ایسے نہیں کہا تھا" گویا بات تو یہی کہی تھی۔ مگر انداز ذرا مختلف تھا۔ گویا باجی کی بات میں فی الواقع "ڈانٹ" شامل تھی اور ڈانٹ بھلا کون سہتا ——— باجی کو یہ فکر ستا رہی تھی کہ اگر کمبخت نے ساری باتیں من و عن بیان کر دی تو بڑی مشکل ہو گی ——— اور اب اسے اپنے آپ پر ہی شک ہونے لگا کہ شاید اسے صلّو کو سمجھنے میں غلطی ہُوئی کہ وُہ اُسے ایسا ویسا سمجھ بیٹھی۔ صلّو نے حرفِ شکایت زبان پر لاتے ہوئے کہا :

"مجھے ایسی بُری طرح کہنے لگیں۔۔۔ ہونہہ! جیسے میں کوئی وُہ ہوں۔

"ارے میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ لیجئے ملاپ ہو گیا۔ اب۔۔۔؟"

معلوم ہوتا ہے کہ صلّو شاید اس موقع کی تاک میں بیٹھا تھا کہ باجی مصالحت کی بات کرے تو وہ لپک کے جھپٹ لے اور مُڑ کر نہ دیکھے۔

"تو۔۔۔ اسی بات پر ہاتھ ملاؤ۔ اوہ۔۔۔ کس قدر سردی ہے۔ ساری رضائی آپ اوڑھے بیٹھی ہو۔ یہ نہیں کہ کسی اور کو بھی اوڑھا لو۔۔"

وہ رضائی میں گُھس کر بیٹھ گیا۔ اور میرے اتنی چُٹکیاں لیں کہ ملاپ کرنے کا مزا آ گیا۔[2]

اور پھر حسبِ معمول وہی آنکھ مچولی ہونے لگی۔ وہی بھُول بھلیاں۔ حتیٰ کہ عاقبت جس کی فکر میں باجی گُھلی جا رہی تھی، بھی کھلکھلا پڑی۔ گھر کا کونہ کونہ مسحور کُن نغموں سے گُونج اُٹھا۔ گویا محبت نہ جانے کن دشوار گذار

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ بھول بھلیاں۔ مجموعہ "چوٹیں" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۹۹، ۱۰۰

راستوں سے ہوتی ہوئی پروان چڑھ گئی۔ یہ دو چاہنے والوں کے لئے کتنی بڑی کامرانی تھی۔ کتنی بڑی شادمانی تھی۔

لڑائی پر جانے سے چند روز پہلے صلّو آیا تو برآمدے میں ننھّے کو کھیلتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ باجی سے بولا کہ اس نے اسے بتایا کیوں نہیں۔ وہ پریشان سا دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی پہیلی بوجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ باجی نے اسے بتایا کہ اُس نے ننھّے کو یتیم خانے سے لیا تھا تاکہ جی بہلا رہے ـــــ صلّو کے چہرے پر اب بھی تجسّس نمایاں تھا۔ باجی نے بات کا رُخ موڑنا چاہا مگر صلّو اس کی طرف لَوٹ آیا۔ اس کے تیور بدلے ؛

"بچارا بچّہ! مر گیا۔۔۔ اس کا باپ شاید" تلخی سے کہا۔

"خاک تمہارے مُنہ خدا نہ کرے۔۔۔" میں نے ننھّے کو کلیجے سے لگالیا۔

"ٹھائیں۔۔۔" ننھّے نے موقع پاکر بندوق چلائی۔

"ہائیں۔۔۔ باجی۔۔۔ ابا کو مارتا ہے" میں نے بندوق چھین لی۔ اور پھر آنکھوں میں وہی شرارت تڑپی۔۔۔ پھر۔۔۔ بلا کی گہری ہوگئیں۔۔۔ کچھ پاگل۔۔۔ عجیب سی۔۔۔ ٹٹولنے کے باوجود اس بھول بھلیاں میں راستہ نہ ملا"[1]

صلّو کی ان گہری آنکھوں میں جذبات کا سمندر موجزن تھا۔ ان میں فتحمندی کا بھرپور احساس بھی ہوگا۔ ان میں پھر سے کسی کے وجود میں کھو جانے کی نرم گرم آرزو بھی ہوگی!

اس افسانے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ عصمت نے اس میں بلوغت کے دَور کی جس خوبصورتی سے تصویرکشی کی ہے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ بلوغت کا دَور مرد کی صورت میں چودہ سال سے شروع ہو کر پچیس سال تک رہتا ہے۔ گویا مرد چودہ سال کے بعد لڑکپن سے شباب کی وادی میں قدم رکھتا ہے اور پچیس برس کی عمر تک بلوغت کی تکمیل کر لیتا ہے ـــــ ایسے ہی عورت بارہ سال کے بعد جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے اور اکیس سال تک اُس کی معراج کو چھُو لیتی ہے ـــــ دوسرے لفظوں میں پچیس سال کی عمر میں مرد مکمّل مرد بن جاتا ہے اور عورت اکیس سال کی عمر میں مکمّل عورت ـــــ بلوغت کا دَور انسانی زندگی میں بہت نازک، حسین، رنگین اور ناقابلِ فراموش ہوتا ہے کہ اس میں جنسی زندگی کے اسرار و رموز اس پر ایک کتاب کے اوراق کی طرح اپنے آپ ایک ایک کرکے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اس عمل کی نشوونمو کے لئے نہ مرد کو کسی درس و تدریس کی ضرورت ہوتی ہے نہ عورت کو۔ قدرت خود بخود اسے بروئے کار لاکر اپنے انجام تک پہنچاتی ہے ـــــ عصمت نے اس افسانے میں صلّو اور باجی کے بلوغت کے دَور کا ذکر جس فنّی چابکدستی اور ہنرمندی سے کیا ہے،

---

[1] عصمت چغتائی "بھول بھلیاں" مجموعہ "چوٹیں"۔ روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۱۰۱

اردو ادب میں اس کی مثال شاید ہی ملے ـــــ منٹو نے اپنے افسانے "دھواں" کی بنا بلوغت پر ہی رکھی ہے مگر وہ افسانہ موضوع اور ٹریٹمنٹ کی نوعیت کے اعتبار سے "بھول بھلیاں" سے قطعاً جداگانہ ہے اور دونوں میں کوئی عنصر قدرِ مشترک کی حیثیت نہیں رکھتا۔

اس افسانے میں صلّو اور باجی جو ایک دوسرے کے ہم عمر اور چچازاد بھائی بہن ہیں، ساتھ ساتھ شباب پُر بہار کی اَن دیکھی اَن جانی وادی میں قدم رکھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، ایک دوسرے میں گم قدم بہ قدم بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی قربت گہری ہوتی جاتی ہے۔ معصوم ہنسی مذاق میں سنجیدگی آنے لگتی ہے۔ جذبات اور احساسات میں نرماہٹ کے ساتھ گرماہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ صلّو مرد ہونے کے ناتے فطری طور پر ذرا جارح اور پہل قدمی کرنے والا ہے، جبکہ بجو نہ کرتی لامحالہ صلّو کی جانب کھنچی چلی جاتی ہے ـــــ چند برس کے مختصر سے دور میں دونوں کا لگاؤ جو ذہنی قربت سے شروع ہوا تھا، جسمانی ملاپ تک پہنچ کر اپنی منزل کو پا لیتا ہے ـــــ عصمت نے ایک دوسرے کی محبت میں شرابور دو جوان دلوں کے جذبات کی جس ملائمت، دردمندی اور ژرف نگاہی سے آئینہ داری کی ہے، وہ کچھ اُن جیسی ادیبہ ہی کا حصّہ ہے ـــــ اس افسانے میں ہر واقعہ، ہر کیفیت، ہر مکالمہ منظر کو روشن اور تاباں کر دیتا ہے۔ اور افسانے کے پیش رفت کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ برائے کرم ذرا پھر سے ان مکالمات پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالئے، جن کا اس تجزیے میں ذکر کیا گیا ہے، آپ پر یہ حقیقت آئینہ ہو جائے گی ـــــ اس خوبصورت قوسِ قزح کے رنگوں سے بھرپور افسانے کا حسن عصمت کی صنّاعانہ چابکدستی اور انسانی جذبات کی پُر حقیقت ترجمانی میں ہے۔

اس افسانے کا دوسرا اہم پہلو اس کا خوبصورت انجام ہے ـــــ عصمت کی کہانیوں کا انجام منٹو کی کہانیوں کی طرح بالعموم حیرت زا ہوتا ہے اور غیر متوقع ہونے کے سبب وہ قاری کو چونکا دیتا ہے اور فنکار کی فنی صنّاعی کی داد دیتے ہی بنتی ہے کہ اس نے کمال چابکدستی اور ہوشیاری سے کہانی کے انجام کو اس پر ظاہر نہ ہونے دیا ـــــ کرشن چندر "بھول بھلیاں" کا ذکر کرتے ہوئے عصمت کی کہانیوں کے اس پہلو کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> "کبھی کبھی تو افسانہ کے قریب اختتام ہونے تک اس کی سمت کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر یکایک سارا افسانہ اس تیزی سے گھوم کر حرفِ مطلب پر واپس آتا ہے کہ یکایک پڑھنے والے کی حیرت مسرّت میں مبدّل ہو جاتی ہے۔ ساری جزئیات صحیح، روشن، متناسب اور برمحل معلوم ہوتی ہیں۔ جذبات کردار سے کردار ماحول سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی فنی صنّاعی کی بہترین مثال "بھول بھلیاں" ہے۔"[1]

[1] کرشن چندر "بلاخیزی" (مضمون) مجموعہ "چوٹیں" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۱۰۸

یہاں کہانی کا مرکزی کردار صلاح الدین جب اس کے اختتام کے قریب اپنی محبوبہ باجی سے ملتا ہے تو اسے خود پتہ نہ تھا کہ ننھا اس کا بیٹا ہے۔ مگر جب وہ بچے کو، باجی کے کہنے کے مطابق، فی الواقع یتیم سمجھ کر ہمدردی کے طور پر کہتا ہے "بچارا بچہ! مر گیا . . . اس کا باپ شاید" تو باجی اِس بات کو سہہ نہیں پاتی کہ اس کے باپ کو جو اس کا محبوبِ صلاح الدّین خود ہے اور بنفسِ نفیس اس کے سامنے کھڑا ہے، مُردہ تصوّر کیا جائے۔ اس پر وہ برملا کہتی ہے "خاک تمھارے مُنہ میں۔ خُدا نہ کرے"۔ اور وہ بچّے کے ہاتھ سے بندوق لے لیتی ہے اور فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر بچّے کو کلیجے سے لگا لیتی ہے ـــــ محبّت کے تعلّق سے اس کا یہ عمل باجی ہی نہیں پُوری صنفِ نازک کے جذبات و احساسات کی آئینہ داری کرتا ہے کہ پیار میں وہ سب حدُود سے گذر جاتی ہے کہ اس کا پیار بے لوث اور پُرخلوص ہوتا ہے۔ اور پھر پہلا پیار تو کوثر و تسنیم میں دُھلا دُھلایا ہوتا ہے جس پر آنچ آنے کا احساس ہی اس کے لئے سوہانِ رُوح ہو جاتا ہے۔

عصمت پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں (دُوسری کہانی "پنکچر" ہے) شادی کے بغیر بچّے پیدا کرنے کی تبلیغ کرتی ہیں جس سے بداخلاقی کو ہوا ملتی ہے اور معاشرے کا نظام بگڑتا ہے ـــــ کرشن چندر اس بارے میں یُوں لکھتے ہیں :

> "پنکچر" اور "بھُول بھُلیاں" محبّت اور معاشری شادی سے متعلّق ہیں۔ اِن دو افسانوں میں عصمت چغتائی کی پیغامیت اور روایتی شادی پر محبّت کو اور رسمی ایجاب و قبول پر دلی رفاقت کو ترجیح دیتی نظر آتی ہیں"[1]

کرشن چندر نے بجا لکھا ہے کہ عصمت معاشری شادی کی قائل نہ تھیں۔ وہ "فری لو" یا "آزاد محبّت" میں یقین رکھتی تھیں۔ ان کی زندگی پر ایک نظر ڈال لئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے ـــــ مگر یہاں سوال "بھُول بھلیاں" کی فنّی حیثیت کا ہے۔ چنانچہ منٹو اس بارے میں لکھتے ہیں :

> "اور لوگ کہتے ہیں عصمت ناشدنی ہے۔ چُربل ہے۔ گدھے کہیں کے۔ ان چار سطروں میں عصمت نے عورت کی رُوح نچوڑ کر رکھ دی ہے اور یہ لوگ اسے اخلاق کی امتحانی نالیوں میں بیٹھے، ہلا ہلا کر دیکھ رہے ہیں۔ توپ دم کر دینا چاہیئے ایسی اوندھی کھوپڑیوں کو"[2]

بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا "بھُول بھلیاں" کو ایک ادب پارے کے طور پر پرکھنا مناسب ہے یا اس کے ڈانڈے معاشرے کے مروّجہ قوانین سے ملا کر اُس کا محاسبہ کرنا چاہیئے۔ ہم منٹو کی رائے سے کُلیتاً متفق ہیں کہ

---

[1] کرشن چندر : "بلاخیزی" (مضمون) مجموعہ "چوٹیں" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۱۱۱

[2] سعادت حسن منٹو "عصمت چغتائی" (مضمون) اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی۔ عصمت چغتائی نمبر۔ دسمبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۵۱

کہانی کے فنّی محاسن کو نظر انداز کر کے اسے اخلاقیات کی کسوٹی پر پرکھنا ناروا ہے کہ ادب اوّل و آخر ادب ہے اور اس قسم کی بحث سے بلند و بالا اور اعلیٰ و ارفع ہے۔

"بھُول بھُلیاں" ایک شاہکار افسانہ ہے جو عصمت کے فن کی بقا کا ضامن ہے۔

ساس

یہ ساس گئے وقتوں کی روایتی، ٹکسالی ساس ہے، جو گھر کی قلمرو کی مختارِ کل ہے اور جسے اپنی بہو سے خدا واسطے کا بَیر ہے۔ وہ ہمہ وقت بات بے بات اُسے طعن و تشنیع کا نشانہ بنائے رکھتی ہے۔ اُسے اس بات سے غرض نہیں کہ بہو فی الواقع قصوروار ہے بھی یا نہیں مگر وہ اُسے کمال لگن اور تندہی سے کوسنے طعنے دے کر، گالی گلوچ کر کے اور اُس کے میکے والوں کو بھی لپیٹ میں لے کر اپنا "فریضہ" ادا کئے جاتی ہے۔ وہ سماعت اور بینائی سے بھی کچھ حد تک معذور ہے مگر اس کی زبان شب و روز کتر کتر چلتی رہتی ہے ــــ کئی دفعہ خیال آتا ہے کہ بہو نہ ہوتی تو بڑھیا اپنا وقت کیسے کاٹتی۔ وہ اپنی بدزبانی اور دشنام طرازی کا ہدف کسے بناتی۔ مگر شاید یہ بھی صحیح ہے کہ بہو کی غیر موجودگی میں اسے "ساس" کون کہتا کہ اس افسانے کا تعلّق تو سراسر ساس ہے۔ اور ساس بھی وہ جس کی زبان پر بچھو کا ڈنک ہے۔ اور بہو کو بے وجہ لتاڑنا، پھٹکارنا اور دھتکارنا جس کا شعار ہے ــــ اور یہ حق اُسے اللہ تعالیٰ نے تفویض کیا ہے، جو رحیم و کریم ہے۔

اس بَلا کی چلچلاتی، جھلستی گرمی پڑ رہی تھی کہ دَم گھُٹا جاتا تھا۔ بڑھیا آنگن میں کھٹولی ڈالے جھپکی لینا چاہ رہی تھی۔ مگر دھوپ تھی کہ کھٹولی کی جانب سرکتی ہی چلی آ رہی تھی۔ وہ ایک بار کھٹولی کو دھوپ کے رُخ سے گھسیٹ چکی تھی مگر دھوپ پھر اس کے پیروں تک آن پہنچتی تھی ــــ اِدھر نامراد دھوپ بڑھیا کو ستا رہی تھی تو اُدھر ناہنجار بہو چھت پر محلّے کے ذرا ذرا سے چھوکروں کے ساتھ دھما چوکڑی مچا رہی تھی۔ نتیجہ یہ کہ بڑھیا کی نیند حرام ہو رہی تھی۔ وہ بار بار اُسے چھت پر سے نیچے اُترنے کے لئے آوازیں دیتی مگر بہو سُنتی ہی نہیں۔ اس پر سیخ پا ہو کر بڑھیا بدکلامی پر اُتر آئی ــــ اور یہ وہ میدان تھا جس میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا:

"خدا غارت کرے پیاروں پیٹی کو۔۔۔"۔ "دُنیا میں ایسی بہوئیں ہوں تو کوئی کاہے کو جئے"[1]

بڑھیا برابر آوازیں دیئے جا رہی تھی ــــ آخر کئی آوازوں کے جواب میں بہو "جی آئی"، کہہ خاموش ہو گئی، مگر آئی نہیں۔ اُدھر بڑھیا ایک کُوک دیئے کھلونے کی طرح بولے جا رہی تھی۔

"ارے تو آچک۔۔۔ خدا سمجھے تجھے۔۔۔"[2]

---

[1] عصمت چغتائی، "ساس"، مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر"، روہتاس بکس، لاہور، ص ۵۴

آخر بہو دھم دھم کرتی سیڑھیوں پر سے اُتری۔ اس کے پیچھے پون درجن بچوں کی فوج تھی۔ کچھ بالکل ننگ دھڑنگ تو کچھ ادھ ننگے۔ منہ پر چیچک کے داغ، ناکیں سڑ سڑاتے، کھوں کھوں، کھی کھی کرتے ہوئے ــــ اب بہو کی جانب سے بڑھیا کے عتاب کا رُخ بچوں کی جانب مُڑ جاتا ہے۔ بڑھیا کے پاس غم و غصّے کے اظہار کے لئے تلخ و ترش الفاظ کا اور زہر میں بُجھی ہوئی گالیوں کا ایک لامحدود خزانہ ہے۔ اور وہ اپنی زبان کو بے لگام چھوڑ دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"الٰہی یا تو ان حرامی پلّوں کو موت دے دے یا میری مٹّی عزیز کرلے ــــ نہ جانے یہ اُٹھائی گیر کہاں سے مرنے کو آجاتے ہیں ــــ چھوڑ دیئے ہیں جن کے ہماری چھاتی پر مونگ دَلنے کو۔ ــــ میں کہتی ہوں تمہارے گھروں میں کیا آگ لگ گئی ہے"[1]

بچے مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو گھونسے دکھاتے رہے۔ گویا بڑھیا کا تمسخر اُڑا رہے ہوں ــــ اور پھر وہ چپکے سے کھسک گئے۔

"بہو نے بشریا کے کہنی کا ٹھوکا دے کر کہا" واہ ــــ تم تو مر گئی تھیں" ــــ[2]

بڑھیا نے جو شاید ذرا اُونچا سُنتی تھی سمجھا کہ بہو کا روئے سخن اس کی طرف ہے۔ وہ تلملا اُٹھی اور اس پر بل پڑی۔

"جھاڑو پھیروں تیری صُورت پر۔ مریں تیرے ہوتے سوتے۔ تیرے۔۔۔"[3]

کیا مرصّع اور مسجع زبان تھی۔ کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی ــــ بہو نے پیار سے ٹھنک کر وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس سے مخاطب نہ تھی۔ مگر بڑھیا روکے نہ رُکی اور بغیر سانس لئے بولے چلی گئی ــــ بہو منہ ہی مُنہ میں کچھ منمنائی اور پھر اضطراری طور پر پنکھے میں سے تنکے نکال نکال کر طوطے کے پنجرے میں ڈالنے لگی۔ طوطا ٹیں ٹیں کر کے چنگھاڑا۔ اور بڑھیا جو پہلے ہی مشتعل تھی اور زیادہ بھڑک اُٹھی۔ اور اس کے پوپلے مُنہ سے پھول جھڑنے لگے۔

"خاک پڑی اب یہ طوطے کو کیوں کھائے لیتی ہے" وُہ غرّائی۔

"تو یہ بولتا کیوں نہیں ــــ"

"تیری بلا سے نہیں بولتا ــــ تیرے باپ کا کھاتا ہے ــــ"

"ہم تو اسے بلائیں گے ــــ" بہو نے اٹھلا کر طوطے کے پنجے میں تنکا کونچ کر کہا۔

"آئیں ــ آئیں ــ اے میں کہتی ہوں تیرا پتا ہی گھس گیا ہے۔ اب مٹی ہے وہاں سے کہ لگاؤں"[4]

---

[1]، [2]، [3]، [4] عصمت چغتائی "ساس" "مجموعہ" "ایک شوہر کی خاطر" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۵۵

ذرا غور فرمائیے کہ بُڑھیا کی زبان کس قدر کرخت اور دُرشت ہے۔ وہ بے مقصد اور بے جواز بہو کے باپ کو بھی لپیٹ میں لے لیتی ہے ـــــ اُدھر بہو کی زبان میں کس قدر نرمی اور ملائمت ہے۔ اس کے "ہم تو اُسے بلائیں گے" میں بھی کس قدر معصومیّت اور بھولپن ہے۔ اس کے الفاظ مصری کی ڈلی کی طرح مُنہ میں گُھلے جاتے ہیں۔ ـــــ مگر اب بھی بُڑھیا کا غصّہ فرو نہیں ہوتا۔ وہ اُبلی پڑتی ہے۔ اور بہو کو مارنے پر تُل جاتی ہے ـــــ وہ تاک کر اُسے جوتی مارتی ہے مگر نصیبِ دُشمناں نشانہ چوک جاتا ہے اور جُوتی گھڑونچی کے نیچے سوئے ہوئے کُتّے کے جا لگتی ہے ـــــ بُڑھیا اور زیادہ کھسیا جاتی ہے۔ دُوسری جوتی سنبھالتی ہے مگر بہو کھمبے کی آڑ میں ہو جاتی ہے ـــــ بُڑھیا بے بس ہو جاتی ہے مگر چُپ نہیں ہوتی ـــــ چُپ ہو جائے تو ساس کیسی!

"آنے دے اصغر کے بچّہ کو۔"

"بچّہ" ـــــ اصغر کے تعلق سے "بچّہ" کے نام پر بہو شرماتی، لجاتی نہیں بلکہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی نمُودار ہوتی ہے جسے وہ دبا جاتی ہے ـــــ مگر بُڑھیا حسبِ سابق "بچّہ" سے غلط نتیجہ اخذ کرتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ بہو شاید اپنے بچّے کا ذکر کر رہی ہے جس سے وہ محرُوم ہے ـــــ بُڑھیا کو پھر انگیخت ہوتی ہے۔

"بھتوبے تیرے جنم پر ـــــ اے اور کیا ـــــ بچّہ بھی آج کو ہو جاتا جو کوئی بھاگوان آتی ـــــ جس دن سے قدم دھرا گھر کا گھر وا ہو گیا۔"[1]

بہو متین، بُردبار اور خوش طبع تھی۔ اُس نے بُڑھیا کی ہرزہ سرائی پر نہ تاؤ کھایا نہ ہی اُسے ترکی بہ ترکی کھری کھوٹی سُنا کر دل کی بھڑاس نکالی۔ وہ جانتی تھی کہ بُڑھیا کی اُفتادِ ہی ایسی پڑی ہے۔ وہ مُسکرائی اور اس نے طوطے کا پنجرا جھکول ڈالا ـــــ طوطا بُڑھیا کی دُکھتی رگ بنا ہُوا تھا۔ بہو کے اس معصوم عمل نے نادانستہ طور پر بُڑھیا کے جذبات کو مزید ہوا دی۔ اور اس نے نشانہ باندھ کر اپنے ترکش کا زہر میں بُجھا ہوا آخری تیر چھوڑا۔

"یہی ڈھنگ ہے تو اللہ جانتا ہے کہ دُوسری نہ لاؤں تو نام نہیں۔"[2]

ساس کے ترکش میں نہ جانے کتنے تیر ہوتے ہیں مگر یہ آخری تیر تو اس کی دانست میں بہت کارگر ہوتا ہے اور اس کا نشانہ کم ہی خطا جاتا ہے کہ اس کے ذکر سے ہی بہو کا دل دہل جاتا ہے۔ کلیجہ ڈول جاتا ہے۔ اُسے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی معلوم ہونے لگتی ہے ـــــ مگر اگر بفضلِ خُدا شوہر پر اس کی گرفت مضبُوط ہو۔ دونوں میں ہم آہنگی اور یگانگت ہو تو وہ ساس کی اس نوع کی دھمکیوں کو گُفتار واہی کچھ کر چشم زدن میں ذہن سے جھٹک دیتی ہے ـــــ ساس بکتی جھکتی رہے، وہ اُسے خاطر میں نہیں لاتی ـــــ بہو نے اطمینان سے سُنا اور پُرسکون

---

[1] [2] عصمت چغتائی: "ساس"، مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر"۔ روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۵۶

رہی۔ شاید یہ دھمکی اس کے لئے نئی نہیں تھی۔

دھیان رہے کہ ایک طرح سے بُڑھیا اور بہو کی گفتگو یک طرفہ تھی۔ بُڑھیا رہ رہ کر کوئی نیا سوال اُٹھاتی اور بہو پر جھپٹ پڑتی۔ مگر بہو اطمینان سے، نرمی سے، ٹال مٹول جواب دیتی مگر بڑھیا پر کوئی اثر نہ ہوتا کہ وہ ایک ہی ڈھیٹ تھی ـــــ بُڑھیا نے ایکا ایکی بات کا رُخ موڑا اور بہو کے جہیز کا معاملہ چھیڑ دیا۔ یہ ایک ایسا "سدا بہار" موضوع تھا کہ بُڑھیا جب تک زندہ رہے گی اسے گاہے ماہے اُٹھاتی رہے گی اور بہو کی چٹیا مروڑتی رہے گی ـــــ ساس جو ٹھہری، چٹیا مروڑنا اس کا ازلی اور ابدی حق تھا۔

"موئے نفقتے۔ بیٹی کو کیا جہیز دیا تھا ـــ اے واہ قربان جایئے ـــــ کھولی کڑے اور ملمع کی بالیاں اور وُہ ایلومونیم کے ـــــ" نہ صرف یہ، وہ ممدھنوں کے گھٹنوں پر سے گھِسے ہوئے گلبدن کے پاجاموں، پھیکے زردے اور گھُنے ہُوئے پایوں والے جہیز کے پلنگ کا ذکر کرتی رہی۔[1]

بہو نے بُڑھیا کی اس بک بک جھک جھک پر کان نہ دھرے اور کھٹولی پر بسیر کر سوگئی ـــ بُڑھیا بھی نہ جانے کب تک بہو اور اس کے میکے والوں کو صلواتیں سُناتے سُناتے اونگھ گئی اور پھر خراٹے لینے لگی ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ بہو کا جہیز کم لانا بُڑھیا کو اندر ہی اندر کرید رہا تھا۔ اور اس کے گھر والوں نے جو کچھ جہیز میں دیا تھا۔ وہ بڑھیا کی لوحِ قلب پر کندہ تھا۔ اسے اب تک یاد تھا کہ "زردہ پھیکا تھا"، "پلنگ کے پائے گھُنے ہوئے تھے" اور "پاجامے گھٹنوں پر سے گھِسے ہوئے تھے" ـــــ بڑھیا کے ہاتھ ایک ایسی چھڑی آگئی تھی جس سے وہ بہو کو اطمینان سے تاحیات پیٹتی رہے گی۔

○ اتنے میں اصغر آیا اور اس نے بُڑھیا اور بہو دونوں کو سوتے پایا۔ آموں اور خربوزوں کی پوٹلی زمین پر رکھی اور جھُک کر بہو کی بانہہ بھینچ دی ـــــ یہ جہاں اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ آگیا ہے، وہیں اسے اُٹھ کر کوٹھری میں چلنے کی خاموش فرمائش بھی تھی ـــــ بہو پہلے تو ذرا تیوریاں چڑھا کر اینٹھی اور اصغر کا ہاتھ جھٹک پہلو بدل کر سوگئی ـــــ اصغر نے پوٹلی اٹھائی اور جیب میں نئی چوڑیوں کی پُڑیا ٹٹولتا ہُوا کوٹھری میں چلا گیا ـــ اب بہو نے سر اُچک کر، چوکس ہو کر بُڑھیا کو دیکھا اور دوپٹہ اوڑھتی جھٹ سے کوٹھری میں چلی گئی۔

"کوٹھری میں سے ایک گڑگڑاتی ہوئی بھاری آواز اور دوسری چنچناہٹ "اوں ... اوں" سُنائی دیتی رہی۔ ساتھ خربوزے کے چھلکوں اور آموں کے چچوڑنے کی چپڑ چپڑ آواز سکون کو توڑتی رہی۔"[2]

---

[1] [2] عصمت چغتائی: "ساس" مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۵۶، ۵۷

اِن آوازوں کی نوعیّت کیا تھی؟ اس کا شاید قیافہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ یا شاید یہ ہمیں جاننے کا حق نہیں کہ یہ معاملہ میاں بیوی کے درمیان تھا۔ لہٰذا اس میں زیادہ کرید یا مین میخ موزوں نہیں۔ ہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اصغر آج نہ صرف خربوزے اور آم لایا تھا بلکہ بہو کے لئے نئی چوڑیاں بھی لایا تھا جو اس کے تئیں اصغر کی محبت کی نشاندہی کرتی تھیں ـــــ اور پھر سب سے اہم بات یہ کہ بُڑھیا سو رہی تھی اور مطلع صاف تھا۔

بُڑھیا کے مُنہ پر بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کے جمِ غفیر نے اُسے نیند سے جگا دیا۔ اس نے بہو کو اپنے مخصوص ساسوں والے ٹکسالی انداز میں آواز دی۔

"بہو ـــــ اے بہو ـــــ مر گئی کیا ـــــ"

بُڑھیا کی طرف سے یہ ایک طرح سے دخل در معقولات تھا ـــــ بہو تڑپ کر کوٹھری سے نکلی مگر دوپٹہ ندارد، گریبان چاک۔ ہاتھ میں آم کی گٹھلی جیسے کسی سے کشتی لڑ رہی ہو ـــــ وہ فوراً لوٹ گئی اور دوپٹہ کندھوں پر ڈالے آنچل سے ہاتھ پونچھتی نکلی۔ اس کی ہیئت کذائی سے صاف ظاہر تھا کہ بُڑھیا نے ان کے رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا ـــــ مگر بُڑھیا کا حکم حکمِ حاکم تھا جس سے مفر ممکن نہ تھا۔

"اے بہو ـــــ میں کہتی ہوں ـــــ ارے بوند حلق میں پانی ـــــ"

اصغر بھی شلوار کے پائینچے جھاڑتا ہوا آیا اور اس نے آموں کی پوٹلی بُڑھیا کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا "لو اماں ـــــ کیا خوشبودار امیاں ہیں ـــــ" بُڑھیا خربوزوں اور آموں کو سونگھ سونگھ کر خوش ہو رہی تھی ـــــ بُڑھیا نے بہو سے چھُری مانگی ـــــ بہو نے گلاس دیتے ہوئے آموں کا رس ہونٹوں سے چاٹا۔ اصغر نے پیر بڑھا کر اس کی پنڈلی میں شرارت سے چٹکی بھر لی ـــــ پانی چھلکا اور بُڑھیا غرّائی "اندھی ـــــ میرے پاؤں پر اوندھائے دیتی ہے" اور ایسا کھینچ کر ہاتھ مارا کہ بھاری پیندے کا گلاس بہو کے پیر پر گرا۔ بہو نے دانت کچکچا کر اصغر کو گھورا ـــــ "لو اماں پانی" اصغر نے فرمانبردار بیٹے کی طرح پیار سے کہا:

"یہ بہو تو وہ بڑی ہو گئی"

"تمھیں دیکھو ۔ ۔ ۔" بُڑھیا نے شکایت کی۔

"نکال دے مار کر حرامزادی کو ـــــ اماں اب دوسری لائیں ـــــ یہ تو ـــــ" اصغر نے پیار سے بہو کو دیکھ کر کہا۔

"اے زبان سنبھال کمینے ـــــ" بُڑھیا نے آم پلپلا کر کے کہا۔

"کیوں اماں ـــــ دیکھو نا کھا کھا کر بھینس ہو رہی ہے ـــــ" اصغر نے بُڑھیا کی نظر بچا کر بہو کی کمر میں چٹکی بھر کر کہا ـــــ بہو نے اُسے چھُری مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے چھُری بُڑھیا

کے گٹے پر بیٹھ دی اور وہ تلملا اُٹھی۔

"دیکھتی ہو اماں ـــــ اب ماروں چڑیل کو ـــــ" اور لپک کر اصغر نے بہو کی پیٹھ پر دھوکا دیا۔

"خبردار ـــــ اور سنو! ـــــ ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گی اب کے جو تو نے ہاتھ اُٹھایا" بڑھیا بہو کی طرفداری کرنے لگی "کوئی لائی بھگائی ہے جو تو ـــــ"[1]

یہ اقتباس بہت دلچسپ اور معنی خیز ہے ـــــ اصغر پر آج پیار کا بھوت سوار ہے۔ وہ بہو سے چھیڑ چھاڑ پر تُلا ہوا ہے۔ وہ اماں کی آنکھ بچا کر اس کی پنڈلی پر چٹکی بھرتا ہے تو بہو کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس چھلک پڑتا ہے اور بڑھیا اُسے گالی دیتی ہے، جو ہر وقت اُس کی نوکِ زبان پر ہوتی ہے۔ اصغر بڑھیا کا رمز شناس ہے، فرمانبردار بیٹا جو ٹھہرا۔ وہ شرارت کے طور پر اماں کو کہتا ہے کہ "نکال دے حرامزادی کو۔ دُوسری لائیں" اور ساتھ ہی بہو پر پیار بھری نظر ڈالتا ہے۔ گویا وہ ایک تیر سے دو نشانے لگاتا ہے۔ اُسے اماں کی خوشنودی ملحوظ ہے تو بہو کا پیار بھی مطلوب ہے۔ بہو جانتی ہے کہ اس کی دھمکی اُوپری اور کھوکھلی ہے ـــ مگر بڑھیا جو یوں تو ہر وقت بہو کی جان کے درپے رہتی ہے ایکا ایکی پینترا بدلتی ہے اور اصغر کو لتاڑ پھٹکار کر رکھ دیتی ہے حالانکہ وہ اس سے پیشتر خود بھی دھمکی بہو کو دے چکی ہے ـــــ "ارے زبان سنبھال کمینے" اور اصغر خاموش ہو جاتا ہے ـــــ پھر جب اصغر کہتا ہے "دیکھتی ہو اماں، اب ماروں چڑیل کو" تو بڑھیا اپنی روایتی زبان میں گلفشانی کرتی ہے ـــــ اور اصغر ظاہرہ طور پر پھر جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے ـــــ اماں بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔ وہ ہر وقت بہو کو دُشنام طرازی کا نشانہ بنائے رکھتی ہے۔ مگر یہ نہیں چاہتی کہ اصغر بھی بہو سے اُسی طرح پیش آئے۔ حالانکہ اصغر کبھی بھی اس بارے میں سنجیدہ نہیں ہوتا۔ وہ بہو کو دل و جان سے چاہتا ہے کہ ماں کی طرح اسے بہو کی خوشنودی بھی مطلوب ہے ـــــ مگر بڑھیا دونوں پر حاوی رہنا چاہتی ہے تاکہ کوئی اُس کے سامنے دَم نہ مار سکے۔

○ عادت سے مجبور بڑھیا پھر رُخ بدلتی ہے اور دھرّے پر آجاتی ہے اور بہو پر گرجنا برسنا شروع کر دیتی ہے ـــــ "ارے میں کہتی ہوں پانی لا دے" ـــــ مگر وہ بہو کے انگوٹھے سے، جس پر کہ گلاس گرا تھا، خون بہتا دیکھتی ہے تو مضطرب ہو جاتی ہے اور دکھاوے کے طور پر غیر معمولی پریشانی کا اظہار کرتی ہے۔

"اوئی ـــــ یہ خون کیسا؟"

"اے میں کہتی ہوں اِدھر آ ـــــ دیکھوں تو خون کیسا ہے؟"

---

[1] عصمت چغتائی "ساس" مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۵۹

بہو ہلی بھی نہیں ۔

"دیکھ تو کیسا جیتا جیتا خون نکل رہا ہے ___ اصغر اُٹھ تو ذرا اِس کے پیر پر ٹھنڈا پانی ڈال ___"

ساس بھی گرگٹ ہوتی ہے ۔

"میں تو نہیں ڈالتا ___" اصغر نے ناک سکیڑ کر کہا ۔

"حرامزادے ___" بُڑھیا خود گھسٹتی ہوئی اُٹھی ۔

"چل بیٹی پلنگ پر ___ ارے میں کہتی ہُوں ۔ یہ گلاس مُوا سوا سیر کا ہے ۔ اس کمینے سے کتنا کہا ہلکا ایلومینیم کا لادے ۔ مگر وہ ایک حرام خور ہے ۔ لے اُٹھ ذرا"

بہو پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی [1]

بڑھیا نے اصغر کو صراحی میں سے پانی ڈالنے کے لئے کہا ۔ اصغر بادلِ نخواستہ اُٹھا ۔ بُڑھیا سوکھے لرزتے ہاتھوں سے خون دھونے لگی ۔ مگر یہ دیکھ کر کہ وہ بجائے زخم پر پانی ڈالنے کے اُس کے گریبان پر دھار ڈال رہا ہے ، وہ ایک دَم بکھر گئی ___ "خاک پڑے تیری صورت پر" ___ بُڑھیا نے اصغر کے ننگے شانے کو سُوکھے پنجے سے جھنجھوڑ دیا ___ اور اصغر نے جل بھُن کر سارا پانی بہو پر اُنڈیل دیا اور خود رُوٹھ کر آم کھانے چلا گیا ___ اور بُڑھیا اس کی موت کی دُعا مانگنے لگی ۔

بُڑھیا جب کبھی بہو یا اصغر سے لڑتی جھگڑتی بے بس ہو جاتی تو وہ چار و ناچار انھیں کسی اور سے گوشمالی کرانے کی دھمکی دیتی ۔ یہ اپنی خفت مٹانے اور احساسِ برتری کو برقرار رکھنے کے لئے اس کا ایک مخصوص حربہ تھا ۔ جب بہو سے نالاں ، وہ ہار گئی تھی تو اس نے اُسے "اصغر کے بچّہ" سے پٹوانے کی دھمکی دی تھی ___ اور آج جب اصغر نے اسے عاجز کر دیا تو اس نے زچ آکر اُسے دھمکی دی ۔

"بدذات ___ ٹھہر جا ___ ٹھہر جا ___ آنے دے ___ اپنے چچا کو وہ کھال اُدھڑواتی ہُوں کہ بس"

پھر بُڑھیا نے اصغر کو کہا کہ وہ بہو کو کھٹولی پر پہنچا دے ___ اصغر نے جل کر جواب دیا کہ اس سے موٹی بھینس کی بھینس نہیں اُٹھتی ۔ بُڑھیا کہاں رُکنے والی تھی ___ بولی " ارے تیرے باپ سے بھی اُٹھے گی ۔ سُنتا ہے کہ اب " اور جب بُڑھیا بالآخر اسے خود اُٹھانے لگی تو اصغر بھنّا کر اُٹھا ۔ اور ایک جھپاکے سے بہو کو اٹھا کر کھٹولی کی طرف لے چلا تو بہو نے جو موقع کی تاک میں تھی اپنے دانت اس کے شانے میں وہاں گاڑ دیئے جہاں بُڑھیا

---

[1] عصمت چغتائی ۔ "ساس" مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر" روہتاس بکس ۔ لاہور ۔ ص ۴۰

کا سوکھا پنجہ پڑا تھا ـــــ اصغر نے لجلچا کر اُسے کھٹولی پر رکھا اور جھٹ سے اس کے سُرخ سُرخ ہونٹ چٹکی سے مسل دیئے ـــــ اور بہو فتحمندانہ انداز میں ہنستی رہی اور اصغر اپنا نیل پڑا کندھا سہلاتا رہا ـــــ اور بڑھیا نماز کے آخری مرحلہ پر آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر نہ جانے کیا بڑ بڑاتی رہی۔ شاید بہو کو کوستی ہو گی۔

یہ خوبصورت افسانہ روایتی ساس کی کردار کی بحُسن و خوبی عکاسی کرتا ہے اور اس کی جو تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے وُہ ایک بےحد تیز و تند اور کرخت و دُرشت مزاج عمر رسیدہ عورت کی ہے۔ وہ زہر کی پوٹلی ہے؛ جو بات بات پر دُشنام طرازی پر اُتر آتی ہے۔ وُہ بہو کو زر خرید باندی سمجھتی ہے اور اس سے ویسا ہی سلوک روا رکھتی ہے اور بغیر رُکے تھمے روز روز بے جواز اُسے اپنے عتاب کا نشانہ بنائے رکھتی ہے ـــــ وہ طامع اور حریص ہے اور اُسے مستقل طور پر یہ شکایت رہتی ہے کہ بہو معقول جہیز نہیں لائی اور اسے کوستے ہوئے وہ بے دریغ اُس کے میکے والوں کو بھی پیٹ میں لے لیتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی اپنے سامنے دَم مارنے کی اجازت نہیں دیتی اور اگر وہ سر اُٹھائے تو لتاڑ پھٹکار کر اُس کا ناطقہ بند کر دیتی ہے ـــــ وہ پارہ صفت ہے اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی رہتی ہے اور وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کب اس کا رویّہ کیا ہو گا۔ نہ جانے اس کا خیال آتے ہی منہ کا مزا کڑوا کسیلا کیوں ہو جاتا ہے ـــــ ساس اس افسانے کا مرکز و محور ہے۔ اس کا کردار بڑا بھرپور، جاندار اور پُر اثر ہے۔ وہ سارے افسانے کو، اپنی ضعیف العمری کے باوصف کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ اور اس کے قد آور اور بلند آہنگ کردار کے سامنے بہو اور اصغر بونے اور ٹھگنے لگنے لگتے ہیں۔

یہاں ایک نفسیاتی عقدے کی گرہ کُشائی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ساس اصلاً ویسی نہیں جیسی کہ وُہ بادی النظر میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ زندگی کے عام رویّے میں چڑچڑی، بددماغ اور رُوکھی پھیکی ہے اور یہ ہر اس ضعیف العمر انسان کا مسئلہ ہے جو خود کو [illegible] Rejected اور Dejected محسوس کرتا ہے۔ اندرُونی طور پر وُہ نرم دل ہے۔ اس کا بہو کے تئیں رویّہ وُہی ہے جو ایک سخت گیر ماں کا اپنے بچّوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس کی تمام تر سخت گیری کے باوجود اس کے وجُود کے اندر جاگزیں ممتا سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے جب اصغر محض دکھاوے کے طور پر اس کی خوشنودی کے لئے بہو کو ڈانٹتا ہے تو وہ اس کا مُنہ بند کر دیتی ہے۔ یہ "ساس" کی باطنی تصویر ہے جسے دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔

بہو ایک خاموش طبع، نرم مزاج، نرم کلام عورت ہے۔ وہ غیر ضروری طور پر بُڑھیا سے نہیں اُلجھتی۔ اور اس سے گفتگو کے دوران نپی تُلی بات کرتی ہے ـــــ یوُں وہ زندگی سے بھرپوُر ہے اور جوانی کے شوخ و شنگ جذبات اس کے کردار سے چھلکے پڑتے ہیں۔ وہ بُڑھیا کی موجُودگی میں اس کی آنکھ بچا کر اصغر سے چھیڑ چھاڑ کرنے اور شوخی آمیز رویّہ اپنانے سے نہیں جھجکتی ـــــ وہ بُڑھیا کی اُس پر سوَت لانے کی دھمکی پر بھی پُرسکون رہتی ہے

اور دماغی توازن نہیں کھوتی کہ اسے اصغر کی محبّت کی استقامت پر کامل اعتماد ہے۔ یہ اس کی پُر اطمینان گھریلو زندگی کا بیّن ثبوت ہے ـــــ بہو کا کردار بہت جاذب اور دلچسپ ہے۔

اصغر ذہنی طور پر بہت ہوشیار، چست، دُرست اور چاق وچوبند ہے۔ وہ ایک فرمانبردار بیٹا اور پُر خلوص شوہر ہے۔ وہ دقیقہ شناس ہے اور اس کا اوّلین مقصد بیک وقت بُڑھیا اور بہو کو بہرکیف خوش رکھنا ہے اور ٹکراؤ کے راستے سے گریز کرنا ہے تاکہ گھر کی فضا مکدّر نہ ہو۔ وہ نہ صرف شوخ طبع ہے، بلکہ حسِ مزاح بھی رکھتا ہے۔ بُڑھیا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کا غیر سنجیدگی سے بہو کو سَوت لانے کی دھمکی دینا، اس امر کی توثیق کرتا ہے۔

مگر یہ افسانہ اس کے عنوان کی نسبت سے محض ایک ساس کے کردار کو ہی نمایاں نہیں کرتا بلکہ یہ ایک نوجوان جوڑے کے پیار و محبّت کی داستان بھی اپنے آپ میں سموئے ہوئے ہے۔ گو بُڑھیا اپنے کردار سے گھر میں تناؤ بنائے رکھتی ہے مگر اصغر اور بہو اس سے بیگانہ وبے نیاز جوانی کی شوخیوں، شرارتوں اور پُر لطف چھیڑ چھاڑ سے اسے بے کیف اور بے رنگ نہیں ہونے دیتے۔ درحقیقت اس افسانے کی جاذبیت اور دلکشی بہت حد تک اُن کی مرہونِ منّت ہے۔ گویا اس افسانے میں جہاں ایک طرف بُڑھیا کا بہت خشک، کھردرا اور بے آب ورنگ کردار ہے، وہیں دُوسری طرف اصغر اور بہو کے شوخ، رنگین اور سرسبز وشاداب کردار بھی ہیں، جو قاری کو تلطّف اور تلذّذ مہیّا کرتے ہیں۔

ہم نے اُوپر بُڑھیا کو "اگلے وقتوں کی ساس" کہا ہے۔ اس لئے کہ جس قبیل کی ساس کا ذکر اس افسانے میں کیا گیا ہے، وہ اب قصّہ پارینہ ہو چکی ہے یا ہوتی جارہی ہے۔ بہوویں اب تعلیم یافتہ، ہوشمند اور زمانے کے نشیب وفراز سے شناسا ہی نہیں بلکہ اقتصادی طور پر خود کفیل بھی ہیں۔ اب وہ گھر کی چاردیواری میں مقیّد نہیں بلکہ اُن کا دائرۂ کار گھر سے باہر ہے۔ اور وہ مَردوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہونے کی استعداد رکھتی ہیں ـــــ دَورِ حاضر میں شادی کے بعد لڑکا لڑکی الگ گھر بسا کر بغیر روک ٹوک آزادانہ زندگی بسر کرنے کے قائل ہیں ـــــ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ساس سُسر ضعیف العمری میں خود اپنے برسرِ روزگار بیٹوں اور بہوؤں پر تکیہ کرنے کے لئے مجبُور ہیں۔ ملک کے طول وعرض میں تیزی سے وجود میں آرہے OLDAGE HOMES اس بات کا ثبوت ہیں کہ سماجی اور اخلاقی اقدار برق رفتار سے تغیّر پذیر ہیں اور نئے دَور میں جس میں ہم قدم رکھ چکے ہیں، پُرانے وقتوں کی ساس کا کوئی مقام نہیں۔

اکثر خیال آتا ہے کہ عصمت نے اس افسانے کا اپنے ذہن میں کیا ڈھانچہ یا پلاٹ مرتّب کیا ہوگا جس پر کہ اس کا ایوان ایستادہ ہے۔ اگر بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو اس افسانے کا روایتی معنوں میں کوئی پلاٹ

ہی نہیں اور اگر وہ ہے بھی تو اس قدر مبہم اور غیر واضح کہ اس کے خدوخال ہی دکھائی نہیں دیتے (اور یہ اس نوع کا واحد افسانہ نہیں "ننھّی کی نانی" بھی جس کا یہاں تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اسی زمرے میں آتا ہے) ـــــ بایں ہمہ عصمت کا چند جزئیات کے سہارے، مکالمے کی شکل میں اس قدر صاف، شفاف اور آبدار افسانہ خلق کرنا حیران کن ہے۔ اس اعجاز کے اسباب وُہی ہیں جن کا اطلاق ان کے تمام افسانوں پر بلا استثنیٰ ہوتا ہے اور جن کا ذکر اس سے بیشتر کیا جا چکا ہے مگر جن کا مختصراً اعادہ ناگزیر سا ہے ـــــ وہ عناصر ہیں افسانے کا عصمت کے مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہونا اور اس میں حقیقت کا گہرا رنگ دَر آنا، جو اسے زیادہ دلچسپ اور جاذب بناتا ہے ـــــ عصمت کی باریک بینی اور دُور رسی، جو چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے ـــــ اُن کا اپنے افسانے کے معیّنہ چوکھٹے سے سرِمو انحراف نہ کرنا، جو افسانے کے تاثر میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے ـــــ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب کا اظہار، جو بات کو زیادہ پُراثر اور پُرمغز بناتا ہے کہ عصمت کا فن اشارے کنائے کا فن ہے ـــــ انسانی جذبات اور احساسات کی بے مثل عکّاسی جو افسانے میں زندگی کی رُوح پھونک دیتی ہے ـــــ مکالمات کی چابکدستی جو ان کی ذہنی اُپج اور زرخیز دماغی کی دین ہے ـــــ اور آخر میں عصمت کی زبان و بیان پر غیر معمولی دسترس جو انھیں اپنے ہم عصروں پر فوقیت عطا کرتی ہے ـــــ زبان کا معاملہ ذرا وضاحت طلب ہے۔ زبان کا بے عیب اور سقائم سے مبرّا ہونا اساسی بات ہے۔ زبان کا دل کش اور جاذب ہونا بھی بہت قابلِ قدر صفت ہے۔ مگر زبان کی سب سے بڑی خوبی اس کا EXPRESSIVE اور PRECISE ہونا ہے۔ ہر خیال اور خیال کے ہر رنگ کو لطیف سے لطیف انداز میں یوں نمایاں کر دینا کہ الفاظ میں مطالب بولتے دکھائی دیں، یہ تحریر کا باطنی حُسن ہے۔ عصمت کے ہاں ہمیں یہ نادر صفت ملتی ہے، اوروں سے کہیں زیادہ۔ زبان کے ساتھ ساتھ وہ پیرایۂ بیان میں بھی یگانہ ہیں۔ اور یہ تمام اوصاف ان کی تحریر کو چکاچوند عطا کرتے ہیں۔ چند ایک مثالیں پیش ہیں:

○ "دَھم دَھم چھن چھن کرتی بہو سیڑھیوں پر سے اُتری" ـــــ اگر اتنا ہی لکھا جاتا کہ "بہو سیڑھیوں پر سے اُتری"، تو بھی شاید افسانے کے تعلق سے کام چل جاتا۔ مگر اس سے مطلب پُورے طور پر ادا نہ ہوتا کہ بہو تو در حقیقت "دَھم دَھم چھن چھن کرتی اُترتی تھی۔" بہو کی دَھم دَھم سے اس کا جوان اور الھڑ ہونا اور چھن چھن سے اس کا زیور سے لدی نئی بیاہتا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ گویا "دَھم دَھم چھن چھن" سے نہ صرف مطلب پُورے طور پر اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں ادا ہو جاتا ہے، بلکہ زبان بھی رنگین ہو جاتی ہے۔ "مکھی تنن تنن کر کے اُڑ گئی" ـــ "وہ بڑے تاک کر پنکھے کا جھپا کا مارتی ہے" ـــ "بُڑھیا نے پنکھے کے پتور بنا کر

اُتری

چھپا چھپ اپنے منہ اور ہاتھوں کو پیٹ ڈالا"۔ "کیسا جیتا جیتا خون ہے" "اصغر ایک جھپاکے سے بہو کو اُٹھا کر چلا"۔۔۔ الفاظ کے معنوں سے واقف ہونا اور ان کی ماہیئت اور نوعیت کو جاننا ایک بات ہے۔ مگر موقع و محل کی مناسبت سے ان کا بیساختہ نوکِ قلم پر آجانا" ایں چیزے دیگری"۔۔۔ اکثر ہماری VOCABULARY محض ذہنی ہوتی ہے FUNCTIONAL نہیں ہوتی۔ یہ ضروری ہے کہ ایک مصنف کی زیادہ سے زیادہ FUNCTIONAL VOCABULARY ہو تاکہ وہ اسے حسبِ ضرورت بروئے کار لاسکے۔ ورنہ وہ اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں بے مصرف اور بے مقصد پڑی رہے گی اور وہ اپنے مطالب کو بحسن و خوبی دوسروں تک پہنچا نہ پائے گا۔۔۔ عصمت کی خوبی یہ ہے کہ ان کے پاس نہ صرف ہر نوع کے مطالب کے اظہار کے لئے الفاظ کا بیش بہا خزانہ ہے بلکہ ان کا دماغ بھی اس قدر حاضر ہے کہ وہ اُسے بلا تکلف استعمال کرنے کی استعداد سے مالا مال ہیں۔۔۔ اور یہ وہ میدان ہے جہاں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

"ساس" ایک گرانقدر افسانہ ہے اور کردار نگاری کے اعتبار سے اس کا شمار عصمت کے چوٹی کے افسانوں میں ہونا چاہیئے۔

بچھو پھوپھی

اُردو فکشن میں کردار نگاری میں عصمت کا بڑا اہم مقام ہے۔ گو وہ ایک مخصوص طبقے کے حصار سے باہر نکل نہیں پائیں پھر بھی انھوں نے اس محدود میدان میں اپنے فن کے جو جوہر دکھائے ہیں اُردو زبان اس کے لئے ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی۔

بچھو پھوپھی کی شخصیت مرعوب کن حد تک بھرپور اور جاندار ہے۔ انھیں اس بات کا غرّہ تھا کہ وہ چغتائی خاندان سے ہیں جس کے آبا و اجداد ایک دور دراز ملک سے گھوڑوں پر سوار منزلیں مارتے آئے اور انھوں نے ہندوستان کی اَن دیکھی زمین پر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے اور پشتوں حکمرانی کی۔ وہ لحیم شحیم، گورے چٹے، سُرخ رو اور گرجدار آواز والے تھے۔ ان کی رگوں میں گرم خون گردش کرتا تھا۔ وہ غیور، جنگجو اور سپاہیانہ خصائل کے حامل تھے۔ اور کسی دیگر قوم کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔۔۔ بچھو پھوپھی میں ہنوز اپنے اسلاف کی خو بو، غرور اور رعونت کی رمق باقی تھی۔ وہی طنطنہ اور دبدبہ تھا۔ وہی اسپات کا سا بے لچک انداز تھا۔ مزاج میں وہی شدّت اور حدّت تھی۔ ان کی زبان بھی بے عنان تھی۔ غم و غصہ میں سب حدود سے گذر جاتی تھیں۔۔۔ سنگین حالات میں فیصلہ کن انداز میں کڑا، جارح اور فیصلہ کن رُخ اپناتی تھیں۔ اور پھر مڑ کر نہ دیکھتی تھیں۔ جو ٹھان لیتیں کر گذرتیں۔ نہ جھجکتیں نہ دبتیں

—— اس اعتبار سے شاید اُنھیں پُورے وثوق کے ساتھ مُغل یا چغتائی نسوانیت کی نمائندہ مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

ذرا بچھّو پھوپھی کی شکل وصورت، قد و قامت اور تن و توش پر ایک نظر ڈالیں:

"ساڑھے پانچ فٹ کا قد، چار انگل چوڑی کلائی، شیر سا کلا، سفید بگلا بال، بڑا سا دہانہ۔ بڑے بڑے دانت، بھاری سی ٹھوڑی اور آواز تو ماشاء اللہ ابا میاں سے ایک سُر نیچی ہی ہوگی۔"[1]

جب وہ رحمان بھائی کے پہلے منزلے کی کھڑکی میں بیٹھتیں تو وہ لبالب بھر جاتی —— مگر وہ محض شکل وصُورت کے اعتبار سے ہی اپنے اسلاف پر نہ گئی تھیں بلکہ اُن میں اُن کے خصائل کی جھلک بھی ملتی تھی۔ وہ اپنے تینوں بھائیوں کے ساتھ پلیں بڑھیں اور ان کے ساتھ ہی انھوں نے تربیت پائی۔

"انھیں شہ سواری، تیر اندازی اور تلوار چلانے کی خاصی مشق تھی۔ ویسے تو پھیل پھال کر ڈھیر معلوم ہوتی تھیں۔ مگر پہلوانوں کی طرح سینہ تان کر چلتی تھیں۔ سینہ تھا بھی چار عورتوں جتنا۔"[2]

پھوپھی کی اپنے تینوں بھائیوں سے لڑائی رہی۔ ایک کو کوسنا شروع کرتیں تو باقی دو کو بھی لپیٹ میں لے لیتیں۔ اور ایسے زہر میں بجھے تیر چھوڑتیں کہ کلیجے میں ترازو ہو کر رہ جاتے۔ بڑی بڑی لمبی گالیاں اور بڑے جلے کٹے کوسنے دیتیں۔ اُن کی گالیوں اور کوسنوں میں ایک اپنی ہی جدّت اور ندرت ہوتی —— ان کے بڑے بھائی عمر رسیدہ، عبادت گذار اور گوشہ نشین تھے۔ انھیں وہ نفرت اور حقارت سے "فقیر" اور "بھک منگا" کہا کرتیں۔ کیونکہ وہ سپاہیانہ خصائل کے حامل نہ تھے، جو چغتائی نسل کا طرّۂ امتیاز تھا —— ان سے چھوٹے بھائی سرکاری ملازمت میں تھے۔ اُنھیں وہ "غدّار" اور "فرنگیوں کے غلام" کے القاب سے نوازا کرتیں۔ کیونکہ سلطنتِ مغلیہ کا زوال انگریزوں کے ہاتھوں ہُوا تھا۔ اس لئے اُن کی ملازمت کرنا اُن کے نزدیک ملک وملّت سے غدّاری کے مترادف تھا —— تیسرے اور سب سے چھوٹے بھائی کو وہ "ڈاکو" کہا کرتیں۔ یُوں وہ تھا بھی دس نمبر کا بدمعاش، شرابی، کبابی اور رنڈی باز۔ درحقیقت اُسے "ڈاکو" کہنا ایک طرح سے اس سے رعایت برتنی تھی —— تینوں بھائیوں سے ایسی ازلی دشمنی تھی کہ انھیں پانی پی پی کر کوستی رہیں، پھر بھی اُن کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہُوا۔

○ مگر پھوپھی بڑی ہوشمند، موقع پرست اور زمانہ شناس تھیں۔ جب وہ اپنے ناہنجار شوہر سے لڑتیں جھگڑتیں، تو اپنے بھائیوں کے تعلق سے فوراً پینترا بدل جاتیں۔ بھائیوں کے اثر و رسُوخ کا ذکر کرتے ہوئے وہ اسے ڈراتیں، دھمکاتیں اور حوصلہ پست کرنے کی کوشش کرتیں:

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ "بچھّو پھوپھی"۔ مجموعہ "دو ہاتھ"۔ روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۳۸، ۴۲

"منہ جلے۔ نگوڑی نابٹی نہیں ہوں۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ اُن کو خبر ہو گئی تو دُنیا کانہ رہے گا۔ اور کچھ نہیں۔ اگر چھوٹا سُن لے تو پل بھر میں انتڑیاں نکال کر ہاتھ میں تھما دے۔ ڈاکو ہے ڈاکو۔ اس سے بچ گیا تو منجھلا مجسٹریٹ تجھے جیل میں سڑائے گا۔ ساری عمر چکیاں پسوائے گا۔ اور اس سے بچ گیا تو بڑا جو اللہ والا ہے، تیری عاقبت خاک میں ملا دے گا۔ دیکھ مغل بچی ہوں۔ تیری اماں کی طرح شیخانی نتانی نہیں"[1]

گویا پھوپھی جن بھائیوں کو کوستے نہ تھکتی تھیں، اپنے شوہر کے سامنے ان کی "اکلوتی بہن" بن جائیں ——— "فقیر اور بھک منگا بھائی"، "اللہ والا" اور "غدارِ سیدہ" بن جاتا ——— اور "انگریزوں کا غلام" اور "غدار" بھائی بارعب اور بااختیار مجسٹریٹ بن جاتا ——— اور "ڈاکو" بھائی انتڑیاں نکال کر ہاتھ میں تھما دینے والا ہیبت ناک شخص بن جاتا ——— اور وُہ خود "مغل بچی" شوہر کی گردن پر سوار ہو جاتیں ——— یہ کسی معمولی سُوجھ بُوجھ والی عورت کا کردار نہ تھا۔

○ بچھو پھوپھی بہت غیور، خود پرست اور ذکی الحس تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بالعموم رنجیدہ، کشیدہ اور تنی تنی ملتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انھیں زندگی بھر سکون اور قلبی طمانیت نصیب نہ ہوئی ——— جب اُن کا شوہر اُن کی موجودگی میں ہی مہترانی سے پینگیں بڑھانے لگتا ہے تو پھوپھی کی چغتائی انا کو کاری ضرب لگتی ہے۔ اور وُہ بلا توقف اپنی چوڑیاں توڑ دیتی ہیں۔ رنگا دوپٹہ اُتار پھینکتی ہیں سفید لباس پہننے لگتی ہیں۔ شوہر سے ہمیشہ کے لئے جسمانی رشتہ منقطع کر دیتی ہیں۔ اور اُس کا ذکر "مرحوم" یا "مرنے والا" کہہ کر کرنے لگتی ہیں۔ یہ ایک غیرت مند اور حساس عورت کا کردار ہے جسے شوہر کی بے راہ روی قطعاً گوارا نہ تھی۔ اور جو اپنی حمیّت کو کسی طور مرنے نہیں دیتی۔ ان میں ایک اپنی ہی باطنی توانائی ہے۔ ارادے کی پختگی ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کا دم خم ہے۔

○ جب واحد متکلم کی اماں کی دادی دمِ مرگ تھیں تو دونوں طرف کے لوگ تیمار داری کے لئے پہنچے۔ ظفر ماموں دیکھنے گئے اور بچھو پھوپھی کے ہمراہ اُن کی بیٹی مسرت خانم بھی پہنچیں۔ ظفر ماموں نے پندرہ برس کی نوخیز مسرت خانم کا چلبلا سراپا دیکھا تو دم بخود رہ گئے۔ جہاں تھے وہیں گڑ گئے۔ مسرت خانم بھی پہلی نظر میں ہی ظفر ماموں کی ہو گئیں۔ جوانی دیوانی کا عشق جب بھی آتا ہے یوں ہی دبے پاؤں آتا ہے اور چھا جاتا ہے ——— رات کو جب دوسرے لوگ دن بھر کی تیمار داری سے تھک کر سو جاتے تو ان دونوں کو مریضہ کی تیمار داری کا موقع ملتا۔ مگر ان کی نظریں مریضہ پر کم اور ایک دُوسرے پر زیادہ مرکوز رہتیں۔ مسرت خانم جب برف میں تر کپڑا بڑی بی کے ماتھے پر رکھتے

بچھو پھوپھی

---

[1] عصمت چغتائی۔ "بچھو پھوپھی"۔ مجموعہ "دو ہاتھ"۔ روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۴۳

کے لئے ہاتھ بڑھاتیں تو ظفر ماموں کا ہاتھ پہلے سے وہاں موجود ہوتا۔ شاید بڑی بی نے صورتِ حال کو بھانپ لیا۔ اگلے روز انھوں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور گاؤ تکیے کا سہارا لے کر جوں توں اٹھ بیٹھیں۔ خاندان کے تمام ذمّہ دار لوگوں کو طلب کیا اور انھیں قاضی کو بلانے کے لئے کہا۔ سب حیران پریشان تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ مگر کسی میں دَم مارنے کا دَم نہ تھا۔ قاضی آیا تو مسرّت خانم بیہوش ہوگئیں۔ ظفر ماموں نے نکل بھاگنے کی کوشش کی مگر دھر لئے گئے۔ بھانڈہ پھوٹ گیا۔ دونوں کا ایک، دوسرے کا ہاتھ پکڑنا ان کے نکاح کا جواز بن گیا — بچّو پھوپھی کے لئے یہ ایک جانکاہ صدمہ تھا کہ ان کی چہیتی بیٹی ان کے جیتے جی ان کے دشمنوں کے گھر چلی گئی۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئیں۔ پھوپھی نے غم و غصّے سے مغلوب ہوکر کھڑے کھڑے بیٹی اور داماد کو گھر سے نکال دیا۔ چار و ناچار ابّا دونوں کو اپنے گھر لے آئے۔ امّاں نے چاندسی بھاوج کو دیکھا تو پھولی نہ سمائیں۔

بچّو پھوپھی کا یہ کردار ان کے بڑے فیصلہ کُن انداز میں سنگین حالات سے نپٹنے کی اہلیت کی توثیق کرتا ہے۔ شوہر کی بے راہ روی پر ان کا اس سے قطع تعلق کرلینا، اور بیٹی کی نافرمانبرداری پر اسے اور داماد کو فوراً گھر سے نکال دینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کوئی معمولی عورت بے بسی سے حالات کے سامنے سر جھکا کر خاموش ہوجاتی۔ مگر پھوپھی بحرانی حالات میں ہمّت نہیں ہارتیں۔

○ پھوپھی کی شخصیت کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو:

ناچاقی کے باوجود ابّا میاں بقرعید کے روز عیدگاہ سے سیدھے پھوپھی کی گالیاں اور کوسنے سُننے اُن کے ہاں کشاں کشاں جایا کرتے — پھوپھی کو ابّا کی آمد کا پتہ چلتا تو وہ پردہ کرلیتیں اور کوٹھڑی کے اندر سے "جادوگرنی" امّاں کو کوسنا شروع کرتیں جس نے ابّا میاں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ پھر نوکر کے ہاتھ سوّیاں بھجواتیں اور اُن کی حد سے بڑھی ہوئی انا دیکھئے کہ ساتھ ہی کہلوا بھیجتیں کہ "پڑوسن نے بھیجی ہیں" — ابّا میاں حسبِ عادت شرارت سے کہتے "ان میں زہر تو نہیں ملا ہوا؟" اس پر وہ سیخ پا ہوکر اُن کی سُسرال والوں کے پرخچے اُڑا دیتیں — سوّیاں کھاکر ابّا میاں عیدی دیتے تو فوراً اُسے پھینک دیتیں کہ "اسے اپنے سالوں کو دو۔ وہی تمھاری روٹیوں پر پلے ہیں"۔ ابّا خاموشی سے اُٹھ کر چلے آتے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے جانے کے بعد پھوپھی عیدی کے دوروپے گھٹنوں آنکھوں سے لگاکر روتی رہیں گی۔

یہ ایک نرم خو، گداز دل پھوپھی کا سب کی نظروں سے ڈھکا چُھپا پہلو تھا۔ وہ ظاہرہ طور پر سخت اور کرخت تھیں مگر بباطن نرم اور ملائم تھیں۔ ابّا میاں سے تمام عمر اُن کی تناتنی رہی مگر ان کی خواہرانہ محبّت کے جذبات ملوّث نہ ہوئے — پھوپھی کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا گرانقدر ہے۔

○ پھوپھی کی شخصیت کے اس بے حد روشن اور پُرخلوص پہلو کی توثیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ

گو اماں کو وہ ذرا دُور سے نہ جانے کیا کیا بُرا بھلا کہتی رہیں۔ مگر جب اکیلے میں ملتیں تو گلے لگا کر پیار کرتیں۔ پھوٹ پھوٹ کہتیں۔ بچّوں کی خیر و عافیت پُوچھتیں اور انھیں دعائیں دیتیں۔ اس ساعتِ سعید میں وہ بھُول جاتیں کہ یہ بچّے اُن کے "دُشمن" ابّا میاں کے ہیں ــــ پھُوپھی کی زبان بھلے ہی خارہ شگاف تھی مگر دل نرم و نازک جذبات سے بھی معمُور تھا۔

○ ایک دن عید کی سویاں کھاتے کھاتے ابّا میاں کا جی متلانے لگتا ہے اور انھیں اُلٹی ہو جاتی ہے ــــ تو انھیں شرارت سُوجھتی ہے :

"لو بادشاہی خانم، کہا سُنا معاف کرنا، ہم تو چلے۔"

اور انھوں نے یوں کراہ کر بناوٹ سے آواز نکالی کہ پھُوپھی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ افراتفری میں پردہ پھینک چھاتی کوٹتی گھر سے نکل پڑیں۔ مگر ابّا میاں کو شرارت سے ہنستا دیکھ کر انھیں کوستی اُلٹے پاؤں لوٹ گئیں۔

"ابّا نے کہا، تم آگئیں بادشاہی تو ملک الموت بھی گھبرا کر بھاگ گئے۔ ورنہ ہم تو آج ختم ہی ہو جاتے۔"[1]

پھوپھی نے یہ سُن کر ایسے بھاری بھرکم کوسنے دیئے کہ توبہ۔ ان کے کوسنوں میں ایک اپنی ہی نُدرت اور انوکھا پن ہوتا جو ان کی جودتِ طبع کا پتہ دیتا۔ گالیاں جتنی تلخ و ترش اور کڑوی کسیلی ہوتیں، ابّا میاں کو اتنا ہی حظ ملتا۔

"اللہ نے چاہا بجلی گرے گی۔ نالی میں گر کر دم توڑو گے۔ کوئی میّت کو کاندھا دینے والا نہ بچے گا۔"

اور ابّا میاں پھوپھی کے مشتعل جذبات کو مزید ہَوا دینے کے لئے انھیں دو روپے بھجوا دیتے ہیں۔

"بھئی ہماری خاندانی ڈومنیاں گالیاں دے دیں تو انھیں بیل تو ملنی ہی چاہیئے۔"

اور پھوپھی بوکھلاہٹ میں کہہ جاتیں۔

"بیل دے اپنی ماں بہنیاں کو۔" اور پھر فوراً اپنا منہ پیٹنے لگتیں۔

یہ مختصر سا اقتباس جہاں ابّا میاں کی خوش ذوقی کا ثبوت ہے وہیں پھوپھی کے کردار کے دو اہم پہلوؤں کو بھی بیک وقت نمایاں کرتا ہے ــــ پھوپھی ابّا میاں کا پیغام پاتے ہی کہ ان کی آخری گھڑی آ پہنچی ہے، آہ و فغاں اور گریہ زاری کرتیں ان کے ہاں فوراً پہنچ جاتی ہیں۔ مگر انھیں ہنستا دیکھ کر اپنی روایتی دُشنام طرازی پر اُتر آتی ہیں۔ گویا ان کے مزاج کی نرمی اور سختی دونوں بیک وقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں۔

پھوپھی کا کردار اپنی پوری بلند قامتی کے ساتھ اُبھر کر تب سامنے آتا ہے جب افسانہ اپنی معراج کو چھونے لگتا ہے۔ دمِ مرگ ابّا میاں پھوپھی کو بلاتے ہیں کہ بادشاہی خانم دمِ آخر ہے آؤ، دل کا ارمان پورا کرنا ہو تو کرلو۔ اور وہ روتیں دھوتیں

---

[1] عصمت چغتائی۔ "بچھو پھوپھی" مجموعہ "دو ہاتھ" روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۴۴

سینہ کوبی کرتیں، گرتی پڑتیں ان کے ہاں پہنچ جاتی ہیں۔

"لو بادشاہی تمھاری دُعا پوری ہو رہی ہے۔" ابّا میاں نے انتہائی کرب میں بھی مُسکراتے ہوئے کہا۔

بچھو پھوپھی لوٹ کر وہی پُرانی ننھی منّی بچھو بن گئیں، جو بچپن میں روٹھ کر، مچل کر بھائیوں سے ہر بات منوالیا کرتی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی خرانٹ آنکھیں سہم کر ایک میمنے کی سی معصوم آنکھوں میں بدل گئیں۔ بڑے بڑے آنسو اُن کے مرمرے سے گالوں پر سے ڈھلکنے لگے ——— "ہمیں کوسو بچھو بی۔" ابّا نے پیار سے کہا۔ امّاں نے بھی سسک سسک کر پھوپھی سے کوسنوں کی بھیک مانگی ——— اِس بھیک میں نہ جانے کیا طوفان چھپا ہُوا تھا ——— پھوپھی نے گرجنا، برسنا چاہا، مگر الفاظ اُن کے ہونٹوں پر آکر منجمد ہو گئے۔ وہ کانپ کانپ گئیں۔ پھر بولیں:

"یا اللہ ——— یا اللہ ——— یا اللہ ——— میری عمر میرے بھیّا کو دیدے ——— یا مولیٰ ——— اپنے رسول کا صدقہ" ——— اور وہ اس بچّے کی طرح جھنجھلا کر رو پڑیں جسے سبق یاد نہ ہو۔[1]

ان کے آنسوؤں میں نہ جانے کتنی دعائیں پنہاں ہوں گی۔ زندگی بھر کے ہر واقعہ کا نقشہ اُن کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا ہو گا۔ گھر کے سب لوگ حیران دیکھتے رہ گئے کہ آج خلافِ معمول اور خلافِ توقع پھوپھی کے مُنہ سے بھائی کے لئے ایک بھی کوسنا نہ نکلا ——— صرف ابّا میاں کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی، جیسے کہ ہمیشہ بہن کے کوسنے سُن کر کھیلتی رہی تھی ——— عصمت کی اس کہانی کا لبِ لباب اُن کے اِس آخری جُملے میں ہے:

"سچ ہے بہن کے کوستے بھائی کو نہیں لگتے۔ وہ ماں کے دُودھ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔"[2]

واللہ کیا حق بات کہی ہے۔ بہن کے کوسنے کوستے نہیں ہوتے کہ وہ حلق سے نکلتے ہیں نہ کہ قلب و جگر کی گہرائیوں سے۔ بہن کا بھائی کے ساتھ مقدس رشتہ زندگی کے نشیب و فراز میں، خوشیوں اور غموں میں، پیار اور محبت میں اور رنجشوں اور من مٹاؤ کی کیفیتوں میں بھی برقرار رہتا ہے۔ اس رشتے کی ڈور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بے نیاز کبھی ٹوٹتی نہیں۔

ابّا میاں عدلیہ میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ وہ مہذّب اور متمدّن ہیں۔ با ذوق اور با مذاق ہیں۔ اونچے درجہ کی حسِّ مزاح سے بہرہ ور ہیں۔ ان کی طبیعت میں شوخی، شرارت اور چلبلاہٹ ہے۔ بات بات میں اپنی بہن کو خوش دلی سے چڑاتے اور ستاتے ہیں اور اس کی گالیاں اور کوسنے سن کر محظوظ ہوتے ہیں۔ مگر اتنے باشعور ہیں کہ کبھی دوبدو کوسنوں کا جواب نہیں دیتے، بلکہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں کے انداز میں اوٹ میں بیٹھ کر اپنے بچّوں سے جواب دلا دیتے ہیں ——— گو دونوں ایک ہی ماں کے جائے ہیں مگر ان کی طبائع میں بعد القطبین ہے۔ وہ اپنی

---

[1] [2] عصمت چغتائی: "بچھو پھوپھی" مجموعہ "دو ہاتھ"۔ روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۴۶، ۴۷

بہن کے برعکس غصہ میں کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ بلکہ انھیں شاذ ہی غصہ آتا ہے۔ ہر وقت چہکتے مہکتے رہتے ہیں۔ ان کی شوخی اور لطیف حسِ مزاح، جو بات بات میں پھوٹی پڑتی ہے قلب و جگر کو چھو لیتی ہے۔ وہ کنبہ پرور اور بندہ نواز ہیں اور کنبے کے کمزور اور پست لوگوں کو تحفظ دیتے ہیں اور ان کی پُشت پناہی کرتے ہیں۔ دردمند اور گداز دل ہیں۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر پگھل جاتے ہیں۔ گویا وہ ایک نیک سیرت اور شریف النفس انسان ہیں —— دمِ مرگ بھی اپنی بیس برس سے روٹھی ہوئی بہن کو بلانا نہیں بھولتے —— آیئے ذرا اُن پر قریب سے ایک نظر ڈالیں۔

پھوپھی حسبِ معمول ایک منزلے کی کھڑکی میں بیٹھیں، ابا میاں اور اُن کے خاندان کو یہ لمبی لمبی گالیاں اور کوسنے دے رہی ہیں۔ مگر ابا میاں اپنے کمرے میں ذرا اوٹ میں آرام کرسی پر دراز اطمینان سے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ساتھ ہی اُن کے کان کوسنوں کی اس بوچھاڑ پر بھی لگے ہوئے ہیں جو کھڑکی سے نازل ہو رہے ہیں۔ پھوپھی کو اس بات کا رنج تھا کہ اماں "جادوگرنی" ہے جس نے شادی سے پیشتر ہی ان کے بھائی کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔ اور ان کے ایک اسقاط بھی ہوا تھا۔ اماں جب ابا میاں کے پاس بیٹھی، اپنے بچوں کی موجودگی میں یہ جگر خراش بہتان تراشیاں سُنتیں تو اس قدر بسور بسور کر روتیں کہ سب بچوں کو بےساختہ اُن پر ترس آنے لگتا۔ مگر ابا میاں کی آنکھوں میں فطری شوخی اور شرارت عود کر آتی اور وہ بڑے پیار سے اپنے بیٹے سے کہلواتے:

"کیوں پھوپھی آج کیا کھایا ہے؟"

"تیری ماں کا کلیجہ"۔ اس بے تکے جواب سے اماں جل کر مرانڈا ہو جاتیں۔ ابا جواب دلواتے۔

"ارے پھوپھی جب ہی مُنہ میں بواسیر ہو گئی ہے۔ جلاب لو جلاب"[1]

اب پھوپھی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ اور وہ آپے سے باہر ہو کر بھائی کے جوان بیٹے کی لاش پر کوّوں کو دعوت دینے لگتیں۔ اس کی دُلہن کو جو ابھی اپنے والدین کے گھر ہی بیٹھی تھی۔ رنڈاپے کی بددعا دیتیں۔ اماں یہ سن کر کانوں میں انگلیاں دے لیتیں۔ اور "جل تو جلال تو، آئی بَلا کو ٹال تو" کا وِرد کرتیں —— ابا میاں پھر شرارت سے اپنے بیٹے کو انگیخت کرتے اور وہ پوچھتا:

"پھوپھی بادشاہی، مہترانی پھوپھی کا مزاج تو اچھا ہے؟"

"ارے جا سنپولئے، میرے مُنہ نہ لگ۔ نہیں تو جُوتی سے مُنہ مسل دُوں گی۔ یہ بڈھا اندر بیٹھا کیا لونڈوں کو سکھا رہا ہے۔ مُنّل بچہ ہے تو سامنے آ کر بات کرے۔"

"رحمان بھائی، اے رحمان بھائی، اس بورانی کُتیا کو سنکھیا کیوں نہیں کھلاتے؟"[2]

---

[1] [2] عصمت چغتائی، "بچو پھوپھی"، مجموعہ "دو ہاتھ"، روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۴۰

بچے ابّا میاں کی اکساہٹ پر پھوپھی سے سوال و جواب تو ضرور کرتے مگر پھوپھی کا اُن پر اس قدر رُعب اور دبدبہ طاری تھا کہ ان کے پسینے نکل جاتے۔

○ پھوپھی کے تعلق سے ابّا میاں کی شرارت اور چلبلاہٹ کے سوتے کبھی خشک نہ ہوتے۔ انھیں نت نئی شرارتیں اور مذاق سوجھتے رہتے۔ غرض یہ ہوتی کہ پہلے ہی سے بھری بیٹھی پھوپھی کے جذبات اور مشتعل ہوں اور وہ کوسنوں سے اُنھیں نوازیں۔ اس سے ان کی طبیعت کو شگفتگی اور بشاشت ملتی۔ قلبی اور ذہنی حظ ملتا ——

ابّا میاں، امّاں سے ازراہِ مذاق کہتے:

"بیگم، بادشاہی سے کشتی لڑو گی؟"

اور پھوپھی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑتیں۔

"ہاں ہاں بُلا اپنی ماں کو۔ آ جائے خم ٹھونک کر۔ ارے اُتو نہ بنا دُوں تو مرزا کریم بیگ کی اولاد نہیں۔ باپ کا نطفہ ہے تو بلا۔ بلا ملّازادی کو"[1]

پھوپھی بیٹھی بیٹھی اندر ہی اندر اُبلتی رہتیں، کڑھتی رہتیں۔ اور ابّا میاں آرام سے بیٹھے مزے لیتے۔ ان کی پیشانی پر کبھی شکن نہ پڑتی۔ وہ حسبِ معمول زیرِ لب مسکراتے اور لطف اندوز ہوتے۔

○ جب ابّا میاں موڈ میں ہوتے تو کہیں رُکتے تھمتے نہ تھے۔ اپنی دریدہ دہن، برہنہ گفتار بہن سے نوک جھونک پر تُل جاتے۔ اُن کا اختراعی ذہن "تازہ بتازہ نو بہ نو" معصوم اور بے ضرر شرارتیں تخلیق کرتا رہتا۔ غرض و غایت ہمیشہ یہ ہوتی کہ اکساہٹ پر پھوپھی مغلّظات ارشاد فرمائیں تو ذرا جی بہلے۔ من ہلکا ہو —— یہ بھی ان کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا۔

○ ابّا میاں کا خلوص اور وسیع النظری ملاحظہ ہو کہ جب اُن پر فالج کا آخری حملہ ہُوا اور موت سرہانے کھڑی ان کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی، تو وہ اس نازک گھڑی میں بھی اپنی مدّتوں سے رُوٹھی بہن کو ملاقات کے لئے بلانا نہیں بھولتے۔

"بادشاہی خانم ہمارا آخری وقت ہے دل کا ارمان پُورا کرنا ہو تو آ جاؤ۔"

اس رُخصتی پیغام میں کتنا درد تھا۔ کتنی اپنائیت اور اُنسیّت تھی۔ کتنی گدازدلی اور دردمندی تھی —— عمر بھر کی مغائرت کے بندھ ٹوٹ گئے۔ پیار اور محبت کے خُشک سوتے پھر سے پھُوٹ پڑے۔ سب ذہنی تحفّظات معدُوم ہو گئے۔ ہمیشہ سے دل کے نہاں خانوں کی گہرائیوں میں پنہاں جذبات پھر سے نمُودار ہو گئے ——

---

[1] عصمت چغتائی۔ "بِچّو پھوپھی" مجموعہ "دو ہاتھ" روہتاس بکس، لاہور۔ ۴۲

ابامیاں کو بچپن کے وہ سہانے دن یاد آ گئے ہوں گے جب ننھی منی گڑیا سی بچھو بی ان کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔لڑائی جھگڑا کرتی تھی اور من جایا کرتی تھی۔ آج وہ خود اس بھائی کو منانے آئی تھیں جن سے زندگی روٹھ گئی تھی۔

ابامیاں کے بارے میں جن واقعات کا ذکر بچھو پھوپھی کے حوالے سے کیا گیا ہے وہ ان کی شخصیت کے کچھ مخصوص پہلوؤں کو آشکار کرتے ہیں مگر ان کے کردار کے کئی دیگر قابلِ قدر پہلو بھی ہیں۔مثال کے طور پر وہ اپنے چھوٹے بھائی کو جو نہ صرف شرابی کبابی اور رنڈی باز ہے بلکہ قتل کے کئی مقدمات میں بھی ماخوذ ہے، تحفظ عطا کرتے ہیں۔کیونکہ وہ خود عدلیہ میں ہیں،اس لئے وہ اُس کے بچاؤ کی صورت نکالنے کے اہل ہیں ـــــ پھر اُن کے بہنوئی کو بھی جو ایک اوباش اور بدکردار شخص ہے اُن کی سرپرستی حاصل ہے ورنہ محلّہ والے اُسے نکال باہر کرتے ـــــ نہ صرف یہ جب پھوپھی اپنی بیٹی اور داماد کو گھر سے نکال دیتی ہیں تو ابامیاں اُن بے سروسامان لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دیتے ہیں۔یہ تمام واقعات اس بات کے مظہر ہیں کہ ابامیاں ایک وسیع القلب، شریف النفس، کنبہ پرور انسان تھے۔یہ تمام خوبیاں ان کی شخصیت کو بلند کرتی ہیں۔

اس افسانے کی آب و تاب بچھو پھوپھی کے بعد ابامیاں کی ذات سے ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ افسانہ بیشتر پھوپھی اور ابامیاں کے مکالموں پر مبنی ہے۔اس لئے دونوں کرداروں کا ساتھ ساتھ نمایاں ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ان کے کردار آپس میں یوں مربوط اور مخلوط ہو گئے ہیں کہ ان کو الگ الگ کر کے دیکھنا محال ہے۔ ابا کے تحت جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے اُن سے پھوپھی کا بھی اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ خود ابامیاں کا ـــــ بدیں وجہ اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے کرداروں کو بحیثیت مجموعی ہی پرکھنا ہوگا۔

عصمت تصویر کشی میں یکتا ہیں۔ وہ چند نپے تلے جملوں میں ہی منظر یا کردار کو یوں نمایاں کر دیتی ہیں کہ اس کا ناک نقشہ اور خدّوخال جگمگا اُٹھتے ہیں۔اس بات کا اطلاق اس افسانے پر ہی نہیں، قریب قریب اُن کے سب افسانوں پر ہوتا ہے ـــــ وہ اپنے کرداروں کے ہر نقش، ہر انداز، پیچ و خم، عادات و خصائل اور بوالعجبیوں تک سے اس قدر آگہی رکھتی ہیں اور انھیں زبان و بیان پر اس قدر دسترس حاصل ہے کہ وہ موئے قلم کی چند بے تکلّف جنبشوں سے ہُو بہُو تصویر کھینچ کر رکھ دیتی ہیں۔وہ نقاش نہیں عکاس ہیں۔خوبی یہ ہے کہ اس بارے میں نہ وہ شہد آگیں زبان کا سہارا لیتی ہیں۔نہ شاعری کرتی ہیں اور نہ تخیّل کے زور سے کوئی مخصوص فضا یا تاثر پیدا کرتی ہیں۔بس سیدھی سادی بات کو، سیدھے سیدھے لب ولہجہ میں بلا تردّد یوں پیش کر دیتی ہیں گویا کوئی بات ہی نہ ہو۔فن کے اس مخصوص پہلو میں وہ اپنے ہمعصر حریفوں پر بلاشبہ فوقیت رکھتی ہیں ـــــ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:

عصمت اپنے ددھیال والوں کا نقشہ یُوں پیش کرتی ہیں:

"ددھیال والے باہر سے سب آخری کیمپ میں آنے والوں میں سے تھے۔ ذہنی طور پر ابھی تک گھوڑوں پر سوار منزلیں مار رہے تھے۔ خون میں لاوا دہک رہا تھا۔ کھڑے کھڑے تلوار جیسے نقوش، لال فرنگیوں جیسے مُنہ، گُربلوں جیسی قد و قامت، شیروں جیسی گرجدار آوازیں شہتیر جیسے ہاتھ پاؤں"[1]

چار پانچ چھوٹے چھوٹے جملوں میں فنکارہ نے ان بہادر، جری، دیوزاد، آہنی شخصیت کے مالک مُغلوں کا نقشہ عین مین کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اور خوبصورتی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بات تشبیہوں کی زبان میں کہی ہے اور ہر تشبیہ اس تصویر کی انگشتری میں ترشا ہُوا نگینہ ہے۔

قریب المرگ بھائی کا پیغام پاکر بچھّو پھوپھی کی ان کے ہاں آمد کا منظر ملاحظہ ہو۔

"نہ جانے اس پیغام میں کیا تیر چھپے تھے۔ بھیّا نے پھینکے اور بہنیاں کے دل میں ترازو ہو گئے بلبلاتی، چھاتی کوٹتی، سفید پہاڑ کی طرح بھونچال لاتی ہُوئی بادشاہی خانم اس ڈیوڑھی پر اُتریں جہاں اب تک انھوں نے قدم نہیں رکھا تھا"[2]

ان دو جملوں میں بھائی کے پیغام کی اپنائیت، بہن کی ان کے تئیں اُنسیت، بہن کا رنج و غم سے مغلوب ہو کر آہ و فغاں کرنا، گوری چٹّی پہاڑ کے سے تن و توش کی بہن کا تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے زلزلہ سا پیدا کرتے ہوئے آنا، یہ سارا منظر زندہ ہو کر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ــــــ عصمت نے اس کہانی میں نہ جانے ایسی کتنی چھوٹی بڑی رنگا رنگ تصاویر کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ جو قاری کے ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں۔

○ یہ افسانہ دھیمی دھیمی خوشبُو بکھیرتا، دل و دماغ کو معطّر کرتا، عصمت کی حسِ مزاح کا ارفع نمونہ پیش کرتا ہے پھُوپھی اور ابّا میاں کی نوک جھونک ازاوّل تا آخر جاری رہتی ہے اور جا بجا موقع محل کی مناسبت سے طنز و مزاح کے پھُول برساتی رہتی ہے۔ (مزاح کے زیادہ طنز کے کم) جس سے کہانی اپنے آپ کھِل اُٹھتی ہے۔ یہ طنز و مزاح مہذّب اور متمدّن ہے۔ صاف ستھرا اور صاف شفّاف ہے۔ اور ایک باشعور، باذوق قاری کے لئے پُر کشش ہے ــــــ پھر یُوں بھی عصمت کی تحریر میں جا بجا ایک اپنی ہی شوخی اور چلبلاہٹ ملتی ہے، جو خُدا کی دین ہے ــــــ اور کہیں کہیں مزاح بہت واضح ہو جاتا ہے اور تحریر کو جگمگا دیتا ہے۔ دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں:

○ "ابّا میاں سے اتنی ہم شکل تھیں، جیسے وہی مُونچھیں اُتار کر دوپٹہ اوڑھ کر بیٹھ گئے ہوں"

---

[1] [2] عصمت چغتائی: "بچھّو پھوپھی" مجموعہ "دو ہاتھ" روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۱۴۱، ۱۴۶

○ "انھوں نے کئی قتل کئے تھے۔ ڈاکے ڈالے تھے۔ شراب اور رنڈی بازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ انھیں "ڈاکو" کہا کرتی تھیں، جو اُن کے کیریکٹر کو دیکھتے ہوئے قطعی پھسپھسا لفظ تھا۔"

○ "پھر جو بادشاہی پھوپھی پر دورہ پڑا ہے تو بس گھوڑے اور تلوار کے بغیر انھوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔"

یہ شستہ ورفتہ، باموقع، بامحل مزاح افسانے کو تروتازگی اور شگفتگی عطا کرتا ہے۔

عصمت سے جب سوال کیا گیا کہ جو بات اُن کے خاکے "دوزخی" اور کہانی "بچھو پھوپھی" میں ہے، وہ ان کے دوسرے خاکوں اور کہانیوں میں کیوں نہیں، تو انھوں نے جواب دیا:

"شاید میں اپنے رشتے داروں کے ساتھ پارشل (PARTIAL) ہوں۔ یا وہ زیادہ میرے دماغ میں واضح ہیں۔۔۔ اور میں اپنے خاندان کے بارے میں زیادہ گہرائی میں جاکر، زیادہ محسوس کرکے لکھ سکتی ہوں۔"[1]

عصمت نے خود ہی "بچھو پھوپھی" کے غیر معمولی طور پر موثر ہونے کے جواز پر اُنگلی رکھ دی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ افسانہ خود عصمت کی داستانِ حیات کا ہی ایک ورق ہے۔ جن کرداروں کے مرکز ومحور کے گرد یہ افسانہ گردش کرتا ہے، وہ تمام عصمت کے اپنے کُنبے کے لوگ ہیں۔ بچھو پھوپھی عصمت کی سگی پھوپھی ہیں۔ اَبّا میاں ان کے والد بزرگوار ہیں اور امّاں ان کی مادرِ مہربان۔ باقی ضمنی کرداروں سے بھی حقیقی زندگی میں ان کا وہی رشتہ تھا جو کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔ عصمت خود ایک طرح سے "داستان گو" ہیں۔۔۔ گویا تمام کردار ان کے دیکھے بھالے، جانے پہچانے، تولے پرکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف اُن کے مظاہر مثلاً شکل وصورت، قدوقامت وغیرہ سے شناسا ہیں بلکہ ان کے مستور پہلوؤں مثلاً عادات، جذبات اور احساسات، معمولات، مزاج وغیرہ سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتی ہیں۔۔۔ پھر وہ ان کے باہمی رشتوں کے نشیب وفراز اور کیف وکم سے بھی آگاہ ہیں۔ ایسے میں عصمت جیسی فنکارہ کا اپنے موضوع میں ڈوب کر لکھنا، گہرائی میں جاکر اپنے کرداروں کی شخصیت کے نہاں خانوں میں دُور تک جھانک کر دیکھنا اور ان کی معمولی سے معمولی جزئیات کو بھی صفحۂ قرطاس پر اُجاگر کردینا حیرت کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری بچھو پھوپھی ایسے بھرپور اور جاندار کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ بات قابلِ ستائش ہے کہ عصمت نے پھوپھی اور ابّا میاں کے کُنبے کا ایک اہم فرد ہونے کے باوصف اپنی معروضیت پر آنچ نہیں آنے دی۔ انھوں نے جو کچھ ایک ادیبہ کی آنکھوں سے دیکھا، اُسے جُوں کا توں پیش

---

[1] عصمت چغتائی۔ "عصمت چغتائی سے گفتگو" انٹرویو از یونس اگاسکر۔ اُردو ماہنامہ "مکالمات" نئی دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۱۷

کر دیا ہے۔ کوئی گوٹ اور پھندنے نہیں لگائے۔ کہیں بے جا ستائش یا مذمت نہیں کی۔ ہر چیز کو دُور کھڑے ہو کر بے تعلقی کے انداز سے دیکھا پرکھا ہے۔ اس ادیبہ سے جس نے اپنے بھائی 'عظیم بیگ چغتائی' کے خاکے " دوزخی " میں بھی اپنی معروضیت قائم رکھی، یہی اُمید کی جاسکتی تھی۔

یہاں یہ لکھنا بھی ضرُوری ہے کہ عصمت نے پھوپھی کی طرح آبا میاں کے کردار سے بھی پُورا پُورا انصاف کیا ہے۔ اور اُن کے سب پہلوؤں، ہر سب زاویوں سے، ان کی اہمیت کے تناسب سے روشنی ڈالی ہے۔ اور افسانے کے اختتامیہ حصے میں ان کا کردار اپنی معراج کو چھُونے لگتا ہے۔

یہ افسانہ اوّل و آخر "بچھو پھوپھی" کی بے مثل کردار نگاری کے سبب ہی یاد رکھا جائے گا۔ ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کہانی میں "کہانی پن" ذرا کم ہے۔ قریب قریب تین چوتھائی افسانہ آبا میاں اور بچھو پھوپھی کے سوالات و جوابات پر مبنی ہے جن میں یکسانیت جھلکتی ہے ـــــ کہانی کے مکالمے بڑے شوخ، تیکھے اور جاندار ہیں اور وہ اس میں زندگی کی رُوح پھونک دیتے ہیں ـــــ کہانی کا انجام اس قدر پُر اثر اور غمناک ہے کہ وہ قلب و جگر پر اپنی مُستقل چھاپ چھوڑ جاتا ہے کہ آبا میاں کی مَوت کے ساتھ ہی پھوپھی کی ان کے ساتھ مناقشت از خود ختم ہو جاتی ہے۔ کہانی کا اس سے بہتر انجام شاید ممکن نہ تھا۔

یہ افسانہ "بچھو پھوپھی" کی کردار نگاری کے تعلق سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

●

مُرقّع نگاری

میرا دوست میرا دشمن ○ کچھ میری یادیں ○ دوزخی

مرقّع نگاری ادب کی ایک اہم صنف ہے جو سوانح سے جُداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ سوانح تاریخی ترتیب کے ساتھ واقعاتِ حیات کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن مرقّع نگاری پر تواتر کی شرط عائد نہیں ہوتی۔ مرقّع نگاری چند واقعاتِ زندگی کو اِس طور سے پیش کرتا ہے کہ کردار کی شخصیت کے خدّوخال اپنی تمام تر خوشنمائیوں اور بدنمائیوں کے ساتھ اپنے اصلی رنگ رُوپ میں نمایاں ہو جائیں۔ اُردو ادب میں مرقّع نگاری دورِ جدید کی پیداوار ہے اور انگریزی ادب کی مرہُونِ منّت ہے۔ انگریزی ادب میں مرقّع نگاری بہت اہم مقام رکھتی ہے اور اُس کا گرانمایہ سرمایہ موجود ہے۔

اُردو میں مرقّع نگاری کی واضح شکل بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں ملتی ہے۔ اس سے پیشتر تذکروں اور سوانح کا دَور تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود تذکرہ نویسی کی معراج ہے۔ لیکن اس میں کہیں کہیں مرقّع نگاری کے دلکش نمونے بھی ملتے ہیں۔ بہرطور بحیثیت مجموعی آبِ حیات کو ہم تذکرہ نویسی ہی کہیں گے اور مرقّع نگاری کی تمہید یا حرفِ اوّل۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق، چراغ حسن حسرت، فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی بطور مرقّع نگار اہم مقام رکھتے ہیں۔ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اور شورش کاشمیری نے سعادت حسن منٹو کے مرقعے لکھے۔ سردار جعفری نے مخدوم محی الدین اور ساحر لدھیانوی کے خاکے لکھے۔ عاشق بٹالوی اور زبیر واسطی نے اختر شیرانی، مہندر ناتھ نے اپنے بھائی کرشن چندر اور فکر تونسوی نے احمد ندیم قاسمی اور ساحر لدھیانوی کے مرقعے لکھے ـــــ یہاں یہ لکھنا شاید غیر موزُوں نہیں ہوگا کہ یہ مرقعے نامور ادیبوں نے اپنے احباب کے بارے میں لکھے۔ اور ان میں بعض مقامات پر فنِ مرقّع نگاری کے بنیادی اصولوں کو ملحُوظ نہیں رکھا۔ کچھ ایک نے صرف "خیالِ خاطرِ احباب" کو سامنے رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کردار کی شخصیت صحیح طور پر نہیں اُبھرتی اور قاری تشنہ کام رہ جاتا ہے اور فن کا تقاضا بھی پُورا نہیں ہوتا۔

شوکت تھانوی از اوّل تا آخر مزاح نگار ہیں۔ اُن کے مرقّعوں میں بھی ظرافت کی جھلک نمایاں ہے۔ مگر افسوس کہ کردار کی شخصیت کھُل کر واضح نہیں ہوتی جو مرقّع نگاری کا بنیادی مقصد ہے۔ فرحت اللہ بیگ کا

کا طویل مضمون" نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی" خوب ہے۔ اسے ان کے منفرد پیرایۂ بیان اور مرقع نگاری کا خوبصورت نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کی چلتی پھرتی، جیتی جاگتی تصویر نمایاں ہوجاتی ہے ——— جوش ملیح آبادی نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف" یادوں کی برات" میں اپنے بزرگوں، عزیزوں اور احباب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ان اوراق میں مرقع نگاری کے عمدہ نمونے بھی مل جاتے ہیں لیکن تشبیہات، استعارات اور تلمیحات نے ان کی تحریر کو بہت بوجھل اور بھاری بھرکم بنا دیا ہے ——— رشید احمد صدیقی کا طنز و مزاح میں بہت ارفع مقام ہے لیکن مرقع نگاری میں بھی وہ نہایت کامیاب ہیں۔ ان کے مرقعات کے مجموعوں" گنج ہائے گراں مایہ" اور" ہم نفسانِ رفتہ" کے تذکرے کے بغیر اردو مرقع نگاری پر کوئی مضمون مکمل نہیں سمجھا جاسکتا۔ رشید احمد صدیقی کو زبان و بیان پر کمال قدرت حاصل ہے۔ وہ صاحبِ اسلوب انشا پرداز ہیں۔ ان کے مرقعے وقیع اور معیاری ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے ہر پہلو کو حُسنِ تحریر سے پُر بہار بنا دیتے ہیں۔ قاری ان کے مرقعوں سے وہی تاثر لیتا ہے جو وہ دینا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی مرقع نگاری کی کامرانی کی دلیل ہے۔

عصمت چغتائی نے کئی اصنافِ ادب کو اپنے فن کا موضوع بنایا مثلاً افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، مرقع نگاری، رپورتاژ مگر بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار ہی ہیں اور اسی صنف میں ان کی عالی مقامی مسلّمہ ہے۔ لیکن مرقع نگاری میں بھی اُن کا ایک مخصوص مقام ہے اور اس صنف میں بھی ان کی خدمات کو اردو ادب کبھی فراموش نہ کر پائے گا ——— عصمت نے مندرجہ ذیل اصحاب پر مرقعے لکھے:

سعادت حسن منٹو، اسرار الحق مجاز، عظیم بیگ چغتائی، اے ایس بخاری پطرس، خواجہ احمد عباس اور جاں نثار اختر ——— یوں افسانوں میں ان کے افسانے" بچھو پھوپھی" اور" جا بڑے" ایسی کہانیاں ہیں جن کے کردار زندہ تھے۔ مگر ہم ان کا شمار قلمی خاکوں میں نہیں کر سکتے۔

یہاں منٹو پر عصمت کا خاکہ" میرا دوست میرا دشمن"، اے ایس بخاری پطرس پر ان کا خاکہ" کچھ میری یادیں" اور اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر ان کا خاکہ" دوزخی" کا تجزیاتی مُطالعہ پیش ہے۔

میرا دوست میرا دشمن

عصمت چغتائی نے منٹو پر اپنا مشہور خاکہ" میرا دوست میرا دشمن" کے عنوان سے لکھا۔ اس سے پیشتر عصمت پر منٹو اپنا خاکہ" عصمت چغتائی" کے عنوان سے لکھ چکے تھے جو عصمت پر لکھے گئے مضامین میں بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اس میں عصمت کی شخصیت اور فن بڑی فنی نفاست کے ساتھ اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں اور متاثر کرتے ہیں ——— عصمت نے منٹو پر اپنا خاکہ اُن کی موت کے بعد لکھا جب انھیں پاکستان ہجرت کئے سات سال

گذر چکے تھے ـــــ جب منٹو ہندوستان میں تھے تو اُن کی عصمت سے بڑی گہری چھنتی تھی۔ عصمت کی منٹو کی اہلیہ صفیہ بیگم سے بھی گہری دوستی تھی۔ لیکن جب منٹو جنوری ۱۹۴۸ء میں عصمت سے "خدا حافظ" کہے بغیر ہی چپکے سے پاکستان چلے گئے اور اپنے دوست نما دشمن احباب کی صحبت میں پڑ کر کثرتِ شراب نوشی سے تباہ ہوگئے، تو عصمت اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا کہ پاکستان کی ہجرت نے دونوں کے درمیان ایک خلیج سی پیدا کر دی تھی ـــــ مرنے سے پیشتر منٹو نے عصمت کو اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ وہ اُن پر خاکہ لکھیں لیکن عصمت کے الفاظ میں "بے ساختہ میری منحوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی"[1] اور ایسا ہی ہُوا۔

عصمت جب اپنے شوہر شاہد لطیف کی معیّت میں منٹو کو پہلی دفعہ ان کی اڈالفی چیمبرز بمبئی والی رہائش گاہ پر ملنے گئیں تو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انھیں گھبراہٹ سی ہونے لگی جو آہستہ آہستہ وحشت میں بدل گئی۔ وہ منٹو کے بھک سے اُڑ جانے والے آتشیں مزاج سے واقف تھیں۔ پھر تب شام کا وقت تھا جب منٹو اکثر شغلِ مے نوشی میں غرق ہوتے تھے۔ گویا ایک تو کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ لیکن عصمت اپنے دَم خم سے بھی خوب واقف تھیں اور وہ منٹو کی تندمزاجی اور تُرش مزاجی سے نبرد آزما ہونے کی ہمّت اور حوصلہ رکھتی تھیں۔

وہ اندر داخل ہوئیں تو انھوں نے دیکھا کہ کمرے میں کھڑکی سے ملی ہُوئی ایک بڑی سی لدی پھندی میز کے پاس ایک بڑی سی کُرسی میں ایک باریک مکوڑے کی شکل کا انسان اُکڑوں بیٹھا ہُوا ہے۔ وہ منٹو تھے اور یہ ان کے بیٹھنے کا مخصوص انداز تھا ـــــ عصمت نے منٹو کی شکل وصورت اور لباس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> "موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پُتلیوں والی آنکھیں جن میں رعونت اور گستاخی کے ساتھ بے ساختہ شگفتگی کی جھلک ملتی تھی۔ نازک نازک ہاتھ پیر، سر پر ٹوکرا بھر بال، پچکے زرد زرد گال اور کچھ بے تکے سے دانت"[2]

منٹو اُس وقت کھدر کا کُرتا پاجامہ اور جواہر کٹ صدری پہنے ہوئے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں یوں گھُل مِل گئے گویا ایک دوسرے سے برسوں سے واقف ہوں اور تھوڑی ہی دیر میں اُن کی بات چیت نے سنجیدہ اور پُرانہماک بحث مباحثے کی صورت اختیار کر لی۔ بات سے بات نکلتی گئی اور یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ بحث یکساں گرمجوشی کے ساتھ چلتی رہی اور رات ہوگئی۔ عصمت اور شاہد کو ملاڈ جانا تھا، جہاں پہنچتے پہنچتے ایک بج جانا تھا۔ اُنھوں نے سوچا کھانا یہیں کھا لینا چاہیئے ـــــ منٹو نے عصمت کو الماری سے

---

[1][2] عصمت چغتائی، "میرا دوست میرا دشمن"۔ "منٹو، شخصیت اور فن"، موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی۔ ص ۴۸-۲۷

پلیٹیں اور چمچے نکالنے کو کہا اور خود ہوٹل سے کھانا لے آئے۔ برنی سے اچار نکالا اور میز پر کھانا چن دیا۔ وہ میز جو دم بھر پہلے ادبی مباحث کا میدان بنی ہوئی تھی، کھانے کی میز میں بدل گئی۔ اور انھوں نے "پہلے آپ" کے تکلّف میں پڑے بغیر بے تکلّفی سے کھانا شروع کر دیا۔ گویا روزِ اوّل سے ایسے ہی کھانے کے عادی ہوں۔

کھانا کھاتے ہوئے پھر سے گرما گرم بحث شروع ہو گئی۔ خوب جھڑپیں ہوئیں۔ موضوع عصمت کا مشہور افسانہ "لحاف" تھا، جس کی وجہ سے انھیں ادبی حلقوں میں بہت خجل اور خفیف ہونا پڑا تھا۔ عصمت اس موضوع کو ٹالنا چاہتی تھیں جو اُن دنوں اُن کی دُکھتی رگ بنا ہوا تھا۔ لیکن منٹو بحث پر مصر تھے اور گھوم پھر کر اس موضوع پر آ جاتے تھے۔ انھوں نے "لحاف" کو تار تار کر ڈالا۔ اور جب عصمت نے "لحاف" لکھنے پر اظہارِ تاسّف کیا تو منٹو بہت برہم ہوئے کہ ان کے نزدیک تو وُہ ایک نادر شاہکار تھا۔ انھوں نے عصمت کو غم و غصّے میں بہت کچھ جلی کٹی سُنا ڈالیں۔ اور انھیں بُزدل اور تنگ نظر تک کہہ ڈالا۔ لیکن عصمت اُسے اپنا شاہکار ماننے پر تیار نہ ہوئیں —— جوش و خروش میں دونوں نے "لحاف" کے موضوع سے بھی گذر کر بہت کھُل کر بحث کر ڈالی۔ عصمت منٹو کی کھلم کھُلا گفتگو کے تعلق سے اپنے ردِّ عمل کا اظہار یُوں کرتی ہیں۔

> "مجھے تعجب ہوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بیہودہ سے بیہودہ بات دھڑلے سے اس معقولیّت اور بھولپن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ یا وہ مہلت دیتا ہی نہیں۔ اُس کی باتوں پر ہنسی آ جاتی ہے۔ گھن یا غصّہ نہیں آتا۔"[1]

منٹو جو بات کرتے ذہنی محفوظات سے مبرّا ہو کر کرتے۔ دل کی بات تصنّع و بناوٹ کے بغیر نوکِ زبان پر لاتے۔ اُتاولے پن میں وہ مدِّ مقابل کی بات کاٹنے کے عادی تھے کیونکہ تیز زبان اور حاضر دماغ تھے۔ بات کرنے والے کا مدّعا چشم زدن میں بھانپ کر اپنی کہہ ڈالتے تھے۔ ایسے ایک دلچسپ اتفاق کہیے کہ عصمت بھی دوسرے کی بات کاٹنے کی عادی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ دونوں بحث میں تحمّل و بُردباری کھو دیتے اور بے تحاشا بھڑ جاتے۔ کیونکہ دونوں ہٹیلے اور کٹیلے تھے۔ کوئی دوسرے سے مات کھانے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ اور اپنے اپنے موقف پر سختی سے قائم رہتے تھے۔ عصمت لکھتی ہیں:

> "منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا جیسے ذہنی قوتوں پر دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے۔ دماغ میں جھاڑو سی دی جا رہی ہے۔"[2]

یہ اقتباس اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی بحث برائے بحث نہ ہوتی تھی، محض تفریحِ طبع کے لئے نہیں تھی۔

---

[1]، [2] عصمت چغتائی "میرا دوست میرا دشمن"۔ "منٹو شخصیت اور فن"۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ ص ۳۰، ۳۱

ان کا مقصد ایک دوسرے سے کچھ سیکھنا، سمجھنا اور اپنی ذہنی قوّتوں کو جلا دینا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی فنّی صلاحیتوں اور اہلیتوں کے قائل تھے ـــــ جب دو چار دفعہ بحث میں کچھ زیادہ تلخی و ترشی پیدا ہوئی اور ڈور ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تو دونوں نے بات بڑھنے سے پیشتر ہی طرح دینے کا ہنر سیکھ لیا۔ عصمت تو موقع شناس اور مصلحت کوش تھیں: بحث میں ہار جائیں تو مہارت سے اپنی خفت چھپا جائیں جبکہ منٹو روہانسے ہو جاتے۔ ان کی آنکھیں تن جائیں، نتھنے پھڑکنے لگتے اور منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا ـــــ جب تک منٹو ہندوستان میں رہے ان کی دوستی بہت ارفع سطح پر برقرار رہی، جس کا ایک سبب یہ تھا کہ عصمت کی منٹو کی اہلیہ صفیہ بیگم سے بھی گاڑھی چھننے لگی تھی اور دونوں جگری سہیلیاں بن گئی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کی دوستی بے غرض اور بے لوث تھی۔ عصمت نے منٹو کے خاکے میں اُن سے اپنی دوستی کے اس پہلو کو بحُسن و خوبی اُجاگر کیا ہے۔

○ منٹو کو اپنے بچّوں سے بے پناہ محبت تھی۔ کس باپ کو نہیں ہوتی؟ لیکن کچھ ماں باپ اپنے بچّوں سے زیادہ ہی پیار، دُلار کرتے ہیں۔ ان کے ناز اُٹھاتے ہیں۔ اور بڑے لاڈ اور چاؤ سے پالتے پوستے ہیں۔ منٹو کے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہوئے جو ڈیڑھ سال کی عمر میں ہی چل بسا۔ عصمت لکھتی ہیں کہ اپنے گذرے ہوئے بچے کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے اُن سے کہا کہ وہ بڑا شریر تھا۔ گھٹنوں گھٹنوں چلتا تھا تو فرش کی درزوں سے مٹّی نکال کر کھا لیا کرتا تھا۔ ان کا کہنا بہت مانتا تھا۔ وُہ ابھی چھ سات دن کا تھا کہ وُہ اُسے ساتھ سُلانے لگے تھے۔ تیل مَل مَل کر نہلاتے۔ رات کو چُپ چاپ دُودھ پلاتے اور صفیہ پڑی سوتی رہتی اور اُسے خبر بھی نہ ہوتی۔ دُودھ پلانے سے پیشتر بچّے کو بوڈی کلون یا اسپرٹ سے صاف کر لیا کرتے تھے ـــــ اور وُہ حیرت زدہ سوچتی رہیں کہ یہ کیسا "مرد" ہے جو بچّوں کو پالنے میں مشاق ہے ـــــ مگر وہ بچّہ مر گیا۔ منٹو نے پُرتصنّع مُسکراہٹ سے کہا:

"اچھا ہُوا جی وُہ مر گیا۔ مجھے تو اس نے آیا بنا ڈالا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اس کے پوتڑے دھوتا ہوتا۔ نکمّا ہو کر رہ جاتا۔ مجھ سے کام کوئی تھوڑا ہوتا۔ سچ مچ عصمت بہن مجھے اس سے عشق تھا۔"[1]

یہ ایک دردمند، مشفق، اپنے بچّے پر جان چھڑکنے والے باپ کی آواز تھی۔

جب عصمت کی بیٹی سیما پیدا ہوئی تو بچّی کو دیکھ کر منٹو کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا۔ وہ دیر تک اُنھیں اُس کی چھوٹی چھوٹی معصوم شرارتیں بتاتے رہے۔ صفیہ جو پاس ہی بیٹھی تھی، کا دل شفقتِ مادری سے پگھل گیا اور سال بھر بعد منٹو کی بڑی بیٹی نکہت پیدا ہوئی۔ پُونے سے واپسی پر عصمت کو معلوم ہُوا تو وہ بہ تعجیل تمام اُن کے ہاں پہنچیں۔ پتہ چلا کہ انھوں

---

[1] عصمت چغتائی، "میرا دوست میرا دشمن"۔ "منٹو شخصیت اور فن"، موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی۔ ص ۳۱

نے مکان بدل لیا ہے۔ وہ ڈھونڈتی ڈھونڈتی وہاں پہنچیں تو دیکھا کہ منٹو ڈرائنگ روم میں پوتڑے نچوڑ نچوڑ کر پھیلا رہے ہیں ـــــ منٹو نے اپنا مکان اس لئے بدل لیا تھا کہ اس کا فرش گندہ تھا۔ بچی گھٹنوں چلتی تو پھانس لگ جاتی اور مٹی چاٹ جاتی۔ یہاں نکہت آزادی سے کھیل سکے گی، جبکہ نکہت محض چند ہفتوں کی تھی ـــــ منٹو اپنے فوت شدہ بیٹے کی طرح نکہت کو بھی رات کو اپنے ساتھ سلاتے، دُودھ پلواتے اور اس کی شرارتوں پر کھِل جاتے۔ اور انھیں اس کے پوتڑے دھونے اور الگنی پر ڈالنے میں بھی عار نہ تھا ـــــ منٹو کو بچوں سے، اپنے ہوں کہ بیگانے، پیار تھا۔ عصمت کے الفاظ میں :

"مجھے بچے سخت ناپسند ہیں" منٹو سنجیدگی سے کہتا "جان کو چمٹ جاتے ہیں، مجھے ان سے اس لئے ڈر لگتا ہے۔ ہر وقت ان کا خیال رہتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا" ـــــ وہ اپنی بچی کی دُودھ کی بوتل دھو کر یوں فلسفہ چھانتے ہیں۔[1]

منٹو کو عصمت کی بھتیجی مینو بھی بہت پیاری تھی۔ وُہ اُس سے گھنٹوں گڑیوں اور ہنڈکلیوں کی باتیں کرتے۔ عصمت کی بیٹی سیما کو پاٹ پر بٹھا کر "شی شی" کرتے ـــــ وہ بچوں کی محبت میں بے بس ہو جاتے تھے ـــــ یہ ایک گداز دل، انسان دوست شخص کا کردار تھا جو بچوں کا دیوانہ تھا ـــــ عصمت نے منٹو کی شخصیت کے اس روشن پہلو کو بڑی خوبصورتی سے نمایاں کیا ہے۔

○ منٹو اکثر اپنی رعونت اور تکبر میں اپنے ہم عصر ادیبوں اور رفقائے کار سے سختی، درشتی اور بدکلامی سے پیش آتے تھے اور ان کے فن میں بے وجہ کیڑے نکالتے تھے۔ ناقدین کو بھی جلی کٹی سُناتے تھے۔ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اور دیوندر ستیارتھی اُن کے مرغوب ہدف تھے۔ اس ناروا رویے کا کوئی معقول اور قابلِ فہم جواز نہ تھا۔ سوائے اس کے یہ احساسِ برتری اور طبعی تفاوت و تفریق پر مبنی تھا۔ اسے ہم بغضِ للّٰہی بھی کہہ سکتے ہیں ـــــ عصمت خلوصِ دلی سے انھیں منع کرتیں کہ جب وہ ناقد نہیں تو دُوسروں کے فن پر اُنگلی کیسے اٹھا سکتے ہیں لیکن وہ ان کے مشورہ کو نظر انداز کر دیتے۔ بدیں وجہ ان کی اپنے ساتھیوں سے آئے دن جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ تب وہ عصمت کو اپنے ساتھ ملا لیا کرتے تھے ـــــ عصمت سے وہ کہتے کہ وہ دونوں ایک ہی ارفع سطح پر ہیں جب کہ دُوسرے ان سے کمتر اور کم تر ہیں۔ یہ منٹو کا اپنے ناگوار رویے کے حق میں ایک بے جواز بہانہ تھا۔ منٹو کی رعونت اور خود پسندی کی جس سے ایک زمانہ واقف تھا، یہ ایک ادنیٰ مثال ہے۔

یہ بات قابلِ توجّہ ہے کہ عصمت نے منٹو سے اپنے تعلقات کو آڑے نہیں آنے دیا اور کمال معروضیت سے اُن کے

---

[1] عصمت چغتائی: "میرا دوست میرا دشمن"۔ "منٹو شخصیت اور فن"۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی۔ ص ۱۴۱

اس ناپسندیدہ پہلو پر سے پردہ ہٹا دیا ہے۔

○ عصمت کو دل ہی دل میں اس بات کا احساس تھا کہ منٹو ادبی اعتبار سے ان سے کہیں سربلند اور قد آور ہیں کہ یہ ایک مسلّمہ بات تھی جس کا دوست دشمن سب اعتراف کرتے تھے۔ منٹو اور عصمت جب اپنے اپنے مقدمات کے سلسلے میں اکٹھے لاہور گئے تو دونوں زری کے جوتے خریدنے انارکلی بازار کی مشہور دکان کرنال شاپ گئے۔ عصمت کے الفاظ میں:

"منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے۔ جیسے کنول کے پھول۔ زری کے جوتے بہت جچنے لگے۔

میرے پیر بڑے بھدے تھے۔ "میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت جوتے" میں نے کہا۔

"اور میرے پیر اتنے بھدے ہیں کہ مجھے ان سے شرم آتی ہے" مگر ہم نے کئی جوڑے جوتے خریدے۔

"آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں۔" میں نے کہا۔

"بکواس ہیں میرے پیر۔ لائیے بدل لیں۔"

"بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں" میں نے رائے دی۔

"بخدا مجھے کوئی اعتراض نہیں" منٹو نے چہک کر کہا۔" [1]

منٹو کا اپنے پاؤں کی نسبت سے کہنا "آؤ پاؤں بدل لیں" اُن کی ذہانت اور حسِ مزاح کا ثبوت ہے ــــ عصمت کا ان کے جواب میں کہنا "بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں" نہ صرف ان کی ذہانت اور حاضر دماغی کا ثبوت ہے بلکہ منٹو کی فنی عظمت اور برگزیدگی کا بڑا واضح اور کھلا اعتراف بھی ــــ یوں دیکھا جائے تو اردو کا کون افسانہ نگار ہوگا جو منٹو سے اپنا سر بدلنے کی خواہش نہ رکھتا ہو کہ منٹو اقلیمِ افسانہ نگاری کے قیصر و کسریٰ تھے۔

○ منٹو کی شراب نوشی کی بابت عصمت لکھتی ہیں:

"یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے۔ میں نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ زبان میں لکنت نہ پائی۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پیے ہوتا تو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشہ میں نہیں اور جان کو آجاتا تھا۔" [2]

منٹو شراب نوش تھے مگر شرابی نہ تھے ــــ گو پاکستان جا کر معاملہ کچھ دگرگوں ہو گیا تھا ــــ وہ شراب پی کر اکثر محفلِ احباب میں چہکتے، مہکتے اور جانِ محفل ہو جاتے تھے ــــ بڑھیا شراب ہو، ساتھ بڑھیا گزک نُقل ہوں، بڑھیا کھانا ہو، گپ شپ ہو اور چہل بازی کے لئے دوست احباب کی بڑھیا مجلس ہو اور کشادہ دستی سے خرچ

---

[1]، [2] عصمت چغتائی "میرا دوست میرا دشمن" (خاکہ) "منٹو شخصیت اور فن" موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی۔ ص ۴۳، ۴۴

کرنے کے لئے بڑھیا آمدنی ہو ــــ یہ منٹو کے لئے حاصلِ حیاتِ فانی تھا ــــ ادب اپنی جگہ تھا جبکہ زندگی کی نعمتوں اور آسائشوں سے بہرہ ور ہونے کا ایک اپنا مقام تھا۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے ہوں گے منٹو صفیہ، نذر اجی اور خورشید انور کے ساتھ ملاڈ میں عصمت کے ہاں وارد ہوئے۔ آنے سے پیشتر منٹو کو صفیہ منع کرتی رہیں کہ اس طرح بیوقت کسی کے ہاں جانا نامناسب ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی فطری ہیکڑی میں ان کا مشورہ رد کر دیا ــــ تینوں دوستوں کے ہاتھ میں گلاس تھے اور بوتل بھی۔ نہ جانے کہاں سے اور کب سے پیتے پلاتے چلے آرہے تھے۔ عصمت کے شوہر شاہد لطیف نے ان کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا ــــ انھوں نے اپنے رات گئے آنے کا جواز بتاتے ہوئے کہا کہ ریل کا وقت گذر چکا تھا۔ ہوٹل بند ہو چکے تھے اور بھوک سخت لگ رہی تھی۔ طے ہوا کہ آپ کے ہاں چلیں ــــ بس آٹا دے دو۔ کھانا باورچی خانہ میں ہم سب مل کر بنا لیں گے ــــ صفیہ کو مردوں کا کھانا بنانا پسند نہ آیا لیکن سب نے اُن کی سُنی اَن سُنی کر دی۔ اور بھسکڑا مار کر وہیں فرش پر بیٹھ کر کام میں جُٹ گئے۔ بوتل بھی اندر آگئی۔ نذر اجی نے انگیٹھی سُلگائی۔ خورشید انور نے آلو چھیل دیئے۔ منٹو نے آٹا گوندھا۔ بڑے سلیقے سے روٹی پکائی۔ اور جھٹ سے پودینے کی چٹنی پیس ڈالی۔ کچّے پکّے پراٹھے پکاتے گئے اور سب کھاتے گئے ــــ وہ کھاپی کر وہیں سو جاتے مگر انھیں گھسیٹ کر برآمدے میں لٹا دیا گیا[1] ــــ یہ تھی زندگی جو منٹو کو مرغوب تھی!

○ عصمت نے منٹو کے فن کا ذکر بھی بڑی باریک بینی اور ژرف نگاہی سے کیا ہے ــــ منٹو نہ صرف خود ستائی کے عادی تھے بلکہ وہ اپنے دوستوں کی شیخی بھی بڑے بلند آہنگ انداز میں بگھارتے تھے۔ رفیق غ۔نوی اُن کا دوست تھا، جو ایک چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ اُس نے یکے بعد دیگرے چار بہنوں سے شادی کی تھی۔ اور لاہور کے بازارِ حسن ہیرا منڈی کی کوئی طوائف نہ تھی جس سے اس کا معاملہ نہ رہا ہو۔ منٹو اس کو وہی تعظیم دیتے تھے جو کوئی اپنے برادرِ بزرگ کو دیتا ہے۔ عصمت سے منٹو اکثر کہا کرتے تھے کہ رفیق غ۔نوی گو ایک لفنگا اور بدمعاش ہے مگر وہ شریف اور مہذب ہے۔ یہ بات عصمت کی فہم و فراست سے بعید تھی کہ ایک بدمعاش شریف کیونکر ہو سکتا ہے۔ منٹو کے اصرار پر عصمت منٹو کی معیت میں رفیق غ۔نوی سے ملیں تو وہ منٹو کے تجربے اور مشاہدے کی گہرائی پر انگشت بدنداں رہ گئیں کہ انھوں نے رفیق کو ایک بدمعاش ہونے کے باوصف شریف، ایماندار اور مہذب پایا۔ ان کے الفاظ میں:

> "یہ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ یہ منٹو کا میدان ہے۔ وہ دُنیا کی ٹھکرائی، گھورے میں پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چن کر نکال لیتا ہے۔ گھورا کریدنے کا اُسے شوق ہے[2]"

---

[1]، [2] عصمت چغتائی، میرا دوست میرا دشمن (خاکہ) "منٹو شخصیت اور فن"۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ص ۳۶۲، ۳۶۴

عصمت کے اِس بیان کی تصدیق میں یہ لکھنا موزوں ہوگا کہ گھورا کریدنے کی اس عادت نے منٹو کے کئی ابدی شاہکاروں کی نمود کی۔ مثال کے طور پر اُن کا افسانہ "بُو" اس کی زندہ مثال ہے جس کے کردار رندھیر کو ایک معمولی کارخانے میں کام کرنے والی جوان، میلی سی دھوتی میں ملبوس اور پسینے میں شرابور گھاٹن کی بُو بھا جاتی ہے۔ مگر اس کے مقابلے اُونچے خاندان کی تعلیم یافتہ، گوری چٹی، عطر میں بسی، نئی نویلی دُلھن اُسے اپنی جانب راغب کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس کے جسم میں وہ حرارت اور کپکپاہٹ پیدا نہیں ہوتی جو اس گھاٹن لڑکی نے پیدا کی تھی اور حنا کی مرتی ہوئی خوشبو میں وہ اس بُو کی بے سود تلاش کرتا ہے جو اسے گھاٹن کے جسم سے آئی تھی۔

○ منٹو عصمت کے سامنے ڈینگ مارنے کے عادی تھے کہ وہ رنڈیوں کے کوٹھوں کی زیارت کرتے ہیں۔ لیکن عصمت کو یقین تھا کہ اس بات میں سچائی نہیں اور اگر وہ کبھی وہاں گئے بھی ہوں گے تو :

> "وہاں رنڈی سے زیادہ اُس نے ایک عورت کا دل دیکھا ہوگا۔ جو باوجودیکہ موری کا کیڑہ ہے مگر زندگی کی قدروں کو پیار کرتی ہے۔ اچھے اور بُرے کو ناپنے کے جو پیمانے عام طور پر بنا دیئے گئے ہیں وہ انھیں توڑ پھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی تول سے اس کا اندازہ لگاتا تھا۔"[1]

عصمت نے بہت حق بات کہی ہے اور یوں منٹو کے فن کی بہت نمایاں خصوصیت کی نشاندہی کر دی ہے۔ کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اُن کے افسانے "خوشیا" کے مرکزی کردار خوشیا کی انا کو جب کانتا کے جواب سے چوٹ لگتی ہے تو اس کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی ہے اور وہ اسے بھگا لے جاتا ہے اور اپنی انا کے آبگینے کو ٹوٹنے سے بچا لیتا ہے وہ حقیر پیشہ دلال سہی مگر اس کے اندر کا غیرتمند اور خوددار انسان اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے۔ "بابو گوپی ناتھ"، "ممد بھائی"، "شاردا" اور "ہتک" کی سوگندھی سب بظاہر غلاظتوں میں ملوث مگر بباطن اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل ہیں ___ عصمت نے منٹو کے فن کے بنیادی عنصر پر اُنگلی رکھ دی ہے۔

○ عصمت کی اکساہٹ پر منٹو محبت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی کشمیر کی سیر و سیاحت کا ذکر کرتے ہیں۔ جہاں وہ ایک کشمیری چرواہی کے عشق میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن ان کا دستِ شوق بڑھ کر اس کے جسم تک نہ پہنچ پایا۔ اور اس کے جسم کی ہر جنبش پر ان کی آنکھیں صرف اس کی گوری چٹی کہنی دیکھنے کے لیے ترستی رہیں اور ستم ظریفی یہ رہی کہ وہ اُس سے محض ایک مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے۔ عصمت یہ سن کر ششدر رہ جاتی ہیں اور انھیں طنزیہ انداز میں کہتی ہیں :

---

[1] عصمت چغتائی : "میرا دوست میرا دشمن" (خاکہ) "منٹو شخصیت اور فن"۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ ص ۳۸

"بالکل ردّی، تھرڈ ریٹ، مرگھلا عشق، مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے۔"

"تو اور کیا کرتا۔ اس کے ساتھ سو جاتا۔ ایک حرامی پلّا اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ڈینگیں مارتا۔" وہ بگڑا۔[1]

منٹو کے اس واحد جملے سے ان کے باطن کی پاکیزگی عیاں ہو جاتی ہے۔ یقیناً یہ وُہ منٹو نہ تھے، جنھیں کوتاہ بین نقّادوں نے فحش نگار، گندہ ذہن اور غلاظت پسند قرار دیا ـــــ عصمت کو یقین تھا کہ منٹو فی الواقع اخلاقی کثافتوں اور آلائشوں سے مبّرا تھے۔

○ تقسیم ملک کے فسادات شروع ہو چکے تھے ـــــ منٹو فلمستان چھوڑ کر اشوک کمار کے پاس بمبئی ٹاکیز چلے گئے۔ عصمت لکھتی ہیں کہ منٹو کی ایک کہانی زیرِ غور تھی اور انھیں یقین تھا کہ اشوک کمار اُسے قبول کر لے گا مگر خلافِ توقع جہاں کمال امروہی کی کہانی "محل" اور عصمت کی کہانی "ضدّی" نہ صرف قبول کر لی گئیں بلکہ ان پر فلمیں بھی بنیں، وہاں منٹو کی کہانی دھری رہ گئی اور وہ دل برداشتہ بمبئی چھوڑ کر کسی کو اطلاع دیئے بغیر جنوری ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ عصمت لکھتی ہیں کہ جانے سے پیشتر منٹو نے انھیں بھی ساتھ چلنے کے لئے بہت زور دیا اور وہاں ایک سنہرے روپہلے مُستقبل کی تصویر کھینچی:

> "پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوٹھیاں ملیں گی۔ وہاں ہم ہی ہم ہوں گے۔ بہت جلد ترقی کر جائیں گے ... اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ منٹو کتنا بُزدل ہے۔ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لئے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اُس سے نفرت ہو گئی۔"[2]

دیکھا آپ نے کہ عصمت نے منٹو کے فن کے بنیادی خصائص اور ان کے محرکات کا ذکر کس خوبی سے کیا ہے۔ یوں چند جملوں میں ہی تہہ در تہہ پردے ہٹاتے جانا عصمت کی منٹو کے فن پر گہری فکر و نظر کا مظہر ہے۔

جب منٹو عصمت سے ملے اور "خدا حافظ" کہے بغیر ہی پاکستان ہجرت کر گئے تو انھیں اپنی ہتک کا شدید احساس ہوا۔ منٹو سے ان کا شب و روز کا ساتھ تھا مگر انھوں نے اتنی بھی رواداری نہ برتی کہ عصمت سے مل کر جاتے ـــــ منٹو کا پاکستان سے پہلا خط آیا تو معلوم ہوا کہ وہ وہاں بہت مطمئن اور خوش ہیں۔ انھیں وہاں ایک عمدہ، کشادہ اور آراستہ مکان الاٹ ہو گیا ہے۔ انھوں نے عصمت کو پھر پاکستان آنے کی ترغیب دی اور یہ امید بھی دلائی کہ انھیں وہاں ایک سینما الاٹ ہو جائے گا۔ عصمت جو پہلے ہی سے منٹو کی محبت اور خلوص کی قائل تھیں

---

[1]، [2] عصمت چغتائی "میرا دوست میرا دشمن" (خاکہ) "منٹو شخصیت اور فن" موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ص ۴۴-۴۵، ۴۶-۴۷

اور زیادہ ان کی معتقد ہوگئیں۔ مگر منٹو کے خط سے انھیں خوشی کی بجائے رنج ہُوا کہ ان کی نظروں میں سوال عقائد اور نظریات کا تھا جن سے انحراف ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ انھوں نے بدظن ہو کر منٹو کے خط تلف کر دیئے۔ عصمت اس بارے میں لکھتی ہیں :

"میں نے اس کے خط پھاڑ دیئے۔ اس بات سے چڑ کر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا۔ میں نے اسے جانے سے نہیں روکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے" [1]

وقت اپنی روایتی برق رفتاری سے گذرتا رہا۔ منٹو نے تھوڑے ہی عرصے میں کئی نشیب وفراز دیکھے۔ پھر ان کے حالات اس قدر دگرگوں ہو گئے کہ قدم ہی اُکھڑ گئے۔ دل برداشتہ ہو کر واپس ہندوستان آنے کی سوچنے لگے۔ عصمت کو لکھا کہ "کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلا لو" ــــ پھر پتہ چلا کہ انھیں فحاشی کے الزام میں جیل ہو گئی۔ عصمت آزردہ خاطر ہو کر لکھتی ہیں:

"سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا۔ بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ اچھا ہُوا جیل ہو گئی اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جلسے ہوئے نہ میٹنگیں ہوئیں، نہ ریزولیوشن پاس ہوئے" [2]

معلوم ہوتا ہے کہ منٹو نے بہتوں کی ہمدردی کھودی تھی۔ مگر ان کے تئیں عصمت کی دردمندی اور گداز دلی صاف جھلکتی ہے ـــــ عصمت کو پھر منٹو نے لکھا "اگر بگر جی سے کہہ کر بمبئی بلوا لو تو بہت اچھا ہو" معلوم ہوتا ہے کہ منٹو ہندوستان واپس آنے کے لئے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ مگر انھیں راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔ اتنے وسیع وعریض ملک میں عصمت ہی ایک واحد ہستی دکھائی دیتی تھیں جس کو وہ مدد کے لئے پکار سکتے تھے ــــ پھر خبر آئی کہ منٹو دوسری بار پاگل خانے چلے گئے۔ عصمت کے دل میں دھکڑ پکڑ ہونے لگی کہ نہ جانے ان کا اگلا قدم کہاں پڑے کہ وہ راستہ تو عدم آباد کو جاتا تھا۔

"اب منٹو کی خبروں سے ڈر سا لگتا تھا۔ پُوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خُدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو۔ مگر پاگل خانے سے آگے جو قدم پڑتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا" [3]

ان سطور سے عصمت کے آنسو چھلکے پڑتے معلوم ہوتے ہیں ـــــ منٹو کی زبوں حالی کی خبریں سُن سُن کر وہ اوب گئیں۔ اندیشہ ہائے دُور دراز انھیں ستاتے رہے۔ رہ رہ کر ان کے قلب وذہن کو ایک انجانا خوف سا

[1، 2، 3] عصمت چغتائی "میرا دوست میرا دشمن" (خاکہ) "منٹو شخصیت اور فن" موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ص ۴۷

کُریدتا رہا۔ منٹو کے ساتھ گذارے حسین ایّام کی یادیں انھیں ستاتی رہیں —— اور پھر ایک روز منٹو جنوری ۱۹۵۵ء میں
تینتالیس سال کی جواں عمری میں اس جہانِ گذراں سے گذر گئے، ؎

چمن سے رو ٹھتا ہُوا موسمِ بہار گیا　　　شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

عصمت اور منٹو کے گہرے دوستانہ تعلّقات سے واقف کوئی بھی باشعور قاری اس خاکے کا عنوان "میرا دوست میرا دشمن" پڑھ کر چونک پڑے گا۔ عصمت کے ان سے ہی نہیں ان کی بیگم صفیہ سے بھی گہرے مراسم تھے۔ پھر وہ عصمت کے "دشمن" کیوں کر ٹھہرے؟ اس لئے کہ تقسیمِ ملک کے بعد دونوں کی دوستی میں بال آگیا تھا۔ صاف شفاف، پُرخلوص، بے لوث دوستی میں دراڑ آگئی تھی۔ عصمت اور منٹو دونوں تقسیمِ ملک کے خلاف تھے اور ہندوستان کی سالمیت اور یک جہتی کے علم بردار تھے مگر جہاں عصمت اپنے موقف پر ثابت قدمی اور پامردی سے جمی رہیں۔ منٹو اس ہنگامی طوفانی دَور میں پھسل گئے اور اپنے عقائد سے رُوگردانی کرکے پاکستان ہجرت کر گئے۔ انھوں نے پاکستان جانے سے پیشتر اور وہاں جا کر بھی عصمت کو بہت سنہرے سپنے دکھائے اور پاکستان میں ایک خوشحال اور خوش آئند مستقبل کی تصویر کھینچی مگر عصمت ٹس سے مس نہ ہُوئیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ منٹو وہاں مہاجروں کی چھوڑی ہوئی جائیداد پر بھی دانت لگائے بیٹھے ہیں تو وہ ان سے کچھ زیادہ ہی متنفر ہوگئیں۔ انھیں اس بات کا سخت رنج تھا کہ منٹو نے ان کے عقائد کی قدر نہ کی اور خود بہک کر ان کو بھی بہکانے کی کوشش کرتے رہے —— اور جب قلیل سے عرصے میں ہی پاکستان میں منٹو پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا اور ہندوستان واپس آنے کے لئے تڑپنے لگے تو عصمت کی نظروں میں ان کے موقف کی اصالت کا جواز از خود پیدا ہو گیا —— یہی وجہ ہے کہ عصمت نے ایک عزیز دوست کو ایک محدود نقطۂ نظر سے "دوست" کے ساتھ "دشمن" بھی سمجھا۔ اور یہی جذبہ اس خاکے کے عنوان کا محرّک ہُوا۔

عصمت کے اس خاکے میں ایک ایسے منٹو کی تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے جس کا مزاج تند اور جس کی زبان تیز، تلخ اور ترش ہے اور جو ذرا سی ناگواری پر آتش گیر مادے کی طرح بھک سے اُڑ جاتا ہے اور اکثر غم و غصّے میں توازن کھو کر دانت پیس پیس کر بات کرتا ہے اور اس کی آنکھیں قہر آلود ہو جاتی ہیں —— مگر اس کا غصّہ جلد فرو بھی ہو جاتا ہے۔ اس منٹو کے شانہ بشانہ ایک دوسرا منٹو کھڑا دکھائی دیتا ہے جو اخلاقی اقدار کا علم بردار ہے۔ جو کسی کے دُکھ درد پر تڑپ اُٹھتا ہے۔ جو ایک مخلص اور وفا شعار شوہر ہے۔ جو ایک غمخوار اور دردمند باپ ہے اور جو ایک بے غرض اور بے لوث دوست ہے —— جو زندگی کی نعمتوں اور آسائشوں سے بہرہ ور ہونا چاہتا ہے۔ جو یاروں کی محفلوں کی جان ہے۔ جو شراب و کباب کا رسیا ہے۔ اور جو اپنے محدود دائرے میں ؎ بابر بعیش کوش . . . . کے مقولے کا قائل ہے۔ گویا منٹو ایک ایسا

انسان ہے جو بشری کمزوریوں اور محاسن کا مجموعہ ہے۔ اس کی کمزوریاں قابلِ عفو ہیں مگر اس کے محاسن اسے رفعت اور سر بلندی عطا کرتے ہیں۔

منٹو ایک عظیم فنکار ہے۔ وہ طوائفوں کے کوٹھوں پر جاتا ہے مگر جسمانی تلطّف اور تلذذ حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان کے باطن کے نہاں خانوں میں جھانک کر اپنی کہانیوں کے لئے خام مواد حاصل کرنے کے لئے۔ وہ چھٹے ہوئے بدمعاشوں اور رنڈی بازوں سے بھی مراسم رکھتا ہے اور ان "گھوروں" میں اپنے فن کے لئے "موتی" تلاش کرتا ہے جن سے اس کے شاہکار جنم لیتے ہیں۔ اس اعتبار سے اردو ادب میں منٹو ایک منفرد فنکار ہے۔

منٹو کے ساتھ ساتھ اس خاکے میں عصمت کی بھی ایک تصویر اُبھرتی دکھائی دیتی ہے، جو فنی چابکدستی سے منٹو کی شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں کی جھلکیاں یکے بعد دیگرے پیش کئے جاتی ہیں۔ ان جھلکیوں میں ایک اپنی ہی معروضیت ہے۔ منٹو سے تعلقات کے باوصف ایک بے تعلقی سی ہے۔ کہیں رنگ آمیزی نہیں۔ گوٹ پھندنے نہیں۔ ستائشِ بے جا نہیں۔ ہر چیز اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں بے کم و کاست پیش کر دی گئی ہے۔ کام مشکل تھا مگر عصمت نے اُسے بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔

دوسرے از اول تا آخر اس خاکے میں دردمندی اور انسان دوستی کی ایک زیریں لہر نظر آتی ہے۔ عصمت منٹو کی بے راہ روی پر کڑھتی ہیں۔ چیں بہ جبیں ہوتی ہیں۔ ان کی خوشیوں پر خوش ہوتی ہیں۔ ان کی زبوں حالی پر آزردہ خاطر ہو جاتی ہیں۔ وہ پاگل خانے میں داخل ہوتے ہیں تو وہ کلیجہ پکڑ کر رہ جاتی ہیں۔ ان کی موت پر صفیہ کو درد بھرا خط لکھ کر مرحوم کا ماتم مناتی ہیں۔ منٹو اپنے لااُبالی پن اور خودسری میں پاکستان چلے جاتے ہیں تو وہ ان سے ناراض ہو جاتی ہیں۔ مگر نہ ان کی دوستی کی ڈوری ٹوٹتی ہے اور نہ اس میں جھول پڑتا ہے ــــــ کبھی کبھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ دوستی کے تمام نشیب و فراز کے باوصف ایک رشتۂ خیال ہے کہ ٹوٹتا نہیں ــــــ یہ کتنی بڑی بات ہے۔

عصمت کا یہ خاکہ منٹو کی شخصیت اور فن کا ایک خوبصورت جائزہ بھی ہے اور منٹو کے تئیں اظہارِ عقیدت بھی ــــــ اسی کے ساتھ یہ خاکہ اس بات پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ خود عصمت کے ہاں مردم شناسی کا کیا پیمانہ تھا۔ گویا اس خاکے کی مدد سے ہمیں خود عصمت کی شخصیت کے نہاں خانے تک پہنچنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

کچھ میری یادیں
(پطرس سے ملاقات کے تعلق سے)

عصمت چغتائی روزِ اوّل سے ہی پطرس کی تحریروں کی والا و شیدا تھیں۔ لڑکپن میں عظیم بیگ چغتائی کتابوں سے

"مضامین پطرس" چُرا کر انھوں نے پڑھی تو لوٹ پوٹ ہوگئیں۔ اور ایک بار پڑھ کر جی نہ بھرا تو اسے بار بار پڑھا۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

"ہمیں جملے کے جملے یاد ہوگئے تھے۔ جو اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے دہرائے جاتے تھے اور قلابازیاں لگائی جاتی تھیں۔ نہ جانے ایک عمر میں کیوں بے بات ہنسی آتی ہے۔"[1]

عصمت کو عظیم بیگ اور ملا رموزی کی تحریریں پطرس کے مضامین کے سامنے پھیکی اور بے رنگ سی لگنے لگیں۔ اُن کے مضامین کی بیساختگی اور زندگی سے بھرپور کیفیت ان کے گھر کی بے تکلف اور کھلی فضا سے یک گونہ موافقت رکھتی تھی۔ اس لئے انھیں ان میں بڑی یگانگت اور قربت محسوس ہوتی تھی ــــ پطرس کا مضمون "میں ایک میاں ہوں" ان کے گھر کے تمام افراد حتیٰ کہ والدہ محترمہ نے بھی مزے لے لے کر پڑھا۔ ملاحظہ ہو:

"میں ایک میاں ہوں" ہمارے گھر میں بالکل کیری کی چٹنی کی طرح چٹخارے لے کر پڑھا گیا۔ اماں تک نے پڑھ ڈالا اور جب پلنگڑی پر بیٹھ کر وہ ہنسیں تو پان دان کی کلیاں پھُدک پھُدک کر آپس میں ٹکرانے لگیں۔"[2]

عصمت کی رائے میں اس مضمون نے صنفِ مزاح نگاری کو اس قدر متاثر کیا کہ بیشتر مزاح نگاروں کی نگارشات میں اس کا رنگ جھلکنے لگا۔ عظیم بیگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے اپنی ایک کہانی میں اس امر کا برملا اعتراف کیا۔ فرحت اللہ بیگ اور شوکت تھانوی کے ہاں بھی وہی رنگ دکھائی دینے لگا۔ عصمت کو جن میں خودادبی جوہر ازل سے موجود تھا۔ پطرس کے مضامین نے اس قدر گرویدہ بنالیا کہ ایک دن انتہائے شوق میں انھوں نے ابا میاں کے بکس سے لفافہ اور ٹکٹ چرائے اور پطرس کو ایک خط رسالہ "تہذیبِ نسواں" کی معرفت لکھ ڈالا ــــ اس رسالے کے مدیر ممتاز علی صاحب نے خط کھولا، پڑھا اور مع لفافہ عصمت کی بڑی بہن آپا کو، جو ان کی منہ بولی بیٹی تھیں، واپس بھیج دیا ــــ گھر کے سب افراد نے اسے پڑھا اور باری باری عصمت کی گت بناڈالی۔ اس خط کو بلند آواز میں ابا حضور کے سامنے بھی پڑھا گیا۔ عصمت کی تحقیر و تضحیک میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔ عصمت نے اپنی لاعلمی میں پطرس کو کوئی مسخرا لونڈا سمجھ کر ان سے بہت بے تکلفی کا اظہار کیا تھا۔ عصمت کی ناتراشیدہ اور بھونڈی تحریر کی جان ان کا یہ شاہکار جملہ تھا "اے پطرس کیا تو گھاس کھا گیا ہے؟" ــــ صاف ظاہر ہے کہ اس وقت عصمت بطور ایک فنکارہ کے پطرس کے منصب و مقام سے بے بہرہ تھیں اور نہ ہی خود ان میں سنجیدگی اور بردباری سے لکھنے کا شعور پیدا ہوا تھا۔ مگر گھر والوں کی ملامت

---

[1] [2] عصمت چغتائی "کچھ میری یادیں" مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر" روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۶-۷

کو وہ کبھی بھول نہ پائیں ـــــ اور پھر برسوں بعد یہ سب بھولی بسری باتیں ایک دن آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہو گئیں۔

○ عصمت کو بمبئی آئے ابھی سال بھر ہی گذرا تھا کہ انھیں ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے فون آیا کہ آجکل بخاری صاحب (اے۔ ایس۔ بخاری پطرس) کچھ دنوں کے لئے بمبئی آئے ہوئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی شاہد لطیف کو بھی بلایا ہے۔ یہ پیغام پا کر عصمت کا فوری ردِ عمل یہ تھا کہ وہ ناسازئ طبیعت کا بہانہ کر دیں۔ پھر خیال آیا کہ یہ تو صریحاً حماقت ہوگی کہ:

"پطرس آئے ہیں یعنی سچ مچ پطرس آئے ہیں۔ وہ مجھے قطعی قابلِ ملاقات سمجھتے ہیں۔ جب ہی تو بلایا ہے۔"[1]

عصمت کا خیال فی الواقع صحیح تھا کہ پطرس ان کے فن کے مدّاح تھے اور اردو ادب کے لئے ان کی ذات کو قابلِ فخر سمجھتے تھے۔ ان کی نظروں میں عصمت نے پرانی روش سے ہٹ کر نئی راہیں تراشیں اور اردو ادب کو نئی سمت اور نیا موڑ دیا۔ بدیں وجہ ان کی بلند قامتی سے منکر ہونا محض کور ذوقی کا ثبوت تھا۔ چنانچہ پطرس لکھتے ہیں:

"عصمت کی شخصیت اردو کے لئے باعثِ فخر ہے۔ انھوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں کہ جب تک وہ کھڑی تھیں، کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اردو ادب میں جو امتیاز عصمت کو حاصل ہے اس سے منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔"[2]

عصمت نے پطرس سے ملنے کا وعدہ کر لیا ـــــ اور شاہد کی بابت کہہ دیا کہ مصروفیت کی وجہ سے وہ اُن کے ساتھ آنے سے معذور ہیں اور یہ بات انھوں نے شاہد سے مخفی رکھنے کو ہی قرینِ مصلحت جانا۔ عصمت کے پاس بلاوے کے ردِ عمل اور شاہد کو اعتماد میں نہ لینے کا خود ساختہ جواز موجود تھا ـــــ عصمت کو غیر معمولی طور پر ذہین اور جملہ باز لوگوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ ان کی شخصیت انھیں اپنی طرف کھینچتی بھی تھی اور پرے دھکیلتی بھی تھی اور پطرس کا رعب تو ان پر نہ جانے کب سے چھایا ہوا تھا۔ اور انھیں یہ خدشہ تھا کہ پطرس سے مل کر ان کا احساسِ کمتری دوچند ہو جائے گا ـــــ اب وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئیں۔ اگر وہ ان سے نہیں ملتیں، تو شاید انھیں مدتوں کفِ افسوس ملنا پڑے گا کہ پطرس روز روز نہیں بلاتے اور اگر وہ ملتی ہیں تو نہ جانے دورانِ گفتگو وہ کوئی ناگوار بات کہہ دیں اور جواب میں برہم ہو کر انھیں بھی کوئی الٹی سیدھی بات کہنی پڑے یا وہ بدتمیزی پر اُتر آئیں۔ اور شاہد کی موجودگی میں ان کی کرکری ہو جائے۔ پھر شاہد ضرور اس واقعہ کو منٹو کو بیان کر دیں گے کہ پطرس نے محترمہ کو خوب چٹخنیاں دیں اور وہ احساسِ ندامت سے گڑ جائیں گی۔

---

[1] [2] عصمت چغتائی "کچھ میری یادیں"، مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر" روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۲۰۸

رات بھر عصمت اضطراب کے عالم میں پطرس کے امکانی سوالوں کے جواب اپنے ذہن میں وضع کرتی رہیں۔ وہ فطرتاً منہ پھٹ تھیں اور پطرس کے سوالوں کے منہ توڑ جواب دینے پر تُلی بیٹھی تھیں:

> "میں نے اپنے پروفیسروں سے کبھی ہار نہ مانی۔ میرے استاد میری منہ زوری سے چوٹ کھاتے تھے۔ میری استانیاں کلاس میں آنسو بھر لاتیں۔ یہ میرا خاندانی ورثہ ہے اور مجھے اس پر بڑا ناز ہے۔"[1]

مگر جیسا کہ بالعموم ایسے معاملات میں ہوتا ہے عصمت کے تمام خدشات بے بُنیاد ثابت ہوئے کہ پطرس نے ان سے وہ سوالات ہی نہ کئے جن کے جوابات انھوں نے اس قدر کاوش سے تراش خراش کر اپنے ذہن میں محفوظ رکھے تھے ــــــ عصمت فطرتاً تلخ زبان، مُنہ پھٹ اور جارح تھیں مگر نہ معلوم پطرس سے ملاقات کے خیال نے انھیں کیوں "ہولا ہولا کر شل کر دیا" ــــ وہ اپنے لباس کی طرف بھی کبھی زیادہ متوجہ نہ ہوتی تھیں مگر اس دن انھوں نے غور و فکر کے بعد ہلکے سے رنگ کی ساڑی کا انتخاب کیا جو ان کے خیال میں اس موقع کے لئے موزوں تھی ــــــ روانہ ہونے سے پیشتر بھی ان کے دل میں دُھکڑ پکڑ ہو رہی تھی کہ پطرس کے سامنے ان کی دال نہ گلے گی اور انھیں بہت خفت اُٹھانی پڑے گی ــــ عصمت جو کبھی کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں آج پطرس کو بنا ملے، بنا دیکھے اُن سے خوف زدہ ہو رہی تھیں ــــ دیکھئے مدِ مقابل کی ذہنی برتری کا احساس ایک خود پرست اور حساس شخص کو کس قدر پست کر دیتا ہے۔ بھلے وہ عصمت چغتائی ہی کیوں نہ ہو۔

مگر پھر ان کی انا اور خاندانی وقار نے پکارا اور وہ "جو ہو سو ہو" کے انداز میں اُٹھ کھڑی ہوئیں:

> "پھر میرے چغتائی خون نے للکارا۔ میرے سکڑ دادا نے کھوپڑیوں کا مینار چنوا کر اس پر بیٹھ کر کھانا تناول فرمایا تھا۔ اور میں ایک حقیر پطرس کی دہشت میں فنا ہوئی جا رہی ہوں۔ ایسا بھی کیا ہے۔ ٹانگ کھینچیں گے تو اپنی ازلی بدزبانی پر اُتر آنا مزاج ٹھکانے آجائیں گے شاہ صاحب کے۔"[2]

اب وہ اپنے پارینہ خاندانی وقار اور بھولی بسری شجاعت کا سہارا لے کر پطرس سے ملنے کے لئے یوں تیار ہو گئیں گویا زرہ بکتر پہن کر غنیم سے نبرد آزما ہونے کے لئے میدانِ جنگ میں اُتر پڑی ہوں ــــ یہ واقعہ عصمت کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو کو نمایاں کرتا ہے جو اب تک ہماری نظروں سے ڈھکا چھُپا تھا۔

عصمت ریڈیو اسٹیشن پہنچیں تو انھوں نے آفس میں ایک شخص کو کاغذوں پر سر جھکائے بیٹھے پایا۔ "آداب عرض" "گڈ مارننگ" کے بعد عصمت نے دیکھا کہ وُہ صاحب سانولی سلونی شکل کے تھے مگر تصویر سے قطعی مختلف ــــ وہ "چلئے" کہہ کر اُٹھے اور آگے آگے ہو لئے۔ عصمت ہُوا اُٹھا کر ان کے پیچھے پیچھے چل دیں۔ سارا ریڈیو اسٹیشن گھمانے کے

---

[1] [2] عصمت چغتائی "کچھ میری یادیں" مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر" روہتاس بکس لاہور۔ ص ۹، ۱۰

بعد انھوں نے عصمت کو ایک کمرے میں جانے کے لئے کہا۔ یہ صاحب جنھیں وہ لاعلمی میں پطرس سمجھ بیٹھی تھیں درحقیقت ان کے اسسٹنٹ لکشمن تھے۔

کمرے میں داخل ہوئیں تو سامنے میز پر اونچے فائلوں کے ڈھیر کے سامنے ایک عقاب کی سی صورت کا گورا چٹا پٹھان بیٹھا ہوا تھا۔ طوطے جیسی لمبی ناک، بھاری بھاری آنکھیں۔

"آئیے آئیے۔ معاف کیجئے گا میری ٹانگ ذرا لمبی کھنچ گئی۔"

"اوہ!" میں نے سانولے سلونے پطرس کے جانے کے بعد کہا۔ "میں سمجھی تھی آپ وہ ہیں۔"

"کیا؟ ـــ میں وہ ہوں ـــ آپ میری ہتک کر رہی ہیں۔" وہ بُرا مان گئے۔ "وہ لکشمن ہیں۔ اور میں قطعی وہ نہیں ہوں۔"[1]

انھوں نے اس بے تکلفی سے بات چیت شروع کی کہ عصمت کا سارا اعصابی تناؤ دیکھتے ہی دیکھتے کافور ہو گیا۔ انھیں ایسا معلوم ہوا گویا ان سے برسوں کے مراسم ہوں۔ پطرس کی یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ ان سے پہلی بار ملنے والا ہر شخص یہی تاثر لیتا تھا۔ عصمت کے بار بار ریہرسل کئے ہوئے اور خوبصورتی سے تراشے ہوئے جملے دھرے رہ گئے۔ باتوں کے ریلے میں کئی ادبی موضوعات زیرِ بحث آئے۔ عصمت کو یہ دیکھ کر مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ:

"انھوں نے اُس زمانے کے لکھنے والوں کا ایک ایک لفظ بڑی دلچسپی سے پڑھا تھا اور یاد رکھا تھا۔ انھیں جملے کے جملے ازبر تھے۔ شعر تو میں نے بہت لوگوں کو یاد رکھتے سنا ہے۔ مگر نثر صرف پطرس کی زبان سے اس طرح سُنی۔"[2]

○ تاج محل ہوٹل میں پطرس کے کمرے میں عصمت بڑی بے تکلفی سے آرام کرسی پر دراز لیمونیڈ پیتی رہیں اور پطرس پلنگ پر لیٹے ٹھنڈی بیر کی چسکیاں لیتے رہے۔ بات چیت متواتر جاری رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے عصمت کو اپنی کم مائیگی کا احساس جلد ہی ہو گیا۔ اس سے انھیں سخت ذہنی کوفت ہوئی کیونکہ وہ کسی سے پٹنے کی قائل نہ تھیں۔ شکست خوردگی کے خیال ہی سے انھیں وحشت ہوتی تھی، مگر ان کے ذہن نے جلد ہی اس ناقابلِ تردید حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ:

"پطرس کا مطالعہ اور مشاہدہ اتنا وسیع ہے کہ برسوں کھرلی گھونگی پر تُل کر بحث نہ ہو سکے گی۔"[3]

احساسِ ہزیمت سے مغلوب ہو کر عصمت نے سوچا کہ وہ کج بحثی کا آزمودہ نسخہ آزمائیں تو بہتر رہے گا۔ مگر انھوں نے اس میدان میں بھی پطرس کو اپنے سے کہیں بہتر اور برتر پایا۔ وہ چوکس تھے اور بڑی چابکدستی سے تیر کو واپس لوٹا

---

[1] [2] [3] عصمت چغتائی: "کچھ میری یادیں"، مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر"، روہتاس بکس لاہور۔ ص ١١

دیتے تھے۔ عصمت کے الفاظ میں:

"پطرس گھسنے میں آنے والے آسامی نہ تھے۔ میرے ہر ذہین اور دقیق سوال کے جواب میں نہایت بھونڈے پن سے" ہٹائیے بھی یہ بورنگ باتیں" کہہ کر انھوں نے میرا خوب جی جلایا۔"[1]

عصمت کے ہر پسندیدہ شاعر اور ادیب کو پطرس نے جاہل اور اُلّو کہا کہ دونوں کے ناپ تول کے پیمانے اور ترازو و باٹ الگ الگ تھے۔ انھوں نے بھی پطرس کو نہایت قرینے اور سلیقے سے "احمق تک کہہ ڈالا"۔ اس پر پطرس بے تحاشا ہنسے۔ عصمت جل کر کباب ہو گئیں:

"پھر بھاری بھاری آنکھوں سے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں بالکل کوڑھ مغز ہوں اور پھر بے اختیار ہنسنے لگے۔ بالکل میرے بدذات بھائی جُنّوں کی طرح۔ ایک دفعہ اس کے چڑانے پر میں نے گال پر ایسا تماچا مارا تھا کہ چربی نکل آئی تھی۔"[2]

مگر یہ کمزور کا غصہ تھا جو بات نہ بنے تو ہاتھ اُٹھانے پر اتر آتا ہے۔ عصمت کو ہر میدان میں شکست کا سامنا تھا مگر اعتراف شکست ان کے قواعد زندگی کے خلاف تھا۔ درحقیقت عصمت نے خود ہی بے وجہ ان کو اپنا حریف تصوّر کر لیا۔ اور انھیں مات دینے پر تُل گئیں۔ ورنہ پطرس جو شخصیت اور فن دونوں اعتبار سے کوہِ گراں تھے، شاید اس احساس سے ہی بیگانہ ہوں گے۔ وہ ادبی اعتبار سے دیوزاد تھے اور بڑے بڑے ان کے علم و دانش کا لوہا مانتے تھے۔ ادھر عصمت اس احساس سے ہی بے نیاز تھیں کہ کسی وقت دوسرے کی بڑائی کے اعتراف میں ہی خود اپنی بڑائی پنہاں ہوتی ہے۔

○ کھانا بدمزہ تھا۔ اسٹو کچا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے چمڑا چبا رہے ہوں۔ پطرس نے اشارے سے بیرے کو بلا کر بڑی لجاجت سے کہا: "دوست یہ بکرا تو سینگ مار رہا ہے۔ کوئی مرا ہوا جانور نہیں پکا تمھارے ہاں"۔ بیرا کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا"۔ یہ تھے "مضامینِ پطرس" کے خالق خوش مزاج، زندہ دل اور زندگی سے بھرپور!

○ پھر وہ عصمت کی طرف مڑے:

"تم نے لکشمن کو پطرس کیوں سمجھا، اگر گدھے کو پطرس سمجھ لیا ہوتا تو مجھے قطعی شکایت نہ ہوتی"۔ میں نے اتنی زور سے ٹھٹھا مارا کہ ہال میں مہذّب لوگ بُد بُد کرتے کرتے ایک دم چونک کر دیکھنے لگے۔ پطرس نے تادیبی نظروں سے مجھے دیکھا۔"[3]

یہ بات ابھی تک پطرس کے دل میں کانٹا بن کر چبھ رہی تھی کہ عصمت نے لکشمن کو پطرس کیسے سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ سہواً ہوا تھا، محض لاعلمی اور انجانے میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس معمولی واقعہ سے پطرس کی انا اور خود پسندی کو ٹھیس

---

[1] [2] [3] عصمت چغتائی: "کچھ میری یادیں"۔ مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر"، روہتاس، لاہور۔ ص ۱۲، ۱۲، ۱۳

لگی تھی اور وہ ابھی تک جز بز ہو رہے تھے ـــــ پطرس کے جملے کی نشتریت قابلِ توجہ ہے۔

اور عصمت پطرس کی "تادیبی نظروں" کے تیکھے اور کٹیلے پن کو سہہ نہ پائیں۔ انھوں نے خود کو اونچے طبقے کے مہذب اور متمدن لوگوں کے درمیان، جو مجلسی آداب سے بخوبی واقف تھے، خود کو اجنبی سا پایا۔ انھوں نے من ہی من میں تاج ہوٹل کی صفائی، نفاست اور آرائش و زیبائش کا اپنے گھر کے رکھ رکھاؤ کے فقدان، بے ترتیبی اور بھونڈے پن سے تقابل کیا تو دونوں کی تفاوت ان پر روشن ہو گئی ـــــ ان کے ہاں مہمانوں کی آمد پر آپا جھاڑ پونچھ کرتیں۔ کھانے کی میز پر رکھی سلائی کی مشین، اچار کی برنیاں اور بچہ کا گداونا اُتار کر تخت کے نیچے دوسرے کاٹھ کباڑ کے ساتھ چھپا دیتیں۔ آپا بڑے چاؤ سے نپکن کے پھول بنا کر گلاسوں میں سجا دیتیں تو تمام بچے اسے "احمقانہ بناوٹ اور بیکار کی زحمت" سمجھ کر نہایت تحقیر آمیز انداز سے ہنستے اور انھیں چڑانے کو گلاس میں سے نپکن نکالے بغیر پانی بھر لیتے۔ آپا مہمانوں کے سامنے ہمارے گنوار پن پر شرمندہ ہوتیں تو ہمیں لطف آتا۔[1] جب کنبہ کا کنبہ مجلسی آداب، قرینے سلیقے اور رکھ رکھاؤ کے احساس سے بے بہرہ ہو تو عصمت کا تاج ہوٹل کے بھرے بڑے ڈائننگ ہال میں بے تکلف ٹھٹھا مار نا حیرانکن نہ تھا ـــــ مگر عصمت کی خود فریبی ملاحظہ ہو کہ انھیں چھری کانٹے سے کھانا کھاتے وقت دقت محسوس ہوئی تو انھوں نے یونہی فرض کر لیا کہ پطرس کو ہر روز یہ زحمت اٹھانی پڑتی ہوگی۔ مگر وہ اس بات کو بھول گئیں کہ دنیا کا خاصہ حصہ چھری کانٹے سے ہی کھانا کھاتا ہے۔ اور ہندوستان میں ایک مخصوص اونچا طبقہ بھی بلا تکلف چھری کانٹے ہی سے کھانا کھانے کا عادی ہے۔ چنانچہ عصمت جھوٹی ذہنی طمانیت کی خاطر لکھتی ہیں :

> "مجھے فوراً احساسِ برتری ہونے لگا۔ کم از کم اس میدان میں تو مجھے فوقیت حاصل تھی۔ پطرس کو روز روز اسی طرح طمطراق سے کھانا پڑتا ہو گا۔ انھوں نے شاید کبھی کھاٹ پر بیٹھ کر آلو گوشت نہیں کھایا ہو گا۔ خاص کر جبکہ اس میں پڑوس کے باغ سے چُرا کر نیبو نچوڑا گیا ہو۔"[2]

عصمت کی خوش فہمی اور خود فریبی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ادبی مباحث میں انھیں پطرس کے ہاتھوں جو خفت اُٹھانی پڑی تھی اب وہ اس کا مداوا ڈھونڈ رہی تھیں تاکہ ان کے بھڑکے ہوئے جذبات پرسکون ہوں۔ احساسِ ندامت اب بھی انھیں اندر ہی اندر جھنجھوڑ رہا تھا اور وہ ذہنی طور پر کھانے کے میدان میں پطرس پر اپنی فوقیت کے تصور سے خوش ہو رہی تھیں۔ گو ان کا استدلال پوچ اور کھوکھلا تھا۔

---

[1] [2] عصمت چغتائی، "کچھ میری یادیں"، مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر" روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۱۴

○ اب کرشن چندر، منٹو اور بیدی کے فن پر بڑی دھواں دار بحث ہونے لگی۔ جب عصمت نے ان سب کی بہت تعریف و توصیف کی تو پطرس کو احساس ہوا کہ وہ تکلّف میں ان کی ستائش کئے جا رہی ہیں، تاکہ لوگ انھیں اپنے ہم عصروں کے تعلق سے بہت فراخ دل سمجھیں۔ مگر عصمت کا کہنا تھا کہ انھوں نے ان فنکاروں کی کہانیاں نہ بطور افسانہ نگار پڑھی ہیں اور نہ ہی بطور تنقید نگار۔ انھوں نے انھیں محض تفریحِ طبع کے لئے پڑھا ہے۔ کچھ کہانیاں پسند نہ آئیں تو کچھ قلب و جگر میں ہمیشہ کے لئے جاگزیں ہو گئیں۔

"یہ جذباتیت ہے۔" انھوں نے کہا۔

"جذباتیت کیا ہوتی ہے؟" میں نے بھونڈے پن سے کہا۔[1]

صاف عیاں ہے کہ اس طول طویل بحث میں عصمت کئی بار بھنا کر اور جذبات سے مغلوب ہو کر آداب اور اخلاق کی حدود سے گذر گئیں۔ پطرس متحمل اور بُردبار رہے۔ لہٰذا وہ ان کی ناشائستگی خندہ پیشانی سے جھیل گئے۔ یہ بھی وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ عصمت کے تلخ و ترش الفاظ اور غیر مہذّب لب و لہجے سے ان کی طبیعت ضرور مکدّر ہوئی ہوگی کہ وہ متمدّن، نازک طبع اور نفاست پسند تھے ــــــ بحث تبھی بامقصد اور بامعنی رہتی ہے جب دونوں فریق کھُلے دل و دماغ سے اس میں حصہ لیں اور سخت الفاظ سے نہیں بلکہ قابلِ قبول دلائل سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کریں۔ عصمت کو احساس تھا کہ وہ اس معاملے میں کھری نہیں اُتریں۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

> "میں نے بہت سی باتوں کے نامعقول جواب دیئے تھے۔ ان کی علمی بزرگی کی قائل ہوتے ہوئے بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ میں کب سے اور کتنی ان کی مختصر سی تحریروں کی مدّاح ہوں۔ میں نے بہت کم ان کی تعریف میں کہا۔ جو کہا وہ نہایت بے رُخی سے سُنی اَن سُنی کر گئے۔ ان کی اپنی تخلیقات ان کے لئے اتنی اہم نہیں تھیں۔ کم از کم مجھے تو یہی انداز ہوا کہ وہ خود پرست نہیں۔"[2]

یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ پطرس نے بحث کو اپنی ذات پر مرکوز نہیں ہونے دیا اور نہ ہی اپنی تعریف و توصیف پر کان دھرے بلکہ بار بار بحث کا رُخ موڑ دیا ــــ یہ ایک بڑے ادیب اور بڑے انسان کا شعار تھا۔

○ معلوم ہوتا ہے کہ دورانِ بحث بھی پطرس کا ذہن تیزی سے عصمت کے فن کا جائزہ لے رہا تھا۔ چنانچہ ایکا ایکی انھوں نے یہ دھماکہ خیز سوال کیا:

"آپ ڈرامہ کیوں لکھتی ہیں؟" انھیں اچانک بم گرانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

"یُونہی۔" میں نے لنگڑا سا جواب دیا۔

---

[1]، [2] عصمت چغتائی: "کچھ میری یادیں"، مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر"، روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۱۴۳، ۱۴۴

"میری رائے میں تو آپ ڈرامے لکھنا چھوڑ دیجئے۔ بڑے اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ کوئی ایکٹ چھوٹا کوئی لمبا، سلیقے سے کتر بیونت کرنے کی بجائے آپ انھیں دانتوں سے کھسوٹتی ہیں"۔ ان کی بوجھل عقابی آنکھوں میں ایذا رسانی کی لذّت کا نشہ اُبھر آیا۔[1]

اس پُرخلوص مشورے پر عصمت کا ردِّعمل جو حسبِ توقع ہے، ملاحظہ ہو:

"جی چاہا میز کا سارا کوڑا کرکٹ ان کے اوپر الٹ دوں اور یہ ملیٹس کے مزے کی پڈنگ ان کے شاندار سوٹ پر لسڑ جائے۔ مگر میں نے جلدی سے بھڑکتے ہوئے راہوار کی لگامیں کھینچ لیں۔ اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی حلق میں اُتار کر نہایت نرمی سے کہا: "اچھا، اب نہیں لکھوں گی"۔[2]

ظاہر ہے کہ ان کے لہجے کی "نرمی" پُرتصنع تھی اور ان کے دلی جذبات کی پردہ پوشی کرتی تھی ــــ غور طلب بات یہ ہے کہ جہاں پطرس اپنی تعریف سُننے سے گریزاں تھے وہیں عصمت اپنی تنقید پر سیخ پا ہو جاتی تھیں۔ اپنے اپنے ادب کے تعلق سے دونوں کے مزاج کا تضاد نمایاں ہو جاتا ہے۔

○ "پطرس نے پوچھا" برنارڈشا سے متاثر ہیں؟"

"بے حد میں نے ایک ڈرامہ میں برنارڈشا کے یہاں سے پورا کا پورا سین اُڑا لیا ہے۔ کیونکہ مجھے وہ سین بہت پسند آیا تھا۔ اس کا حوالہ بھی نہیں دیا"۔[3]

عصمت کو بعد ازاں دھیان آیا کہ یہ تو ادبی سرقہ ہے جس کے لئے انھیں جوابدہ ہونا پڑے گا۔

○ بحث بیچ میں قطع کر کے پطرس نے عصمت سے بڑے ادب سے معذرت چاہی۔ اشارے سے بیرے کو بلایا اور بڑی پریشان سی صورت بنا کر چاروں طرف دیکھا اور سرگوشی میں اس سے کچھ کہا۔ وہ بڑے زور زور سے سر ہلانے لگا۔

"صاحب آپ اطمینان رکھو، کوئی بات نہیں"، بیرے نے ہمت بڑھائی۔

"نہیں اگر کوئی اعتراض ہو تو ۔۔"، پھر سہم کر چاروں طرف دیکھا۔

"آپ بولو صاحب"

"مینجر کو تو کچھ۔۔"

"نہیں صاحب مینجر کو کون بولے گا؟ ــــ ہم کو بولو ــــ؟"

پطرس نے بڑی شکر گذار نظروں سے اسے دیکھا پھر بالکل کان کے پاس ہونٹ لے جا کر بولے۔

"کافی"

---

[1]، [2]، [3] عصمت چغتائی "کچھ میری یادیں"، مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر"، روہتاس بکس، لاہور، ص ۱۵

"کافی؟" بیرا چکرایا۔

"ہاں! اور نمکین بسکٹ بھی"۔ بیرا مجسم سوال بنا کبھی مجھے اور کبھی انھیں دیکھنے لگا۔

"کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے —— شاباش"۔

"نہیں صاحب اطمینان رکھو" بھونچکا سا بیرا کافی لینے چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے

حیرت زدہ ہو کر پلٹ کر دیکھا جیسے کہتا ہو۔ دماغ تو سلامت ہے حضور کا۔ پطرس نے نہایت

معنی خیز انداز میں آنکھ ماری بے چارہ گھگیا کر ہنسنے لگا۔[1]

یہ پطرس کی شخصیت کا ایک اور رُخ تھا جو بہت دلکش ہے —— کئی گھنٹہ کے بحث مباحثہ کے بعد عصمت پطرس کی کثیر پہلو شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے مجموعی تاثرات کو یوں سمیٹتی ہیں:

"اور مجھے معلوم ہوا پطرس مزاح نگار ہی نہیں ان کی زندگی میں شرارت اور چلبلاپن ہے۔ ان کی زبان میں لطیفے ہیں اور برتاؤ میں ہلکا پھلکا پن، ان کے طنز میں تیکھاپن ہے۔ انھوں نے زندگی کا تنگ اور تاریک رُخ نہیں دیکھا۔ وہ اُلجھنوں کا شکار نہیں تھے۔ آزاد زندگی کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی تلخی اور جھنجھلاہٹ سے مکدر سے ہو جاتے تھے۔"[2]

عصمت کا جائزہ بہت معقول اور متوازن ہے کہ انھوں نے اپنے وقتی جذبات کو حق گوئی کے اظہار میں سدِ راہ نہیں ہونے دیا۔ ان جیسی بے خوف اور بے باک ادیبہ سے یہی توقع کی جا سکتی تھی۔

عصمت کے لئے پطرس کی صحبت میں اس طول طویل بحث کا "ایک ایک لمحہ بہت پُر لطف گذرا"۔ مگر ان کا جی نہ بھرا کہ ابھی بہت کچھ کہنے سننے کو باقی تھا —— پطرس کا اخلاق ملاحظہ ہو کہ وہ عصمت کو چرچ گیٹ اسٹیشن تک چھوڑ گئے کہ انھیں ملاڈ اپنے گھر جانا تھا۔

اس ملاقات کو دونوں نہ بھلا پائے اور ان کی ذہنی قربت اور بڑھ گئی —— بعدازاں پطرس نے عصمت پر ایک مضمون قلم بند کیا —— اور ایک بار عصمت دہلی گئیں تو انھیں دعوت میں اپنے ہاں بلایا، جس میں فیض احمد فیض بھی شریک ہوئے —— سال بھر بعد عصمت نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اُن دنوں شاہد کی نوکری بھی خطرے میں تھی۔ عصمت نے اپنے اردگرد دیکھا تو انھیں پطرس ہی ایک واحد شخص نظر آئے جن پر اس بحران کی گھڑی میں تکیہ کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے پطرس کو لکھا کہ انھیں نوکری کی اشد ضرورت ہے، جو کم از کم چار پانچ سو کی ہو۔ ہفتہ بھر کے

---

[1] [2] عصمت چغتائی "کچھ میری یادیں"۔ مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر"۔ ردہتاس بکس لاہور۔ ص ۱۶

اندر اندر انھوں نے چھ سو روپیہ کی نوکری کا تقرری نامہ انھیں بھجوا دیا۔ مگر اتفاق سے دریں اثنا عصمت اور شاہد دونوں کو فلم لائن میں ہی معقول کام مل گیا اور عصمت کو پطرس سے اظہارِ معذرت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

ملک تقسیم ہو گیا۔ پطرس پاکستان ہجرت کر گئے۔ اور یو۔ این۔ او میں ایک بہت بڑے عہدہ پر فائز ہو گئے —— پھر پتہ چلا کہ وہ چل بسے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کا ہزاروں لاکھوں لوگوں کو تازگی، شگفتگی اور مسکراہٹیں عطا کرنے والا قلم بھی خاموش ہو گیا۔ مگر عصمت کے ذہن کے اُفق پر دُور کہیں دو بھاری بھاری غلافی آنکھیں نہ جانے کب تک مسکراتی رہیں۔

عصمت نے اِس مضمون کو پطرس پر خاکہ قرار دیا ہے[1]، لیکن اس کا عنوان انھوں نے "کچھ میری یادیں" رکھا ہے۔ درحقیقت یہ عصمت اور پطرس دونوں کی شخصیت اور فن کے کچھ پہلوؤں کا بسر حاصل مطالعہ ہے —— قلم بالعموم سوچ سمجھ کر، کئی مصلحتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا ہے۔ مگر زبان میں ایک اپنی ہی آمد اور بیساختگی ہوتی ہے جو دل کی بات کو فی البدیہہ قوتِ اظہار عطا کرتی ہے، جس سے سب ذہنی محفوظات دھرے رہ جاتے ہیں —— یہی بیساختہ پن اور تازگی اس مضمون کا طرّۂ امتیاز ہے۔

پطرس ایک بڑی قد آور، پُر وقار، مرعوب کُن، دلکش، ہمہ جہت شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں اور بلا اختیار متاثر کرتے ہیں۔ ادبی اور منصبی بلند مقامی کے باوصف اُن کی طبیعت میں وہی شوخی، چلبلاہٹ اور شرارت ہے، جو ان کے کرداروں میں رچی بسی ملتی ہے۔ وہ جب سب تکلفات اور ذہنی محفوظات کو بالائے طاق رکھ کر انسانی سطح پر اُتر کر بات کرتے ہیں تو قاری اسامع کو اپنی مقناطیسی کشش سے گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ تاج محل ہوٹل کے بیرے کے ساتھ ان کی بات چیت ان کی شخصیت کے اس مخصوص پہلو کو اُجاگر کر دیتی ہے —— پھر وہ بہت متوازن اور ٹھنڈے دل و دماغ کے حامل ہیں۔ پُرجوش مباحث میں بھی اُن کا ذہن مرتعش اور متلاطم نہیں ہوتا —— نہ صرف یہ وہ بہت چوکس اور چوبند ہیں —— بحث جب ناخوشگوار موڑ لینے لگتی ہے تو وہ بڑی نفاست اور چابکدستی سے اس کا رُخ موڑ دیتے ہیں۔ ناپسندیدہ موضوع پر سوال اُٹھایا جائے تو طرح دے جاتے ہیں —— پھر وہ ایک خوش اخلاق میزبان بھی ہیں تہذیب، اخلاق اور مجلسی آداب کا پاس اُن کی شخصیت کا اہم جُزو ہے —— مزید براں وہ انسان دوست اور ادب دوست ہیں۔ آڑے وقت میں کام آنے والے عصمت کے ساتھ ان کا سلوک اس بات کی توثیق کرتا ہے —— ایسی شخصیتیں خال خال ہوتی ہیں اور چہار سو اپنی خوشبوئیں بکھیرتی رہتی ہیں۔

ادبی سطح پر بھی وہ بہت ارفع و اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ان کا مرعوب کُن وسیع مطالعہ اور اردو اور انگریزی ادب پر بہت گہری نظر انھیں ایک منفرد مقام عطا کرتے ہیں —— اردو ادب کے ہم عصر ادبا کی تخلیقات سے ان

---

[1] عصمت چغتائی سے گفتگو، یونس اگاسکر (انٹرویو) عصمت چغتائی نمبر (دسمبر ۱۹۹۱ء) اُردو ماہنامہ مکالمات، دہلی ص ۱۷

کی رغبت اور وابستگی حیرت انگیز ہی نہیں فکر انگیز بھی ہے۔ انھوں نے جس باریک بینی، توجہ اور انہماک سے ان کا مطالعہ کیا اظہر اس بات سے ظاہر ہے کہ انھیں ان کے جملے کے جملے ازبر تھے۔ وہ عصمت سے ان کے فن پر ہی نہیں بلکہ منٹو، کرشن چندر اور بیدی کے فن پر بھی تبادلۂ خیالات کرتے ہیں پھر ان کا عصمت کو ڈرامہ نگاری سے دست بردار ہو جانے کا مشورہ بھی بے جواز نہیں کہ اس کی اصالت کو سب تسلیم کرتے ہیں ــــ غرضیکہ پطرس ایک اعلیٰ انسان اور ارفع ادیب، نقّاد اور دانشور ہیں ــــ اور ہمارے لئے یہ احساس عصمت کے قلم کی دین ہے۔

اسے اس خاکے کا حسن کہئے کہ یہ پطرس کے ہی نہیں عصمت کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو بھی آشکار کرتا ہے ــــ دو شخصیتوں کی بحث میں دونوں کی تصویر اُبھر کر سامنے آجانا ایک قدرتی بات ہے ــــ عصمت ایک بیحد حسّاس، تیز طرّار، لااُبالی اور جارح شخصیّت کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ وہ بغیر کسی عقلی اور منطقی جواز کے خیالوں ہی خیالوں میں فرضی مدِّمقابل سے بھڑ جانے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اکثر غم و غصّے سے مغلوب ہو کر توازن کھو دیتی ہیں۔ مختصراً ان میں وہ تحمّل اور بُردباری نہیں جو ایک پختہ کار زمانے کا سرد گرم دیکھے دانشور کا خاصہ ہوتی ہے۔ ان کی انا اور خود پسندی حد درجہ بڑھی ہوئی ہے اور وہ دوسروں کی برتری اور برگزیدگی تسلیم کرنے میں اپنی ہیٹی سمجھتی ہیں۔ عصمت کی شخصیّت کا یہ پہلو قدرے ناخوشگوار ہے ــــ مگر وہ حد درجہ ذہین اور فطین ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور قوتِ مشاہدہ عمیق ہے۔ ادبی مذاکرات میں بڑے بڑوں سے ٹکّر لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مغربی ادب سے خوب مانوس ہیں۔ پھر وہ خود صفِ اوّل کی افسانہ نگار ہیں اور پطرس ان کی فنی صلاحیتوں کے مدّاح رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان جیسی برگزیدہ ہستی نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا اور ان کی صحبت میں اتنا وقت گذارا۔ اور محظوظ ہوئے۔

عصمت کا یہ مضمون ان کے ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

دوزخی

پھوّ پھوپھی عصمت چغتائی کی سگی پھوپھی تھیں جن کا اپنے بھائی (عصمت کے والد) اور ان کے سسرال والوں سے خدا واسطے کا بیر رہا۔ اور وہ تاحیات انھیں کوسنے دیتی رہیں۔ جب دمِ مرگ عصمت کے والد نے اپنی بہن کو آخری ملاقات کے لئے بلایا اور پیار سے کہا "ہمیں کو معاف کر دو پھوّبی"، تو کوسنے اُن کے ہونٹوں تک آ کر منجمد ہو گئے اور ان کے مُنہ سے بیساختہ یہ دُعا نکلی۔

"یا... یا اللہ... میری عمر میرے بھیّا کو دیدے... یا مولا... اپنے رسول کا صدقہ"

اور وہ اس بچّے کی طرح جھنجلا کر رو پڑیں جسے سبق یاد نہ ہو۔"

اس پر عصمت اپنی کہانی "بچھو پھوپھی" یوں ختم کرتی ہیں :

" سچ ہے بہن کے کوسنے بھائی کو نہیں لگتے ۔ وہ ماں کے دودھ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔"[1]

عین اسی طرح عصمت کا کوسنا "دوزخی"، بھی عظیم بیگ چغتائی کو نہیں لگے گا کہ وہ اُن کی ماں کے دُودھ میں ڈُوبا ہوا ہے۔

عصمت کو عظیم بیگ کے جیتے جی اُن کی کتابوں سے رغبت نہ ہوئی کہ وہ ان کو پُرانے وقتوں کے لوگوں میں شمار کرتی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ آخر عظیم بیگ کی کتابوں میں بوسیدہ مذاق اور سڑیل عشقیہ قصّے کہانیوں کے سوا اور کیا دھرا ہوگا۔ گویا عصمت نے عظیم بیگ کو پڑھے بغیر ہی ایک مفروضہ قائم کر لیا جس کا کوئی عقلی جواز نہ تھا۔ عصمت کو یُوں بھی عظیم بیگ کی باتوں سے چڑ سی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ در پردہ ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ عصمت کے الفاظ میں:

" بخدا جب وہ شخص کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا بچّوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز، کیسی کڑوی مُسکراہٹ اور کٹیلے ہوئے جملے۔ میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بد زبانی کی۔"[2]

عظیم بیگ کی وفات کے بعد عصمت نے انھیں پڑھنا شروع کیا تو عظیم بیگ کی تحریروں کا حسن اُن پر آشکار ہوتا چلا گیا اور ساتھ ہی مرحوم کی شکل و صُورت کا ہر نقش عصمت کے ذہن کے پردے پر جاگ اُٹھتا تھا ـــــ وہ رنج والم کے گہرے سمندر میں ڈُوبی ہُوئی، مسکرانے کی سعی کرتی ہوئی آنکھیں، مُرجھائے ہوئے چہرے پر سیاہ، گھنے، پریشان بال، پیلی نیلاہٹ لئے ہوئے بلند پیشانی، ناہموار دانت، سوکھے سوکھے دوائیوں میں بسی ہوئی انگلیوں والے ہاتھ، کھپچی جیسی پتلی پتلی ٹانگیں اور بد وضع پیر، سوکھے سڑے، پنجرہ جیسا سینہ جس پر اُن کی گھٹی گھٹی سانسوں کی وجہ سے دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا ـــــ مگر ان کے سینے میں کس قدر زندہ اور پھڑکتا ہُوا دل دھڑکتا تھا۔ رہ رہ کر اُن پر کھانسی کے شدید دورے پڑتے، مگر اِدھر دورہ ختم ہوتا اُدھر ان کے اندر کا انسان اپنے فطری قہقہوں اور مسکراہٹوں کے ساتھ جاگ اُٹھتا۔ ان کے نحیف و نزار جسم میں نہ جانے کہاں سے توانائی اور زندگی کی آب و تاب عود کر آتی اور ہر چیز گنگناتی، رقص کرتی دکھائی دینے لگتی ـــــ گویا عظیم بیگ، بیحد جسمانی ناتوانی کے باوجود ذہنی طور پر بلا کے چُست اور چاق و چوبند تھے۔ مگر بیماری کے کرب کو پامردی سے جھیلنا اور اُسے اپنے اُوپر حاوی نہ ہونے دینا

---

[1] عصمت چغتائی: "بچھو پھوپھی"۔ مجموعہ "دو ہاتھ"۔ روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۴۷

[2] عصمت چغتائی۔ "دوزخی"۔ اُردو ماہنامہ "مکالمات"۔ دہلی۔ (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۹۴

انھوں نے سیکھ لیا تھا۔

عظیم بیگ کا ناول "کھرپا بہادر" تخیّل پر مبنی تھا۔ اس کا خالق خود اپنی زندگی میں چلنے پھرنے سے معذور تھا مگر اپنے ہمزاد سے وہ سب کام کروالیتا تھا جو وہ خود حقیقی زندگی میں کر سکتے سے قاصر تھا۔ ہمزاد چوریاں اور شرارتیں کرتا اور جی بھر کر مار کھاتا مگر ٹس سے مس نہ ہوتا۔ عظیم بیگ کو یہ حسرت رہی کہ کاش وہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح توانا ہوتے اور ان کی طرح پٹ کر بھی کمر جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوتے۔ مگر بدقسمتی سے قضا و قدر نے انھیں نحیف و ناتواں بنایا تھا ___ نہ جانے اُن کے قلب و جگر میں اور بھی کیا کیا آرزوئیں اور ارماں تھے، جو ناآسودگی کے ساتھ دَم توڑ گئے ہوں گے۔ عصمت لکھتی ہیں:

"تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں دُنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال اُن کا تھا۔ وہ جو کچھ نہ تھے افسانہ میں وہی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔ کچھ تو چاہیئے نا جینے کے لئے۔"[1]

یہ مختصر سا اقتباس پاکیزہ خواہرانہ جذبات سے لبریز ہے اور اس میں عظیم بیگ کے تئیں دردمندی چھلکی پڑتی ہے۔ عصمت اس بات پر رنجیدہ خاطر دکھائی دیتی ہیں کہ عظیم بیگ حقیقی زندگی میں کس قدر مجبور اور معذور تھے اور وہ کس طرح اپنی کوتاہیوں کا مداوا اپنے کرداروں میں ڈھونڈتے تھے۔ انھیں اتنا سہارا بھی نہ ہوتا تو جینا دُوبھر ہو جاتا ___ ملاحظہ فرمائیے کہ "کچھ تو چاہیئے نا جینے کے لئے" میں کس قدر ناآسودہ آرزوئیں پنہاں ہیں ___ عصمت نے یہاں بڑے نرم و نازک انداز میں عظیم بیگ کی تحریروں کے تعلق سے ان کے کردار کا تجزیہ کیا ہے۔ عظیم بیگ کا جسم ناکارہ اور ازکار رفتہ تھا مگر ذہن بے حد تیز اور زرخیز تھا جو ان کی کوتاہیوں کا مداوا کرنے میں ممدو معاون ثابت ہوتا تھا۔

○ بایں ہمہ عظیم بیگ احساسِ ناتوانی سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ گھر والوں نے یہ صورت دیکھی تو اُن سے بڑا نرم اور ملائم رویّہ روا رکھا اور ان کی تسکینِ قلب کے لئے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ والد اُن کی فروگذاشتوں پر انھیں فراخدلی سے معاف کر دیتے۔ قوی الجثّہ بھائی مودّبانہ جُھک کر اُن سے مار کھا لیتے۔ ہر چھوٹا بڑا اُن کی دلداری اور پاسداری میں لگا رہتا۔ مگر اس کا اثر توقع کے برعکس ہوا۔ عظیم بیگ کا احساسِ کمتری فزوں تر ہو گیا۔ یہ خیال ہی اُن کے لئے سوہانِ رُوح تھا کہ کوئی انھیں قابلِ رحم جان کر ہمدردی اور شفقت کا اظہار کرے۔ ان کے باغیانہ جذبات تیز تر ہوتے گئے اور ان کا غم و غصہ بڑھتا گیا۔ اس پر گھر والوں نے مصلحتاً ہر معاملے

---

[1] عصمت چغتائی "دوزخی" اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۹۷

میں انھیں کھلی چھوٹ دے دی اور انھیں اپنی سی کر لینے دی جس نے ان کی پژمردہ رُوح کو اور زیادہ جھنجھوڑ دیا۔

عصمت کے الفاظ میں :

"وہ چاہتے تھے کہ کوئی تو انھیں بھی انسان سمجھے۔ انھیں بھی کوئی ڈانٹے۔ انھیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان۔ چٹخارے لے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی، ماں باپ سب کو نفرت ہو گئی۔ اچھا خاصہ گھر میدانِ جنگ بن گیا۔ اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے۔ اور کمزور، لاچار، ہر دم کا روگی تھئیٹر کا ویلن ہیرو بن گیا۔ اور کیا چاہیئے۔ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہو گئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا۔"[1]

اس طرح جسمانی طور پر بیحد کمزور اور مضمحل عظیم بیگ، ذہنی طور پر بیحد توانا عظیم بیگ کے ہاتھوں باغی اور مُفسد بن گئے، جس سے ان کی انا کو بالیدگی اور آسُودگی ملی۔ اُن کے جذبۂ خود پرستی کو تقویت حاصل ہوئی۔ اور احساسِ کمتری اور فروتنی بہت حد تک ناپید ہو گئی ـــــ مگر گھر کی فضا مکدّر ہو گئی۔ ہنستے کھیلتے گھر کی زندگی میں زہر گھُل گیا ہر کسی نے ان سے برگشتہ ہو کر مُنہ پھیر لیا۔ مگر اس سے بھی عظیم بیگ کو قلبی طمانیت نصیب نہ ہُوئی۔

ـــــ عصمت یہاں اُن کی دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھتے ہوئے لکھتی ہیں :

"لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دُنیا انھیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا، اتنا ہی وہ لپٹے۔"[2]

عصمت کے دل میں پھر عظیم بیگ کے تئیں خواہرانہ محبّت کروٹ لیتی معلوم ہوتی ہے کہ وُہ ان کے نفسیاتی عمل کے پیچ وخم سے واقف تھیں۔ عظیم بیگ گھر والوں سے ٹکراؤ اور تصادم کے خواہاں نہ تھے بلکہ وہ تو ان کی محبّت کے بھوکے تھے۔ مگر اس کی جگہ انھیں تحقیر و تذلیل ملی۔ انھیں نفرت سے دھتکارا گیا۔ اس نے انھیں بُری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ گھر والے جتنا اُن سے دُور ہٹتے گئے، عظیم بیگ اتنا ہی اُن سے لپٹتے گئے۔ مگر پھر بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

---

[1] [2] عصمت چغتائی "دوزخی" اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۹۷، ۹۸

"وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی۔ بچّے باپ نہ سمجھتے۔ بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں اور بھائی آواز سُن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی سانپ جنا تھا میں نے"[1]

عظیم بیگ کی ذہنی کیفیت کا جو تجزیہ عصمت نے کیا ہے وہ انتہائی فکرانگیز ہے کہ یہ ان کی نفسیاتی اُلجھنوں اور پیچیدگیوں کی گرہ کُشائی کرتا ہے ــــ مگر عظیم بیگ اپنے ذہن کے حصار میں محبوس تھے جس سے مفر ممکن نہ تھا۔ ذہنی گتھیوں کو سُلجھانا تو دُور رہا، سمجھنا بھی آسان نہیں۔ وہ گھر والوں کی دلی قربت کے لئے ترس گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ماں باپ ان کے سر پر دستِ شفقت پھیریں۔ بھائی انھیں برادرِ بزرگ جان کر عزت و تعظیم دیں۔ بہنیں انھیں بھائی سمجھ کر پیار سے پیش آئیں۔ بیوی انھیں رفیقِ حیات جان کر محبت نچھاور کرے ــــ مگر کسی نے اُن کی گھٹی گھٹی درد بھری پُکار نہ سُنی۔ کسی نے اُن کی آشفتگی اور دل گرفتگی کا راز جاننے کی سعی نہ کی۔

عظیم بیگ چالیس سال کی مختصر سی عمر میں ہی چل بسے اور پھر جب عصمت نے مُڑ کر اُن کی زندگی پر اُن کے نظریات اور اعتقادات کے تعلّق سے ایک نظر ڈالی تو انھیں یقین ہو گیا کہ عظیم بیگ کا پیغام انھیں پسِ مرگ بھی زندہ رکھے گا۔ یہ وہ پیغام ہے جس کے لئے وہ زندگی بھر برسرِ پیکار رہے اور آج بھی وہ پیغام اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے بامعنی اور بامقصد ہے:

"ختم ہو گئے منّے بھائی"، نہ جانے کس نے کہا: "وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے" مجھے خیال آیا۔ "میرے لئے تو وہ مر کر ہی جئے اور نہ جانے کتنوں کے لئے مرنے کے بعد پیدا ہوں گے اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ اُن کا پیغام دُکھ سے لڑو، نفرت سے لڑو، اور مر کر بھی لڑتے رہو" یہ کبھی نہ مر سکے گا۔ ان کی باغیانہ رُوح کو کوئی نہیں مار سکتا"[2]

یہ نہ صرف عظیم بیگ کے نظریات کا لبِ لباب تھا بلکہ عصمت کا ان کے تئیں خراجِ عقیدت بھی ہے ــــ اگر عظیم بیگ "باغی" تھے تو عصمت بھی اپنی طرح کی ایک "باغی" تھیں۔ اس اعتبار سے دونوں شانہ بشانہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

○ مگر عصمت عظیم بیگ کے تئیں تمام تر نرم و نازک خواہرانہ جذبات کے اظہار کے باوجود ان کی شخصیت کے قدرے ناگوار پہلوؤں سے صرفِ نظر نہ کر پائیں۔ وہ اس بات کو نہ بھُلا پائیں کہ عظیم بیگ کے ناپسندیدہ رویّے کے طفیل ان کے ماں باپ اور بھائی بہنوں کو شدید کرب و عذاب سے گذرنا پڑا تھا۔ اس بے راہ روی کی

---

[1] [2] عصمت چغتائی "دوزخی" "اردو ماہنامہ "مکالمات"، نئی دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۹۸، ۱۰۰

پاداش میں اگر انھیں دوزخ میں جانا پڑے گا تو وہ جاننا چاہیں گی کہ وہاں اُن پر کیا گذری۔ چنانچہ وُہ لکھتی ہیں:

"وہ ایک عفریت تھے جو عذابِ دُنیا بن کر نازل ہُوئے تھے۔ اب دوزخ کے سوا اُن کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اگر دوزخ میں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانہ ہے، تو ایک بار تو ضرُور اس دوزخ میں جانا پڑے گا صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ جس شخص نے دُنیا کے دوزخ میں یوُں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور تیر اندازوں کو کڑوے تیل میں تلا، وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑا چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس میں وہ تلخ طنز بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہُوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اٹھتا ہو گا۔"[1]

عصمت نے غم و غصّے سے مغلوب ہو کر عظیم بیگ کو نہ جانے کیا کچھ جلی کٹی سُنا ڈالی ہیں۔ حالانکہ عصمت نے خود ہی ان کی نفسیاتی گُتھّی کو بڑے مدلّل انداز میں سُلجھا بھی دیا ہے۔ عظیم بیگ فطرتاً مُفسد اور شر انگیز نہ تھے۔ مگر حالات نے انھیں ایک ایسی ڈگر پر ڈال دیا تھا جس نے سب کو اُن سے بدظن کر دیا۔ اور وُہ ان کی موت کی دُعا مانگنے لگے۔ مگر ساتھ ہی عصمت نے دردمندی سے اس خوش دلی اور خندہ پیشانی کا ذکر بھی کیا ہے جس سے کہ عظیم بیگ نے اپنے حریفوں کے وار سہے اور انھیں ہنس ہنس کر چڑایا، ستایا۔

مرنے سے دو دن پہلے جب موت اُن کے سر پر منڈلا رہی تھی اور چیونٹیاں ان کے جسم کو لگنی شروع ہو گئی تھیں، وہ ہنس کر کہتے ہیں "یہ چیونٹی صاحبہ کس قدر بے صبر ہیں۔ یعنی قبل از وقت اپنا حصّہ لینے آن پہنچیں۔" دمِ مرگ خوُد اپنی ذات سے اس نوع کی جملہ بازی کے لئے دل گُردہ چاہیئے تھا۔ عظیم بیگ موت کا تمسخر اڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔ حالتِ نزع تک اُن کا دماغ چلتا رہا۔ زبان چلتی رہی اور نپے تُلے جملے تراشتی رہی اور ہر جملہ ایسا کہ چسپاں ہو کر رہ جاتا۔

○ دورِ جدید کے ادیبوں کے سامنے عظیم بیگ کی دال نہ گلی۔ تغیر پذیر زمانے میں ہر شے بدل گئی۔ نظریات بدل گئے۔ لب و لہجہ بدل گیا۔ نئے ادیب سرمایہ داری، سوشلزم اور بیکاری کے ستائے ہوُئے ہیں۔ وُہ جو کچھ لکھتے ہیں غم و غصّے سے مغلوب ہو کر لکھتے ہیں ـــــ دُکھی عظیم بیگ بھی کم نہ تھے کہ وُہ نادار اور بیمار تھے۔ سرمایہ داری سے بھی وُہ عاجز تھے۔ بایں ہمہ اُن میں اتنا دَم تھا کہ دُکھ میں بھی ٹھٹھا لگاتے تھے۔ وہ جہاں اپنے افسانوں میں ہنستے تھے وہیں حقیقی زندگی میں بھی ہنس ہنس کر رنج و غم کو سرنگوں کر دیتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ بے مثال تھے۔

---

[1] عصمت چغتائی۔ "دوزخی" اُردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۰

عصمت کے نزدیک ان کے بیشتر ناول قابلِ اعتنا نہیں۔ اس سلسلے میں "کولتار" اور "شریر بیوی" کے نام فوراً ذہن میں آتے ہیں۔ مگر "چمکی" ایک لپکتا ہوا شعلہ ہے اور یہ بات ناقابلِ یقین سی معلوم ہوتی ہے کہ سوکھا، بیماریوں کا مارا، کرم خوردہ انسان اس حد تک عیش پرست بھی ہو سکتا ہے۔ مگر درحقیقت یہ اُن کا ہمزاد ہے، جس کے جسم میں اُن کی رُوح حلول کر آئی ہے اور جنھیں دیکھ کر انھیں شادمانی اور کامرانی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا یہ ایک بالواسطہ انبساط یا VICARIOUS PLEASURE ہے ـــــ اس اعتبار سے عصمت کے نزدیک ان کی زندگی اور ادب "جھوٹ" کا جامہ اوڑھ لیتے ہیں ـــــ مگر ایک دُوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو وہ صریحاً سچے تھے اور ان کا ادب ان کے ذہن کا سچا عکّاس تھا۔ وہ اپنی دائمی علالت کے سبب زندگی کو زندگی کی طرح برتنے سے قاصر تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں کے طفیل جو کچھ لکھا، دل و جان سے لکھا۔ اپنے دُکھ درد کو بالائے طاق رکھ کر لکھا اور اپنے زمانے کے اعتبار سے خوب لکھا اور بڑا نام پیدا کیا۔

○ عصمت عظیم بیگ کے ادب کا موجودہ دَور کے ادب سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اُن کا ادب مقبول نہ تھا کہ وہ بے حجابانہ نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے لیکن اس کے جسم سے اغماض برتتے تھے۔ اس دَور میں عورت کے سینے کا اُتار چڑھاؤ، پنڈلیوں کی مچھلیاں اور رانوں کا گداز ادب میں چھلکنے لگا ہے مگر عظیم بیگ اسے عُریانی کہتے تھے مگر خود اسے کپڑوں میں ملبوس دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ نئے ادیب بھوکے ہیں اور ان پر جنس طاری ہے اور ہمیشہ طاری رہی ہے۔ ہماری شاعری، مصوّری، سنگتراشی ہماری جنسی گرسنگی کا ثبوت ہے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ عظیم بیگ نے بجا فرمایا ہے۔ ہمارے فنکار، ہماری قوم فی الواقع جنسی اعتبار سے بھوکی ہے۔ ہمارا معاشرہ اب تک ایک بند معاشرہ رہا ہے اور ایک بند معاشرے میں جنس سے متعلق ہر بات ڈھکے چھپے انداز میں ہوتی ہے۔ اگر منظرِ عام پر آجائے تو وہ جرم یا گُناہ بن جاتی ہے ـــــ اس لحاظ سے عظیم بیگ کا ادب اپنے دَور کی صدا ہے۔

○ عصمت کے الفاظ میں:

> "ہم ان کے افسانوں کو عموماً جھوٹ کہا کرتے تھے۔ جہاں انھوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے۔ پھر "قصرِ صحرا" لکھنے لگے؟ وہ ان کی گپّوں کو "قصرِ صحرا" کہتے تھے۔ عظیم بیگ کہتے "سرکار دُنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں! بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔"

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو "قصرِ صحرا" ہے۔" اِس پر

ماموں کہتے:

"ارے اس زندہ لاش کو منع کرو کہ یہ کفر ہے"۔ اِس پر وہ ماموں کے توہّم پرست سسرال والوں کا تمسخر اڑاتے تھے[1]

اس مختصر سے اقتباس سے ایک بڑے آزاد خیال، روشن دماغ، زندہ دل، توہّم پرستی کے دشمن عظیم بیگ کی تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے ـــــ عظیم بیگ نے خوب کہا ہے کہ کہانی کو دلچسپ بنانا ہو تو حقیقت میں تھوڑی سی جھوٹ کی آمیزش کر دو وہ رنگین ہو جائے گی۔ اس کا چہرہ مہرہ نکھر جائے گا ـــــ اور جسے عظیم بیگ کے والد "قصرِ صحرا" کہتے تھے وہ درحقیقت پروازِ تخیّل ہے جو ایک قابلِ قدر فنّی جوہر ہے ـــــ پھر عظیم بیگ نے کس قدر معنی خیز اور راست بات کہی ہے کہ جنّت اور دوزخ کا بیان بھی "قصرِ صحرا" ہی تو ہے۔ اور یہی بات تو مرزا غالب نے بھی کہی ہے: "ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن"۔ اور غالب کے اس شعر پر زمانہ ڈیڑھ سو سال سے سر دھن رہا ہے اور دھنتا رہے گا۔

○ عصمت مذہب کے تعلق سے عظیم بیگ کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے اس کے ساتھ سو جاتے تھے ـــــ بحث کی غرض سے انھوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر حدیثیں حفظ کر رکھی تھیں۔ انھیں سُنا کر وہ لڑا کرتے تھے۔ ان حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے ـــــ یزید کے بڑے مدّاح تھے اور حضرت امام حسینؑ کی شان میں گستاخی سے باز نہ آتے تھے اور اپنے موقف کے جواز میں جھوٹے سچے قصّے اختراع کر لیتے ـــــ لوگ انھیں کہتے کہ اپنے اعمال کے سبب دوزخ میں جاؤ گے تو وہ کہتے "یہاں کونسی اللہ میاں نے جنّت دے دی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں"۔ کبھی کہتے "اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم تو مر جائیں گے۔ جنّت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے" ـــــ "یہی وجہ ہے کہ سب انھیں باغی اور دوزخی کہتے ہیں"[2]

اس آخری جملے سے اس خاکے کے عنوان "دوزخی" کا جواز واضح ہو جاتا ہے۔ عظیم بیگ "باغی" تھے اس لئے وہ سب کی نظروں میں "دوزخی" ٹھہرے۔

عظیم بیگ نے اپنے آبائی مذہب کے مسلّمات سے روگردانی کی اور ان کی شکست و ریخت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انھوں نے مجاہدانہ جوش و خروش کے ساتھ یہ کام روزِ اوّل سے دمِ آخر تک انجام دیا اور اپنے ہم مذہبوں کی طعن و تشنیع کے ہدف بنے۔ اور سزاوارِ نارِ جہنّم ٹھہرے۔

---

[1] [2] عصمت چغتائی، "دوزخی"، اردو ماہنامہ "مکالمات"، دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۳، ۱۰۵

اس خاکے کو جو بات غیر معمولی اہمیت عطا کرتی ہے۔ وہ، وہ فنی چابکدستی اور نفاست ہے، جس سے عصمت نے ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جو عظیم بیگ کی تحریروں کے محرک تھے۔ عصمت نے تحلیلِ نفسی کی مدد سے اس عظیم بیگ کا سُراغ لگایا ہے جو اپنی تحریروں کے پیچھے پوشیدہ تھا اور اپنے کرداروں کو اپنی کوتاہیوں کی ڈھال بنا کر پیش کرتا تھا۔ اور زورِ تخیل سے اُن سے وہ کام لیتا تھا جو وہ خود حقیقی زندگی میں علالت اور ناتوانی کے سبب کرسکنے سے قاصر تھا۔ اُس سے انھیں توانائی، بالیدگی اور خود اعتمادی کا احساس ہوتا تھا گویا عصمت نے جہاں اپنے بھائی کے تئیں اس کی ستم ظریفی پر تلخ و ترش لب ولہجہ اختیار کیا وہیں ساتھ ساتھ ان کی تحلیلِ نفسی کا کام بھی بیحد گدازدلی اور ملائمت سے کرتے ہوئے ان کے ظاہر و باطن کو اُجاگر کردیا۔ اوپندر ناتھ اشک اس بات کی توثیق یوں کرتے ہیں :

"دوزخی" کے عنوان سے اپنے ستم ظریف بھائی کا ذکر، جو دق کے مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود ستم ظریفی سے سارے گھر کو ستاتا تھا عصمت نے نشتر کے سے جس تیز طنزیہ لہجے میں کیا ہے، اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ اُسے "دوزخی" کے نام سے یاد کیا ہے' لیکن ساتھ ہی بیمار ستم ظریف کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے ایسی دردمندی اور محبت سے کام لیا ہے کہ وہ یادداشت کبھی بھلائے نہیں بھولتی ہے[1]

دوسری چیز جو اس خاکے کو امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے اور اب تک لکھے گئے اس نوع کے مضامین میں سرفہرست لا کھڑا کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ عصمت نے خواہرانہ جذبات کو نظرانداز کرکے بے رحمانہ معروضیت اور سفّاکانہ راست گوئی کے ساتھ عظیم بیگ کی شخصیت اور فن کو جوں کا توں پیش کردیا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو خاکے کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیئے۔ مگر کیونکہ ہمارے ہاں اس طرح کی صاف گوئی کو قابلِ قبول نہیں مانا جاتا اس لئے عصمت پر انگلی اُٹھ جانا قدرتی بات ہے۔ ہمارے ہاں مرحوم کی ذات اپنی زندگی میں بھلے کیسی ہی رہی ہو مرنے کے بعد قابلِ احترام ہوجاتی ہے۔ عصمت نے اس پٹی ہوئی روایت سے انحراف کیا اور انھیں ادب کے طہارت پسندوں اور روایت پرستوں نے ناشُدنی اور خواہرانہ جذبات سے عاری قرار دیا، مگر دیدہ ور ناقدین نے "دوزخی" کو ایک ادبی شاہ پارہ گردانا ___ بعضوں نے تو عنوان کو لے کر ہی عصمت کو مطعون گردانا۔ اُن کا کہنا تھا کہ تم کیسی بہن ہو جو تم نے اپنے مرحوم بھائی کو "دوزخی" کہا۔ کیا تمھارا خونِ سفید ہوگیا ہے جو تم اس پست سطح پر اُتر آئیں؟ ___ مگر اُنھوں نے فرطِ جذبات میں خاکے

---

[1] اوپندر ناتھ اشک: "عصمت چغتائی۔ دوزخی کی باتیں" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی جنوری ۱۹۹۲ء ص ۷

فنی

کی فنکار کی حیثیت سے چشم پوشی کی کیونکہ یہ مروّجہ روش سے ہٹ کر تھا۔ اسے سطحی اور فروعی طور سے پرکھا، پرکھا کیا بغیر پرکھے ہی فتویٰ صادر کر دیا۔ مثال کے طور پر مشہور پاکستانی ادیب ایم اسلم نے عصمت کو "دوزخی" پر طعن و تشنیع شروع کی تو وہ بھی مشتعل ہو گئیں:

"تم نے "دوزخی" کیوں لکھا؟"

میرے دماغ میں ایک دھماکا ہُوا۔

"کیسی بہن ہو کہ اپنے سگے بھائی کو تم نے "دوزخی" لکھا۔"

"وہ "دوزخی" تھے یا "جنتی"، میرا جو جی چاہا لکھا۔ آپ کون ہوتے ہیں؟"

"وہ میرا دوست تھا۔"

"میرا بھائی تھا۔"

"لعنت ہے ایسی بہن پر۔"[1]

ایم۔ اسلم جب دُشنام طرازی پر اُتر آئے تو عصمت نے خاموش رہنے کو ہی قرینِ مصلحت جانا کہ وہ اُن کے ہاں بطور مہمان قیام پذیر تھیں۔

مگر عصمت کے حساس دل و دماغ سے ایم اسلم کی ناروا تنقید کی خلش عرصۂ دراز تک نہ گئی اور انھیں رہ رہ کر کچوکے دیتی رہی۔ چنانچہ اس بارے میں وہ لکھتی ہیں:

"میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا کہ میں نے "دوزخی" لکھا تھا تو میرے اوپر کیا بیتی تھی۔ میں خود کس دوزخ کے شعلوں سے گذری تھی، میرا کیا کچھ جل کر راکھ ہوا تھا۔ رات کے دو بجے تھے جب میں نے یہ مضمون ختم کیا۔ کیسی ہیبت ناک رات تھی۔ سمندر گھر کی سیڑھیوں تک چڑھ آیا تھا۔ جب تک احاطے کی دیوار نہیں بنی تھی۔ مجھ پر عجیب وحشت سی طاری ہو گئی۔ جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ میرے چاروں طرف سینما کی ریل کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے لیمپ بجھایا تو دم گھٹنے لگا۔ جلدی سے پھر جلا دیا۔ اندھیرے سے ڈر لگ رہا تھا۔ مجھے وہ قبر یاد آ رہی تھی، جسے دیکھ کر آنے کے بعد میں مہینوں اکیلے کمرے میں نہیں سو پاتی تھی۔ اکیلے پلنگ پر مجھے وحشت ہوتی تھی۔ میں اپنے ساتھ اپنی چھوٹی سی خالہ زاد بہن کو سلانے لگی تھی۔ جو دھپور سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ اس لئے میں بمبئی بھاگ آئی تھی۔ دس ستونوں میں سے ایک ڈھہ گیا تھا۔ اس خلا کو کون ناپ سکتا تھا۔"[2]

---

[1] ، [2] عصمت چغتائی: "کاغذی ہے پیرہن"۔ ماہنامہ "آجکل"، نئی دہلی۔ مارچ ۱۹۷۹ء۔ ص ۷

اس اقتباس سے عصمت کی عظیم بیگ کے تئیں محبت جھلکی پڑتی ہے۔ وہی محبت جس نے عصمت کو "دوزخی" لکھنے کی انگیخت کی۔

دھیان رہے کہ عظیم بیگ باغی تھے تو عصمت بھی باغی تھیں۔ عظیم بیگ نے معاشرے کی مسلمہ اقدار سے انحراف کیا تو عصمت نے بھی۔ دونوں کی بغاوت پُرخلوص تھی کہ وہ جذباتی نہیں عقلی اور منطقی تھی۔ سطحی اور فروعی نہیں، اساسی اور بنیادی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم بیگ اور عصمت تاحیات اپنے اپنے موقف پر کوہِ گراں کی طرح ثابت قدم رہے ـــــ پھر نظریاتی سطح سے ہٹ کر ذاتی سطح پر بھی عصمت اور عظیم بیگ کو ایک دوسرے سے جو گہری قربت رہی وہ انھیں اور کسی بھائی، بہن سے نہ تھی۔ اس خاکے کا محاسبہ کرتے ہوئے اسے صحیح تناظر میں دیکھنے کے لئے، اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

اوپندر ناتھ اشک "دوزخی" کے حوالے سے عصمت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یادداشت کے فن میں اگر میں کسی کو اُستاد مانتا ہوں تو عصمت کو۔ طنز میں نشتر کی سی تیزی اور اس کے باوجود کردار کے لئے قاری کے دل میں دردمندی کو اُبھار دینے کا فن میں نے عصمت سے سیکھا ہے۔"[1]

اشک عصمت کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اشک کا بڑپن ہے کہ انھوں نے خاکہ نگاری میں عصمت کی برگزیدگی کو یوں کھلے طور پر تسلیم کیا ہے۔

منٹو نے "دوزخی" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "تاج شاہجہاں کی محبت کا برہنہ مرمریں اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن "دوزخی" عصمت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے۔ وہ جنت جو اس مضمون میں آباد ہے، عنوان اُس کا اشتہار نہیں دیتا۔"[2]

تاج محل شاہجہاں کی محبت کا کھلا اعلان ہے۔ بیجان، بھُنڈا اور برہنہ۔ جبکہ "دوزخی" میں عصمت کی محبت کے نرم و نازک جذبات کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ عظیم بیگ کی شخصیت اور فن کا کوئی پہلو نہیں جو اچھوتا رہا ہو۔ اور عصمت نے جس پہلو کو بھی چھُوا، کبھی اشارے کنائے سے تو کبھی اونچے سُروں میں، کبھی خوش دلی سے تو کبھی رنج و غم میں ڈوب کر، کبھی شہد آگیں انداز میں تو کبھی جھلّا کر، بھنّا کر تلخ و ترش انداز میں،

---

[1] اوپندر ناتھ اشک "عصمت چغتائی۔ دوزخی کی باتیں" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۹۲ء۔ ص ۷

[2] سعادت حسن منٹو۔ "عصمت چغتائی" (خاکہ) اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۵۹

مگر ہمیشہ اپنائیت اور انسیت کے جذبات میں ملفوف پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کے الفاظ میں اس میں "ایک جنت آباد ہے"۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس زندگی سے بھرپور جائزے میں ایک بہن کا دردمند اور گداز دل دھڑکتا معلوم ہوتا ہے۔ جذبات کے مدّوجزر کے باوصف محبت کی ایک باریک مگر مضبوط سی ڈوری اس میں شروع سے آخر تک کسی کسی تنی تنی ملتی ہے۔ انسانی نقطۂ نگاہ سے یہ بہت بڑی چیز ہے۔

جب منٹو کی بہن اقبال بیگم نے "دوزخی" پڑھنے کے بعد ان سے کہا:

"سعادت، یہ عصمت کیسی بیہودہ عورت ہے کہ اپنے مُوئے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا۔ کمبخت نے کیسی کیسی فضول باتیں لکھی ہیں۔"

تو منٹو نے کہا تھا: "اقبال اگر تم مجھ پر ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو میں ابھی مرنے کے لئے تیار ہوں۔"[1]

اس سے بڑا خراجِ تحسین کوئی فنکار اپنے ہم عصر کو نہیں دے سکتا۔ عصمت کے بارے میں "دوزخی" کے تعلق سے منٹو جیسے خودسر اور خودپسند ادیب کے قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ "دوزخی"، اردو ادب میں اب تک لکھے گئے تمام خاکوں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1] سعادت حسن منٹو، "عصمت چغتائی" (خاکہ) اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۵۹

یہاں سے وہاں تک

"یہاں سے وہاں تک" عصمت کا سفرنامۂ پاکستان ہے۔ ۱۹۴۷ء میں مُلک تقسیم ہُوا تو ہزاروں لاکھوں گھروں کی طرح اُن کا خاندان بھی بٹ گیا۔ کچھ لوگ نوزائیدہ پاکستان ہجرت کر گئے تو کچھ اپنے آبائی مُلک ہندستان میں ہی رہے۔ عصمت کے جو اعزا و اقربا پاکستان چلے گئے ان میں ان کے بھائی، بہن اور ان کے بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں سبھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ پاکستان میں ان کے ہزاروں دوست احباب، ادبا، شعرا اور فن کے پرستار بھی تھے۔ ناشرین بھی تھے جن سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ پھر ان کے شوہر شاہد لطیف کا پُورا خاندان پاکستان میں تھا۔ اس طرح گو عصمت ہندوستان میں رہیں مگر ملک کے بٹوارے کے ساتھ اُن کا بہت کچھ پاکستان چلا گیا تھا ——— اٹھائیس ۲۸ سال کے طویل عرصہ تک وہ پاکستان نہ جا پائیں۔ ماہ ستمبر ۱۹۷۶ء میں انھیں وہاں جانے کا موقع ملا تو وہاں اُن کا بہت تپاک اور گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ لوگوں نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور ان کی تعظیم و تکریم اور خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ دو ماہ کے قیام کے بعد وہ وہاں کی خوشگوار یادیں لئے بھاری دل کے ساتھ ہندوستان لَوٹ آئیں۔ یہ اُن کا پاکستان کا پہلا اور آخری سفر تھا اور یہ رپورتاژ اسی سے متعلق ہے۔

ماہ ستمبر ۱۹۷۶ء میں عصمت کا ہَوائی جہاز بمبئی سے پرواز کر کے ایک گھنٹہ چالیس منٹ میں کراچی پہنچ گیا۔ ہزاروں میل کا فاصلہ جو عصمت کو اپنے اعزا و اقارب سے اٹھائیس برسوں سے جُدا کئے ہُوئے تھا، پلک جھپکتے طے ہو گیا۔ اُنھوں نے ہَوائی جہاز کی سیڑھی سے نیچے قدم رکھا تو پاکستان کی سرزمین نے انھیں فرطِ مسرت سے اپنی بانہوں میں بھر لیا ——— لاؤنج کے دروازے پر مدحت سعید، عصمت کے چہیتے بھائی مرحوم عظیم بیگ چغتائی کی بیٹی اُن کے خیر مقدم کے لئے کھڑی تھی۔ عصمت اُسے پندرہ سال کی مدّتِ مدید کے بعد مل رہی تھیں۔ اس عرصے میں مدحت بہت بدل گئی تھی مگر عصمت کو اُسے

پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ دونوں ملیں اور اُن کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔

عصمت بطور ایک چوٹی کی ادیبہ کے ہندوستان میں جس قدر مقبول تھیں پاکستان میں بھی اُتنی ہی معروف تھیں۔ ادب کے پرستار اُن سے بالمشافہ بھلے ہی نہ ملے ہوں مگر ان کی شکل وصورت اور خدوخال اُن کے قلب و ذہن پر ضرور مرتسم تھے ــــــ کسٹم کاؤنٹر پر ایک صاحب نے اُن سے پاسپورٹ اور ویزا مانگا، نام پڑھا، انھیں بڑے غور سے دیکھا، اپنے پاس بیٹھے صاحب سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا، اور بولے۔

"آپ عصمت چغتائی ہیں؟"

"پاسپورٹ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"خوش آمدید!" اُس نے مُسکرا کر کہا۔

عصمت باہر نکلیں تو اپنے عزیزوں نے، جن میں ان کے بھائی، بھاوج، بھانجے، بھتیجے، نواسے اور پوتے شامل تھے، لوٹ کر ملیں۔ عصمت، مدحت (عظیم بیگ کی بیٹی) کے گھر پہنچیں تو انھوں نے وہاں بھی کئی بچھڑے ہوئے رشتہ داروں کو چشم براہ پایا ــــــ انھیں یوں لگا جیسے کوئی سُہانا سپنا دیکھ رہی ہوں اور ساتھ ہی یہ احساس بھی جاگا کہ وقت اپنی روایتی برق رفتاری سے پرواز کرتا ہُوا گزر جائے گا، وہ واپس ہندوستان میں ہوں گیں اور اُن کے درمیان ناقابلِ عبور فاصلے پھر سے حائل ہو جائیں گے۔ گویا ــ تھا وصل میں بھی ہجر کا کھٹکا لگا ہُوا ــــــ آپس میں باتیں ہو رہی تھیں کہ خدیجہ زاہد عمر کی ہمشیرہ، کا فون آیا کہ اس کی بیٹی زیبا کے ہاں دعوت ہے اگر وہ تھکی ہُوئی نہ ہوں تو تشریف لے آئیں، فیض احمد فیض بھی آ رہے ہیں ــــــ عصمت فیض کا نام سُن کر اُچھل پڑیں اور چشم زدن میں اُن کی تھکن کافور ہو گئی کہ فیض سے اُن کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ فیض جب بمبئی تشریف لائے تھے، تو انھوں نے عصمت کے ہاں ہی قیام کیا تھا۔ پُرانی یادیں آنکھیں ملتی ہُوئی بیدار ہو گئیں ــــــ وہ پہنچیں تو دونوں بچّوں کی طرح لپٹ گئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر اظہارِ مُسرّت کیا اور کہا "ہندوستان اور پاکستان گلے مل رہے ہیں"۔ یہ ایک طرح سے ان دونوں کی ادبی بلند قامتی کا واضح اعتراف تھا۔

محفل جمی۔ فیض سگریٹ پر سگریٹ پھُونکتے رہے اور اپنے اشعار سُناتے رہے اور سب ہمہ تن گوش سُنتے رہے ــــــ فیض بیچ بیچ میں پُوچھتے جاتے۔ "کرشن کیسے ہیں؟ سردار کیا کر رہے ہیں؟ بیدی نے کوئی نئی فلم بنائی؟ کیفی کا کیا حال ہے؟ ساحر پاکستان کیوں نہیں آتے؟ ــــــ عصمت بولیں۔ "دروازوں سے ہم لگے کھڑے ہیں۔ ذرا کُنڈی تو کھولئے"۔ ــــــ فیض بولے۔ "ہاں

روزن و دَر کھلنا چاہئیں"ـــــ یہ اُن پابندیوں کی طرف اشارہ تھا جو اربابِ بست وکُشاد نے دونوں ملکوں کے باشندوں کی دوطرفہ آمدورفت پر عائد کر رکھی تھیں۔

یہ تمام نامور شاعر اور ادیب، جنھیں فیضؔ نے یاد کیا نہ صرف ان کے ہمعصر تھے بلکہ ہمدم و ہم نشین بھی، ہم نوالہ و ہم پیالہ بھی۔ وہ سب برِصغیر میں اُردو شاعری اور ادب کی آبرو تھے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور ساحرؔ لدھیانوی رُخصت ہو گئے ـــــ اور پھر نہ فیضؔ رہے نہ عصمت ـــــ رہے نام اللہ کا ـــــ محفل رات کے دو بجے ختم ہوئی۔

صبح دس بجے ہی عصمت سے ملنے چار پانچ آدمی آئے۔ ابھی وہ بیٹھے بھی نہ تھے کہ چار پانچ اور آ گئے، اور پھر تو آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ معلوم ہوا کہ اُن اصحاب نے جو ہوائی اڈّے پر، کسٹم کاؤنٹر پر بیٹھے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے، عصمت کی آمد کی اطلاع لوگوں کو ٹیلیفون پر دے دی تھی اور اخبارات میں خبر جلی سرخیوں میں شائع ہو گئی تھی ـــــ نتیجہ یہ کہ دعوت ناموں کی بارش سی ہونے لگی۔ رسائل کے ایڈیٹر اور نامہ نگار انٹرویو کے لئے آنے لگے۔ برسوں کے صبر کے پیمانے چھلک پڑے۔

○ ادب کے دیوانوں اور پروانوں نے جو سوال عصمت سے ہر جگہ بار بار پوچھا وہ تھا "کرشن چندر کیسے ہیں؟" دھیان رہے کہ کرشن چندر ان دنوں بیمار تھے۔ پاکستان میں کرشن چندر کے پرستار ہندوستان سے کم نہ تھے۔ وہ پاکستان کی ادبی زندگی کی جان تھے۔ پاکستان سے، خاص طور پر لاہور سے کرشن چندر کو عشق تھا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں پاکستان جانے کے لئے بہت مضطرب رہے۔ لیکن نامساعد حالات کے سبب اُن کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہُوا۔ اگر وہ جا پاتے تو لوگ بلاشبہ اُنھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ـــــ خاص طور پر لاہور کے لئے اُن میں ایک عجیب سی تڑپ تھی جیسے ایک عاشق کو اپنے محبُوب سے ہوتی ہے۔ لاہور کرشن چندر کی جوانی دیوانی کا شہر تھا۔ اُن کا شباب لاہور کی حسن پرست فضا میں انگڑائی لے کر بیدار ہُوا تھا۔ لاہور نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے جوہر سے سنوارا تھا۔ لاہور میں اُن کے فن نے آنکھ کھولی اور پروان چڑھا۔ لاہور میں متعدد رسائل کے مُدیران تھے، جو ایک مُبتدی کرشن چندر کے لئے خضرِ راہ بنے۔ لاہور میں ان کے ناشر تھے جنھوں نے برِصغیر کے طول و عرض میں ان کے نام کی تشہیر کی۔ لاہور میں ان کے ہم فکر، ہم نظر، اور ہم مشرب احباب تھے، جن کے ساتھ اُنھوں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام گذارے ـــــ اور لاہور پاکستان کی ادبی زندگی کا مرکز و محور تھا ـــــ دمِ مرگ بھی، جب اُن کی سانس اُکھڑ چکی تھی، اُنھوں نے اپنی بیوی سلمیٰ صدّیقی سے، جو سرہانے بیٹھی تھیں، کہا، "اگر میرے بعد حالات پر قابو نہ پایا جا سکے تو پاکستان

چلی جانا۔ وہاں میرے بہت سے دوست ہیں۔ وہ لوگ سچ مچ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ تم وہاں اکیلی نہ رہو گی۔[1] ــــــــ ایسے میں کرشن چندر کی خیر و عافیت کی بابت ہر کسی کا پوچھنا چنداں حیران کن نہ تھا۔

ــــــــ پھر تو عصمت کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ جس ادبی مجلس میں شرکت کرتیں، سب سے پہلے کرشن چندر کی خیر و عافیت کی اطلاع حاضرین کو دیتیں ــــــــ اس بارے میں عصمت ایک بڑا البصیرت افروز اور فکر انگیز واقعہ بیان کرتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ کس حد تک اپنے محبوب فنکار کے دیوانے تھے۔

"ایک صاحب نہایت پریشان صورت ڈھول میں اٹے ہوئے آئے۔

"میں چودہ میل سے سائیکل پر آیا ہوں کئی گھنٹے سے گھر تلاش کر رہا ہوں۔"

"بیٹھیے کچھ ٹھنڈا منگواؤں"۔

"نہیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

وہ نہیں نہیں کرتے رہے مگر مدحت بھاگ کر شربتِ رُوح افزا لے آئی ــــ

ایک دم غٹاغٹ پی گئے ــــــــ "اور؟"

"پانی ہی منگوا دیجئے"۔ وہ کچھ نادم ہو کر بولے مگر مدحت لپک کر دوسرا گلاس بنا لائی ــــــــ وہ گم ُسم بیٹھے رہے پھر بولے "کرشن چندر کیسے ہیں؟" میں نے کرشن چندر کی بیماری، پھر رو بصحت ہونے کا حال سنایا۔ سنتے ہی ایکدم کھڑے ہو گئے۔ بولے "چلتا ہوں"۔ جُھک کر میرے پاؤں چُھو کر ہاتھ ماتھے سے لگایا۔ اور ایک سپاٹے میں باہر نکل گئے۔ ہم لوگ ہکا بکا ایک دوسرے کی صورت تکنے لگے۔ نام بھی تو پوچھنے کی مہلت نہ دی کہ کرشن کو بتاتی تمہارا کوئی دیوانہ تمہاری خیریت لے کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا۔ کون تھا، خدا جانے!"[2]

دوسری شخصیت جس کے بارے میں فن کے پرستار جاننے کے لئے بیقرار رہتے، وہ مشہور ناول نگار ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ قرۃ العین حیدر تھیں۔ عصمت نے ان کے نئے ناول کی اشاعت کی اطلاع سب مداحین کو دے دی۔

دھیان رہے کہ ہمارے نامور ادیبوں اور شاعروں سے پاکستانی عوام و خواص کا لگاؤ اس لئے ہے کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور اردو ادب وہاں کی تہذیب و تمدن کا جزو لاینفک ہے اور اسے پاکستان کے طول و عرض میں ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے اور اعلیٰ و ارفع ادب کو سر آنکھوں سے لگایا جاتا ہے۔ ہمارے

---

[1] سلمیٰ صدیقی "آخری باب"۔ "آدھے سفر کی پوری کہانی"۔ راجپال اینڈ سنز۔ دہلی۔ ص ۱۶۳

[2] عصمت چغتائی "یہاں سے وہاں تک"۔ مجموعہ "بڑی شرم کی بات"۔ روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۲۷

اُردو ادب کو وہ لوگ ایک طرح سے اپنے ہی ادب کا حصّہ سمجھتے ہیں۔ پھر ہمارے کئی چوٹی کے فنکاروں مثلاً کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک وغیرہ کی نمُو دونمو پاکستان میں ہی ہُوئی ـــــ عصمت کی رائے میں جب دوطرفہ آمدورفت کی راہیں مسدُود کر دی گئیں تو فن کے پرستاروں کا اپنے پسندیدہ شعرا اور ادبا کی بابت جاننے کا تجسّس بھی بڑھا۔ دُوری نے اُن کی آتشِ شوق کو ہُوا دی اور سرکاری پروپیگنڈے دھرے رہ گئے۔

○ عصمت تذبذب میں تھیں کہ اپنے مرحوم شوہر شاہد لطیف کے اعزا کو اپنی آمد کی اطلاع دیں یا نہ۔ شاہد لطیف چلے گئے تو ایک طرح سے ان کے رشتہ داروں سے اُن کا رشتہ ناتا ٹُوٹ سا گیا تھا۔ پھر وہ ہندوستان میں تھیں اور وہ سب پاکستان میں۔ دل نے کہا کہ ان سے رابطہ قائم کرنا ہی قرینِ مصلحت ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے گھنٹوں کی جستجو کے بعد اُن کے ٹیلی فون نمبر ڈھونڈھ نکالے اور شاہد لطیف کے بڑے بھائی کے داماد اور بھتیجے کو فون کیا۔ دونوں آئے۔ شاہد لطیف کے بھائی عظمت اللہ خان بھی آئے اور سب بڑے تپاک، گرمجوشی اور خلوص سے ملے۔ اُنھوں نے عصمت کی بڑی پُر تکلف ڈھنگ سے خاطر مدارات کی اور ان کی اُنسیت اور اپنائیت نے عصمت کو بہت متاثر کیا۔

○ مدحت اور خالد لطیف نے عصمت کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لیا۔ اُن کا ہر پروگرام وہی مُرتّب کرتے۔ ٹیلی فون پر دعوتوں کا تانتا لگا ہُوا تھا۔ اگر عصمت سب دعوتیں قبول کرتیں تو شاید اُنھیں چھ ماہ کا عرصہ درکار ہوتا۔ بہرحال اُنھوں نے احتیاطاً اپنا ویزا ایک ماہ کے لئے بڑھوا لیا ـــــ ہر میٹنگ میں کھانے پینے کا شغل رہتا اور ہر دعوت میٹنگ میں بدل جاتی اور سوالات کی بوچھار ہونے لگتی ـــــ سب سے مقدم سوال یہ تھا کہ کیا ہندوستان میں ترقی پسند ادب نے دَم توڑ دیا ہے؟

عصمت کہتیں کہ یہ فرسُودہ اور بوسیدہ سوال ہے۔ میں بیس برسوں سے سُن رہی ہوں کہ ترقی پسندی کا جنازہ اُٹھ گیا ہے۔ میں ہزاروں میل سے پہلی بار آپ کے ہاں آئی ہُوں اور آپ مجھے ترقی پسند بھی کہتے ہیں اور دیگر ترقی پسند ادیبوں کی خیروعافیت کی بابت بار بار مجھ سے استفسار بھی کرتے ہیں۔ پھر آج ترقی پسند ادب زندہ نہ ہوتا تو آپ شاید اتنی بڑی تعداد میں یہاں موجود نہ ہوتے۔

یہ سوال تکرار سے پُوچھا جاتا تھا کہ کیا اُردو زبان کو ہندوستان میں بالکل ختم کر دیا گیا ہے؟ کیا اُردو رسم الخط مِٹ رہا ہے؟ ـــــ عصمت صُورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہتیں کہ اُردو رسم الخط کو ہندوستان میں زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ اُردو اکادمیوں کو وُسعت دی جا رہی ہے اور وہ زبان کی توسیع اور ترویج کا کام بڑی لگن اور جانفشانی سے کر رہی ہیں۔ ادبا اور شعرا کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات اور اعزازات عطا کئے جا رہے ہیں۔ اُن کی تصنیفات کی اشاعت کے لئے حکومت مالی تعاون دیتی ہے۔ لائبریریوں کو عطیے دیئے جا رہے ہیں۔ ویسے اُردو زبان مُلک بھر میں کم و بیش سمجھی جاتی ہے۔ تمام فلمیں اُردو میں بنتی

ہیں۔ غزلوں اور قوالیوں کی محفلیں بیش از پیش پسند کی جاتی ہیں ۔ اگر سچ پوچھئے تو اُردو ہندوستان کی غیر سرکاری مادری زبان ہے۔۔۔ اب بھی ہندوستان میں پاکستان سے زیادہ آبادی اُردو سمجھتی اور بولتی ہے"۔

مگر یہ صورتِ حال کی صحیح تصویر معلوم نہیں ہوتی کہ اس میں لفاظی زیادہ اور حقیقت کم ہے —— حقیقت یہ ہے کہ اُردو کو سیاست دیمک کی طرح چاٹ گئی ہے اور وہ سرِراہ برہنہ سر کھڑی ووٹوں کی بھیک مانگ رہی ہے۔ جب تک اردو کو سیاست کے شکنجے سے چھٹکارہ نہیں ملتا وہ پڑی سسکتی رہے گی۔ —— دوسرے جب تک اُردو کے نام نہاد پاسبان اور نگہبان آنکھوں سے تعصب کی پٹی اُتار کر اسے عملاً دونوں قوموں کی زبان نہیں بناتے اُردو کی نجات ممکن نہیں۔ اور اس کی توسیع اور تبلیغ کے خواب شرمندۂ تعبیر رہیں گے۔ یہ ایک بڑی تلخ و ترش حقیقت ہے جسے آج وہ صدق دل سے تسلیم کرنے سے منکر ہیں۔

عصمت کو اس بات کی سخت شکایت رہی کہ اخبارات ان کے بیانات کو مسخ کر کے ایک مخصوص زاویۂ نگاہ سے آدھا ادھورا شائع کرتے ہیں۔ جب وہ ان سے وضاحت طلب کرتیں تو وہ بغلیں جھانکنے لگتے اور انہیں بائیں شائیں کرتے —— بعض لوگ ایسے بھی تھے جنھیں یہ سن کر دلی خوشی ہوتی تھی کہ ہندوستان میں اُردو انحطاط پذیر ہے کہ اس سے ان کی دانست میں پاکستان کے قیام کے جواز کو تقویت ملتی تھی —— مگر اکثریت اُن لوگوں کی تھی جو فی الواقع قلب و جگر سے اُردو کے بہی خواہ اور خیر اندیش تھے اور وہ کہیں بھی ہو، اُسے پھلتا پھولتا اور ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے کہ اُن کے اذہان سیاست کی آلائش سے مبرّا و منزّہ تھے۔

ہندوستان میں جو اُردو ادب معرضِ وُجود میں آتا ہے پاکستان اسے بہر طور حاصل کر کے اپنے ادب میں شامل کر لیتا ہے لیکن وہاں ہندی ادب کو اُردو میں منتقل کرنے کا احساس بیدار نہیں ہوا۔ شاید اس لئے کہ وہاں ہندی زبان پر قدرت رکھنے والے موجود نہیں، جو اس کام کا بیڑا اُٹھا سکیں —— ویسے پاکستانی شعرا کی نئی پود ہندی کے الفاظ بکثرت استعمال کر رہی ہے جس پر اُردو کے نستعلیق، ناک چڑھے، بے لچک پرستار اُنگلی اُٹھاتے ہیں —— جمیل الدین عالی اعلیٰ پائے کے ادیب اور شاعر ہیں، جو اپنے اشعار میں ہندی کے الفاظ بحُسن و خوبی سموتے ہیں۔ اس نے اُن کی شاعری کو ایک نئی وُسعت اور لطافت عطا کی ہے —— سرور بارہ بنکوی کی نظم "اُوم پد بھُو شانتی" ہندی میں ہے۔ اُنھوں نے نرم، نازک اور لطیف ہندی الفاظ چُن چُن کر استعمال کئے ہیں۔ مگر اکثر لوگ ان کے اس فعل کو پاکستان اور اُردو سے غدّاری کے مترادف گردانتے ہیں۔ اس پر عصمت آزردہ خاطر ہو کر لکھتی ہیں "جب خسرو نے فارسی میں ہندی کے الفاظ ٹانکے تو وہ کلاسیکی ادب بن گئے۔ اُن پر کسی نے فارسی کے ساتھ غدّاری کا الزام نہ لگایا"——

عصمت کے اس استدلال کا جواب نہیں۔ لیکن تعصّب عقلی اور منطقی نہیں ہوتا۔ وہ کورانہ تقلید کا قائل

ہوتا ہے۔

○ عصمت نے اپنے رپورتاژ میں پاکستانی معاشرے پر بڑی گہری اور فکر انگیز نظر ڈالی ہے۔ خواتین میں تعلیم کا ذوق و شوق روز بروز فروغ پر ہے۔ بُرقعہ پوش مائیں گھر کی چار دیواری میں محبوس ہیں جبکہ بیٹیاں کالجوں میں تعلیم پا رہی ہیں۔ زیادہ تر لڑکیاں ہوم سائنس کورس پر سائنس کورس کو ترجیح دیتی ہیں کہ وہ ڈاکٹر اور انجینئر بننے کی خواہاں ہیں۔ وُہ شادی کے بعد ملازمت اختیار کرکے خُود کفیل ہونا چاہتی ہیں ـــــ مگر کٹھ مُلّائی ذہنیت کے بعض کم فہم، تنگ نظر لوگ پڑھی لکھی، آزاد خیال لڑکیوں پر سرِ بازار رکیک جُملے کستے ہیں مگر وہ اپنی ڈگر پر رواں دواں مُڑکر نہیں دیکھتیں ـــــ تعلیم یافتہ بیدار مغز مرد اپنی بیویوں کو ملازمت کرتا دیکھ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ شوہروں کی آمدنی معقول ہو تو بھی بیویاں ملازمت کرنا پسند کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ پرائیویٹ طور پر ڈگریاں بھی حاصل کرتی جاتی ہیں اور اپنے گھر کا کام کاج اور بچّوں کی دیکھ بھال بھی خوش دلی اور خندہ پیشانی سے کرتی ہیں ـــــ ایک پسماندہ معاشرے کے لئے یہ بہت نیک فال ہے کہ جب خواتین برقعہ اُتار پھینک، گھر کی چار دیواری چھوڑ کر، باہر کی کھُلی فضا میں نکل آئیں گی تو ان پر ترقّی اور فروغ کی راہیں از خود کھُلتی چلی جائیں گی۔ اور جلد ہی وُہ وقت آجائے گا کہ وُہ دُوسرے ترقی یافتہ ممالک کی خواتین کی صف میں کھڑی ہوں گی۔

○ "ینگ رائٹرز" کی میٹنگ بڑی دلچسپ رہی۔ غالب لائبریری کا ہال کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ کچھ لوگ احاطے کے اُس پار فٹ پاتھ پر بھی کھڑے تھے۔ نوجوان ادیبوں نے مقالے پڑھے۔ عصمت کی باری آئی تو بجلی فیل ہوگئی اور وُہ اندھیرے میں ہی اٹکل سے آٹوگراف بُک پر دستخط کرتی رہیں ـــــ کیونکہ حاضرین میں اکثریت نوجوانوں کی تھی وُہ ان کی نبض پہچان کر بڑی بے تکلّفی اور گرمجوشی سے بولیں۔ سب سے پہلے انھوں نے انھیں ہندوستان کے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور عوام کی جانب سے پاکستان والوں کو نیک خواہشات اور خیر سگالی کا پیغام دیا جس پر دیر تک پُرجوش تالیوں سے ان کے جذبات کا خیر مقدم کیا گیا۔ عصمت نے دِلی تمنّا کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دروازے کھُل جائیں تو لتا منگیشکر اور مہدی حسن ڈوئٹ گائیں اور نور جہاں اور محمّد رفیع مِل کر گائیں تو ہندوستان اور پاکستان وجد میں آجائیں ـــــ ادیب اور شاعر سر جوڑ کر بیٹھیں۔ صُلح، آشتی اور امن کی کوئی راہ نکالیں۔ ادب کا تبادلہ کریں تو بات بنے۔ اُنھوں نے سردار جعفری کی نظم "صبحِ فردا" کا حوالہ بھی دیا اور مجمع فرطِ مسّرت سے جھُوم گیا ـــــ عصمت نے کہا: ـــــ "عوام کسی مُلک کے ہوں، گھُٹن سے عاجز آجاتے ہیں۔ ہم خواہ جسمانی طور پر کتنی دُور ہوں، دِلوں میں تو ایک دُوسرے کے لئے

عصمت بھول گئیں کہ جو ملک تیس سال کے قلیل عرصے میں برِصغیر کو تین بار جنگ کی بھٹی میں جھونک چکا ہو اس سے دلی مفاہمت اور مصالحت کی توقع کرنا عبث ہے۔ بے انتہا جگہ ہے[1]۔

○ انتیس ستمبر کو عصمت کو "پریس کلب" نے مدعو کیا۔ کلب کے صدر ہمدان امجد علی نے ایک مضمون پڑھا جس میں خود عصمت کی تحریروں پر حرف زنی کی گئی تھی۔ وہ کھسیانی صورت بنائے سُنتی رہیں ــــ اے پی پی کے مختار زرّیں نے بھی ایک بھڑکتا ہوا مضمون پڑھا" جس کا ہر جملہ چنگاری کی طرح چٹخنا رہا"، اور جس کی نرم گرم آنچ عصمت نے محسوس کی۔ چنانچہ عصمت لکھتی ہیں کہ "میں ہر شخص کو لپیٹ میں لے لیتی ہوں۔ پھر جب کوئی میرے اُوپر چھُری پھیرتا ہے تو مجھے بڑا سکون ملتا ہے، جیسے میرے گناہوں کی تلافی ہو رہی ہو[2]۔"

عصمت صاف گو تھیں اور اکثر دورانِ تقریر چاروں طرف چوٹیں کیئے جاتی تھیں۔ کئی دفعہ تقریر کے بہاؤ میں ناگفتنی باتیں بھی عمداً یا سہواً اُن کی نوکِ زبان پر آجاتی تھیں۔ وہ "سُننے" کی نہیں "سُنانے" کی عادی تھیں۔ لیکن ایک میزبان مُلک میں اُن کے لئے خاموش رہنا ہی قرینِ مصلحت تھا۔

○ شام کو عصمت کے اعزاز میں پاکستان کی "آرٹس کونسل" نے "اخبارِ خواتین" کے تعاون سے ایک استقبالیہ منعقد کیا۔ وہاں اُن کی مُلاقات مشہور سائنس دان سلیم الزماں صدیقی، رئیس امروہی اور حقی صاحب سے ہُوئی ــــــــ انجم اعظمی، محسن بھوپالی، حمایت علی شاعر اور انجم رومانی نے اپنا کلام سُنایا۔ عصمت اُن کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ "پاکستان کے نوجوان شعراء کے کلام میں بڑی جان ہے۔ وہ لوگ وقت سے وابستہ ہیں۔ زندگی سے قریب اور مسائل سے آشنا ہیں[3]۔"

درحقیقت ہر مُلک کی نئی پَود اپنے مسائل کو پُرانی نسل سے بہتر جانتی ہے اور وُہی ان کا حل تلاش کر سکتی ہے۔ زمانہ یوں برق رفتاری سے رواں دواں ہے کہ پُرانی نسل نظر و فکر کے اعتبار سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ نئے دَور کے نئے تقاضے ہیں جنھیں "پُرانے وقتوں کے لوگ" مُشکل سے سمجھ پاتے ہیں۔

○ اُسی روز پھر ریڈیو پاکستان کی "ورلڈ سروس" نے ایک مباحثہ ریکارڈ کیا جس میں ہاجرہ مسرُور، محمود شام، ابوالخیر کشفی اور نصراللہ خان "حُریت" کے کالم نویس نے شرکت کی۔ زندگی کا ہر پہلو زیرِ بحث آیا۔ ترقی پسند اور جدید ادب، ادب میں جمُود، نئے ادیبوں کی مُشکلات اور وُہ ماحول جس سے نیا ادب اُکتایا ہُوا ہے، سب کو کھنگال ڈالا گیا۔ مثال کے طور پر۔

"نئے ادیب کو پُرانے ادیب چھپنے کا موقع نہیں دیتے۔"

---

[1]، [2]، [3] عصمت چغتائی: "یہاں سے وہاں تک" ۔ (مجموعہ) "بڑی شرم کی بات"۔ روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۲۶-۲۷

"یہ غلط ہے کیونکہ ہر رسالہ میں اگر ایک کہانی پُرانے ادیب کی ہوتی ہے تو چار نئے ادیبوں کی ہوتی ہیں۔"

"پھر تو شاید وُہ نئے ادیبوں کی رہنمائی نہیں کرتے۔"

"کیسے رہنمائی کریں؟"

"ایسے کہ پہلی فرصت میں مرجائیں اور وصیت کر جائیں کہ اُن کے بعد ان کی ساری تحریریں جلا دی جائیں[1]۔" عصمت نے دبی زبان میں رائے دی۔

بات ہنسی میں ٹل گئی بحث کا حاصل یہ رہا کہ نئے ادیب شان سے منظر پر آرہے ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آج کوئی کہانی لکھے اور کل ادیب بن جائے کہ ادیب برسوں کی کاوش اور عرق ریزی کے بعد بنتے بنتے ہی بنتے ہیں۔ عصمت نے ہندوستان کی مثال پیش کی، جہاں کہا جاتا ہے کہ اُردو کی حق تلفی ہُوئی ہے، لیکن وہاں ادیبوں کی ایک کھیپ اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ قاضی عبدالستار، غیاث احمد گدی، رام لعل، جیلانی بانو، اقبال متین، واجدہ تبسم سب اس میں شامل ہیں۔ بلراج مینرا کا اپنا ایک مقام ہے۔ جوگندر پال جم گئے ہیں اور ابھی کئی اور ہیں جو زبان زدِ عام نہیں ہُوئے۔ اگر یہ ثابت قدمی اور استقلال سے پیش رفت کرتے رہے تو نئے ادیبوں کی ایک باڑھ کی باڑھ کھڑی ہو جائے گی۔

بادی النظر میں عصمت کی بات میں وزن دکھائی دیتا ہے کہ اس میں حقیقت کی چاشنی ہے مگر مُصنّف کی نظر میں شاید اُردو کے نئے فنکاروں کی یہ آخری کھیپ ہے کہ اُردو ادب کے سوتے اور سرچشمے سُوکھتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد گھپ اندھیرا ہے کہ حدِ نظر تک اُمید کی کرن دکھائی نہیں دیتی —— یہ قنوطیت نہیں" احوالِ واقعی" ہے۔

ہاجرہ مسرور نے سوال کیا کہ اگر ہندوستان میں اُردو نے دَم توڑ دیا تو پاکستان کس زبان میں رابطہ قائم رکھ سکے گا؟

عصمت نے جواب دیا کہ اگر پاکستان فی الواقع صدق دِلی سے اُردو کی فلاح و بہبود کا خواہاں ہے تو آگے بڑھے، راستہ کھُلا ہے۔ آیئے اور اُردو میں زندگی کی رُوح پھُونک دیجئے۔ ہمارے رسائل کو اپنا کر اپنی تخلیقات شائع کیجئے۔ ادیبوں اور فنکاروں کو انعامات اور اعزازات سے نوازیئے۔ اُردو کے ادیبوں کی تصنیفات شائع کیجئے اور انھیں رائیلٹی دیجئے۔ ہمارے جرائد کے لئے اپنے بند دروازے

---

[1] عصمت چغتائی "یہاں سے وہاں تک" (مجموعہ) "بڑی شرم کی بات" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۲۸

وا کیجئے اور اُردو کو اپنے لاکھوں کروڑوں قارئین دیجئے۔ ہر رسالہ سر سبز و شاداب ہو جائے گا اور اُردو واز جی اُٹھے گا ـــــ یہ بات قابلِ مذمّت ہے کہ دونوں ممالک کے ناشرین رائیلٹی ادا کئے بغیر غیر قانونی طور پر کھُلے بندوں کتابیں چھاپ رہے ہیں ـ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد ـــــ دونوں ممالک کے درمیان ناخوشگوار تعلّقات کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی تو ہم ایک دوسرے کی جانب پُر خلوص دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتے ہیں۔

خیالات نیک تھے لیکن ناقابلِ عمل ـــــ کسی کو کیا پڑی ہے کہ اُردو سے جذباتی لگاؤ کے سبب ہمارے ادیبوں، شاعروں اور رسالوں کو روزی روٹی کا ذریعہ مہیّا کرے۔ یہ توقع ہی عبث ہے ـ ایں خیال است و محال است و جنوں ـــــ پھر جب تک دونوں ممالک کے درمیان مغایرت اور مخاصمت کی دیوار حائل رہے گی اور وہ ایک دوسرے سے دست بہ گریبان رہیں گے۔ ادیبوں میں تعاون، بھائی چارہ اور خیر سگالی کی اُمید خوش فہمی نہیں خود فریبی ہے ـــــ دل کا میل اُترے تو بات بنے اور یہ گتھی بہت اونچی سطح پر ہی سُلجھ سکتی ہے، جس کی اُمید کی روشنی آج دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتی۔

○ اسی دن شام کو "انجمن ترقی پسند مصنفین" نے غالب لائبریری میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ طویل بحث و تمحیص اور سوال و جواب کا لبِ لباب اور نچوڑ یہ رہا کہ "ترقی پسند تحریک صدیوں سے زندہ ہے اور جب تک انسان زندہ ہے، جیتی رہے گی۔ انسان کے عروج کی کوئی حد مقرر نہیں۔ وُہ پاتا جائے گا اور زیادہ مانگتا جائے گا۔ آج جو روٹی کپڑے کے لئے شمشیر بکف ہے، کل سب کچھ پا کر مرّیخ کو فتح کرنے چڑھ دوڑے گا۔ تحریک میں ڈھیل آ سکتی ہے، وُہ بے دَم نہیں ہو سکتی۔"[1]

○ روز روز کی پُر تکلّف دعوتوں میں مرغن اور مجرّب کھانے کھاتی کھاتی عصمت اُوب گئیں اور ترکاری، ارہر کی دال اور پودینے کی چٹنی کو ترس گئیں ـــــ لیکن شیرمالوں، بہاری کبابوں اور بریانیوں نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔ حتّٰی کہ وہ دست بدُعا ہو گئیں کہ "کاش کوئی اللہ کا بندہ جَو کی روٹی، لہسن کی چٹنی اور پیاز کی ڈلی رکھ کر کھلا دیتا" ـــــ شاید یہی وہ "دعوتِ شیراز" تھی جس کے لئے شیخ سعدی بھی ترس گئے تھے۔

○ چوتھی اکتوبر کو "علی گڈھ اولڈ گرلز ایسوسی ایشن" نے عصمت کے اعزاز میں عصرانہ دیا ـــــ یہ میٹنگ بڑی دِل خوش کُن اور دِل چسپ رہی۔ بڑی دیر تک تو وہ سب ایک دوسرے کو پہچان پہچان کر گلے ملتی رہیں۔ سب بھولی بسری پارینہ یادیں تازہ ہو گئیں۔ اُنھوں نے آلہ بی کے پیار محبّت اور پاپا میاں

---

[1] عصمت چغتائی: "یہاں سے وہاں تک" (مجموعہ) "بڑی شرم کی بات"۔ روہتاس بُکس۔ لاہور۔ ص ۳۰

کی شفقت کو یاد کیا، جن کی برسہابرس کی شبانہ روز کاوش اور پُرخلوص لگن سے علی گڈھ کالج وُجود میں آیا تھا۔ (ان قابلِ احترام شخصیتوں کا ذکر جذبۂ ممنونیت اور تشکر سے مغلوب ہو کر عصمت نے اپنے مضمون "کاغذی ہے پیرہن" میں بڑی تفصیل سے کیا ہے) ـــــ دُور دُور کی لڑکیاں گھُل مل کر ایک دوسرے کے قریب آگئیں۔ وہ "لڑکیاں" جنھیں عصمت نے علی گڈھ میں تیس بتیس برس پہلے دیکھا تھا اتنی بدل چکی تھیں کہ وُہ انھیں پہیلیوں کی طرح بوُجھ رہی تھیں ـــــ ان لڑکیوں نے جو پاکستان میں پیدا ہوئی تھیں اور جنھوں نے اپنی ماؤں کے محض قصّے ہی سُن رکھے تھے، علی گڈھ سے گہرا رشتہ محسوس کرتی تھیں، وہ آج اپنی ماؤں کی شوخیوں اور شرارتوں کا ذکر سُن کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ انھیں یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ بُزرگ ذمّہ دار خواتین جو ہر کس و ناکس کو پند و نصائح کرتی رہتی ہیں انھیں بھی رات کو اُٹھ کر کالج سے سوتی لڑکیوں کو مونچھیں لگانے پر ڈانٹ پڑا کرتی تھی ـــــ اُنھوں نے علم و ادب پہ بحث سے پہلو تہی کرتے ہوئے ہنسی مذاق اور بھوہڑ قسم کی گپ بازی پر اکتفا کی اور کھُل کر بے فکری سے قہقہے لگائے۔ محفل برخاست ہوئی تو سب کے دِل بھاری ہو گئے اور آنکھیں بھیگ گئیں۔

○ اُنھوں نے چھ اکتوبر شام کو ایک اُبھرتی ہوئی ادیبہ سُلطانہ مہر کی کتاب "سیپیاں" کی رسمِ اجرا میں شرکت کی۔ حسبِ توقع وہاں بھی سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پاکستان کی نئی پوَد کے ذہن میں نہ جانے کتنے سوالات اُتھل پُتھل مچائے ہوُئے تھے۔ دُوری نے ہندوستان اور پاکستان کے پڑھے لکھے طبقوں میں ذہنی بعُد پیدا کر دیا تھا اور اُن کے درمیان ایک سنگین دیوار حائل کر دی تھی۔ پاکستان کا نوجوان طبقہ اپنے ادب کے مُستقبل کے بارے میں تشویش میں مُبتلا تھا۔ معیاری ادب اُس کی گذر بسر کا کفیل نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے جان و تن کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے اُنھیں ساتھ ہی کوئی اور کام بھی کرنا پڑتا تھا ـــــ گویا ایک طرح سے ان کے مسائل ہندوستان کے ادیبوں کے مسائل سے جُدا نہ تھے ـــــ پیٹ بھرے، مطمئن ناصح کہتے ہیں کہ ادیب کو اپنی تمام تر توجہ نخلِ ادب کی آبیاری پر مرکوز کرنی چاہیئے اور روپیہ کمانے کی فکر سے گریز کرنا چاہیئے۔ وہ اس اساسی مسئلے سے صرفِ نظر کرتے ہیں کہ ادیب کے بھی اللہ میاں نے ایک عدد پیٹ لگا دیا ہے جو دو وقت نانِ جویں کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس کے اہل و عیال کی بھی کچھ ضرُوریات ہوتی ہیں۔ ادیب فقط ہَوا پانی پر توجی نہیں سکتا پیٹ پر پتھر باندھ نہیں سکتا۔ زندگی کے تلخ و ترُش حقائق سے مُنہ موڑ نہیں سکتا۔ آج یہ حالت ہے کہ ادیب ضرُوریاتِ زندگی سے نپٹنے میں ہی خوُد کو بے دست و پا پاتا ہے اور مَن مار کر بیٹھ جاتا ہے۔

پاکستانی لڑکیاں شاعری، افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے میدان میں لمبے لمبے ڈگ بھرتی

پیش رفت کئے جا رہی ہیں اور ان کی تخلیقات کثرت سے ہر سال شائع ہوتی ہیں۔ یہ خیال بھی عام ہے کہ اکثر مرد عورتوں کے نام سے رومانی قسم کے ناول لکھ کر شائع کراتے ہیں، جو بآسانی بک جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ناول ادب کے اعتبار سے فروعی اور سطحی ہوتے ہیں اور ذہن پر دیرپا تاثر نہیں چھوڑتے۔

○ سات اکتوبر کو عصمت "نیشنل میوزیم" دیکھنے گئیں۔ وہاں "پروفیشنل ویمن" امریکی کونسلیٹ کی مسز مور کو استقبالیہ دے رہی تھیں۔ انھوں نے عصمت کو بھی اس تقریب میں شامل کر لیا اور وہ میوزیم دیکھنے سے محروم رہ گئیں ــــــ مسز مور نے اپنی تقریر میں بتایا کہ کس طرح امریکی خواتین امورِ خانہ داری سے وقت نکال کر سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لیتی ہیں اور ذمہ دار عہدوں پر فائز ہوتے ہوئے بھی ادبی مجالس میں شرکت کرتی ہیں۔ مزید برآں سیاست کے میدان میں بھی وہ مردوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہیں ــــــ عصمت نے مسز مور سے استفسار کیا کہ ہمارے ملک میں امریکی خواتین کی بابت یہ معلومات کیوں بہم نہیں پہنچائی جاتیں۔ ہمارے ہاں تو فقط آپ کی مخرب الاخلاق کتابیں اور رسائل اور مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں ہی آتی ہیں، جس سے امریکہ کی شبیہ مسخ ہوتی ہے ــــــ پھر آپ کی میگزینوں میں مردوں کو لبھانے رجھانے کے لئے فقط عورتوں کی ننگی تصویریں ہوتی ہیں۔ ہمارے عوام انھیں پڑھ کر ہی امریکی معاشرے کی بابت رائے قائم کرتے ہیں ــــــ پھر امریکہ ترقی پذیر ممالک کو بہت بڑے پیمانے پر اسلحہ برآمد کرتا ہے جس سے بین اقوامی تنازعات پیدا ہوتے ہیں ــــــ برسوں سے کوئی ایسی فلم نہیں دکھائی گئی جس میں امریکی گھریلو عورت کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ یا نسلی امتیاز کے پیچیدہ مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہو ــــــ مسز مور نے جواب دیا کہ "آپ ہماری امریکی لائبریری میں ایمبیسی آکر مطالعہ کیجئے" ــــــ عصمت نے بھرے اجلاس میں جو اہم مدعے اٹھائے تھے یہ یقیناً ان کا تسلی بخش جواب نہ تھا۔

لیکن عصمت رکی تھی نہیں۔ انھوں نے ان امور کو مزید کرید کر پوچھا تو مسز مور نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

> "ہم گندے ادب پر روک تھام نہیں لگا سکتے کہ وہ ایک بیوپار ہے اور بیوپار میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔ اس پر ہم امریکہ میں پابندی نہیں لگا سکتے کہ ہمارے ملک میں ہر شخص کو اپنے خیالات کے اظہار کی مکمل آزادی ہے۔"
>
> "اشتراکیت کے بارے میں بھی خیال کے اظہار کی اتنی ہی آزادی ہے۔"[1]

---

[1] عصمت چغتائی "یہاں سے وہاں تک" (مجموعہ) "بڑے شرم کی بات"۔ روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۳۴

مسز مور ہنسنے لگیں اور اُن سے جواب بن نہ پڑا۔

دھیان رہے کہ عصمت خود فلموں سے عمر بھر وابستہ رہی تھیں اور پھر وہ مُلک گیر شہرت کی ادیبہ بھی تھیں۔ اس لئے امریکی فلموں اور رسائل پر جو ہندوستان بھیجے جاتے تھے، وہ پُورے تیقن کے ساتھ بولنے کی صلاحیت رکھتی تھیں ـــــــ نہ صرف یہ وہ سکہ بند اشتراکی بھی تھیں اور امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کی کٹّر مخالف، بدیں وجہ ان کے آخری سوال میں بَلا کا طنز اور زہرناکی ہے جس نے مسز مور کو لاجواب کر دیا۔

○ آٹھ اکتوبر کو مُدیر "سب رنگ" شکیل عادل زادہ کے ہاں ڈنر تھا۔ کرشن چندر کے بھی شکیل عادل زادہ سے گہرے مراسم رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے تیسرے ہارٹ اٹیک کا حال اُنھیں بڑی تفصیل سے بڑے پُرخلوص انداز میں لکھا تھا جس کا ذکر مُصنّف نے اپنی تصنیف "کرشن چندر: شخصیت اور فن" میں کیا ہے۔ ـــــــ جمیل الدین عالی، جون ایلیا اور شان الحق حقی نے اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ عالی کے دوہے عصمت کو بہت پسند آئے۔ اُنھوں نے ہندی کے نرم و نازک الفاظ بڑی خوبصورتی سے اُردو میں سموئے تھے۔ عالی کے ہاں ترنم غضب کا تھا اور طرز انوکھا و نرالا ـــــــ حقی صاحب کے ہاں گہرائی اور لطافت کا بڑا حسین امتزاج تھا ـــــــ منیر نیازی کے کلام میں نئے پن کے باوصف اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا تھا ـــــــ عصمت کو اس بات کا اعتراف تھا کہ جدید شاعری اُن کے پلے نہیں پڑتی اور سر سے گذر جاتی ہے مگر پاکستانی کے علامتی شعرا اُنھیں اتنے مبہم نہ لگے۔

○ رات ذکیہ سرور کے ہاں ڈنر تھا۔ وہاں اُن کی ملاقات فیض احمد فیض اور زہرہ نگار سے ہوئی۔ زہرہ نگار نے فیض کی غزلیں ترنم سے سُنائیں۔ فیض کے اشعار، جن میں اُنھوں نے جذبات کو رنگوں سے تشبیہ دی تھی، اور زہرہ نگار کی میٹھی اور رَس بھری آواز نے سماں باندھ دیا ـــــــ زہرہ پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہے۔ تیز طرار اور زندگی سے بھرپُور اور شاعری سے بڑا لگاؤ رکھتی ہے ـــــــ وہاں کئی نوجوان پاکستان کا قومی لباس یعنی ہم رنگ شلوار قمیض پہنے تھے۔ یوپی کے لوگ کبھی شلوار قمیض پر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے مگر اب وہ بھی اس لباس سے مانوس ہوگئے ہیں ـــــــ یہ بات عصمت کی فکر و فہم سے بعید ہی رہی کہ یوپی، بہار اور دُوسرے صوبوں کے لوگ اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود اب بھی "مہاجر" کیوں کہلاتے ہیں اور اکثر لوگ انھیں طنز و تضحیک سے "تیتر" اور "مکڑی"، یعنی مٹڈی کیوں کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پاکستانی معاشرہ انھیں اپنے اندر جذب کرنے سے قاصر رہا ہے۔

○ دس تاریخ کو رُخسانہ سہام مرزا مُدیر "دوشیزہ" اور ان کے عملہ کے ساتھ عصمت چوکھنڈی، بھنبھور اور مائلی ہل گئیں۔ چوکھنڈی میں اُنھوں نے زمانۂ قدیم کی قبریں دیکھیں، ان پر اس قدر خوبصورت

اور نازک کام کیا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سُنار نے پتھر پگھلا کر سانچوں میں ڈھال دیا ہے"۔ لوحوں پر عربی رسم الخط میں کچھ تحریر تھا جو ان سب کی سمجھ سے بعید تھا ـــــ وہاں نہ کوئی چار دیواری تھی اور نہ دروازہ، نہ چوکیدار اور نہ گائیڈ۔ ببول اور تھوہڑ کے درخت اُداس اُداس کھڑے پہرہ دے رہے تھے ـــــ نشاندہی کے لئے مُردوں کی قبروں پر تلوار اور ڈھال بنی تھی اور عورتوں کی قبروں پر زیوروں کی نقاشی کی گئی تھی۔ زیور وُہی تھے جو ہندوستان میں عام مروّج ہیں۔ مثلاً جُھمکے، چندن ہار، گلو بند، کنگن اور چوڑیاں۔ نہ جانے کیسے کیسے لوگ زیرِ زمین پڑے سو رہے تھے ــ خاک میں کیا صُورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔

میلوں چلنے کے بعد اُنھیں ایک بوسیدہ سی کاٹیج ملی، جس کے فرش پر دو گدّے پڑے تھے۔ وہ سب تھکن سے چُور اور بھوک سے نڈھال ہو رہے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے وہیں ڈیرہ ڈال دیا۔ رخسانہ نے گرمے کاٹ کاٹ کر ڈھیر لگا دیا۔ گلاوٹ کے کباب اور شیرمال پر سب ٹُوٹ پڑے۔ ان کبابوں کے سامنے انھیں مُرغی بھی ہیچ لگی۔ گرمے بہت میٹھے اور رَسدار تھے۔

○ شام کو ہاجرہ مسرور کی بیٹی کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ خدیجہ مستوُر بھی لاہور سے شادی میں شمولیت کے لئے آئی ہوئی تھی۔ ان دونوں بہنوں نے پاکستانی ادب کو بہت نکھارا سنوارا اور اُبھارا ہے۔ اور وہ وہاں بہت مقبوُل اور ہر دلعزیز ہیں۔ مشہوُر شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی بھی، جو مرحوم سعادت حسن منٹو کے یارِ غار تھے، وہاں موجود تھے۔ کئی لوگوں نے اس موقع پر ادبی مباحث کو گھسیٹنے کی کوشش کی مگر شادی بیاہ کے ماحول میں ان کی دال نہ گلی۔

○ کراچی میں رات کو عید کے موقع پر سہام مرزا اور رُخسانہ اُنھیں شہر کی روشنیاں دکھانے لے گئے۔ تمام شہر بقعۂ نوُر بنا ہوا تھا۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ ہر طرف لوگ خرید و فروخت میں مدہوش تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر بھر کی موٹریں سڑکوں پر آ گئی ہیں۔ عصمت کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کی کتابیں بڑے اطمینان سے بک رہی ہیں۔ افسانہ کے چار پانچ نئے مجموعے چھپ گئے ہیں۔ حیران کُن بات یہ رہی کہ انھیں اپنی کچھ وہ کہانیاں بھی مل گئیں جو ان کی دانست میں گُم ہو چکی تھیں۔ انھیں اُس زمانے کی کہانیاں بھی مل گئیں جب دونوں ممالک کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ پوُچھ تاچھ سے پتہ چلا کہ رسالے اور کتابیں ہندوستان سے پہلے ولایت جاتی ہیں اور وہاں سے پاکستان پہنچ جاتی ہیں ـــــ انسان میں ادب کی چاہ بے پناہ ہے کہ یہ قلب و جگر کے لئے وجہِ تسکین ہے۔

افسانوں

○ عصمت کی آپا، جو اُن کی سب سے بڑی بہن تھیں، اور جنھوں نے انھیں ماں کی طرح پالا پوسا تھا، کم سنی میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں۔ اُنھوں نے اپنے تین بچّوں کو بڑے ناسازگار حالات میں لشتم پشتم پالا اور پڑھایا تھا۔ جب ان کی شادیاں ہوگئیں تو مُلک کا بٹوارہ ہوگیا۔ آپا کا ایک بیٹا ڈاکٹر مجیب علی گڈھ کالج میں تھا اور دُوسرا بیٹا کرنل حبیب پاکستانی فوج میں۔ لڑکی بھی پاکستان میں تھی۔ آپا اٹھائیس سال دیوانوں کی طرح ہندوستان اور پاکستان کے درمیان چکّر کاٹتی رہیں مگر اُنھیں سکونِ قلب نصیب نہ ہُوا۔ وہ دَر دَر کی خاک چھان کر ویزا حاصل کرتیں اور جس بیٹے کی یاد ستاتی گرتی پڑتی اس کے پاس پہنچ جاتیں۔ بیاسی سال کی عمر میں وہ مشتِ استخوان ہو کر رہ گئی تھیں ـــــــ ڈاکٹر مجیب کو دل کا دورہ پڑا اور سال بھر کی علالت کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ دوسرے بیٹے حبیب کو بھی دل کا دورہ پڑا۔ اور شومیٔ قسمت دیکھیے کہ داماد کو بھی دل کا عارضہ لاحق ہوگیا ـــــــ کہنے کا حاصل یہ کہ بٹوارے نے برِصغیر میں نہ جانے کتنے گھروں کو اُجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ آپا کی دِلدوز کہانی لاکھوں کروڑوں گھروں کی کہانی ہے۔ قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ آپا نے بے یار و مددگار ہوتے ہوئے بھی نامساعد حالات کے تھپیڑوں کا بڑی ثابت قدمی، پامردی اور بے جگری سے مُقابلہ کیا۔ عصمت نے خوب لکھا ہے۔

"جب وُہ کُھلی جاتی ہیں تو سر نہیں جھکاتیں۔ جدِامجد چنگیز خان کی طرح ننگی تلوار کی طرح تن جاتی ہیں اور اُن کی زبان سے زہر ٹپکنے لگتا ہے۔ وہ زہر ان صفحوں پر نچوڑ دُوں تو وُہ بھڑک اُٹھیں اور نہ جانے کیا کچھ خاکستر ہوجائے"[1] ـــــــ وطنِ عزیز کی تقسیم کے ذمّہ دار لوگ ایک ایسے گھناؤنے فعل کے مُرتکب ہوئے ہیں جس کے لئے تواریخ انھیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

○ عصمت کو لاہور سے محمّد طفیل کا فون آیا کہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیج رہے ہیں، چلی آئیے ـــــــ یہی وہ ہمارے سب کے جانے پہچانے محمّد طفیل تھے جو ماہنامہ "نقوش" لاہور کے مالک اور مُدیر تھے اور جن کا برِصغیر کے ناشرین میں بڑا نام تھا۔ سعادت حسن منٹو سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے، اور کرشن چندر سے بھی۔ ادیبوں کے آڑے وقت میں ہمیشہ کام آتے تھے اور بازُوئے برادر بن جاتے تھے۔ جب کراچی کی عدالت میں منٹو پر ان کے افسانے "اُوپر، نیچے اور درمیان" کے سلسلہ میں مقدمہ چلا تو وہ تہی دست تھے۔ محمّد طفیل ہی نے اُنھیں کراچی کا ریل ٹکٹ لے کر دیا اور منٹو کے دوست نصیر انور کو احتیاطاً ان کے ہمراہ بھیج دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لااُبالی منٹو کراچی پہنچ کر عدالت

محمد طفیل
محمد طفیل
محمد طفیل

---

[1] عصمت چغتائی "یہاں سے وہاں تک" (مجموعہ) "بڑی شرم کی بات"۔ روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص۔ ۴۰

ہیں حاضر ہی نہ ہوں۔ منٹو زادِ راہ کے طور پر دو درجن بیر کی بوتلیں ساتھ لیتے گئے ـــــ کرشن چندر سے بھی محمد طفیل کے ناشرانہ نہیں دوستانہ تعلقات تھے۔ محمد طفیل ہندوستان آئے تو کرشن چندر نے انھیں کھانے پر مدعو کیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ہندو پھیکی میٹھی دال ترکاری کے سوا اور کیا کھلائے گا۔ مگر جب انھوں نے کرشن چندر کے دسترخوان کی گوناگونی اور رنگارنگی دیکھی تو دنگ رہ گئے ـــــ عصمت لاہور پہنچ گئیں۔

ہوائی اڈّے پر نہ جانے کس حیلے بہانے اور جتن سے مرحوم منٹو کی اہلیہ صفیہ بیگم اپنی نواسی کا ہاتھ تھامے ہوائی جہاز تک آن پہنچیں۔ دونوں ایک دوسرے سے والہانہ انداز میں لپٹ گئیں اور فرطِ مسرت سے چھلک پڑیں ـــــ نہ جانے کیوں عصمت کا منٹو پر خاکہ جو انھوں نے منٹو کی موت کے بعد لکھا تھا لامحالہ اپنی تمام تر شدت کے ساتھ ذہن میں ابھر کر جھنجھوڑ دیتا ہے۔ اس خاکے کا اختتامیہ حصّہ صفیہ بیگم کو مخاطب کر کے جس درد مندی اور دلسوزی سے لکھا گیا ہے، اس کی مثال کم ہی ملے گی۔

باہر جو لڑکیاں عصمت کے خیر مقدم کے لئے کھڑی تھیں ان میں سے وہ آمنہ اور خدیجہ مستور کو ہی پہچان پائیں، جو علی سردار جعفری کی بہنیں تھیں اور گاہے گاہے بمبئی آتی رہتی تھیں۔ باقی لڑکیوں کی شکل و صورت اُن کے ذہن سے اُتر چکی تھی۔

دُوسرے دن عصمت، عزیز الحسن کے ہمراہ شاہ نور اسٹوڈیو گئیں۔ مشہور فلم ڈائریکٹر اور اسٹوڈیو کے مالک شوکت حسین نے انھیں اسٹوڈیو دکھایا۔ وہ اس کی آرائش و زیبائش دیکھ کر بہت متاثر ہوئیں۔ یہ شوکت حسین وہی تھے جو سعادت حسن منٹو کے عزیز دوست تھے اور جن کا ذکر انھوں نے ملکۂ ترنم نورجہاں کے خاکے میں بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے ـــــ شوکت حسین نے پاکستان جا کر "دوست"، "زینت" اور "جگنو" جیسی کامیاب فلمیں بنائیں لیکن وہاں انھیں وہ داد و دہش نہ ملی جو ہندوستان میں ان کا مقدر ٹھہری تھی ـــــ شوکت حسین نے انھیں بتایا کہ پاکستان میں فلم انڈسٹری نے زیادہ ترقی نہیں کی کیونکہ سارے ملک میں کُل ملا کر صرف آٹھ ساڑھے آٹھ سو سینما گھر ہیں۔ اس لئے پروڈیوسر کو اپنا سرمایہ نکالنا دشوار ہو جاتا ہے ـــــ ہندوستانی فلموں کی درآمد پاکستان میں اس لئے بند کی گئی تھی تاکہ پاکستانی فلموں کو فروغ ملے، لیکن یہ مقصد تشنۂ تکمیل رہا کہ جب پاکستانی انڈسٹری کو مقابلہ کا سامنا نہ کرنا پڑا تو پروڈیوسر سہل انگار اور تساہل پسند ہو گئے۔ نتیجہ یہ کہ اُن کی فلموں کا معیار پست ہو گیا ـــــ ابتداءً ٹیلی ویژن کی آمد پر فلم انڈسٹری پر بہت ناموافق اثر پڑا کہ لوگ ٹیلی ویژن سے چپکے بیٹھے رہتے۔ مگر آہستہ آہستہ صورتِ حال میں نمایاں سُدھار ہوا کہ مُلک کے بہت بڑے طبقے کی ٹیلی ویژن تک رسائی نہیں تھی ـــــ عصمت نے شوکت حسین کو بڑا سنجیدہ، متین، باذوق اور باشعور انسان پایا۔ وہ اب بھی ہندوستان کے دوست احباب کو پُرخلوص

طور پر یاد کرتے ہیں۔

○ رات کو محمد طفیل نے ڈنر دیا۔ وہاں عصمت کی ملاقات عبادت بریلوی، وقار عظیم، خدیجہ مستور، عبدالرحیم صاحب اور حجاب امتیاز علی سے ہوئی ـــــ عبدالرحیم صاحب نے انھیں بیش بہا اور نادر تحائف دیئے۔ انھوں نے مرقعِ چغتائی غالب، مرقعِ چغتائی اقبال اور چغتائی پینٹنگز کی ایک ایک کاپی انھیں پیش کی، اور عصمت کو اظہارِ تشکر اور ممنونیت کے لئے موزوں الفاظ نہ ملے ـــــ عصمت کو شکایت رہی کہ چودھری صاحب نے ان سے ملاقات کی زحمت گوارا نہ کی۔ گو وہ اُن کی کتابیں بغیر اجازت اور بغیر رائیلٹی ادا کئے چھاپتے رہے تھے اور اس وقت بھی چھاپ رہے تھے اور محض ٹیلی فون کرنے پر ہی اکتفا کی۔ (غالباً عصمت کا اشارہ چودھری نذیر احمد کی جانب ہے جو مکتبہ اُردو کے مالک تھے اور مرحوم منٹو کے دوست اور ناشر تھے۔ (ان کا ذکر مصنف نے اپنی تصنیف "منٹو نامہ" میں تفصیل سے کیا ہے) باقی جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ پاکستان ہی نہیں ہندوستان کی ادبی دُنیا میں بھی جانے پہچانے نام ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

○ پندرہ کو حفیظ اللہ حسن نے ڈنر دیا جنھیں لوگ پیار سے "آپی" کہتے ہیں۔ وہاں ان کی ملاقات سنتوش کمار اور ان کی بیگم صبیحہ خانم، فریدہ خانم اور سب سے بڑھ کر ملکۂ ترنم نورجہاں سے ہوئی ـــــ سنتوش کمار کلکتہ میں فلم ہیرو کے طور پر مشہور تھے اور انھیں پاکستان کا دلیپ کمار تسلیم کیا جاتا ہے مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے اعتبار سے دلیپ کمار کی مثال نہیں ملتی۔ "لوگ اُنھیں معیار ناپنے کا فیتہ سمجھتے ہیں"۔ ـــــ ملکۂ ترنم فی الواقع ملکہ لگ رہی تھیں۔

○ "فلم رائیٹرز گلڈ" کے جلسہ میں فیض احمد فیض نے صدارت کی۔ خدیجہ اور ممتاز مفتی نے عصمت پر مضامین پڑھے۔ ممتاز مفتی کا مضمون "تیر و نشتر سے بھرپور تھا"۔ مضمون کیونکہ خود عصمت پر تھا، لہٰذا وہ چور سی بنی بیٹھی رہیں۔ پھر بھی ان کے مُنہ سے تحسین کے چند جملے نکل ہی گئے۔

○ سترہ کو فلم رائیٹرز کی طرف سے ہوٹل لارڈز (LORDS) میں ریسپشن تھا، جہاں دونوں مُلکوں کی فلمی صنعت پر بات چیت ہوتی رہی ـــــ اُن کی مشکلات بھی وہی ہیں جو ہماری۔ پبلک کی بدذوقی، سرمایہ کی کمی، اچھے فلم بنانے والے کے لئے مواقع کی کمی ـــــ وہاں عصمت کی ملاقات جمیلہ ہاشمی، یاسمین شاہد، بانو قدسیہ اور اشفاق احمد سے ہوئی ـــــ سب نے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی اور اختر الایمان کو پوچھا۔ دھیان رہے کہ ہمارے یہ ادیب اور شاعر فلموں سے وابستہ تھے اور فلمی دُنیا میں اُنھوں نے بہت نام پایا تھا ـــــ قرۃ العین حیدر کو تو بیشمار لوگوں نے پوچھا۔ "عینی" جیسا کہ اُنھیں پیار سے کہا جاتا ہے، برصغیر کی چوٹی کی ناول نگار ہیں

اور ساہتیہ اکادمی اور گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ ہیں۔

ایک ہال میں بزمِ سخن منعقد ہوئی، جس میں فیض احمد فیضؔ، قتیلؔ شفائی اور سرور بارہ بنکوی نے رنگ جما دیا ــــــ دوسرے دن وہ لاہور کے قابلِ دید تواریخی مقامات دیکھنے نکل گئیں۔ انھوں نے جہانگیر اور نور جہاں کا مقبرہ، شاہی مسجد، قلعہ اور شالیمار گارڈن دیکھے ــــــ انار کلی بازار کی سیر کی۔ یہ تمام مقامات ہمیشہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

لاہور کے چاروں طرف پھیلی رُوح افزا اور دلخوش کُن ہریالی نے عصمت کا مَن موہ لیا۔ کراچی کے لوگ اپنے درختوں کی اسی طرح دیکھ بھال اور پرداخت کرتے ہیں جیسے کوئی اپنی اولاد کی کرتا ہے اور تب کہیں اس کی شکل و صورت نکھری نکھری سنوری ہے۔ رنگ رُوپ میں چمک دمک آئی ہے۔ مگر پنجاب کی بے حد اپجاؤ دھرتی خود بخود سبزہ اگلتی ہے اور صُوبہ پُر بہار ہو جاتا ہے۔

لاہور سے عصمت اسلام آباد کے لئے بذریعہ ریل روانہ ہوئیں۔ ان کے ساتھ دیگر لوگوں کے علاوہ محمد طفیل بھی تھے۔ اسلام آباد کے ریلوے اسٹیشن پر احسن خان، اختر جمال، عصمت کی بھانجی نیرؔ، ان کی بیٹی یاسمین، خالہ زاد بہن صفیہ اور اس کے شوہر اُن کے خیر مقدم کے لئے موجود تھے ــــ اختر جمال وہی ہیں جو کرشن چندر کی منہ بولی بہن تھیں۔ وہ گاہے گاہے ہندوستان آتی رہتی تھیں۔ کرشن چندر کی بہن سرلا دیوی کی وفات کے بعد وہ راکھی کے موقع پر ہندوستان آئیں تو انھوں نے صرف کرشن چندر کو راکھی باندھنے کے لئے پاکستان کو اپنی روانگی ملتوی کر دی تھی ــــــ پھر کرشن چندر نے ان سے وزیر اعظم اندرا گاندھی کی عائد کردہ ایمرجنسی کی برکات کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا تھا۔ مُصنف نے ان تمام باتوں کا ذکر مختصراً اپنی تصنیف "کرشن چندر، شخصیت اور فن" میں کیا ہے ــــــ نیرؔ، عصمت کی سب سے بڑی بہن "آپا" کی اکلوتی بیٹی تھی جس کا ذکر عصمت نے اپنے شاہکار ناول "ٹیڑھی لکیر" اور مضمون "کاغذی ہے پیرہن" میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ نیرؔ سے تب اُن کی بالکل نہیں پٹتی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ امتدادِ زمانہ نے سب رنجشیں اور کدورتیں مٹا دی تھیں ــــــ اسلام آباد میں عصمت کے دو تین دن اپنے بچھڑے ہوئے رشتہ داروں سے ملاقاتوں میں گذر گئے۔ یہاں ان کی ملاقات اپنے بھائی عظیم بیگ کے بیٹے میجر زعیم بیگ چغتائی سے ہوئی جسے اُنھوں نے پینتیس برس پہلے دیکھا تھا۔ اب اس کی کنپٹیوں پر سفید بال ہویدا تھے۔ اس کی بیوی مُغل شہزادیوں جیسی حسین تھی اور بیٹیاں بہت بے تکلف، پُر کشش اور مَن موہنی تھیں۔

اسلام آباد، پاکستان کی راجدھانی، بہت نفیس، صاف سُتھرا اور دلکش شہر ہے۔ اس کی ایک اپنی

محمد طفیل

ہی مہک ہے۔ جو سڑکوں پر لگی، پھولوں سے لدی، مہندی کی باڑھوں سے آتی ہے۔ شہر خاموش اور پُرسکون ہے اور اس میں عام بڑے شہروں والی بھیڑ بھاڑ اور شور و شغب نہیں۔ ہَوا خوشگوار، ہلکی پھلکی اور شفاف ہے، جیسے باریک ململ میں سے چھَن کر آرہی ہو ــــــ اسلام آباد کے پُر فضا شہر نے عصمت کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

عصمت، شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی سے ملنے گئیں معلوم ہوتا ہے کہ وقت کی دست بُرد اُن پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ بیاسی سالہ ہونے کے باوجود وہ چاق و چوبند اور مُستعد دکھائی دیتے تھے۔ ان کا چہرہ بشرہ شکن آلود نہیں تھا اور اس پر شگفتگی اور تروتازگی نمایاں تھی۔ انھوں نے چاروں طرف نظر گھمائی اور ان کی تیز نگاہیں ایک پھول جیسی خوبصورت، نازک اندام لڑکی پر ٹک گئیں۔

"یہ کس کی بچی ہے؟" انھوں نے شکرے سی دھاردار نظریں گھمائیں۔

"میری نواسی ہے جوش صاحب"۔ میں نے پھُسلایا۔ بولے

"خوب ہے!"

گویا زندگی کے اس خزاں رسیدہ دور میں بھی جوش کی جمالیاتی حِس جوان تھی۔ انھوں نے چاندسی صورت کو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

عصمت نے ان کی بیاض اُٹھائی اور ایک شوخ سی نظم کا صفحہ کھول کر انھیں پڑھنے کی درخواست کی۔ "بس چنگاریاں سی چھٹنے لگیں۔ شعلے لپکنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اپنی دبنگ آواز کے زیر و بم پر سُننے والوں کو پھلجھڑیاں دے رہے ہیں" ــــــ عصمت کا جی نہ بھرا تو انھوں نے جوش سے ایک بار اور ملنے کی درخواست کی۔ انھوں نے اپنی ایک دعوت رد کردی اور عصمت کی خواہش کا احترام کیا ــــــ عصمت جب جوش کے ہاں پہنچیں تو وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اُن کا کلف دار پاجامہ الگ پڑا تھا۔ وہ ململ جاسا کُرتا اور تہبند پہنے باہر نکلے اور عصمت کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

"لیجیے آپ اب آئی ہیں جب ہمارا انتقال ہوگیا"

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا موڈ بدل گیا۔ ایک بار پھر بوتل منگوائی اور جم کر بیٹھ گئے۔ ٹیپ ریکارڈ ان کے سامنے تھا اور طبیعت ترنگ میں تھی۔ وہ ایک دَم وطن عزیز ہندوستان اور وہاں اپنے بچھڑے ہوئے دوست احباب کو یاد کرنے لگے اور سب کے جی بھاری ہوگئے ــــــ خیال

---

[1] عصمت چغتائی "یہاں سے وہاں تک"۔ (مجموعہ) "بڑی شرم کی بات"۔ روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۷۴

آتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے کن احباب کو یاد کیا ہوگا ۔ یقیناً اُن کو جن کا ذکر اُنھوں نے بڑے پیار محبت سے پُر خلوص انداز میں اپنی خودنوشت سوانح حیات "یادوں کی برات" میں کیا ہے ۔ جن میں سے چند ایک نام آج بھی مُصنّف کے قلب و ذہن پر ثبت ہیں ۔ پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، کنور مہندر سنگھ بیدی، سردار دیوان سنگھ مفتوں، فراق گورکھپوری، اسرار الحق مجاز، فانی بدایونی، سردار رُوپ سنگھ ــــــ جوشؔ ہندوستان کو یاد کر کے ضرور آہیں بھرتے ہوں گے ۔ نہ جانے وہ کیا کیا اُمیدیں لئے، کیا کیا سُنہرے سپنے قلب و جگر میں سجائے، وطن عزیز کو خیرباد کہہ کر پاکستان گئے تھے ۔ مگر اُن کے خواب سراب نکلے ۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ" ۔ حکومتِ پاکستان نے ان کی تحقیر و تذلیل میں کوئی کسر نہ چھوڑی ۔ بایں ہمہ اُنھوں نے سر نہ جُھکایا ۔ اپنے موقف سے سرِ مُو انحراف نہ کیا اور ویسے ہی تن کر کھڑے رہے ــــــ اور آہستہ آہستہ وہاں بھی اُن کے مدّاحوں اور پرستاروں کا ایک خاصا حلقہ بن گیا ۔ مگر ان کی تنگدستی کا مداوا نہ ہو سکا ۔

عصمت کا ویزا ختم ہو رہا تھا ۔ مگر کراچی دامن گیر تھی اور بمبئی بازو کھولے واپس بُلا رہی تھی ۔ ہَوائی اڈّے پر انھیں بہت سے لوگ "خُدا حافظ" کہنے آئے ۔ وہ ایک دُنیا سے دُوسری دُنیا کو جا رہی تھیں ۔ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا مگر ہزاروں میل کا فاصلہ ۔ جانے پھر کبھی زندگی میں آنا ہو نہ ہو ــــــ وقتِ رُخصت عصمت کا دل بھاری تھا کہ پاکستان سے ایک طرح سے ان کا خون کا رشتہ تھا ۔ اُن کی چار نسلیں وہاں رہ رہی تھیں ۔ اُن کے تین ماں جائے زیرِ زمیں سو رہے تھے ۔ ان کا سب سے چھوٹا بھائی اور سب سے بڑی بہن "آپا" زندہ تھیں ۔ اور ان کے بھائی بہنوں کے بیشمار بچّے وہاں تھے ۔ ان کے مرحوم شوہر شاہد لطیف کا پورا خاندان وہاں تھا ۔ ان کے وہاں ہزاروں دوست احباب، شعرا، ادبا، دانشوروں اور ناشرین سے گہرے مراسم تھے ۔ اور پھر وہاں اُن کے فن کے لاکھوں پرستار تھے جنھوں نے انھیں شب و روز دو ماہ تک سر آنکھوں پر بٹھائے رکھا تھا ۔ اور ان کی خاطر تواضع اور عزّت و تکریم ایک عزیز از جان ہستی کے طور پر کی تھی ــــــ عصمت وہاں سے واپس آئیں لیکن اپنا بہت کچھ پیچھے چھوڑ آئیں ۔

اس رپورتاژ کا ادبی اعتبار سے محاکمہ یا محاسبہ کرتے ہوئے یہ دیکھنا از بس ضروری ہے کہ ایک اچھے رپورتاژ نویس سے ہماری کیا توقعات وابستہ ہوتی ہیں ۔ ہماری نظر میں "دیدہ" کو من و عن بیان کرنا، "شنیدہ" کو تصدیق کئے بغیر زیرِ قلم نہ لانا، متنازعہ معاملات کے تمام پہلو اپنی رائے کے ساتھ پیش کرنا اور قطعی فیصلہ قاری کی "عقلِ سلیم" پر چھوڑ دینا، اور اپنے نظریات، اعتقادات اور تعصّبات کو

شاہد

حقائق کے ذکر کی راہ میں حائل نہ ہونے دینا، یہ تمام ایک اچھے رپورتاژ نویس کے بنیادی خصائص ہیں۔ پھر رپورتاژ کا دلچسپ اور پُراز معلومات ہونا بھی ضروری ہے تاکہ قاری اسے رغبت سے بغیر رُکے تھمے رواں دواں پڑھتا چلا جائے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب مُصنّف کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہو اور وہ اپنے مشاہدات، جذبات اور احساسات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔ ——— عصمت کا یہ رپورتاژ اس معیار پر بہت حد تک کھرا اُترتا معلوم ہوتا ہے۔

عصمت نے جو کچھ دیکھا سُنا اسے جانچ پرکھ کر نپے تُلے الفاظ میں پیش کر دیا ——— انھوں نے متنازعہ معاملات پر اپنی رائے کے برملا اظہار میں کہیں، ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔ ہاں میزبان مُلک میں اخلاق اور آداب کو ملحُوظ رکھتے ہوئے کہیں کہیں بحث مباحثہ کے دوران اُنھوں نے خاموش رہنا ہی قرینِ مصلحت جانا اور بدمزگی سے بچنے کے لئے اپنے خیالات کے اظہار سے گریز کیا مگر رپورتاژ میں اُنھوں نے اپنے نظریات کی وضاحت کرنے سے احتراز نہیں کیا۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں اُردو زبان کے مُستقبل کے تعلّق سے اُنھوں نے لکھا ہے کہ پاکستان میں ایک طبقہ اُردو کے زوال پذیر ہونے پر دل ہی دل میں خوش ہے کہ اس سے تقسیمِ مُلک کے جواز کو تقویت ملتی ہے۔ یہ صُورتِ حال کا بہت صریح اور کھُلا اظہار ہے ——— پھر امریکی خاتون سے بحث کے دَوران اُنھوں نے اپنے موقّف کا اظہار بہت جرأتمندانہ ڈھنگ سے کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ بیحد نڈر اور دبنگ تھیں اور حق بات مدِمقابل کے منصب و مقام اور ردِّ عمل سے بیگانہ و بے نیاز بیساختہ ان کی نوکِ زبان پر آجاتی تھی ——— پاکستانی معاشرے پر لڑکیوں کی نئی پَود کی اعلیٰ تعلیم کے تعلّق سے، اُنھوں نے بہت گہرائی میں جا کر لکھا ہے، جو ان کے مشاہدہ کی باریک بینی، ژرف نگاہی اور معاملہ فہمی پر دلالت کرتا ہے ——— یہی بات ان کے پاکستانی فلم انڈسٹری کے مطالعہ کے بارے میں وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ عصمت نے پاکستان کے شب و روز اور کیف و کم کو دیدہ و دل وا کر کے دیکھا اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی پُرخلوص کوشش کی ——— رپورتاژ میں عصمت کی جو تصویر بطور ایک انسان کے اُبھرتی ہے وہ بہت خوشگوار ہے۔ اُنھوں نے ان لوگوں کا ذکر جن سے اُن کا خون کا رشتہ تھا بہت پیار محبّت اور پُرخلوص انداز میں کیا ہے جس سے ان کی انسان دوستی، متانت اور خوش خلقی نمایاں ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے مرحوم بھائیوں کا ذکر مطہر خواہرانہ جذبات سے مغلوب ہو کر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اوائل عمری میں بھائیوں نے ان سے جو بدسلوکی روا رکھی تھی عصمت نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا

جوان کی کشادہ دلی، عالی ظرفی اور پاک باطنی کا ثبوت ہے ـــــ پھر انھوں نے اپنی بڑی آپا کا ذکر بھی بہت دردمندی اور گداز دلی سے کیا ہے۔ اس بارے میں ان کی تحریر "اشک و آہ" کا دلدوز مرقع پیش کرتی ہے جو قلب و جگر کو بے اختیار چھُو لیتا ہے ـــــ رپورتاژ میں جو چیز بہت متاثر کرتی ہے وہ عصمت کا حُسنِ زبان و بیان ہے۔ ان کی تحریر کی روایتی دِل کشی، بیساختگی اور روانی ہے ـــــ اور جو چیز اکھرتی ہے وہ نامانوس شخصیتوں کے ناموں کی فراوانی اور رہ رہ کر مرغن اور مچرّب کھانوں سے دل برداشتگی کا اظہار ہے۔

بحیثیت مجموعی رپورتاژ دل چسپ اور جاذب ہے اور اسے ہم بے تکان رغبت سے پڑھتے چلے جاتے ہیں مگر یہ قلب و ذہن پر دیرپا اثر نہیں چھوڑتا کہ یہ اتنا فکرانگیز اور معنی خیز نہیں۔ یہ ہمیں غور و فکر کی ترغیب نہیں دیتا۔ یہ ہمارے تجسس کو نہیں اُبھارتا۔ پھر اس میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ ایسی نایاب اور نادر نہیں کہ ایک باخبر قاری کے دائرۂ علم سے باہر ہوں۔ اسے پڑھتے ہوئے ایک حساس، باشعور، دُوررس قاری محسوس کرتا ہے کہ فاضل ادیبہ نے اسے بہ تعجیل تمام لکھا ہے اور اس پر وُہ توجہ مرکوز نہیں کی جس کا کہ اچھا ادب متقاضی ہوتا ہے۔ یہ احساس قائم رہتا ہے کہ یہ رپورتاژ "ایک" ادب پارۂ بنتے بنتے رہ گیا ہے۔

●

○ ناول

ٹیڑھی لکیر

○ پلاٹ :

جب کوئی ناول نگار کسی مرکزی خیال کو ناول کی شکل میں ڈھالنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے سب سے پہلا مرحلہ پلاٹ کی تشکیل کا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کی تشکیل و تعمیر پلاٹ سازی سے شروع ہوتی ہے۔ جیسے کس واقعہ کو کس طور سے پیش کیا جائے۔ اس میں کیا کیا دل چسپی اور جاذبیت کا سامان پیدا کیا جائے۔ کیا کیا نشیب و فراز اور پیچ و خم کس کس مقام پر آئیں۔ مختلف کردار کیا کیا رول ادا کریں اور کب اُبھریں اور کب معدوم ہو جائیں۔ ناول کے کینڈے کو کن کن واقعات، کیفیات اور سانحات سے گوشت پوست مہیا کیا جائے۔ ناول کا انجام کیا ہو۔ غرضیکہ پلاٹ ناول کا خاکہ یا OUTLINE ہوتا ہے جو ناول کے ناک نقشہ اور خدّوخال کی نشاندہی کرتا ہے ــــ جب ناول کا پلاٹ تمام جزئیات کے ساتھ مکمل ہو کر سامنے آتا ہے تو وہ اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔

شمن اپنے والدین کی دسویں اولاد تھی۔ گھر میں آسودہ حالی تھی اور سبھی بچے بخیر و خوبی پل رہے تھے۔ متوسط گھرانوں میں جہاں اولاد کثرت سے ہو بالعموم بڑی بہن چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال اور پالنے پوسنے کی ذمہ داری اُٹھاتی ہے۔ مگر شمن کی بڑی بہن آپا اس کی طرف توجہ نہیں دیتی۔ اس لئے اس کے لئے آگرے سے انا بلائی جاتی ہے۔ مگر جب ایک روز انا اپنے عاشق کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑی جاتی ہے تو اُسے واپس بھیج دیا جاتا ہے اور شمن کی دیکھ بھال کی ذمہ داری منجھو (آپا سے چھوٹی بہن) سنبھال لیتی ہے۔ منجھو بی نے جہاں شمن کو پیار دُلار سے پالا پوسا وہاں اُس پر سختی بھی بہت برتی اور معمولی لغزشوں پر بھی بڑی بے رحمی سے مار پیٹ کرتی رہی۔ منجھو شمن کو جس قدر صفائی کی جانب مائل کرنے کی کوشش کرتی، ضد میں شمن اُتنی ہی گندگی کی طرف راغب ہوتی جاتی اور یوں شمن منجھو کی سخت گیری کے ردِ عمل کے طور پر ضدی اور اڑیل سی ہو گئی۔ منجھو چونکہ خود ماں نہ تھی لہٰذا وہ شمن کو لاڈ چاؤ تو دے پائی مگر ماں کی ممتا دینے سے قاصر رہی۔ شاید اس لئے کہ ماں بنے بغیر ممتا دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اس صورتِ حال نے شمن میں نفسیاتی کجی پیدا کر دی۔ ضدی ہونے کے علاوہ وہ جارح ہو گئی۔ گھر

میں سب اُسے "بھتنی" کہتے تھے اور وہ آپے سے باہر ہو کر ان پر خونخوار بلّی کی طرح جھپٹ پڑتی اور ایسا نوچتی کہ گوشت میں اُس کے ناخن گڑ جاتے اور خون بہنے لگتا ـــــ ایک وہ تصوّر ہی تصوّر میں منجھو بی کو ٹھیک اسی طرح گھس گھس کر نہلاتی اور غم و غصّہ سے مغلوب ہو کر پیٹ ڈالتی۔ ایک دن اِس پر بھی اُس کا جی نہ بھرا تو اُس نے اپنی گڑیا کو مار مار کر اُس کے ہاتھ پیر الگ الگ کر دیئے اور اُس کا بُرادہ بکھر گیا ـــــ اب شمن کے پڑھائی شروع کرنے کا وقت آ گیا۔ منجھو بی نے قاعدہ لے کر اُسے الف سے انار کہنے کو کہا تو اُس نے انکار کر دیا کہ اوّل تو الف لمبا ہوتا ہے اور انار گول ـــ دُوسرے الف سے "انار" کیوں کر ہو گیا۔ یہ اس بات کی جانب واضح اشارہ تھا کہ شمن ایک ذہین لڑکی تھی اور وہ بغیر سوچے سمجھے کسی بات کو قبول نہیں کر سکتی تھی ـــــ آخر شمن نے اس کتاب سے یہ سمجھ کر سمجھوتہ کر لیا کہ اس کے بعد اس کی پڑھائی ختم ہو جائے گی۔ مگر یہ جان کر اُسے صدمہ ہُوا کہ یہ تو اس کی تعلیم کی محض شروعات ہے اور آگے چل کر اُسے اپنے بھائی کی طرح موٹی موٹی کتابیں پڑھنی پڑیں گی۔

(پھر منجھو بی کی شادی کی گھڑی آ گئی۔ وہ دُلہن بنی بیٹھی تھی اور شمن کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ وہ گھر میں بے نتھے بیل کی طرح بے مقصد ادھر اُدھر گھومتی پھرتی جہیز کے کمرے میں گھس گئی تو اس نے بے تحاشا سب کپڑوں کو نوچ کھسوٹ ڈالا۔ کچن میں گئی تو کھانوں میں نمک اور راکھ ملا دی۔ بری کی شکر کو غسل خانے کے مٹکوں میں گھول دیا۔ تولیہ باندھے وہ سب بچوں کے لئے کشش کا موجب بن گئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اُسے تولیے سے الگ کر کے ننگا دیکھیں۔)

منجھو بی کے سُسرال چلے جانے کے بعد شمن لاوارث سی ہو گئی۔ وہ شب و روز اُسے یاد کر کے پکارا کرتی اور اس کے شوہر کے مرنے کی دُعائیں مانگا کرتی تاکہ وہ واپس آ جائے اور اُسے پھر سے اپنی تحویل میں لے لے۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ آپا کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور وہ مستقل طور پر اپنی بیٹی نوری کے ساتھ میکے آ گئیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ ہر بات میں شمن کا مقابلہ اپنی بیٹی نوری سے کرتیں اور شمن کو اُس سے کمتر ثابت کرنے کی کوشش کرتیں۔ پھر وہ شمن کی بے وجہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ شمن زبردست احساسِ کمتری کا شکار ہو گئی۔ وہ گھر کے کونوں کھدروں میں چھُپی پھرتی اور کسی کے سامنے آنے سے گریز کرتی ـــــ منجھو بی کچھ روز کے لئے میکے آئی تو شمن کو یہ دیکھ کر صدمہ ہُوا کہ وہ تو حسبِ معمول گندے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی، جبکہ منجھو بی بہت عُمدہ قیمتی کپڑوں میں ملبوس تھی۔ منجھو بی سب سے گلے مِل مِل کر روئی مگر شمن کی جانب متوجّہ نہ ہوئی ـــــ اور جب کافی دیر بعد اُس نے شمن کو یاد کیا تو بڑی آپا نے شمن کو روکا کہ خبردار جو منجھو کے کمرے میں گئی ـــــ پھر منجھو بی نے شمن کو پکڑ کر پہلے کی طرح مُکّے گھُونسے اور تھپّڑ مارے تو شمن کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ نکلے کہ آخر کسی نے تو اس کی جانب توجّہ دی۔ اور وہ فرطِ مسرّت سے اِدھر اُدھر ناچتی پھری، مگر اس کی یہ ادا آپا کو ایک آنکھ نہ بھائی اور اس نے شمن کو بہت ڈانٹا پھٹکارا اور شمن نے ضد میں انتقام کے جذبے کے تحت آپا کی ہری بھری کیاری بُری طرح نوچ کھسوٹ

ڈالی اور کافی دن بسترِ علالت پر پڑی رہی۔

شمن رُو بصحت ہوئی تو اُسے منجھو کے ساتھ اس کی سُسرال بھیج دیا گیا۔ وہاں اُسے نہ تو منجھو بی کا گھر پسند آیا، نہ اُس کی بُڑھیا ساس اور ساس کا پوتا کدّن۔ کدّن کو تو اس نے روزِ اوّل ہی مار پیٹ کر سیدھا کر دیا۔ شمن کو کدّن اس لئے ناپسند تھا کہ وہ ڈھیلا ڈھالا تھا اور سب کا کام بلا چون چرا کر دیتا تھا۔ دُوسرے وہ ہر وقت اپنی دادی کے پاس گھُسا رہتا۔ گویا اس کا دُم چھلا ہو۔ مگر شمن کے لئے اُس سے دوستی کئے بغیر چارہ نہ تھا ـــــ جس دن کدّن کی دادی نے شمن کی بوئی ہوئی گولی زمین سے کھود کر دھو ڈالی شمن غم و غصّے سے اُبل پڑی اور اس نے دادی کی ساری کیاری تہس نہس کر ڈالی۔ شمن بہت ضدّی اور اکھڑ ہوگئی تھی اور اپنے پہ ہوئی زیادتی کا بدلہ لئے بغیر اُسے چین نہ آتا تھا۔ وہ جلد ہی دل برداشتہ ہو کر منجھو کی سُسرال سے واپس آگئی۔

شمن نے گھر والوں کا اس قدر ناک میں دَم کر دیا کہ اُسے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ نوری بھی شمن سے روز روز کے لڑائی جھگڑے سے اُکتا گئی تھی۔ اس لئے دونوں نے مصالحت کو ہی قرینِ مصلحت جانا۔ پھر آنے دن مسجد کے مُلّا جی کی عجیب و غریب حرکت بھی ان کو ایک دُوسرے کے قریب لے آئی ـــــ اُدھر بڑی آپا اپنے دیلور ڈاکٹر رشید کی آمد کے بعد متواتر بیمار رہنے لگیں۔ انھیں سوائے رشید کے کسی کی دوا سے افاقہ نہ ہوتا۔ مگر جلد ہی جب رشید کا آپا کے نام خط پکڑا گیا تو دونوں کے عشق کا راز فاش ہوگیا اور ابّا کے خوف کی وجہ سے آپا کی بیماری از خود ٹھیک ہوگئی اور رشید کی آمد و رفت بھی بند کر دی گئی ـــــ شمن اسکول کے قواعد و ضوابط سے بے بہرہ تھی۔ اس لئے شروع میں اس کی بہت سرزنش ہوئی اور اس کی نا اہلیّت کی وجہ سے اُسے جلد ہی نیچے کی کلاس میں اُتار دیا گیا۔ وہاں اس نے تھوڑے ہی دنوں میں سب پر رُعب جما لیا۔ اسکول میں ہی اس نے نئی نئی باتیں سیکھیں جیسے کھانے کی چوری، پیسے چُرانا وغیرہ ـــــ اسکول میں اس کی ملاقات مس چرن سے ہوئی جو اس کی ٹیچر تھی۔ اور دل ہی دل میں اس پر فریفتہ ہوگئی۔ گو بظاہر شمن کو محبت کے نام سے نفرت تھی مگر بباطن وہ مس چرن کو اس قدر چاہنے لگی کہ انھیں ہمیشہ اپنے گرد و پیش چلتے پھرتے محسوس کرتی۔ رات کو سوتے میں اُٹھ کر خود کو ان کے کمرے کے باہر کھڑا پاتی۔ ان کے سب نجی کام کرتی۔ یہ شمن کی زندگی میں غیر شعوری طور پر ہم جنسی کا پہلا تجربہ تھا۔ مگر جلد ہی مس چرن کو لڑکیوں کا اخلاق بگاڑنے کے جُرم میں ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا ـــــ مس چرن کی قربت نے شمن میں کئی نفسیاتی اُلجھنوں کو اُبھارا۔

شمن اب قدم بہ قدم بڑھتی سنِ بلوغ کو پہنچ گئی۔ اس کو اپنا جسم پرایا محسوس ہونے لگا۔ جا بجا گوشت بے تحاشا بڑھ گیا۔ اُنہی دنوں اُسے ایک خوفناک بیماری نے آن گھیرا جس پر نوری نے اُسے بتایا کہ وہ ایک بچّے کی ماں بن گئی ہے اور وہ مارے شرم کے اسکول میں مُنہ چھپائے گھومتی پھری۔ مگر سعادت نے آکر اس کا خدشہ یہ کہہ کر دُور کر دیا کہ جب اس کی ابھی شادی ہی نہیں ہوئی تو وہ بچّے کی ماں کیوں کر بن سکتی ہے۔ تب سعادت نے شمن کو اور بھی کئی باتیں بتائیں جن سے

وہ اب تک بے بہرہ تھی۔

شمن بڑی آپا کی سخت گیری کا بدلہ ہوسٹل میں نوری سے لینے لگی۔ آخر تنگ آکر آپا نے پرنسپل کو لکھا کہ نوری کو شمن سے الگ کر دیا جائے۔ ایسا ہی ہوا اور نوری دوسرے کمرے میں چلی گئی اور شمن کے کمرے میں ایک نئی لڑکی رسول فاطمہ آ گئی، جو ہم جنسیت کا شکار تھی۔ شمن اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے اپنی دوست سعادت کے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ مگر ہم جنسیت کی لت وہاں بھی سب کو تھی۔ سعادت نجمہ پر مرتی تھی شمن بھی اس بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ویسے اس ہوسٹل میں مرنے والیوں کی بہتات تھی۔

سعادت خرابی صحت کی بنا پر پہاڑ پر چلی گئی۔ اس کی دوست بلقیس کی بڑی بہن جو انگلینڈ سے واپس آئی تھیں اسکول کی پرنسپل مقرر کی گئیں۔ وہ اپنی پانچ بہنوں کے ہمراہ اسکول کے احاطے میں ہی رہتی تھیں اور سبھی بہنوں کے ساتھ کھلے عام لڑکوں سے عشق کیا کرتیں ـــــ اُن دنوں بلقیس نے شمن کو یہ بہت اہم بات بتائی کہ لڑکیوں کو ہمیشہ لڑکوں پر مرنا چاہیئے اور اس طرح اُس نے شمن کا اولین عشق اپنے بھائی رشید سے کروایا۔ رشید اور شمن کا عشق تیزی سے پروان چڑھنے لگا اور بلقیس اُن دونوں کے مابین قاصد کا کام انجام دیتی رہی ـــــ دریں اثنا نسیما اور کوکو نے آکر نہ صرف رشید کو شمن سے الگ کر دیا بلکہ کچھ عرصے کے لئے بلقیس بھی شمن سے الگ ہو گئی ـــــ اُنہی دنوں رشید حصولِ تعلیم کے لئے انگلینڈ چلا گیا۔ یہ حادثہ کچھ یوں رونما ہوا کہ شمن کو احساس تک نہ ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی فلم چلتے چلتے رُک گئی ہو ـــــ اور اس طرح شمن اپنے پہلے عشق میں ناکامیاب رہی۔

وقت رواں دواں رہا۔ آپا میں کئی تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔ اب وہ متین اور سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ ان کی دوستی مونچھوں والی بیگم سے ہو گئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں ہم جنسیت کا رشتہ تھا ـــــ انہی دنوں شمن کا خالہ زاد بھائی اعجاز عُرف اجو اُن کے ہاں آ گیا کیونکہ اس کے والد فوت ہو گئے تھے اور والدہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اب وہ بے یار و مددگار تھا۔ اجو بدوضع اور کم عقل تھا اور سب اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ وہ حقیر سے حقیر کام جوٹھے کھانے کے عوض کر دیا کرتا تھا۔ اور گھر کا کام بھی بڑی مستعدی سے کرتا۔ بچپن میں اس کی شادی شمن سے طے ہو گئی تھی۔ وہ شمن سے بڑے بھدّے اور بھونڈے انداز میں اظہارِ محبت کرتا۔ جب رات کو سب سو جاتے تو وہ گھنٹوں اِس تاک میں رہتا کہ شمن کے جسم کو چھو سکے۔ مگر شمن کو اعجاز قطعاً پسند نہ تھا۔ آخر ایک رات شمن اُسے کھینچ کر جوتی مارتی ہے۔ اعجاز اس صدمہ سے سخت بیمار پڑ جاتا ہے اور پھر حصولِ تعلیم کی خاطر کہیں باہر چلا جاتا ہے۔

اجو کے بعد ناول میں عبّاس کی آمد ہوتی ہے۔ یہ شمن کے چچا کا لڑکا ہے جو انگلینڈ سے انجینئر بن کر آیا ہے۔ یہ وہی چچا ہیں جن کی آمد پر بھی ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے اور ڈیوڑھی میں اُن کا پلنگ بچھوا دیا جاتا۔ اس

بار جب وہ اپنے بیٹے کے ساتھ آئے تو اُن کی خوب خاطر تواضع ہوئی۔ عبّاس سے بھی اپنی بیٹی کی شادی کے خواہاں تھے۔ گھر کی بھی جوان لڑکیوں میں عبّاس نے دِل چسپی ظاہر کی اور گاہے گاہے لڑکیوں کو پکڑنا اور اُن سے چھیڑ چھاڑ کرنا اس کا من پسند مشغلہ رہا۔ اپنی اپنی جگہ پر سب پُر امید تھے کہ عبّاس ان کی بیٹی کو منتخب کرے گا۔ مگر رخصت ہوتے وقت چچا نے عبّاس کی شادی کا نیوتا دے کر سب کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔

شمن اسکول واپس آتی ہے تو اس کی ملاقات رائے صاحب اور ان کی بیٹی پریما اور بیٹے نریندر سے ہوتی ہے۔ پریما شمن کی دوست ہے۔ وہ اپنے والد رائے صاحب سے بہت پیار کرتی ہے۔ رائے صاحب بھی اُس پر جان چھڑکتے ہیں اور اُس سے ایک دوست کا سا سلوک کرتے ہیں۔ رائے صاحب کی شخصیت بہت دلچسپ، جاذب اور پُر رعب ہے۔ وہ شمن سے بھی اپنی بیٹی کی طرح بہت بے تکلفی سے پیش آتے ہیں۔ شمن جو کہ بچپن میں پدرانہ محبت سے محروم رہی تھی، نہ جانے کس غلط فہمی میں اُن سے محبت کا اظہار کر بیٹھتی ہے اور ٹھوکر کھاتی ہے۔ اُسے بہت خفت اُٹھانی پڑتی ہے مگر خود کردہ را علاجے نیست۔ اتفاق سے جلد ہی رائے صاحب کا انتقال ہو گیا۔۔۔۔ اس حادثے کا شمن پر بہت گہرا اثر ہوا اور وہ بیمار پڑ گئی۔ بیماری کی وجہ سے وہ چڑچڑی اور ترش رُو ہو گئی۔ تبھی اعجاز کی آمد اس کے گھر ہوتی ہے۔ مگر اب وہ پُرانا اجو نہ تھا، بلکہ اب وہ ایک پڑھا لکھا، خوبرو، پُراعتماد زندگی سے بھرپور جوان تھا۔ بات بات پر وہ اوروں کا مذاق اڑاتا اور اندھیرے اُجالے شمن سے چھیڑ چھاڑ کرتا۔ ایک بار پھر سارا گھر اپنی لڑکیوں کے لئے اُسے پھنسانے میں مستعد ہو گیا۔ مگر غیر متوقع طور پر وہ شمن کی دوست بلقیس کو پسند کرتا ہے اور اس بیل کو منڈھے چڑھانے کے لئے اس کا تعاون چاہتا ہے مگر شمن سُنی اَن سُنی کر دیتی ہے۔۔۔۔ بعدازاں جب شمن سے اس کی شادی کی بات چلتی ہے تو وہ صاف انکار کر دیتی ہے اور اپنی ذلت کا بدلہ چکا دیتی ہے۔

شمن کی دوست ایلما سماج کے قواعد و ضوابط اور اخلاقی اور رُوحانی اقدار سے منحرف تھی۔ اسے لڑکیوں سے کہیں زیادہ مَردوں کی صحبت میں حظ ملتا تھا۔ وہ عیسائی ہوتے ہوئے بھی کرشن بھگت تھی۔ اپنے باغیانہ خیالات کی وجہ سے اُسے اسکول سے خارج کر دیئے جانے کی دھمکی مل چکی تھی۔ کالج کی کھُلی فضا میں آنے سے اس کی دُنیا ہی بدل گئی۔ اب اُسے معلوم ہُوا کہ دُنیا حقیقتاً کتنی وسیع و عریض ہے۔ شمن اور ایلما میں گہری چھننے لگی اور شمن نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ اب وہ پُرانی شمن نہ رہی تھی اور اُسے خود اپنی شناخت کرنے میں دقت ہوتی۔ کالج کی اَن دیکھی دُنیا میں قدم رکھنا اس کی زندگی میں بڑا اہم موڑ تھا۔ یہاں اس کی ملاقات یونین کے پریذیڈنٹ افتخار سے ہوتی ہے۔ اور وہ اس سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ دیگر لوگوں مثلاً سیتل اور مس لوگانے بھی اسے متاثر کیا۔ بعد میں شمن بھی کالج یونین کی ممبر بن جاتی ہے اور اسی دوران افتخار سے اس کی قربت گہری ہو جاتی ہے۔

نوری کی شادی طے ہونے کی خبر ملنے پر شمن اپنے گھر جاتی ہے۔ نوری کو مانہوں بیٹھے دیکھ کر اُسے عجیب سا

احساس ہوتا ہے۔ شادی کے دوران اُس نے بزرگوں کے خیالات کا خوب مذاق اُڑایا۔ اُسے مہر کی رقم یوں لگی گویا کسی نے نوری کی جوانی کا سودا اکیاون ہزار میں کر لیا ہو۔ اُس نے ایک ایک رسم کو بنظرِ غور دیکھا اور اس پر بہت گہرائی سے سوچ بچار کیا۔ اور اُسے شادی محض سودے بازی لگی۔ مگر جب نوری رُخصت ہونے لگی تو ایکا ایکی ثمن کے خیالات میں تغیر آیا اور اسے یوں محسوس ہُوا کہ شادی فقط ایک سودا نہیں بلکہ یہ ایک پاکیزہ رشتہ ہے جس میں دُولھا سب کی موجودگی میں نوری کو خوش رکھنے کا وعدہ کر کے، اُسے اپنے ہمراہ لے جا رہا ہے۔

اُدھر افتخار "دق" کا مرض بڑھ جانے کی وجہ سے بھوالی سینی ٹوریم علاج کے لئے چلا گیا تھا۔ اور کالج یونین میں اس کی جگہ سیتل نے لے لی تھی۔ ثمن یونین سے منسلک رہی اور اس کی سرگرمیوں میں تندہی اور خلوص دلی سے جُٹی رہی۔ یہ سب لوگ روشن خیال تو تھے ہی اب انھوں نے اشتراکی نظریات کو بھی اپنا لیا۔ مُلک کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے کھادی پہننا ضروری سمجھا جاتا تھا اس لئے اب وہ کھادی پہننے لگے ـــــــ دریں اثنا پتہ چلا کہ ایلما سیتل کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ لیکن ایلما سیتل سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اس لئے وہ اپنے بچے کا اسقاط کرانے کے لئے کسی دُوسرے شہر چلی جاتی ہے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر ثمن نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایک قومی اسکول کی سرپرستی قبول کر لی۔ مگر اسکول کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ایک رئیس نے خستہ سی عمارت خیرات میں دے دی۔ دُوسرے نے اپنی تمام بیکار اور بے مصرف کتابیں لائبریری کے لئے دے دیں۔ بیشتر لڑکیاں جن کے نام رجسٹر میں درج تھے، ناپید تھیں۔ غریب استانیوں سے بیس روپیہ ماہوار تنخواہ دے کر تیس روپیہ کی رسید لکھوائی جاتی تھی۔ دو چپراسنیں تھیں جو کبھی طوائفوں کی نائکہ رہ چکی تھیں۔ ایک چپراسی تھا جو بیک وقت منیجر صاحب کا بیرا، باورچی، فراش وغیرہ تھا۔ گویا قومی اسکول قوم کی حالت کا آئینہ دار تھا۔ یہاں پڑھائی برائے نام ہی ہوتی تھی۔ ثمن ابھی اسکول کے رنگ ڈھنگ کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ ایک دن افتخار نے آکر اُسے حیرت میں ڈال دیا۔ پتہ چلا کہ وہ جیل میں تھا۔

ثمن نے اسکول کی نوکری کی یکسانیت سے اُکتاہٹ محسوس کی اور کچھ روز کی چھٹی لے کر تفریح کے لئے گھر سے نکل پڑی۔ مگر اسے اپنی منزل کا پتہ نہ تھا۔ حُسنِ اتفاق سے اُسے اپنی سہیلی ایلما اسٹیشن پر ہی مل گئی۔ ایلما سے اُسے معلوم ہُوا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے سیتل کے بچے کو جنم دیا اور اب وہ اُسے مجبوراً پال رہی ہے مگر ماں بیٹے میں طبعی تضاد کی وجہ سے بالکل نہیں بنتی۔ اب ایلما سیتل سے اپنی نفرت کا انتقام اُس کے بیٹے رولف سے لیتی ہے۔ اسے بات بات پر مارتی پیٹتی ہے۔ دھتکارتی، پھٹکارتی ہے۔ ثمن نے کچھ ہی دنوں میں ان کے درمیان مغائرت کی کھائی کو بہت حد تک پاٹ دیا۔ اور وہ اپنے اسکول واپس آ گئی۔ مگر اسکول کی گھٹی گھٹی فضا میں اسے جلد ہی گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ اس گھبراہٹ اور اکیلے پن کے احساس کو دُور کرنے کے لئے اس نے کلب جانا شروع کر دیا۔

وہیں اس کی ملاقات منظور صاحب سے ہوتی ہے۔ وہ ایک رئیس شخص تھے اور ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ ان کے دل میں موجزن تھا۔ انہی کے ساتھ شمن گاؤں سدھار کے لئے جانے لگی۔ مگر درحقیقت یہ ایک پکنک ہوتی ——— اس طرح وقت گذرتا رہا۔ ایک دن شمن کو افتخار کا تار ملا۔ جس میں اُسے ملنے کے لئے لکھا تھا۔ اور وہ بھوالی چلی گئی۔ اس بیچ وہ افتخار کے علاج کے لئے روپے بھیجتی رہی تھی۔ وہ اس کے لئے سویٹر اور حلوہ بنا کرلے گئی۔ گویا شمن اور افتخار کے درمیان غیر شعوری طور پر عشق پروان چڑھ رہا تھا ——— واپس آنے پر ایلمانے اسے کچھ روز کے لئے اپنے پاس بلالیا۔ تبھی اُسے معلوم ہوا کہ ایلما کی دماغی حالت درست نہیں اور رولف کا انتقال ہو چکا ہے۔ اسی دوران وہ ایلما کو بار بار شادی کے لئے تیار کرتی ہے مگر وہ رضامند نہیں ہوتی ——— ایک دن اچانک حسین بی نام کی ایک عورت نے شمن کو عرش سے فرش پر پٹخ دیا۔ اس نے اپنا تعارف افتخار کی بیوی کے طور پر کرایا۔ اس سے شمن کو یہ بھی معلوم ہوا کہ افتخار کا تعلق صرف اس سے ہی نہیں بلکہ کئی عورتوں اور طوائفوں سے بھی ہے۔ حسین بی شمن کو اس کا افتخار کو لکھا خط دکھا کر اُسے بلیک میل بھی کرتی ہے۔ ان حیران کن انکشافات سے شمن اندر ہی اندر ٹوٹ جاتی ہے، بکھر جاتی ہے۔ اور جلد ہی اپنی زندگی کا رُخ نئی سمت میں موڑ دینا چاہتی ہے۔ اور کسی ایک کی ہو کر رہنے کی بجائے سب میں تقسیم ہو جانا چاہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا اُس نے پروفیسر رحمان، کامریڈ اور انقلابی شاعر بھی کے ساتھ رشتہ اُستوار کر لیا۔ مگر یہ سلسلہ بھی لمبے عرصے تک نہ چلا اور سب سے اُس کا جی بھر گیا۔ اور اس نے یکے بعد دیگرے اُن کو جھٹک دیا۔ اور اپنی نسوانیت کی خاطر یہ طے کیا کہ وہ اپنے خاندان کے کسی بچے کو گود لے کر پالے گی۔ آخر اس نے منجھو بی کی ایک لڑکی کو گود لیا مگر وہ انتقال کر گئی۔ اس پر شمن اس قدر خجل ہوئی کہ اس نے کسی بچے کی طرف نہ دیکھا کیونکہ اُسے اب احساس ہو گیا تھا کہ محبت اور ممتا کبھی خریدی نہیں جا سکتی۔

ایک بار پھر شمن ایلما سے ملتی ہے اور وہیں اُس کی ملاقات رونی ٹیلر سے ہوتی ہے جو فوج میں افسر تھا۔ شمن کو سفید فام نسل کے لوگوں سے فطرتاً نفرت تھی مگر محبت کی بارگاہ میں اُسے سربسجود ہونا پڑا اور دونوں نے شادی کر لی۔ مگر نفرت کا جذبہ جلد ہی پھوٹ نکلتا ہے جس کی شدت اور حدت وقت کے ساتھ ساتھ فزوں تر ہوتی جاتی ہے۔ روز روز کی تُو تُو مَیں مَیں ان کی زندگی کا سکھ چین حرام کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ماہ بعد ہی دل برداشتہ ہو کر رونی ٹیلر خاموشی سے محاذ جنگ پر چلا جاتا ہے۔ شمن پھر تنہا رہ جاتی ہے۔ مگر تبھی اسے ڈاکٹر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بچے کی ماں بننے والی ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی ناول اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔

یہ مختصر الفاظ میں "ٹیڑھی لکیر" کا قصہ ہے۔ ناول کی بنا اس کے قصہ پن پر اُستوار کی گئی ہے۔ عصمت نے اس میں فلیش بیک یا شعور کی رَو کی تکنیک اپنانے سے گریز کیا ہے اور راز اوّل تا آخر اسے سیدھے سادے انداز میں پیش کیا ہے۔ یعنی ناول کا آغاز شمن کی پیدائش کے بیان سے ہوتا ہے۔ اور اس کے بچپن اور جوانی سے گذرتا، اس

کی زندگی کے واقعات، سانحات اور نشیب و فراز کا احاطہ کرتا، ایک اہم اور نازک موڑ پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔

○ منجھو

شمن کی پیدائش کے بعد اُس کی مادرِ نامہربان نے حسبِ دستور اُسے انّا کے حوالے کر دیا اور جب انّا اپنی بدچلنی کے سبب نکال دی گئی تو منجھو نے اس کی پرداخت اور دیکھ بھال کی ذمّہ داری سنبھال لی۔ درحقیقت جس دن شمن نے منجھو کے کپڑوں میں انّا کو تلاش کیا تھا وہ اُسی دن سے شمن کو پیار کرنے لگی تھی۔ شمن کے چھوٹے چھوٹے معصوم ہاتھ اس کی گردن اور سینے پر بھٹکتے رہتے پھر بھی وہ قطعاً بُرا نہ مانتی۔

منجھو نہ صرف صفائی پسند تھی بلکہ نفاست پسند بھی۔ وہ شمن کے لئے خوبصورت فراکیں اور ٹوپیاں سیتی، اُسے بار بار نہلاتی، کاجل اور مسّی لگاتی، چوٹیاں بناتی اور ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیتی کہ خبردار جو ایک بال بھی ادھر سے اُدھر ہوا۔ مگر اِدھر منجھو کی آنکھ بچتی اُدھر وہ باہر کھسک جاتی اور شام کو دھول میں لت پت، بھُتنی بنی، واپس آجاتی۔ منجھو برافروختہ ہو کر گھونسوں اور تھپڑوں سے اس کی تواضع کرتی تو وہ آئندہ ایسا نہ کرنے کی قسم کھاتی۔ مگر اگلے روز وہ پھر پلک جھپکے بغیر اُسی فعل کا اعادہ کرتی تو پھر اس کی مرمّت ہوتی، کچھ اس طرح کہ دیکھنے والے عبرت حاصل کرتے۔

منجھو کی خامی یہ تھی کہ وہ فطرتاً حد درجہ غُصیل تھی اور شمن کو مارتے وقت توازن کھو بیٹھتی تھی۔ اور اس کا رویّہ ایک سفاک اور جلّاد کا سا ہوتا تھا —— مثال کے طور پر:

> "سب سے پہلا کام منجھو بی یہ کرتیں کہ گھونسوں، تھپڑوں اور چانٹوں سے جتنی دھُول جھڑ سکتی جھاڑ دیتیں"[1]

وہ ایک معصوم سی بچّی کو صفائی ستھرائی کا درس دیتی سب حدُود سے گذر جاتی تھی کہ وہ بچّوں کی تربیت کے معاملے میں ناتجربہ کار تھی اور اُسے احساس نہ تھا کہ راہِ راست پر لانے کے لئے انھیں کس حد تک سزا دینا مناسب ہے۔ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ مار پیٹ سے بچے ضدی اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں اور اُن میں نفسیاتی کج روی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر وُہ اس بات سے بھی بے بہرہ تھی کہ بچّے محبت، پیار اور زبان کی شیرینی اور حلاوت سے زیادہ سیکھتے ہیں بہ نسبت مار اور سختی کے —— منجھو نے ایک ماں کے فرائض تو سنبھال لئے مگر وہ ماں کی ممتا سے عاری تھی۔ شاید ماں بنے بغیر ممتا کی نمُود ہی نہیں ہوتی۔

شمن ذرا بڑی ہوئی تو منجھو نے اُسے پڑھانا شروع کیا۔ وہ اس کے لئے قاعدہ لائی۔ اُسے سلا اور شمن کو پیار سے گود میں بٹھا کر کہا کہ یہ الف ہے، الف سے انار۔ مگر یہ شمن کی فہم و فکر سے بعید تھا کہ اس کے نزدیک تو انار آتش بازی سے چھوٹتا ہے۔ ح، خ اُسے چائے دانیوں کے سے لگے اور ج کی شکل تو اُسے اِتراتی ہوئی مہترانی کی سی لگی ——

---

[1] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ ص ۱۵-۱۶

(سبل) شمن نے موقع ملتے ہی منجھو کی غیر موجودگی میں قاعدہ بے سلیقگی سے مکمل ڈالا اور منجھو نے غم و غصّے سے مغلوب ہو کر اُسے ایسے بھاری بھرکم اور زوردار گھونسے مارے کہ وہ دیر تک بغیر آنسو بہائے سسکیاں بھرتی رہی:

"جب منجھو نے قاعدے کی صورت دیکھی تو تمام گذشتہ گھونسوں سے زیادہ وزنی گھونسا جمایا۔ اس کے بعد تھپڑ اور چانٹے۔ وہ دیر تک بیٹھی بے آنسوؤں کی سوکھی سوکھی سسکیاں بھرتی رہی۔"[1]

منجھو بی اگر شمن کو مار پیٹ کرتی تھی تو وہ اس کے ساتھ لاڈ پیار اور چمکار دُلار بھی کرتی تھی۔ جب شمن روٹھتی تو وہ اپنے سینے کی حدّت سے اس کے سارے زخم سینک دیتی ـــــ منجھو سسرال سے آئی تو شمن کا خیال تھا کہ وُہ اس کے بغیر روتی بسورتی میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوگی کہ وہ اماں کو اکثر لکھا کرتی تھی کہ شمن اُسے بہت یاد آتی ہے۔ مگر یہ سب جھوٹ تھا کہ اگر وہ فی الواقع یاد آئی ہوتی تو منجھو کا چہرہ یُوں طباق سا لال چقندر نہ ہوتا۔ اور پھر وہ سرتاپا ریشمی کپڑوں میں ملبُوس اور زیوروں سے لدی پھندی نہ ہوتی ـــــ اس پر ستم یہ کہ آکر بھی وہ بہت دیر سے شمن کی طرف متوجّہ ہُوئی۔ اور وہ دروازے سے لگی اس کی نظرِ التفات کی منتظر کھڑی رہی ـــــ مگر جب منجھو نے شمن کی ہیئت کذائی دیکھی تو اس کا پیار بے اختیار اُمڈ پڑا۔ اس نے کس کر اس کے دو گھونسے جمائے اور کھینچتی ہوئی غسل خانے میں لے گئی۔ شمن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور آنسو بہہ نکلے کہ وُہ ان پیار بھرے گھونسوں کی شیرینی کے لئے ترس گئی تھی۔ ان گھونسوں اور تھپڑوں نے اس کے جسم کا ہی نہیں رُوح کا میل بھی اُتار دیا اور وہ جی اُٹھی ـــــ منجھو نے اس کے بال نوچ نوچ کر کنگھی کی اور سارا دن کھانا پینا چھوڑ کر اس کی جوئیں نکالیں۔ شام کو شمن کے پیر زمین پر نہ پڑتے تھے اور فرطِ مسرّت سے وُہ منجھو کے پلنگ پر قلا بازیاں کھانے لگی۔

شمن منجھو کے ساتھ اُس کی سسُرال گئی تو وہاں جلد ہی اُکتا گئی۔ اُسے نہ منجھو کا چھوٹا سا گھر پسند آیا، نہ اس کی بڑھیا ساس اور نہ ہی اس کا پوتا کدّن (قادر)۔ کدّن کو تو وہ ذرا دھمکا لیتی اور ضرورت پڑے تو مار پیٹ کر سیدھا کرنے سے بھی گریز نہ کرتی۔ اس کی ساس کی بھی اُس سے رُوح قبض ہوتی تھی ـــــ اور منجھو کے ساتھ نہ اب وہ پہلے کی طرح سو سکتی تھی اور نہ منجھو اس سے پہلے کی طرح لاڈ پیار کرتی تھی اور نہ ہی مارتی تھی۔ گویا اس کے تعلق میں بے تعلقی سی آگئی تھی ـــــ شمن منجھو کے پاس سے واپس آئی تو اُسے یُوں لگا گویا وہ اُسے ہمیشہ کے لئے دفن کر آئی ہو۔

منجھو کا کردار بڑا دلچسپ اور جاذب ہے۔ وہ شمن کی مادرِ مہربان بن کر اس کی پرداخت کرتی ہے۔ اس کی تعلیم کی جانب بھی توجّہ دیتی ہے۔ اُسے ناسمجھی میں مار پیٹ کرتی ہے تو پیار دُلار سے اس کے زخم سہلاتی بھی ہے۔ منجھو کا وجُود شمن کے کردار کی تکمیل کے لئے بہت ضرُوری ہے۔

---

[1] عصمت چغتائی، "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۳

○ بڑی آپا

آپا اپنے ماں باپ کی سب سے بڑی اور چہیتی بیٹی تھی اور شمن کی سب سے بڑی بہن ——— امّاں کا کام تو فقط بچّے جننا تھا جو ہر ڈیڑھ دو سال بعد ان کی کوکھ کو روندتے چلے آتے تھے۔ اور آپا کا کام ان کی پرداخت اور دیکھ بھال کرنا تھا جب شمن پیدا ہوئی تو آپا بچّوں کو پالتے پالتے اُوب چکی تھیں۔ اس لئے انھیں شمن کی پیدائش پر کوئی مسرت نہ ہوئی اور انھوں نے آزردہ خاطر ہو کر کہا "خُدا غارت کرے اِس ننھی سی بہن کو۔ امّاں کی کوکھ کیوں نہیں بند ہو جاتی" ——— شاید اسی دن سے ان کے قلب و ذہن میں شمن کے تئیں ایسا بُغض اور عناد جاگزیں ہو گیا کہ وہ عمر بھر نا پید نہ ہوا ——— یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ شمن اپنے ماں باپ کا دسواں بچّہ تھی۔

○ بڑی آپا اُوپری طور پر یوں تو کہتی تھیں کہ انھیں شمن کی فلاح و بہبود مقصود ہے اور اس کی عاقبت سنوارنا اُن کا نصب العین ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ اپنی بیٹی کو درسِ عبرت دینے کے لئے وہ شمن کو آلۂ کار بناتی تھی۔ مثلاً وہ نوری سے کہتیں:

○ "کہنا نہیں مانوگی تو شمن کی طرح پھٹکاریں گے سب"

○ "نہاؤگی نہیں تو شمن کی طرح جوئیں پڑ جائیں گی"

○ "پڑھوگی نہیں تو شمن کی طرح جاہل رہ جاؤگی"

○ "پھر تم نے شمن کی طرح ضد کی"

○ "شمن کی طرح جھوٹ بولنا خوب آتا ہے" ——— اور

○ "یہ شمن ہی تمھیں بگاڑتی ہے خبردار جو اس کے ساتھ کھیلیں"[1]

اس طرح شمن کے حوالے سے نوری کو درس دینا آپا کا شعار بن گیا اور شمن سب کی نظروں میں اپنے آپ گر گئی۔ اور آپا کا یہ عمل سہواً نہیں عمداً تھا جس کا مقصد اپنے بچّوں کی تربیت سے کہیں زیادہ شمن کی تذلیل و تحقیر تھا ——— آپا کا ایک اور انداز بھی تھا۔ وہ اپنی بیٹی نوری کو شمن کے تقابل سے یوں پیش کرتیں کہ نوری کا روشن اور تاباں پہلو اُبھر کر سامنے آتا اور شمن کا تاریک اور ناخوشگوار پہلو۔ مثلاً نوری گوری ہے وہ کالی۔ نوری نازک ہے وہ بھدّی۔ نوری ہنس مکھ، شرمیلی، باتمیز اور پڑھنے میں تیز ہے اور وہ بدمزاج، بدتمیز اور پھوہڑ۔ اور یوں نوری سُرخ رُو اور سرفراز ہو جاتی اور شمن سیاہ رُو اور سرنگوں۔ آپا کا یہ کردار انھیں ہماری نظر میں جھکا دیتا ہے، گرا دیتا ہے۔

○ یوں بھی آپا شمن سے بڑی سختی اور دُرشتی سے پیش آتیں۔ مارنے پر آتیں تو مار مار کر بھرکس نکال دیتیں۔ انھیں شمن کا کوئی قول فعل ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اِدھر شمن سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی حرکت سرزد ہوتی، اُدھر اُن کا ہاتھ

---

[1] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر"۔ (ناول) نصرت پبلشرز لکھنؤ ص ۷،۴

اُٹھ جاتا۔ ڈانٹ ڈپٹ، بھاڑ پھٹکار تو آئے دن کا معمول تھا۔ پیار دُلار کے نام کی ان کے ہاں کوئی چیز نہ تھی —
کئی دفعہ تو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ انھیں شمن سے بُغضِ للّٰہی تھا، خداواسطے کا بیر، جو بے وجہ، بے جواز ہوتا ہے۔
دو ایک مثالیں پیش ہیں:

- "جب منجھو سسرال سے واپس آتی ہے اور شمن کو اپنے سینے سے لگا لیتی ہے تو آپا چلاتی ہیں۔
"جوئیں جوئیں۔ اے ہے منجھو، موئی کے ہزاروں جوئیں بھری پڑی ہیں۔ اور منجھو ڈر کر اُسے دُور دھکیل دیتی ہے"[1]

- "شمن منجھو کے کمرے میں جاتی ہے تو آپا بغیر کسی معقول جواز کے اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہیں۔" خبردار جو یوں میلی کچیلی منجھو کے کمرے میں گئی، مُردار کہیں کی"۔ وہ اسے بے رحمی سے جھنجھوڑ دیتی ہیں۔ اگر آپا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شمن دیوانہ وار اس سے لپٹ جاتی اور ایسی تیسی کر دیتی"[2]

- "جب شمن سے سالن کا ڈونگا اُجلے دسترخوان پر اوندھا ہو جاتا ہے تو آپا اُسے گھسیٹ کر برآمدے میں پٹخ آتی ہے۔ "آواز نکالی تو دَم گھونٹ دوں گی"[3]

یہ بات قابلِ غور ہے کہ شمن آپا سے ان کی سفاکی اور بے رحمی کی وجہ سے بلاشبہ ڈرتی تھی۔ مگر ان کا کہنا مانتے وقت بھی اُس کی آنکھیں کسی بھیانک نفرت سے دہک اُٹھتی تھیں۔ جب وہ اُسے ڈانٹتیں، پھٹکارتیں تو شمن خاموشی سے انھیں ایسے دیکھتی کہ ان کی برہمی اور آشفتگی چہار چند ہو جاتی اور چاہتیں کہ اُسے چبا ڈالیں —— یہ یقیناً ایک بڑی بہن کا کردار نہ تھا، جو شمن کی نگراں بھی تھی۔ اور جس کے کندھوں پر اس کی دیکھ بھال کی پوری ذمّہ داری تھی۔ یہ ایک سفاک اور سنگدل بہن کا کردار معلوم ہوتا ہے، جو انسانیت اور خدا ترسی کے جوہر سے محروم تھی اور جس میں نرمی اور دردمندی کا شائبہ نہ تھا۔

○ مگر انسان کی شخصیت بالعموم تہہ در تہہ ہوتی ہے اور اُسے کھولیں تو پرت پرت کھلتی چلی جاتی ہے۔ ایسے ہی آپا کی شخصیت کے بھی ایک سے زیادہ پہلو ہیں۔ اگر شمن کے تعلق سے وہ سنگدل اور بے رحم تھیں تو اپنے بچوں کے لئے وہ ایک شفیق اور غم خوار ماں تھیں جو اُن پر بے طرح جان چھڑکتی تھیں اور جن کی فلاح و بہبود اُن کے لئے حاصلِ حیات فانی تھی اور جنھیں آدرش انسان بنانے میں اُنھوں نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اُنھوں نے اپنی اولاد کو تہذیب، اخلاق اور فرمانبرداری کے ارفع نمونوں کے طور پر پیش کرنا چاہا۔ نوری کو قرآن شریف کا روز کا سبق از بر رہتا۔ وہ ننھی سی بدھنی سے چوکی پر بیٹھ کر وضو کرتی اور جائے نماز پر ماں کے برابر کھڑی ہو کر نماز پڑھتی اور دیکھنے سُننے والے

---

[1] [2] [3] عصمت چغتائی، "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص۔ ۳۰، ۳۲، ۳۴

عش عش کرتے لگتے ـــــ روز صبح اُٹھ کر سب کو سلام کرنا، کوئی مہمان آئے تو حسب حیثیت و عمر خطاب دینا، جھٹ پٹ "آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ" سنانا بچوں کا معمول تھا۔ غرضیکہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی پہلو نہ تھا جس کی جانب آپا نے اپنی پوری توجہ مبذول نہ کی ہو ـــــ خاوند کی عدم موجودگی میں آپا کا یہ کردار انھیں ہماری نظروں میں قدر و منزلت عطا کرتا ہے۔

آپا اچھی بھلی تندرست تھیں کہ انھیں عشق کا مرض بلائے ناگہانی بن کر لاحق ہو جاتا ہے اور ایکا ایکی ان کا ہاضمہ بگڑ جاتا ہے اور ان کی صحت انحطاط پذیر ہو جاتی ہے۔ انھیں گاہے گاہے دورے بھی پڑنے لگتے ہیں تو ان کا ایک رشتہ کا دیور رشید جو حال ہی میں ڈاکٹری پاس کر کے آیا تھا، آپا کے پاس آنے لگتا ہے۔ جب انھیں دورہ پڑتا تو وہ نہ جانے کہاں سے آٹپکتا۔ ان کے پاس گھنٹوں بیٹھنا اور مرض کے متعلق ہدایتیں دیتا۔ کبھی ایک آدھ انجکشن بھی ان کے بازو میں لگا دیتا۔ اور اُن کے دورے کچھ روز کے لئے تھم جاتے ـــــ مگر بڑے بھیّا کو دال میں کچھ کالا کالا دکھائی دیا اور اُنھوں نے اُس کی نگرانی شروع کر دی ـــــ اور پھر ایک دن بھیّا نے اس کے خط پکڑ لئے اور آپا سے کہہ دیا کہ اگر یہ سلسلہ فوری طور پر بند نہ ہوا تو معاملہ ابا میاں کے حضور میں پیش کر دیا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت لے دے کے بعد رشید کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی گئی اور آپا کو دورے پڑنے بند ہو گئے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ رشید سے کنارہ کشی کے بعد آپا کی جنسی تشنگی ناآسودہ رہی اور اب وہ ہم جنسیت کا شکار ہو گئیں ـــــ انھوں نے موٹچھوں والی عزیز بیگم سے دوستی کر لی اور اس سے دوپٹہ بدل کر مستقل رشتہ اُستوار کر لیا۔

آپا بہت ہوشیار اور زمانہ شناس تھیں ـــــ جب نوری نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو آپا کو شب و روز اس کی شادی کی فکر ستانے لگی اور وہ بہت ہوشیار ماں کے طور پر سامنے آئیں۔

> "ساس بہو نے مل کر لڑکا گھیرنے پر کمر باندھ لی۔ علاوہ نوری کی ذاتی صفات کے اس کی یتیمی کا سرٹیفکیٹ ہر جگہ کارآمد ثابت ہوا اور جلد ہی ایک نہایت مالدار اور اکلوتے لڑکے کو اس پر عاشق کرا لیا گیا۔ اس کے کنبے والوں نے لاکھ اودھم مچائی مگر ایک نہ چلی"[1]

اور یوں اپنی دانش مندی اور حکمت عملی سے آپا نے اپنی اکلوتی بیٹی نوری کی زندگی سنوار دی۔

آپا کی جو تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ ایک غصیل اور سنگدل عورت کی ہے جو شمن کو اپنے قہر کا نشانہ بناتی ہے۔ اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے جو آپا کو ایک مشفق، غم خوار اور فرض شناس ماں کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اُن کی شخصیت کے یہ متضاد عناصر اُسے دلچسپ اور جاذب بناتے ہیں ـــــ آپا نے نفس کو مار کر اپنی جوانی

---

[1] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۱۱

کے جذبات کو کچلنے کی کوشش کی مگر وہ فطرت کے تقاضوں کے مطابق بے قابو ہو گئے اور آپا کی بشری کمزوری نمایاں ہو کر سامنے آ گئی ـــــــ مگر ان خامیوں اور کمزوریوں کے باوصف آپا دانش مند، ہوشیار اور باتدبیر تھیں۔

آپا کا کردار بہت اہم اور پُرمعنی ہے کہ وہ ناول کی مرکزی کردار ثمن کی ماں کا رول ادا کرتی ہیں۔ پھر ثمن کی شخصیت آپا کے کردار کے ردِعمل کے طور پر اُجاگر ہو جاتی ہے۔ اور اسے گہرائی اور گیرائی ملتی ہے ـــــــ اور پھر ان کی بیٹی نوری بھی ثمن کی ہم جماعت، ہمدم اور ہمراز کے طور پر اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے آپا کا کردار بہت اہم ہے۔

○ رائے صاحب

رائے صاحب ثمن کی دوست ہم جماعت، ہم عمر پریما کے والد ہیں۔ ان کی بیوی فوت ہو چکی ہے۔ اور گھر میں تین افراد رائے صاحب، پریما اور اس کا بھائی نریندر ہیں ـــــــ ثمن اتوار کی چھٹی گذارنے پریما کے ہاں جاتی ہے تو رائے صاحب کو دیکھتے ہی ان کی شخصیت سے بے اختیار متاثر ہوتی ہے۔ چشمے کے نیچے سے جھانکتی ہوئی بڑی بڑی روشن آنکھیں، ہونٹوں میں جھولتا ہوا لمبا سا سگار، چھریرا مگر مضبوط توانا جسم، لانبا قد، تپے ہوئے سونے جیسا چمکتا دمکتا رنگ، پلاٹینم کی جھلک لئے ہوئے بے حد گھنے بال، ثمن انھیں دیکھتی ہی رہ جاتی ہے ـــــــ کئی شخصیتیں اس قدر پُرکشش، پُروقار اور جاذب نظر ہوتی ہیں کہ دیکھنے والے کو پہلی نظر میں ہی اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں، رائے صاحب ایسی ہی شخصیت کے حامل تھے۔

مگر ظاہرہ خصائص کے علاوہ رائے صاحب باطنی محاسن سے بھی متصف ہیں۔ انھیں مصوّری سے شغف ہے۔ رقص و سُرود کے نہ صرف شائق ہیں بلکہ دونوں میں ماہرانہ دسترس بھی رکھتے ہیں۔ اکثر دلچسپ قصے کہانیاں سُنا کر سامع کا مَن موہ لیتے ہیں۔ وہ باغ و بہار طبیعت کے مالک ہیں اور اپنی حسِ مزاح سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ ان کی ہر بات میں شوخی، چہل اور چھیڑ چھاڑ کا رنگ ہوتا ہے اور ان کی طبیعت میں پیار، دُلار اور محبّت و شفقت کا جذبہ ہر وقت موجزن رہتا ہے ـــــــ وہ اپنے سے بہت کم عمر لڑکے لڑکیوں میں یوں گھُل مِل جاتے ہیں۔ گویا ان کے ہم عمر اور ہم سر ہوں ـــــــ ایسے میں عمر کے تفاوت کے باوصف ثمن کی سی حسّاس، نفاست پسند، نوخیز لڑکی کا ان کی قربت کا خواہاں ہونا شاید اچنبے کی بات نہ تھی۔

رائے صاحب ثمن سے متعارف ہونے کے بعد بھی خوش دلی سے اُسے "چمن" کہہ کر ہی پکارتے رہے ـــــــ اُسے دیکھتے ہی وہ اپنی بیٹی سے کہتے ہیں کہ یہ بیچاری "کچھ بھوکی معلوم ہوتی ہے۔ ارے پریما کچھ دانہ پانی تو ڈال اس بھوکی چڑیا کے لئے"، گویا وہ اپنے خوبصورت، منفرد انداز میں اپنی بیٹی سے گھر آئی مہمان کی خاطر مدارات کرنے کے لئے کہہ رہے تھے ـــــــ وہ مذاق مذاق میں ثمن سے کہتے ہیں کہ اس کا رنگ بہت

زرد ہو رہا ہے اور ساتھ ہی اپنے پینٹنگ برش سے اس کے گال پر سُرخ رنگ لگا دیتے ہیں اور شمن شرما شرما جاتی ہے
ـــــ جب سب سوئمنگ پول میں نہاتے ہیں تو شمن تالاب کے کنارے بیٹھی خاموش تماشائی بنی دیکھتی رہتی ہے۔
جب رائے صاحب کو پریما سے معلوم ہوتا ہے کہ شمن تیرنا نہیں جانتی تو وہ تفننِ طبع کے لئے ڈبکی لگا کر شمن کو بھی پانی میں کھینچ لیتے ہیں۔ شمن غوطے کھانے لگتی ہے تو سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو جاتا ہے ـــــ یہ رائے صاحب کی رنگا رنگ شخصیت کے مختلف انداز تھے۔ جس کی مقناطیسی کشش سے شمن اندر ہی اندر اُن کی طرف کھنچی چلی جاتی ہے۔

کھنچی

جب سب اصرار کرتے ہیں کہ رائے صاحب تفریح کے طور پر اپنا رقص پیش کریں تو وہ قدرے توقف کے بعد مان جاتے ہیں ـــــ ساز بجتا رہتا ہے۔ رائے صاحب کُرتا اتار کر ہوا میں اُچھال دیتے ہیں اور دیوار کی طرف رُخ کر کے اپنے برہنہ بازوؤں کو سہلاتے ہیں۔ شمن حیرت زدہ منہ کھولے دیکھنے لگتی ہے۔ بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ رائے صاحب کا سڈول کسرتی جسم مڑ کر سُر تال پر لہرانے لگتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا ان کے جسم میں بجلیاں عود کر آئی ہیں اور ان کا رُواں رُواں انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا ہے۔ خاموش، ساکت فضا میں تیز تیز قدموں کی دھمک سے کپکپاہٹ پیدا ہو جاتی ہے ـــــ پُشت پر روشن لیمپ ان کے نقرئی گھنے بالوں کو اور زیادہ دلفریب بنا دیتا ہے ـــــ بالآخر ساز رُک جاتا ہے۔ مگر سحر زدہ شمن کا دل دیوانہ وار ناچے جاتا ہے ـــــ شمن دل ہی دل میں رائے صاحب پر مرمٹتی ہے ـــــ اور ہوسٹل واپس آکر بھی ان کی شخصیت کے سحر سے آزاد نہیں ہو پاتی۔ ملاحظہ ہو:

"نہ جانے کیوں آج اس کا دل کسی مقناطیسی طاقت کے آگے ماتھا ٹیک دینے کو چاہتا تھا۔ آج اس کے دل میں عبودیت نوخیز کلی کی طرح کھل رہی تھی۔"[1]

دل کے آنے کے بھی رنگ نرالے ہیں۔ نہ جانے کب کس پر کیوں آجائے۔ یہ جذبہ دبے پاؤں آتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھٹا بن کر چھا جاتا ہے۔

شمن کو اب رائے صاحب کی کشش ہر اتوار کو ان کے ہاں کھینچے لے جاتی ہے۔ وہ ان کے پاس بیٹھی اُن کے کُرتوں میں بٹن ٹانکتی ہے۔ اور وہ مرچ مسالہ لگا کر اسے عجیب وغریب کہانیاں سُناتے ہیں ـــــ وہ ان کے سر میں تیل ڈالتی ہے ـــــ رائے صاحب جب تنبورا لے کر نہ جانے کون سا راگ سُناتے ہیں۔ تو وہ نہ جانتے ہوئے بھی اس پر سر دُھنتی ہے ـــــ رائے صاحب پریما کی طرح کبھی کبھی شمن کے گدگدیاں کرتے۔ گال نوچ لیتے تو وہ جھینپ جاتی ـــــ نربندر شمن سے اظہارِ محبت کرتا ہے تو وہ اُسے جھٹک دیتی ہے مگر رائے صاحب اس کے دل ودماغ پر ہر وقت چھائے رہتے ہیں اور ان کی صحبت میں اُسے سکونِ قلب ملتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ

---

[1] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" (ناول) النصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۱۶۶

انھیں معبود جان کر پوجنے لگتی ہے ـــــ رائے صاحب باہر سے آتے ہیں تو شمن ان کی فرمائش پر ان کا کوٹ اُتارتی ہے ـــــ کھیل کھیل میں وہ ایک دن سوتی بن کر لیٹ جاتی ہے اور رائے صاحب اسے پلنگ پر لٹانے لگتے ہیں تو وہ انھیں دونوں ہاتھوں سے تھام لیتی ہے :

"نہیں رائے صاحب، مجھے گرائیے مت، رائے صاحب ... رائے صاحب ....
رائے صاحب میں آپ سے پریم کرتی ہوں ... میں آپ سے پریم ... رائے صاحب میں "
اس کی آواز اور گھٹ کر سہم گئی۔
"ایں چمن ... اچھا سو جاؤ" وہ جلدی سے اس کی لپٹتی ہوئی انگلیاں الگ کرنے لگے۔
"نہیں ... نہیں رائے صاحب میں مر جاؤں گی۔ رائے صاحب، مجھے رائے صاحب دور نہ کیجئے" رائے صاحب ایسے جھجکے جیسے کسی نے ان کے ماتھے پر تھپڑ مار دیا۔
"رائے صاحب میں اپنا دھرم بھی بدل دوں گی" اس نے اور قریب ہو کر کہا۔ رائے صاحب چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں[1]

یہ شمن کی طرف سے رائے صاحب سے اپنی والہانہ محبت کا بڑا کھلا اظہار تھا۔ وہ آتشیں جذبات جو نہ جانے کب سے اس کے قلب و ذہن میں مضمر تھے بالآخر اس کی نوکِ زبان پر آ گئے ـــــ مگر یہ یک طرفہ محبت کا اظہار تھا کہ رائے صاحب نے شمن کی محبت کا جواب اثبات میں نہ دیا اور وہ خاموشی سے وہاں سے چلے گئے۔

سوئے اتفاق سے رائے صاحب کو دو چار روز بعد ہی دل کا دورہ پڑا اور وہ چل بسے ـــــ مرحوم رائے صاحب کا خیال شمن کو ہر وقت ستانے لگا۔ اس نے بہتیرا چاہا کہ ان کے خیال کو بیک جنبشِ سر جھٹک دے۔ مگر وہ بھوت بن کر اس کے قلب و ذہن کو چمٹ گیا۔ چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے وہ ہر جگہ ان کا پیچھا کرتا ـــــ اس کی ذہنی کیفیت رائے صاحب سے اس کے شدتِ جذبات کی مظہر تھی۔

رائے صاحب کی جو تصویر ہمارے ذہن میں اُبھرتی ہے وہ ایک مہذب اور متمدن انسان کی ہے۔ انھیں زندگی کی اچھی چیزوں سے بے پناہ رغبت تھی۔ ان کے گھر کا رکھ رکھاؤ، مصوری سے شوق، شکار سے لگاؤ، رقص و سرود سے عشق، سب ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل تھے ـــــ وہ ہنس مکھ، شیریں زبان اور خوش خلق تھے۔ اور اپنے بیٹے بیٹی کے دوستوں کے ساتھ گھل مل کر، عمر کی تفاوت کے باوجود ان کے سے ہی ہو جاتے تھے۔ گویا انھیں اپنی امارت کا پندار نہ تھا اور وہ انسان کی قدر و قیمت کو پہچانتے تھے۔ وہ لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ان کی سطح پر اُتر کر کھیلتے کودتے

---

[1] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۰۲

اور ہنسی مذاق کرتے تھے۔ یہ ایک بڑے کشادہ دل، عالی ظرف، انسان دوست شخصیت کا کردار تھا۔۔۔۔ ثمن جب رائے صاحب سے محبت کی بھیک مانگتی ہے تو وہ جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے مقام پر ثابت قدم رہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بیٹی پریما کی دوست ثمن کو بھی اپنی بیٹی ہی جانا۔

رائے صاحب کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے کہ وہ اپنی تب و تاب سے ناول کو رنگینی اور جاذبیت عطا کرتا ہے۔۔۔۔ رائے صاحب کے تعلق سے ثمن کی جو تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ ایک ناپختہ، ناتجربہ کار، لاابالی لڑکی کی ہے، جو جذبات کے ریلے میں کچھ بھی کر گذرنے پر آمادہ دکھائی دیتی ہے۔

○ افتخار اور اس کی بیوی

افتخار یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کا صدر اور اشتراکی نظریات کا حامل ہے۔ اس کی حرکات و سکنات پر یونیورسٹی کے اربابِ بست و کشاد ہی کی نہیں بلکہ حکومت کی بھی نظر رہتی ہے۔ لہٰذا ہر شکل وصورت میں وہ ناسمجھ اور کم فہم دکھائی دیتا ہے اور بعض لوگ اسے مُفسد اور مکّار بھی گردانتے ہیں۔ مگر وہ اپنی تیز طرار زبان اور فطری چستی اور ہوشیاری سے فساد پر آمادہ ہجوم کا رُخ صلح و آشتی کی جانب اور پُرامن گروہ کا رُخ فساد کی طرف موڑ دینے کی استعداد رکھتا ہے۔ یہ بات ایک معجزہ سے کم نہیں اور اس معجزہ نمائی میں افتخار ماہر ہے اور اسی میں اس کی مقبولیت اور طاقت کا راز مضمر ہے۔

ثمن افتخار کی صلاحیتوں، خلوص اور لگن کی مداح ہے اور بغیر پلک جھپکے اس کی ہر بات پر صاد کردیتی ہے۔ افتخار سے اس کی ملاقات کبھی کبھار ہی ہوتی مگر جب بھی وہ اسے ملتی تو یوں معلوم ہوتا گویا اُسے صدیوں سے جانتی ہو۔ یہ بات ثمن کی افتخار سے دلی قربت کی مظہر تھی۔۔۔۔ نئے انتخاب میں ثمن کو یونین کا رکن بنا دیا جاتا ہے جس سے نہ صرف اس کی خود اعتمادی بڑھتی ہے بلکہ وہ مغرور اور متکبر بھی ہو جاتی ہے اور ذہنی طور پر افتخار کے اور زیادہ قریب ہو جاتی ہے۔

افتخار کو ایک عرصہ سے تپدق کا مرض لاحق ہے۔ وہ ڈاکٹروں کے مشورہ پر بھوالی سینی ٹوریم چلا جاتا ہے۔۔۔۔ ثمن کو ایک روز افتخار کا تار ملتا ہے جس میں وہ اُس سے آکر ملنے کے لئے کہتا ہے۔ گذشتہ چند ماہ میں ثمن نے اسے کچھ رقم، طاقت کی دوائیں اپنے ہاتھ کا بُنا ہوا اُونی سویٹر اور گرم کپڑے بھیجے تھے۔ درحقیقت ثمن کو افتخار سے اس قدر اُنس ہے کہ وہ اس کے لئے ہمہ وقت کچھ بھی کر گذرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ ایک طرح سے ثمن کا اُس سے پاکیزہ گہرا ناتا تھا کہ قربت کے باوصف افتخار نے کبھی اس کے جسم کو چھوا تک نہ تھا۔ وہ ثمن کو بے اختیار اپنی جانب کھینچتا۔ مگر ایک مخصوص حد سے کبھی تجاوز نہ کرتا۔ اور یوں جسمانی اعتبار سے اُن دونوں کے درمیان ہمیشہ ایک فاصلہ رہتا۔

شمن سینی ٹوریم پہنچتی ہے تو وہ افتخار کو برآمدے میں اس کی دی ہوئی رضائی پیروں میں ڈالے اور اپنا بُنا ہُوا سویٹر پہنے دیکھتی ہے۔ وہ شمن سے بہت تپاک سے ملتا ہے اور خلافِ معمول اس سے مصافحہ کرتا ہے۔ دونوں مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے ہیں۔ مثلاً پارٹی کی حالت، فنڈز کی قلت، کارکنوں کا حکومت کی نظروں سے چھُپے چھُپے پھرنا، یہ سب معاملات زیرِ بحث آتے ہیں ــــــ افتخار سینی ٹوریم کے بلوں کو جو سامنے ہی پڑے تھے، چھُپانے کی کوشش کرتا ہے تو شمن اُسے ملائمت سے ڈانٹ دیتی ہے اور تمام بِل ادا کر دیتی ہے اور سَو سَو کے چند نوٹ لفافے میں ڈال کر اس کی جانب سرکا دیتی ہے ــــــ پھر افتخار اپنی نامراد بیماری کا بھاری دل کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ فٹ پاتھ پر راتیں گذارنے اور ہوٹلوں کے بُرے بھلے کھانوں کی وجہ سے لاحق ہوئی ہے اور اس کی آنکھوں میں وہی پُرانی بغاوت کی آگ سُلگتی دکھائی دیتی ہے، جو اس کے سیاسی نظریات کی دین تھی ــــــ شمن دِل گرفتہ وہاں سے رخصت ہوتی ہے اور اس کے قلب و ذہن میں افتخار کے تئیں جذبۂ تکریم و تعظیم اور زیادہ شدّت سے بھڑک اُٹھتا ہے۔

ایک دن شمن کے اسکول میں ایک عورت اُسے ملنے آتی ہے اور بغیر اجازت ہی اس کے کمرے میں داخل ہو کر اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔ وہ عورت دو ٹوک سوال کرتی ہے کہ آیا وہ افتخار احمد کو جانتی ہے؟ شمن کے کان معاً کھڑے ہو جاتے ہیں اور اُسے کسی ناگہانی خطرے کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ اس عورت کو فوراً چلے جانے کے لئے کہتی ہے۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی اور بکمال خود اعتمادی سے اپنی جگہ پر جمی رہتی ہے اور بہت دبنگ اور نڈر انداز میں واضح کر دیتی ہے کہ وہ اپنی کہے اور اس کی سُنے بغیر وہاں سے ہرگز رخصت نہ ہوگی ــــــ جب وہ شمن کو بتاتی ہے کہ وہ افتخار احمد کی بیوی ہے اور کئی بچّوں کی ماں ہے تو وہ انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ اپنی بات کے جواز میں وہ عورت شمن کو ایک سرٹیفکیٹ نکال کر دکھاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ "حسین بی زوجہ افتخار احمد۔۔۔ قوم سیّد ہے"۔ شمن کے پیروں تلے سے زمین کھسک جاتی ہے اور وہ دَم بخود رہ جاتی ہے ــــــ پھر وہ خود ہی کہتی ہے کہ یاد آیا تمھارا نام شمشاد ہے اور افتخار تمھارا ہم جماعت تھا۔ تمھارا فوٹو بھی اس کے پاس موجود ہے اور تم اُسے روپیہ بھی دیتی رہی ہو۔ اپنے ہاتھ سے سویٹر بُن بُن کر بھی دیتی رہی ہو اور حلوے بنا بنا کر بھی اسے کھِلاتی رہی ہو۔ مگر شمن چوکنّی ہو کر ان سب باتوں سے انکار کر دیتی ہے تو وہ عورت فوراً اُسے بتاتی ہے کہ اس کا انکار بے سُود ہے کہ اس کے پاس افتخار کے نام لکھّے اس کے تمام خطوط موجود ہیں جن میں ان تمام باتوں کے حوالے درج ہیں۔ اور یہ کہہ کر وہ خطوط کے ایک بنڈل سے افتخار کے خطوط نکال کر شمن کو دے دیتی ہے، جنھیں شمن کو پڑھنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ جانتی تھی کہ ان لفافوں میں کیا ہے۔ اب حقیقت اس کے سامنے برہنہ سرناچ رہی تھی ــــــ اس عورت نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ نہ جانے افتخار کے کتنے معاشقے جاری ہیں۔ کتنی عورتوں نے اس کے باقاعدہ وظیفے باندھ رکھّے ہیں اور اس کے سینی ٹوریم جانے

کی تہہ میں بھی کوئی راز پنہاں ہے ـــــ شمن پر یہ بات آشکار ہوجاتی ہے کہ اُسے اپنی عزت اور ناموس کے تحفظ کے لئے اس عورت کا منہ بند کرنا ازبس ضروری ہے ۔ بدیں وجہ "دہن سگ بلقمہ دوختہ بہ" کے مصداق وہ اپنے بُندے اور چوڑیاں اُتار کر اُسے بھینٹ کر دیتی ہے ۔ وہ عورت تقاضا کرتی ہے کہ اگر اس کے پاس کچھ رقم پڑی ہو تو اُسے دے دے۔ شمن بٹوہ جھاڑ کر سب رقم اس کے حوالے کر دیتی ہے ۔ اور وہ اُسے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوجاتی ہے اور شمن افتخار کو لکھے اپنے لاوارث خطوط کو خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی رہ جاتی ہے ۔

اب افتخار ایک بیحد ہوشیار، مکار اور عیار شخص کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے، جس نے کئی مکھوٹے پہن رکھے تھے ۔ وہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کا صدر تھا، جو ایک باوقار اور بارعب عہدہ تھا ۔ اس کی غیر معمولی خطابت اور بے باکی سے کالج کے منتظمین بھی اس سے خوف کھاتے تھے اور طلباء کے حلقہ میں بھی وہ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا ـــــ پھر وہ کہنے کو ایک اشتراکی تھا جس پر حکومتِ وقت کی کڑی نظر رہتی تھی ۔ ـــ وہ ایک آدرش وادی بنتا تھا اور مثالی دوست، مثالی انسان اور اخلاق کا مرقع بھی ـــــ شمن سے اس کا بڑا گہرا ذہنی اور قلبی تعلق تھا ـــــ مگر جب اس کی بیوی منظر پر آتی ہے اور اپنے حیران کن انکشافات سے وہ تمام نقاب اور مکھوٹے جو اس نے پہن رکھے تھے انھیں نوچ کر پرے پھینک دیتی ہے اور اسے اپنی اصلی اور ننگی حالت میں بیچ چوراہے لا کھڑا کرتی ہے ۔ وہ نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ اس کے بچے بھی ہیں ۔ پھر اس کی نہ جانے کتنی محبوبائیں ہیں جنھوں نے اس کے وظیفے باندھ رکھے ہیں ۔ ان کے اعتماد میں لکھے خفیہ خطوط کو وہ اپنی بیوی کو دے دیتا تاکہ وہ انھیں راز افشا کرنے کا خوف دلا کر بلیک میل کر سکے ۔ یہ ایک بہت گھناؤنا، مجرمانہ، غیر انسانی فعل تھا ـــــ اس کی دوست اور محبوبائیں ازراہِ عقیدت اُسے جو تحائف نذر کرتیں وہ انھیں بھی اپنی بیوی کے سپرد کر دیتا تاکہ وہ انھیں اپنے مصرف میں لائے ۔ یہ اس کی محبوباؤں کے پرخلوص اور بے لوث جذبات کی صریحاً تضحیک و تحقیر تھی ـــــ یہ بھی شک ہوتا ہے کہ کہیں وہ اپنی بیوی کے اشتراکِ عمل سے اوروں کو ٹھگنے اور بلیک میل کرنے کا دھندا تو نہیں کرتا تھا ۔ ورنہ اسے ان کے خطوط کا اپنی بیوی کو دینے کا کیا جواز ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ وہ دھونس اور دھمکی سے روپیہ بٹور سکے ـــــ درحقیقت انسان کی شخصیت بڑی پُرپیچ اور تہہ دار واقع ہوئی ہے اور اس کے قلب و ذہن کے اسرار و رموز کو پا جانا چنداں آسان نہیں ۔

افتخار احمد اس ناول کا بہت اہم کردار ہے کہ اس کے درجنوں کرداروں میں وہ اس کی مرکزی کردار شمن سے ذہنی طور پر سب سے زیادہ قریب ہے ۔ شمن کے نزدیک وہ ایک آئیڈیل انسان تھا جس کی وہ دل کی گہرائیوں سے عزت کرتی تھی لیکن اس کی بیوی کے انکشافات نے اس کا بھرم توڑ دیا ـــــ درحقیقت اس کا بھید کھل جانے سے شمن کا اپنا عکس بھی دھندلا سا جاتا ہے کہ اس قدر قربت کے باوصف وہ اُسے قطعاً پہچان

نہ پائی ـــــ افتخار کی پُر تضاد شخصیت ہمارے ذہن پر اپنا تاثر چھوڑ جاتی ہے اور اس کی بیوی اپنے بیباک اور نڈر طرزِ عمل سے اس تاثر کو دوچند کر دیتی ہے۔

○ اعجاز عُرف اجّو

اعجاز شمن کا خالہ زاد بھائی تھا جو ان کے ہاں قیام پذیر تھا۔ وہ نہ صرف شکل و صورت بلکہ حرکات و سکنات کے اعتبار سے بھی حیوانِ مطلق تھا۔ وہ بس احمقوں کی طرح بیٹھا بیٹھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دوسروں کو تکا کرتا۔ کسی سے لڑنا جھگڑنا، اُلجھنا اس کی سرشت میں نہ تھا۔ وہ نہ صرف یتیم تھا بلکہ یتیم صُورت بھی تھا ـــــ اسے کھانے سے بے پناہ رغبت تھی اور بھر پیٹ کھانے کے بعد بھی وہ بھوکا ہی رہتا۔ اچھے بُرے کھانے میں وہ کوئی امتیاز نہ رکھتا۔ جو کچھ سامنے آتا بے تکلف و بے تردّد نگل جاتا۔ کھانا ختم کر کے وہ کبھی کُلّی نہ کرتا تاکہ منہ میں کھانے کا اثر تھوڑی دیر برقرار رہے۔ ـــــ ایک تو وہ فطرتاً غلیظ واقع ہُوا تھا، دُوسرے وہ نہانے دھونے کے بعد بھی بدرنگ اور بے رونق سا دکھائی دیتا تھا ـــــ اس کے عجیب و غریب اطوار اور عادات کے سبب سب اُسے نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اپنے سے کم تر اور کہتر سمجھتے تھے۔

ایک دن کم فہم اور کم شعور خالہ کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ سب کی موجودگی میں شمن سے اجّو کی منگنی کا ذکر چھیڑ دیتی ہے۔ سب انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ کہاں شمن کہاں اجّو۔ شمن جل بھُن کر راکھ ہو جاتی ہے مگر اجّو کے رویہّ میں حیرت انگیز تغیّر پیدا ہوتا ہے۔ اب وہ شمن کو دیکھتے ہی شرما کر جھینپ سا جاتا ہے۔ اس میں دامادوں کا سا تکلّف اور حجاب عود کر آتا ہے۔ مگر شمن اس پر نگاہِ غلط انداز بھی نہیں ڈالتی ـــــ رات کو اجّو اپنا پلنگ شمن کے پلنگ کے برابر لگانے لگتا ہے اور جب شمن کی آنکھ کھُلتی ہے تو وہ اجّو کا ہاتھ اپنے جسم پر رینگتا ہُوا پاتی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ شمن کو لے کر ایک شدید جذبے کی گرفت میں ہے ـــــ اور اس میں دن بدن شمن سے قربت اور محبت کا جذبہ فزوں تر ہوتا جاتا ہے۔ وہ رات کو اس کے سرہانے یا پائینتی کھڑا نظر آتا ہے۔ شمن کی ایک روز آنکھ کھُلتی ہے تو دیکھتی ہے کہ وہ اس کے بالوں میں منہ دیئے سِسکیاں لے رہا ہے۔ شمن نے غصّے میں چپل اُٹھا کر اسے زور سے ماری مگر وہ اس کی زد سے باہر ہو گیا ـــــ دوسرے دن گھر کے سب کونے کھدرے چھان مارے گئے مگر چپّل نہ ملی۔ سب حیران تھے کہ آخر وہ چپّل کیا ہوئی۔

اجّو کو لُو لگنے سے شدید بخار ہو جاتا ہے اور اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ گھر کے سب افراد باری باری اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ شمن بھی طوعاً کرہاً اُن میں شامل ہو جاتی ہے ـــــ دوسرے دن اجّو کا بخار اُتر جاتا ہے اور جب اس کا بستر بدلنے لگتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ شمن کی کھوئی ہوئی چپّل دونوں ہاتھوں میں بھینچے ہوئے بستر پر اوندھا پڑا ہے ـــــ یہ شمن سے اجّو کے خاموش اور بے زبان عشق کا بیّن ثبوت تھا۔

کافی عرصے کے بعد کالج سے لوٹتے ہوئے اعجاز شمن کے ہاں چند روز کے لئے آجاتا ہے۔ مگر اب وہ پُرانا شکستہ وخستہ، بھونڈا اور بھدا، بدوضع، سوکھا سڑا اعجاز نہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کایا کلپ ہوگیا ہے۔ اب وہ ایک وجیہہ، جاذب شکل، خوش پوش، مہذب نوجوان تھا۔ اس کی جھینپ اور احساسِ کمتری کافور ہوچکے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر پڑے تالے بھی کھل گئے تھے۔ اور اس کی چرب زبانی، خوش دلی اور حاضر جوابی بے اختیار متاثر کرتی تھی۔ شمن کے سامنے آتے ہی وہ اسے خارہ شگاف نگاہوں سے دیکھتا جو اس کے آرپار ہوجاتیں ــــ اس کی نگاہ میں بھوک تھی، ارمان تھے حسرت تھی، سب کچھ ہی تو تھا۔

گھر کے سب افراد اسے ایک نادر الوجود شخص سمجھ کر لپٹ لپٹ جاتے ہیں۔ وہ اعجاز جس کا کبھی کوئی پُرسانِ حال نہ تھا آج سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، سب اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ اور اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ سب کو یقین تھا کہ تحصیلِ علم کے بعد وہ ایک اچھے عہدے پر فائز ہوگا ــــ اور پھر اب وہ اپنے مرحوم چچا کی گراں بہا جائیداد کا وارث تھا۔ گویا قرائن بتا رہے تھے کہ اس کا مستقبل روشن اور تابندہ ہے ــــ اور اس اعتبار سے وہ ایک داماد بننے کا مستحق ہے ــــ یکے بعد دیگرے گھر کی تمام لڑکیوں کے بارے میں اس کا عندیہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے مگر وہ ناک چڑھا اپنے ہی نشے میں چُور سب کو کسی نہ کسی بہانے رد کر دیتا ہے۔

ــــ اعجاز بہت کوشش کرتا ہے کہ شمن اس کی طرف مائل ہو مگر وُہ اسے گھاس نہیں ڈالتی کہ اس کی نظر میں وہ اب بھی پُرانا اجّو ہے، احمق، بودم بے دال۔ وہ جب بھی اس کے قریب ہو کر بیٹھتا ہے، شمن خاموشی سے اُٹھ کر چل دیتی ہے۔ آخر وہ جان جاتا ہے کہ ان تلوں میں تیل نہیں کہ شمن اب بھی وہی ہٹیلی اور ضدّی لڑکی ہے جس نے رات کو اجّو کو چپل دے ماری تھی اور اجّو آج بھی اس کی نظروں میں وہی گھٹیا اور پست اجّو ہے۔ اجّو اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا ہے ــــ کینہ پرور شمن اعجاز کی خفّت پر دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے۔

اعجاز کے رُخصت ہونے سے پیشتر شمن کے والد چاہتے ہیں کہ شمن سے اجّو کی شادی کی بات طے ہوجائے۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ اعجاز سے بات کرتے، شمن ان کا عندیہ بھانپ کر نوری سے کہہ دیتی ہے کہ "وہ اعجاز کے علاوہ ہر جانور سے شادی کرسکتی ہے۔" اس پر بہت واویلا اور شور وغل ہوتا ہے۔ رونے دھونے کا ڈھونگ بھی رچا جاتا ہے۔ مگر کالج پہنچنے پر شمن صاف صاف انکار کر دیتی ہے۔ اور "اس قدر بے حیائی کے ساتھ کہ یہ سانحہ خاندان میں تاریخ بن گیا۔ شمن کی گھر والوں کے ساتھ یہ کھُلی بغاوت تھی۔ اور وُہ اپنے مَوقف پر پہاڑ کی طرح اٹل رہتی ہے۔ "اس نے سب کے مُنہ پر طمانچہ مار دیا۔ دل توڑ دیئے امیدیں خاک میں ملا دیں اوہ کتنی ظالم تھی وُہ۔"[1]

---

[1] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۲۲

اعجاز کا کردار ظاہر کرتا ہے کہ تعلیم و تربیت اور دولت کس طرح انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے انھیں تب و تاب عطا کرتی ہیں۔ اس کی روکھی پھیکی اور بے آب و رنگ شخصیت کو نکھارتی اور سنوارتی ہیں۔ خود اعتمادی کے فقدان کا قلع قمع کر کے اسے پُر اعتماد بناتی ہیں۔ اور اس کی زبان پر پڑے قفل کو کھول کر اسے خوش گفتار بناتی ہیں ___ گویا وہ ایک ایسی شمع جلاتے ہیں جس کی ضو سے اس کا ظاہر و باطن جگمگا اٹھتا ہے۔

اعجاز کا کردار ضمنی طور پر شمن کے کردار پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور وہ ایک بے حد ہٹیلی، غصیل، سرکش اور خود پسند لڑکی کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ وہ اصلاً باغی واقع ہوئی ہے۔ انتقامی جذبہ بھی بڑی شدّت سے اُس میں بروئے کار رہتا ہے۔ ایک دفعہ اعجاز کو دل و دماغ سے اُتار دینے کے بعد اب وہ کسی بھی قیمت پر اسے مُنہ لگانے پر رضامند نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ وہ ماں باپ کے اصرار کو بھی پائے حقارت سے ٹھکرا دیتی ہے۔ یہ خصائص ایک مضبوط، بے لچک، پُر اعتماد شخصیت کو آشکار کرتے ہیں۔

اعجاز کا کردار اپنی توام شخصیت کے سبب قاری پر اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ وہ نہ صرف ناول کو دلچسپ اور جاذب بناتا ہے بلکہ شمن کے کردار کے کئی پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

○ نوری

نوری شمن کی آپا بی کی بیٹی ہے۔ وہ ایک سیدھی سادی معصوم فطرت لڑکی کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ عام بچّوں کی طرح گڑیا گڈّے سے کھیلی، تھوڑی بہت تعلیم پائی اور شادی کے بندھن میں بندھ کر امورِ خانہ داری میں ڈوب گئی۔ اس میں کوئی انفرادیت دکھائی نہیں دیتی جو اسے دوسروں سے ممیّز کر سکے۔ مگر ناول کے مخصوص سیاق و سباق میں شمن کے تعلّق سے اس کی اہمیّت بڑھ جاتی ہے اور اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

نوری ایک طرح سے شمن کی حریف بن جاتی ہے اور اپنی والدہ آپا بی کے زیرِ اثر شمن کو نیچا دکھانے اور اُسے اوروں کی نظروں میں ذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ شمن کا حق خواہ وہ اوروں سے پیار پانے کا ہو یا تحفہ حاصل کرنے کا، چھین لیتی ہے۔ شادی کے بعد جب منجھو بی گھر آتی ہے تو شمن کی ہیئتِ کذائی کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے نوری کہتی ہے:

"گندی ہے یہ بھنگن کی لونڈیا۔ نوری اترائی اور منجھو کی گود میں چڑھ بیٹھی۔"[1]

اور پھر:

"خالہ جان شمن مہترانی کی لڑکی ہیں یہ۔ انھیں نانی نے بھنگن سے دو پیسے کو لیا تھا۔"[2]

شمن کو منجھو بی نے پالا تھا اور ان پر شمن کا حق نوری سے کم نہ تھا، مگر نوری اس حق کو چھین لیتی ہے اور شمن

---

[1] ، [2] عصمت چغتائی، "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۳۰، ۳۱

کس مپرسی کے عالم میں آنسو بہاتی رہ جاتی ہے ۔۔۔ یوں نوری اپنے دل میں شمن کے تئیں کوئی بغض و عناد نہیں رکھتی۔ مگر گھروالوں نے ہمیشہ اس کا مقابلہ شمن سے کر کے جہاں اس میں احساسِ برتری پیدا کر دیا، وہیں شمن احساسِ کہتری کا شکار ہوگئی۔

مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا نوری اور شمن میں فاصلہ کم ہوتا گیا کہ دونوں ہم عمر تھیں اور پھر ان میں خون کا رشتہ بھی تھا۔ اور ان کی دوستی آخری عمر تک قائم رہی۔ وہ کبھی کبھار لڑتیں جھگڑتیں، روٹھتیں مگر پھر شیر و شکر ہو جاتیں۔

نوری کی شادی کی خبر ملتے ہی شمن گھر جاتی ہے تو اُسے:

"نوری اندر کمرے میں مائیوں بیٹھی ملی۔ شمن کو دیکھ کر وہ اس سے لپٹ گئی ۔۔۔ نہ جانے کیوں دونوں طرف سے پیار اُبل پڑا۔ بڑی محبت سے دونوں ایک ہی رضائی میں لپٹ کر سوئیں اور رات گئے تک باتیں کرتی رہیں"[1]

شادی کے بعد نوری میں حیرت انگیز تبدیلی آئی۔ اس کی ساری شوخی اور چلبلاہٹ کافور ہوگئی۔ بطور ایک خانہ دار عورت کے اسے اپنی بزرگی کا احساس ہونے لگا اور وہ گھر کی چار دیواری میں سمٹ کر رہ گئی۔

اپنے آپ میں نوری کے کردار میں کوئی انفرادیت، جاذبیت یا دلچسپی نہیں۔ مگر شمن کے تعلق سے اس کا کردار دلچسپ لگنے لگتا ہے۔ اور اُس کا رول انفعالی ہوتے ہوئے بھی ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرتا ہے۔ گو وہ ہمارے قلب و ذہن پر دیرپا اثر نہیں چھوڑتا۔

○ رونی ٹیلر

رونی ٹیلر ایک آرٹسٹ تھا جو انگریز فوج میں بھرتی ہونے سے پیشتر کسی اخبار کا نمائندہ تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور ادب کا دلدادہ شخص تھا۔

وہ ہندوستانیوں کے جذبات و احساسات کی قدر کرتا تھا اور ان کے تئیں اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات موجزن رہتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان کی غلامی کے اسباب کیا ہیں اور وہ غلامی کے جوئے کو کیوں کر اتار پھینک سکتا ہے۔ وہ ہندوستان سے اپنے لگاؤ کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

"مجھے ہندوستان سے لگاؤ ہے۔ اسے زخمی دیکھ کر میرا دل دُکھ رہا ہے۔ مجھے وہ دُنیا کا ایک عضو نظر آرہا ہے، اس دُنیا کا ایک ٹکڑا جو میری ہے"[2]

وہ فطرتاً بڑا خوش مزاج اور زندہ دل واقع ہُوا تھا اور ہنسی خوشی زندگی گذارنا اس کا نصب العین تھا۔ وہ

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۳۳، ۴۳۸

شمن سے آپسی تصادم اور ٹکراؤ سے گریز کرتا اور اسے بھی نرم اور ملائم رویّہ اپنانے کی تلقین کرتا۔ مگر شمن جب تند و تیز لب و لہجہ اختیار کرتی اور تلخ و ترش زبان استعمال کرتی تو وہ بھی برہمی اور آشفتگی کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکتا۔ مگر وہ شمن کی طرح جوش میں ہوش نہیں کھوتا اور بحث و تمحیص میں اس کے دلائل منطقی اور عقلی ہوتے جن سے اس کے علم اور عقل و دانش کا بڑا واضح اظہار ہوتا ــــ جب شمن اس سے کہتی کہ انگریزی حکومت اپنی شاطرانہ حکمتِ عملی سے ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتی ہے تو وہ بجا طور پر کہتا کہ اُسے الزام دینے کی بجائے ہندوستانی خود متحد ہو کر حکومت کی ریشہ دوانیوں کا مؤثر جواب کیوں نہیں دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تم ہندوستانی ہی آپس میں دست و گریبان رہتے ہو تو ایسے میں کون تمھیں آزادی عطا کرے گا۔ اور پھر آزادی کشکولِ گدائی ہاتھ میں لے کر مانگی نہیں جاتی بلکہ وہ غاصب کے ہاتھ سے طاقت کے زور سے چھین لی جاتی ہے ــــ خوبی یہ ہے کہ بحث کی حدّت اور شدّت میں بھی ٹیلر کی حسِ مزاح بروئے کار رہتی اور وہ بیچ بیچ میں شمن کے چٹکیاں بھی لیتا جاتا۔

ٹیلر کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں محبّت کے نرم گرم جذبات سے لبریز دل دھڑکتا تھا۔ ہزاروں میل دُور بیٹھے اُسے رہ رہ کر اپنی منگیتر کی یاد ستاتی اور وہ صبر و قرار کھو دیتا۔ اُس سے رخصت ہوتے وقت اس کا دل ٹوٹ ٹوٹ گیا تھا مگر اب وہ اس کے خطوں کا جواب تک دینے کی روادار نہ تھی۔ اس کی بیوفائی ٹیلر کے قلب و جگر پر چرکے لگاتی معلوم ہوتی تھی ــــ اس کا خیال تھا کہ محبّت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی کہ جب محبّت کا اثبات میں جواب نہیں ملتا تو وہ از خود مرجھا جاتی ہے ــــ ٹیلر کو غریب الوطنی میں اپنی بہن کی یاد بھی ستاتی جس سے اسے بے حد محبّت تھی۔ وہ بہت شوخ و شنگ مگر بڑی پیاری تھی اور وہ ہمیشہ اُسے پیار بھرے طعنے دے کر چڑایا کرتا تھا۔ کئی لڑکے اس پر فریفتہ تھے۔ اور وہ ٹیلر کو اس کے جھینپوپن کی وجہ سے بدھو سمجھتی تھی ــــ اُسے اپنی پیاری عمر رسیدہ مادرِ مہربان سے بھی بہت لگاؤ تھا، جس سے اُس کے بچپن کی سہانی یادیں وابستہ تھیں ــــ اس طرح ٹیلر ایک گداز دل محبت کرنے والے انسان کے طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے اور متاثر کرتا ہے۔

ایلما جب ٹیلر سے شمن کا تعارف کراتی ہے تو وہ جلد ہی اُس کی جانب کھنچ جاتا ہے اور فلم دیکھتے ہوئے وہ جتنی بار اس کی جانب دیکھتی ہے اُسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتی ہے ــــ پھر جب ٹیلر اس کے ساتھ گھر سے باہر جاتے ہوئے اُسے ماتھے پر بندیا لگانے کے لئے کہتا ہے تو وہ ایک طرح سے اپنے مخصوص مہذب انداز میں اُس سے اظہارِ محبّت کرتا ہے ــــ اور جب وہ غور و فکر کے بعد اپنے دل میں شمن سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کی بابت ٹھان لیتا ہے تو وہ اپنی راہ میں کسی رکاوٹ کو برداشت نہیں کر سکتا اور شمن سے کہتا ہے:

> "چپ رہو ــــ میں تمھارے اور اپنے درمیان کسی دُنیا کو نہیں لانا چاہتا۔ ایک خیال ہے اور وہ یہ کہ میں اور تم قریب تر ہو جائیں ــــ میری ماں بڑی اچھی ہے۔ وہ بہت خوش ہو گی۔" (ص ۴۳۸)

مگر شادی کے تھوڑے عرصہ بعد ہی ملمع اُتر گیا۔ تصنع و بناوٹ کی جگہ حقیقت اور اصلیت نے لے لی۔ درحقیقت دونوں کے دلوں میں، خاص طور پر شمن کے دل میں کچھ گرہیں تھیں جو شادی کا بندھن بھی کھول نہ سکا۔ شک و شبہات نے پھر سے آنکھ کھول دی اور دبی ہوئی نفرت و حقارت اپنی تمام تر شدت کے ساتھ عود کر آئی۔ ایک، دوسرے کی اچھائیاں بُرائیوں میں بدل گئیں اور فاصلے بڑھتے گئے۔ انھیں اپنی قربت سے خوف سا لگنے لگا اور وہ اپنے ملاپ کو بے ڈھنگا اور بے تکا سمجھنے لگے ـــــ پونا میں بھی ٹیلر کی زندگی سلجھنے کی بجائے اور زیادہ اُلجھ گئی۔ ہر کوئی انھیں شک کی نظر سے دیکھتا۔ دوست احباب، اڑوسی پڑوسی، رفقائے کار سب متجسّس تھے کہ اس بے جوڑ شادی کی پوری داستان سُنیں ـــــ اور تو اور ٹیلر کے افسر نے بھی اس کی شادی کو سیاسی نقطۂ نظر سے معیوب ٹھہرایا کہ وہ آقا اور محکوم کے روایتی رشتوں کے خلاف تھی۔ نتیجہ یہ کہ ٹیلر نے وضاحتیں پیش کرتے کرتے اپنی خوداعتمادی بھی کھو دی۔

وہ دونوں ہر وقت تلخ و ترش مباحث میں اُلجھے رہتے۔ دو قوموں سے متعلق بحث کو انھوں نے ذاتی جھگڑے اور تُو تُو مَیں مَیں کا رنگ دے دیا۔ اور گفتنی ناگفتنی کی تمیز بھی کھو دی۔ ٹیلر نے ایک روز زچ ہو کر کہا:

"اپنی ساری قوم کا دبا ہوا جذبۂ انتقام تم میرے ہی سر پر ختم کر دو گی"[1]

شمن نے غصّہ سے اُبلتے ہوئے کہا:

"تم لوگ انسان بن ہی نہیں سکتے۔ لاکھ خول چڑھالو حقیقت تم بھیڑیوں کا راز فاش کر کے رہے گی خونخوار درندے جھوٹے اور فریبی کہیں کے"

"خاموش، بدتمیز"

"ہنہ بدتمیز! چور کو چور اور حیوان کو حیوان کہنا بدتمیزی نہیں راست گوئی ہے۔ تم جیسے لٹیرے"[2]

یہ میاں بیوی کا ایک عام جھگڑا نہ تھا جو تیز و تند ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر پیار محبت کی ایک زیریں لہر سموئے رہتا ہے اور جوان کے باہمی اعتماد اور اٹوٹ رشتے کا ضامن و امین ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دو متخالف طبائع کا بے محابہ ٹکراؤ معلوم ہوتا ہے جو ایک دوسرے کی جان کے لاگو تھے ـــــ ٹیلر اس روز روز کی جھک جھک سے، جس نے اُن کی ازدواجی زندگی میں بس گھول دیا تھا، آزردہ خاطر ہو کر شمن سے کہتا ہے:

"ہم نے سخت غلطی کی"

"حد سے زیادہ بڑی حماقت"

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۴۶۲، ۴۶۳

"کیسے بُجھتی جائے گی یہ دوزخ۔"

"کیا ضرورت ہے کہ بُجھتی ہی جائے۔ اگر زہر کھا لیا جائے تو قے کیوں نہ کر دی جائے۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"مطلب یہ کہ دو زندگیوں کو قبر میں جھونکنے سے بہتر ہے تم اپنا منہ اُدھر کر لو، ہم اپنا منہ اِدھر کر لیں۔"[1]

اور پھر:

"چُپ کمبخت۔ گلاب کے پھولوں کو چھوڑ کر میں نے بھنو ہر سے ناتا جوڑا۔"

"اور تم بڑے حسن کے پُتلے ہو۔ کوڑھ جیسی رنگت سڑے ہوئے دانت بندر کہیں کے۔"[2]

یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ ان کی ازدواجی زندگی روز روز کے تنازعات اور تلفریقات کی تاب نہ لا کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی تھی ـــــ یہ باہمی دشنام طرازی اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہوئی اور ٹیلر نے اس نا مختتم بک بک جھک جھک سے تنگ آ کر بالآخر شمن سے کنارہ کشی کرنے کی سوچ لی کہ ایسی نام نہاد رفاقت سے کیا لینا دینا جو دائمی مخاصمت میں بدل جائے اور زندگی اجیرن کر دے۔

ٹیلر شمن کو "خدا حافظ" کہے بغیر خاموشی سے دہلی روانہ ہو گیا اور وہاں سے جنگی محاذ پر چلا گیا۔

ٹیلر کا کردار اس ناول کے تمام مرد کرداروں میں شاید سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس نے اُسے ایک انوکھی وسعت اور گہرائی عطا کی ہے۔ ایک نئی جاذبیت اور دل کشی بخشی ہے۔ پھر وہ ناول کی مرکزی کردار شمن کا شوہر بھی ہے۔ اور اس کے کردار کے کئی مستور پہلوؤں کو نمایاں کرتا تھا ـــــ شمن اس کے چلے جانے کے بعد کفِ افسوس ملتی رہ جاتی ہے اور چاہتی ہے کہ ٹیلر کسی طور واپس آ جائے اور ان کی گھریلو زندگی جی اُٹھے مگر یہ گئے وقت کو آواز دینے والی بات تھی۔

○ رسُول فاطمہ

رسُول فاطمہ شمن کی رُوم میٹ ہے، بدشکل اور سوکھی سڑی سی۔

"اس کی باہر کو اُبلی ہوئی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی اور بے رونق تھیں جیسے چپٹی تھالی میں دو مینڈک رکھے ہوں۔"[3]

اُس کے چہرے مہرے سے بے کسی، مفلسی اور بیوقوفی جھلکتی ہے۔ شمن کو اس کی آنکھوں کو دیکھ کر لامحالہ غصّہ

---

[1] [2] [3] عصمت چغتائی، "ٹیڑھی لکیر" (ناول) ۴۹۴، ۴۹۵، ۸۰

آنے لگتا شمن کبھی اس سے سیدھے مُنہ بات نہ کرتی اور بات بے بات جھاڑ پھٹکار دیتی۔ مگر وہ شمن کی خفگی اور برہمی کو ایک عاشقِ صادق کی طرح بڑی خندہ پیشانی، تحمّل اور برُدباری سے برداشت کرتی اور اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر مُسکراتی ——— رات کو وہ اپنا پلنگ شمن کے پاس سرکا لیتی اور سوتے میں شمن اس کا ہاتھ اپنے جسم پر رینگتا محسوس کرتی مگر پہلو بدل کر خاموش لیٹی رہتی۔ اور صبح اُٹھ کر اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ کرتی۔ وہ اندر ہی اندر غم و غصّہ سے اُبلتی مگر رسُول فاطمہ بڑے اطمینان سے اس کا تازہ رنگا ہُوا دوپٹہ چُنتی دکھائی دیتی ———

رسُول فاطمہ شمن کے نام اپنے رقعہ میں کلیجہ چیر کر رکھ دیتی ہے اور گڑگڑا کر محبّت کی بھیک مانگتی ہے۔

"۔۔۔ اگر ایسی ہی مجھ سے نفرت ہے تو اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دو۔ یہ تم نے کیا جادو کر دیا ہے۔ ایک دفعہ اپنے پیروں پر سر رکھ معافی مانگ لینے دو۔"[1]

مگر شمن ٹس سے مس نہیں ہوتی ——— درحقیقت رسُول فاطمہ جنسی کجروی کا بُری طرح شکار تھی اور شمن سے وہ اس کی تکمیل چاہتی تھی مگر شمن کو اس کی شکل و صورت سے ہی کراہت ہوتی تھی۔ وہ اسے اپنے سے جتنا دُور رکھنا چاہتی۔ رسول فاطمہ اُتنا ہی اُس سے لپٹنے کی کوشش کرتی ——— ایک رات اتفاق سے وہ دونوں نماز کے کمرے میں دُعا مانگ رہی تھیں کہ شمن چپکے سے اُٹھی اور باہر نکل کر دروازے کی کُنڈی چڑھا دی اور سیدھی اپنے کمرے میں آگئی اور دیر تک آپ ہی آپ ہنستی رہی۔ اندر سے شمن کو ایک دفعہ رسُول فاطمہ نے پکارا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

رسول فاطمہ کا کردار اپنی کجروی کی وجہ سے ہمیں متاثر کرتا ہے اور قاری اُسے بھول نہیں سکتا ——— اپنے آپ میں بھلے ہی اس کا کردار زیادہ اہمیت کا حامل دکھائی نہ دے مگر ناول کے مخصُوص سیاق و سباق میں اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

○ مس چرن

اسکول میں شمن کو ایک نئی استانی مس چرن سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ دیکھنے میں کم عُمر کی معلُوم ہوتی ہے اور شمن کی شرارتوں اور شوخیوں کو دیدہ دانستہ نظر انداز کر دیتی ہے۔ چند ہی دنوں میں وہ شمن پر کئی ذمّہ داریوں کا بار ڈال دیتی ہے۔ اب شمن کلاس کی مانیٹر تھی اور مس چرن کے چھوٹے موٹے ذاتی کام بھی اس کے سپرد تھے۔ وہ شمن سے ایک ہم عمر سہیلی کا سا برتاؤ کرتی تھی۔ شمن اس کے کمرے میں جاتی تو وہ اسے کُرسی پر بیٹھنے کو کہتی اور چائے اور شربت سے تواضع کرتی۔ اس کی گفتگو کا انداز بھی پیار بھرا اور دوستانہ ہوتا ——— مس چرن نے شمن کو اسکول کے علاوہ بھی کام دینا شروع کر دیا اور ڈبل پروموشن دے کر دو درجے اُوپر چڑھا دیا۔ منجھو کے بعد مس چرن پہلی عورت تھی

---

[1] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۸۴

جس نے شمن کو متاثر کیا۔ مس چرن کے ہر حکم پر وہ لبیک کہتی اور اس کا مشکل سے مشکل کام کرنے پر آمادہ رہتی۔ شمن جب مس چرن کے کمرے میں پڑھتی تو مس چرن کا ہلکے ہلکے گنگنانا فضا کو یوں ہموار اور خوشگوار بنا دیتا کہ اس کے سوالوں کی الجھی ہوئی گتھیاں از خود سلجھ جاتیں ـــــ آہستہ آہستہ اسے مس چرن اپنے رگ و ریشے میں سماتی اور خوابوں اور خیالوں میں گھر کرتی محسوس ہونے لگی۔ اسے مس چرن کی ہر چیز، ہر بات، ہر ادا خوبصورت اور دل خوش کن دکھائی دیتی ـــــ ایک رات وہ نیند میں ہی چلتے ہوئے مس چرن کے کمرے کے باہر پہنچ گئی ـــــ چند روز بعد اس نے رات کو خود کو مس چرن کے کمرے کے باہر روتا ہوا پایا ـــــ اوروں سے یہ بات چھپی نہ رہی اور ہوتے ہوتے پرنسپل کے کانوں تک پہنچی اور انھوں نے مس چرن کو بلا کر سرزنش کی کہ وہ لڑکیوں کا اخلاق بگاڑ رہی ہے ـــــ اور پھر ایک رات شمن اپنے آپ کو مس چرن کے کمرے میں ان کے بیڈ میں لیٹا ہوا پا کر ششدر رہ گئی۔ پرنسپل وہاں ٹارچ لیے چوغہ پہنے کھڑی تھی۔ شمن کو گھسیٹ کر اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا ـــــ دوسرے دن پرنسپل نے شمن سے بہت سوال کیے مگر اس نے چپ سادھے رکھی۔ پرنسپل اور مس چرن میں بھی اس معاملے پر ترش کلامی ہوئی اور وہ خاموشی سے بغیر کسی کو ملے اسکول چھوڑ کر چلی گئی۔

مس چرن کا کردار دلچسپ اور جاذب ہے کہ اس نے اپنے رویّے سے شمن میں ہم جنسی کے جذبہ کو بیدار کیا اور یہ قباحت اس کے اسکولی دور میں فزوں تر ہوتی گئی۔ مس چرن ہمارے ذہن پر اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے، ہلکا سا ہی سہی۔

○ ایلما

ایلما شمن کی سہیلی، نوجوان، خوبرو، ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ وہ آزاد محبّت یا "فری سیکس" کی قائل ہے۔ کسی فرد واحد کے ساتھ عمر بھر منسلک رہنا اسے ہر گز گوارا نہیں کہ اُسے اس میں عورت کی توہین اور تذلیل دکھائی دیتی ہے ـــــ وہ مذہب سے بھی بیگانہ و بے نیاز ہے۔ اس کے کمرے میں بھگوان کرشن کی تصویر آویزاں ہے مگر وہ یسوع مسیح کی شان میں گیت گاتی ہے ـــــ اُسے یہ بھی شکایت ہے کہ تمام پیغمبر صرف مرد ہی کیوں ہوئے۔ کوئی عورت کیوں نہ ہوئی۔ اس کے انہی باغیانہ خیالات کی وجہ سے اُسے اسکول اور ہوسٹل سے نکالے جانے کی تنبیہہ کی گئی ہے۔

کالج کے دور میں ایلما کی کئی لڑکوں مثلاً افتخار، سیتل وغیرہ سے آشنائی رہی۔ وہ دل ہی دل میں سیتل سے نفرت کرتی ہے۔ مگر پھر بھی اپنے جسم کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے وہ اپنے ضمیر کی آواز کو سختی سے دبا دیتی ہے۔ وہ شمن سے بڑے کھلے اور بیباک انداز میں اپنے دوستوں کا ذکر کرتی ہے۔ مگر حیرت کا مقام ہے کہ اُسے کسی سے دلی لگاؤ نہیں۔ اس کی شخصیت کی نمایاں خصوصیّت سماج کے رسوم و قیود سے بغاوت ہے۔ مردوں کی قسموں کے

بارے میں وہ شمن سے کہتی ہے:

"اگر میں تمھیں بتاؤں کہ مردوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے۔ جن کا --- جو--"

"کیا؟" شمن نے ڈر کر پوچھا۔

"جنھیں دیکھ کر دل میں ایک عجیب خواہش جاگ اٹھتی ہے۔ مثلاً جیسے افتخار ہے۔ اب مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ بھی وہ بڑا عجیب مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میرا پہلا بچہ افتخار کا ہو.. لیکن میں ایک لمبے سفر میں افتخار کو نہیں بھگت سکتی"[1]

اس کے نزدیک خدا نے انسان کو یہ زندگی موج و مستی اور عیش و عشرت کے لئے عطا کی ہے تاکہ وہ اسے رسوم و قیود سے آزاد، اپنی مرضی کے مطابق ہنسی خوشی جیسے چاہے جئے۔ مگر یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اسی مقولے کے مطابق زندگی گذارتے ہوئے بھی وہ اس سے مطمئن نہیں۔ جب وہ سیتل کے بچّے کی ماں بننے والی تھی تو وہ بار بار اپنے آپ کو کوستی:

"میں نے اپنی رُوح کو دھوکا دے کر جسم کا پیٹ بھر دیا"[2]

مگر وہ سیتل سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ بحالتِ مجبوری وہ سیتل کے بچّے کی ماں بن جاتی ہے۔ مگر اُسے ماں کا پیار دینے سے قاصر رہتی ہے اور تب وُہ فلسفیانہ انداز میں سوچتی ہے کہ کیا بچّہ محض اس لئے ناجائز ہے کہ وُہ سماج کی اجازت کے بغیر اس دُنیا میں وارد ہُوا ہے ---- ایلما کے کردار میں ایک ناکامیاب شکست خوردہ لڑکی مُضمر دکھائی دیتی ہے، جو دماغ کی نہیں دل کی بات پر کان دھرتی ہے اور صعوبتیں جھیلتی ہے۔ بالآخر وہ یہ سوچنے پر مجبُور ہو جاتی ہے کہ انسان کی خوشی کا راز کسی کا ہو جانے میں ہے اور پروفیسر کو اپنا رفیقِ حیات بنا لیتی ہے۔

ایلما کا کردار ارتقائی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑی خوبصُورتی سے کھُلتا ہے ---- وہ ایک ماڈرن، آزاد خیال لڑکی کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔ گو وہ شمن کی قریبی دوست ہے مگر وہ اُس کے نظریات کو آنکھیں میچ کر قبُول نہیں کرتی بلکہ اپنی عقل و دانش کو مشعلِ راہ بناتی ہے۔

ایلما اس ناول کے کرداروں میں منفرد ہے۔ وہ شمن کی جگری دوست ہے اور اس کے کردار کو استحکام عطا کرتی ہے اور اُس کی شخصیّت کے کئی پہلوؤں کو اُبھارتی ہے۔

○ نجمہ

رسُول فاطمہ شمن پر مرتی ہے تو شمن نجمہ پر جان چھڑکتی ہے۔ نجمہ کو دیکھتے ہی شمن کا دل بے ترتیبی سے دھڑکنے

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۳۲

لگتا ہے کہ وہ بہت نرم و نازک اور خوش شکل ہے۔ عصمت اس کے پیکر کا حسن یوں بیان کرتی ہیں:

"نجمہ بڑی نازک تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں ایک بھی پکی ہڈی نہیں۔ شمن کا دل اس کو چھونے کے خیال سے گھبرانے لگتا۔ گرم اور نرم ایسی کہ اگر ہاتھوں میں لے کر زور سے دباؤ تو اُبلے ہوئے انڈے کی طرح پھسل جائے"[1]

نجمہ جتنی خوبصورت تھی اُتنی ہی خوش پوشاک اور خوش ادا بھی تھی۔ شمن اسے نگل جانے والی نگاہوں سے گھورنے لگتی اور اس کی ہر ادا پر فدا ہو جاتی۔ مگر شمن ہی نہیں سعادت بھی نجمہ پر مرتی تھی۔ اس طرح نجمہ، سعادت اور شمن کی ایک تثلیث سی بن گئی تھی۔ محبوبہ ایک، اور اس پر مرنے والیاں دو۔ رقابت کا جذبہ سعادت اور شمن دونوں کو کریدنے لگتا اور نجمہ دونوں کی جانب میلان ظاہر کرتی۔ سعادت کی جانب زیادہ اور شمن کی جانب کم —— جب امتحان کے موقع پر نجمہ کو اس پر مرنے والیوں نے پھول مالاؤں سے لاد دیا تو شمن نے بھی نجمہ کو موٹا سا گجرا پیش کیا —— اور نجمہ امتحان کے کمرے میں جانے کی بجائے سعادت کے پاس بیماروں کے کمرے میں چلی گئی۔ نہ جانے کیوں شمن کے پیر بھی اس کے پیچھے پیچھے اُٹھ گئے اور وہ یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی کہ سعادت بالکل دُرست اور خوش بیٹھی تھی اور گجرا جو اس نے نجمہ کو ارمان بھرے دل سے پیش کیا تھا، سعادت کے جوڑے میں سجا ہُوا تھا۔

نجمہ ایک ذہین اور ہوشیار ہم جنسی کی شکار لڑکی کے طور پر اُبھر کر سامنے آتی ہے جو بیک وقت دو لڑکیوں کو جو اس پر فریفتہ تھیں، بھرماتی ہے مگر بباطن ایک ہی لڑکی سے وابستہ ہے۔ اس اعتبار سے نجمہ کا کردار اپنے آپ میں دلچسپ ہے اور وہ شمن کے کردار کو استحکام اور معنویت عطا کرتا ہے۔

○ بلقیس

بلقیس شمن کی اسکول کی سہیلی ہے، جو بعدازاں اس کی رُوم میٹ بن جاتی ہے۔ وہ ایک صاف دل تعلیم یافتہ، منہ پھٹ، رومانی لڑکی کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ گو شمن کی ہم عمر ہے مگر لڑکے لڑکیوں کے تعلّقات کے بارے میں اس سے کہیں زیادہ واقفیت رکھتی ہے۔ اس نے ہی شمن کو بتایا کہ لڑکیوں کو لڑکیوں پر مرنے کی بجائے لڑکوں پر مرنا چاہیئے۔ اور وہ شمن کا رابطہ اپنے بھائی رشید سے کرا دیتی ہے اور دونوں کے درمیان قاصد کا کام کرتی ہے —— وہ بیک وقت کئی لڑکوں سے عشق کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ محض جسمانی چھیڑ چھاڑ اس کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اور وہ اپنے معاشقوں کا حال مزے لے لے کر بڑی تفصیل سے بیان کرتی ہے —— بلقیس کو فلمی اداکاراؤں کی طرح کپڑوں سے بالکل لگاؤ نہ تھا اور وہ کم از کم کپڑے پہن کر بے حجابانہ لڑکوں سے بات چیت کرتی۔ اسے لڑکیوں

---

[1] عصمت چغتائی۔ ٹیڑھی لکیر (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۹۱

کے سامنے بالکل برہنہ بیٹھنے سے بھی عار نہ تھا۔ گویا شرم وحیا، جو عورت کا زیور سمجھی جاتی ہے اسے چھُو کر نہیں گئی تھی۔ بلقیس اور اس کی بہنوں کی لڑکوں سے اس حد تک بے تکلفی تھی کہ سب کے سامنے عشق ہوتا اور سبھی مجموعی طور پر لُطف اندوز ہوتے۔

ناول کا یہ کردار نہ صرف اُسے پیش رفت کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ شمن کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو گہرائی عطا کرتا ہے۔

○ رشید

رشید شمن کی سہیلی بلقیس اور ان کی چار بہنوں کا اکلوتا لاڈلا بھائی ہے۔ اس کی شکل وصورت عام سی تھی، مگر بات چیت میں بہت ماہر تھا۔ لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا اور رومانس لڑانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ خود پڑھائی میں کمزور تھا مگر لڑکیوں کو ٹیوشن پڑھانے کے بہانے ان سے رومانس کرتا تھا۔ شمن اور نسیمہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

"شمن اور رشید گھنٹوں آسانی سے باتیں کیا کرتے۔ جب بہت دیر ہوجاتی تو دوسرے دن کی اُمید دل میں لے کر جُدا ہوجاتے"[1]

نسیمہ کے آنے پر اس نے شمن کو چھوڑ دیا۔ وہ اور بھی کئی لڑکیوں سے منسلک رہا مگر وقتی طور پر ہر کسی سے محبت کا کھیل کھیل کر آگے بڑھ گیا۔ گویا وہ ایک بے فکرے، مطلب پرست، مَن موجی اور دل پھینک لڑکے کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

"جس کالج یا یونیورسٹی میں پڑھا، تین چار زخمی چڑیاں تڑپتی چھوڑیں۔ کالج کی بہت سی لڑکیاں ان کی دیوانی تھیں۔ کئی امیر لڑکیاں تو ان سے ٹیوشن بھی لیتی تھیں"[2]

رشید کا کردار اس لئے اہم ہے کہ وہ پہلا لڑکا تھا جس سے شمن نے عشق کیا اور اس سے متاثر بھی ہوئی۔

○ شمن

یوں دیکھا جائے تو اس ناول کی مرکزی کردار شمن کا جائزہ بہت حد تک دیگر کرداروں کے تعلق سے فرداً فرداً لیا جاچکا ہے جو اس کی شخصیت کے بیشتر پہلوؤں پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتا ہے ــــ اس لئے یہاں شمن کے نمایاں خصائل کا ذکر مقصود ہے، جنھوں نے اُسے انفرادیت عطا کی اور جو اس کی پہچان بن گئے۔ مثلاً شمن بیحد ضدی، غصیل اور زُود رنج تھی اور اُس میں حریف سے بدلہ لینے کے جذبات بہت شدید تھے ــــ وہ خُودداری اور خود اعتمادی کا پیکر تھی اور اس کا اندازِ نظر وفکر منفرد تھا ــــ وہ سماجی رسُوم وقیوُد سے بیگانہ و بے نیاز تھی اور شادی کی تقدیس کی بھی قائل نہ تھی ــــ شمن کی محبت غیر مستقل تھی اور وہ کسی ایک ہی ہو کر نہ رہی۔ شاید وہ آزاد

---

[1] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۱۱۸، ۱۱۵

محبّت یعنی "فری لو" کی قائل تھی ـــــ اس میں دروں بینی اور خود انتقادی کا مادہ موجود تھا اور وہ معروضی طور پر اپنے کردار کا محاسبہ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور تھی ـــــ وہ مذہب اور خدا کی ہستی سے بھی بے تعلق سی رہی ـــــ ان اور دیگر کئی خصائل کا ذکر شمن کے کردار کو اُجاگر کر دے گا۔

○ ضدی اور غصیل

شمن اس ناول کی مرکزِ محور ایک ضدی اور غصیل لڑکی کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ کسی ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتی اور فوراً بدلہ لینے پر تُل جاتی ہے۔ پھر اُسے ہر ناروایات پر غصّہ آتا ہے۔ اور اندر ہی اندر کھولنے لگتی ہے۔ وہ عمر کے لحاظ سے سب سے چھوٹی ہے اس لئے مدِّمقابل سے طاقت کے بوتے پر نپٹنے سے قاصر ہے مگر وہ اکثر اپنی گڑیا، کیاری یا بستر کو نوچ کھسوٹ کر، توڑ پھوڑ کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی ہے۔

○ "پہلے تو اس نے اس کو (گڑیا کو) ہولے ہولے دو تنبیہی طمانچے مارے پھر ایک دم اُس پر بھوت سوار ہو گیا۔

دھڑادھڑ اس نے گھونسوں اور لاتوں کی بوچھاڑ کر دی۔ دانتوں اور ناخنوں سے اُس کے پرزے کر دیئے۔ گویا وہ اپنے کسی خوفناک دشمن سے لڑ رہی ہو۔"[1]

○ "وہ دانتوں سے میلے کپڑے کھسوٹنے لگی۔ بدبودار پاجامے، سڑی ہوئی بنیانیں اور بساندے کرتے، وہ غصّے میں اُن سب کو نگل جانا چاہتی تھی۔"[2]

شمن میں انتقام کا زبردست مادہ ہے جس کسی نے اس کے ساتھ زور زبردستی سے کام لیا، اس نے اُسے کبھی نہ بخشا۔ کسی کو اس کی فروگذاشت پر معاف کر دینا، اس کی فطرت سے بعید تھا۔ بڑی آپا نے اپنی بیٹی نوری سے اس کا مقابلہ کر کے اسے ہمیشہ ذلیل کیا تو وہ اُسے سہہ نہ سکی۔

"بڑی آپا کی کیاریاں! آناً فاناً میں وہ بھُو کی شیرنی کی طرح ہری بھری کیاریوں پر پل پڑی۔"[3]

اسی طرح شمن کدن کو بار بار مار پیٹ کر اس کی دادی سے بدلہ لیتی ہے ـــــ منجھوبی نے شمن کو پالا پوسا، بڑا کیا مگر ساتھ ساتھ اسے بہت مارا بھی۔ شمن بے بس ہو کر خیال ہی خیال میں اُسے پیٹ ڈالتی ہے جس سے اس کا غم و غصّہ فرو ہو جاتا ہے۔

"پھر تخیّل میں ہی وہ منجھوبی کو پیٹنے لگی۔ دو تھپیڑ گال پر مار کر اس کے کپڑے اتار ڈالتی اور نہلانے لگتی۔"[4]

افتخار نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تو اس نے اس کا بدلہ محبت کے نام پر کامریڈ صمد، انقلابی شاعر اور پروفیسر سے لے لیا اور انھیں خوب تڑپایا اور بے آبرو کر کے ان سے گلو خلاصی کرالی ـــــ جب اس کے بچپن کا منگیتر اعجاز ایک

---

[1] [2] [3] [4] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۱۸، ۳۰، ۳۶، ۱۸

خوش وضع، خوب رُو نوجوان بن کر واپس آتا ہے اور بلقیس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ اس کی طرف مُلتفت نہیں ہوتی، تو وہ شمن کی جانب راغب ہو جاتا ہے۔ شمن کا سارا کُنبہ اُسے اپنا داماد بنانے کا خواہش مند ہے مگر شمن اپنی بے عزّتی کا بدلہ لینے پر ڈٹ جاتی ہے اور اعجاز پر واضح کر دیتی ہے کہ تم بھلے جتنے بھی اچھے، دولت مند اور عزّت دار بن جاؤ مگر میری نظروں میں وہی حقیر اور ذلیل اچّو رہو گے۔ وہ اپنے والدین سے صاف صاف کہہ دیتی ہے کہ وہ :

"اعجاز کے علاوہ ہر جانور سے شادی کر سکتی ہے"[1]

ضدی، غصیل اور بے حد حسّاس ہونا، اپنی خود داری اور انا کے تحفّظ کے لئے ڈٹ جانا اور اپنے سے ہوئی ناانصافی کا بدلہ چُکا کر رہنا شمن کے کردار کے بنیادی عناصر ہیں۔

○ خودداری اور خود اعتمادی

شمن ایک بے حد خود دار اور بڑے مضبوط ارادے کی لڑکی ہے۔ وہ نہ کبھی اپنے رنج و غم پر روئی تڑپی، نہ ہی اس نے آہیں بھریں اور اشک بہائے۔ وہ اپنے دُکھ درد کو ہمیشہ خاموشی سے اندر ہی اندر پی گئی۔ اس نے کبھی دوست احباب اور اعزا و اقارب کو اعتماد میں لے کر بھی دل کا بار ہلکا نہ کیا ـــــ جب اس کی نظروں سے کوئی اُتر گیا یا یوں منظر سے ہٹ گیا تو اس نے کبھی بھولے سے بھی مڑ کر نہ دیکھا اور اُسے لوحِ قلب سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ اس اعتبار سے وہ بے حسی کی حد تک اوروں کو بھول جانے والی تھی۔ وہ دلی لگاؤ جو بچھڑنے پر جان کا روگ بن جاتا ہے اسے کبھی کسی سے نہ ہوا۔ جن لوگوں نے اُسے متاثر کیا، انھوں نے بھی اس کے دل و دماغ پر اپنی چھاپ نہ چھوڑی۔ گویا زندگی بھر اس کے ذہن کے پردے پر تصویریں بن بن کر مٹتی رہیں اور مٹ مٹ کر بنتی رہیں اور کسی تصویر کی پرچھائیں تک بھی قائم نہ رہی۔ بالعموم انسان کی زندگی میں ایسا شاذ ہی ہوتا ہے ـــــ شمن کی زندگی کے نمایاں واقعات پر گہری نظر ڈالیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔

○ منجھو بی شمن سے بہت سختی اور بے دردی سے پیش آتی رہی مگر ساتھ ہی وہ اس سے پیار دُلار بھی کرتی رہی۔ شمن منجھو بی کی سُسرال جاتی ہے تو نہ اسے اس کا گھر پسند آتا ہے، نہ ساس اور نہ ساس کا پوتا کدن اور نہ ہی منجھو بی خود اس سے پُرانا لاڈ چاؤ کرتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ :

"منجھو کے یہاں سے واپس لوٹی تو ایسا محسوس ہوا گویا اُسے ہمیشہ کے لئے دفن کر آئی۔
مگر تعجب ہے اُسے ذرا بھی افسوس نہ تھا"[2]

رشید شمن کا پہلا پیار تھا۔ وہ شمن کی محبت کو ٹھکرا کر پڑھنے کی غرض سے انگلینڈ چلا گیا تو شمن نے طبیعت پر جبر کر کے

---

۱ ۲ عصمت چغتائی، "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز لکھنؤ۔ ص ۲۲۱، ۴۵

زہر کا یہ گھونٹ بھی پی لیا:

"شمن کو ایسا معلوم ہُوا جیسے فلم کی ریل چلتے چلتے بیچ میں سے ٹوٹ گئی اور ہال کی بجلیاں
بھک سے روشن ہو گئیں"[1]

شمن کو مس چرن سے بہت لگاؤ تھا مگر جب اُسے ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا تو شمن کے ذہن سے اس کے خدوخال تک مٹ گئے اور مس چرن سے متعلق ہر واقعہ اس کے دل و دماغ سے یوں ناپید ہو گیا گویا اُسے کبھی اس سے سابقہ نہ رہا ہو:

"مس چرن کو وہ آخر بھول ہی گئی اور اسے غور کرنے پر بھی ان کا ناک نقشہ، لباس، ہنسی،
ان کا باسکٹ بال کھلانا یاد نہ رہا"[2]

شمن نے افتخار سے پُرخلوص اور بے لوث محبّت کی مگر اس نے شمن کی سادہ لوحی اور بھولپن کا فائدہ اٹھایا اور اسے "ایموشنل بلیک میل" کیا اور پھر اس کی بیوی نے بھی اسے بلیک میل کیا۔ اس کے زیورات تک اُتروا لیے۔ یہ دو زبردست جھٹکے تھے جنھیں شمن حسبِ معمول سہہ گذری۔ نہ اس کی جبیں پر شکن پڑی اور نہ ہی اس کے لبوں پر حرفِ شکایت آیا۔

پریما کے والد رائے صاحب سے بھی شمن نے یک طرفہ محبّت کی تو اُسے زبردست ٹھوکر لگی۔ مگر ٹھوکریں کھانا شاید اس کا مقدر بن چکا تھا۔

شمن نے رونی ٹیلر سے آخری محبّت کی، جو پروان چڑھی اور دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے مگر جلد ہی دونوں کے متضاد فکر و نظر نے ان کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول دیا۔ ٹیلر دل برداشتہ چلا گیا اور شمن اس وسیع و عریض دُنیا میں بے یار و مددگار رہ گئی۔

خیال آتا ہے کہ اس کا کیسا دل تھا جو اپنے آلام پر بھی پگھلتا نہ تھا۔ گداز نہ ہوتا تھا۔ اسے ہمیشہ نامرادیوں، ناکامیوں اور ناشادیوں کا مُنہ دیکھنا پڑا اور اس نے انھیں سینے سے لگا لیا۔ اس نے کبھی کسی کو چارہ ساز اور غمگسار جان کر اس کا ہاتھ نہ تھاما تاکہ زندگی ذرا آسان ہو جائے اور نہ ہی کسی نے آگے بڑھ کر اُسے سہارا دیا۔

○ منفرد طرزِ فکر

شمن ایک ذہین لڑکی ہے۔ وہ سُوجھ بُوجھ سے اپنے فیصلے خود کرتی ہے۔ اپنی راہیں خود تراشتی ہے۔ بیشتر موضوعات پر اس کا ایک منفرد نقطۂ نظر ہے۔ وہ کسی بات کو آنکھیں میچ کر کبھی قبول نہیں کرتی۔ وہ ہر بات پر "کیوں"

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۱۴۱، ۷۳

یا " کیسے" کا سوالیہ نشان لگا دیتی ہے۔ گویا کُرید، تحقیق اور تفتیش اس کی شخصیت کے اہم جُز و ہیں۔ بچپن میں ہی جب اس کی بہن منجھو اُسے بتاتی ہے کہ " ا " (الف) سے انار ہوتا ہے تو وہ بیساختہ کہتی ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ " الف " تو لمبا ہوتا ہے جبکہ انار گول ــــ اسی طرح جب منجھو کی بارات پر شمن کے اصرار پر اُسے گود میں اُٹھا کر دولہا دکھایا جاتا ہے تو اسے یقین نہیں آتا کہ ایک عام آدمی " دولہا " ہو سکتا ہے۔ پھر وہ سوچتی ہے کہ لڑکے تو کبھی مہندی نہیں لگاتے، پھر منجھو کے دولہا نے مہندی کیوں لگائی ہے؟ ــــ ایسے ہی جب ماسٹر صاحب پڑھاتے وقت اُس سے پوچھتے ہیں کہ " ایک پیسے کی دو نارنگیاں تو ڈیڑھ روپے کی کتنی؟ " تو وہ سوچتی ہے کہ اوّل تو یہ گُلچھرّے اس کے مقدر میں نہیں، پھر اتنی ڈھیر ساری نارنگیاں ایک ساتھ خریدنے سے کیا حاصل۔ کیا وہ گل سڑ نہیں جائیں گی؟ ــــ بچپن کے یہ معصوم خیالات بادی النظر میں فاضل اور غیر اہم معلوم ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ گھر والے اور ماسٹر اُسے " کوڑھ مغز " کہتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ ہر بات کو نئے اور انوکھے پیرائے میں سوچنا، ایک اپنا ہی اندازِ فکر و نظر اپنانا، پختہ ہو کر شمن کی پہچان بن گیا۔ وہ مذہب، شادی بیاہ، عورت مرد کے تعلقات غرضیکہ معاشرے کے ہر پہلو کو ایک مخصوص انداز سے دیکھتی اور سوچتی ــــ وہ اپنی بھانجی نوری کی شادی پر اسے مائیوں بیٹھے دیکھ کر عورت اور شادی کے بارے میں ایک نئے انداز سے سوچنے لگتی ہے۔ اُسے عورت بالکل چاٹ کی طرح لگ رہی تھی جسے بنا سجا کر شوہر کو پیش کیا جا رہا تھا ورنہ یہ اُبٹن، یہ مہندی، یہ عطر پھلیل کس لئے؟ کیا اس لئے کہ نوری اپنے ہونے والے شوہر کے حلق سے بآسانی اُتر جائے؟

> " عورت! کیا یہی تھی عورت جو حلوے کی مرغن قاب کی طرح سجا بنا کر کل ایک مہمان کے سپرد کی جانے والی تھی۔ اُسے نہلا دُھلا کر عطر میں بسایا جائے گا کہ اگر تھوڑی بہت بساند ہو بھی تو معلوم نہ پڑے۔ ایسے ہی جیسے سڑے گلے آلو کی چاٹ بنانے والا تلخی چھپانے کے لئے ڈھیر سارا مسالہ چھڑک دیتا ہے۔ بالکل اُسی طرح دُلہن کو شیرے میں لتھیڑ کر دولھا کے حلق میں اُتار دیا جائے گا اور جب ایک بار نگل گیا تو مہاشیر اپنا ہے۔"[1]

ایسے ہی شمن عورت اور مرد کا تقابل کرتے ہوئے روایتی طور پر مرد کی بالادستی اور عورت کی زیردستی کا ذکر نہیں کرتی۔ مرد کو جابر اور عورت کو مجبور نہیں گردانتی۔ بلکہ اس کے برعکس اس کی ہمدردی مرد کے ساتھ ہوتی ہے، جو کولھو کے بیل کی طرح ہمہ وقت کام میں جُتا رہتا ہے اور عورت آرام سے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے ــــ یہ ضروری نہیں کہ قاری شمن کے نقطۂ نظر سے متفق ہو۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ شمن کی رائے بالعموم دوسروں سے جُدا گانہ مگر مدلل اور عقلی ہوتی ہے جو اس کی شخصیت کو جاذبیت اور انفرادیت عطا کرتی ہے اور وہ بھیڑ سے الگ کھڑی دکھائی دیتی ہے۔

---

[1] عصمت چغتائی۔ " ٹیڑھی لکیر " (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۴۰-۲۴۱

○ ادب سے لگاؤ

شمن کو علم و ادب سے گہرا لگاؤ رہا۔ فرصت کے اوقات میں وہ کتابوں میں غرق رہتی، جو اس کے فکر و نظر کو وسعت اور عمق عطا کرتیں۔ مذہب، تاریخ، فلسفہ اور ادب اُس کے مرغوب مضامین تھے۔ راما ئن اور بلند پایہ مصنفین کی نگارشات اس کی توجہ کا خاص مرکز تھیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں تضییع اوقات کی بجائے اُسے کتابوں کی رفاقت زیادہ پسند تھی۔

"خاموشی سے کرسی پر لیٹ کر وہ رامائن کا ترجمہ پڑھا کرتی ہے"[1]

اور

"چند ہی دنوں میں اس نے انگنت کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں سے جین ایر نے اُسے حد سے زیادہ متاثر کیا۔۔۔ ٹیگور کی کہانیاں خصوصاً "کاسٹ آوے" پڑھ کر تو سچ مچ آنسو نکل پڑے۔ ہارڈی کے مشہور ناول "ٹیس" نے بھی اُسے ہلا کر رکھ دیا۔ مگر سب سے زیادہ جس چیز نے اس کی رگ رگ کو پچکار پست کر ڈالا وہ بائرن، شیلے اور کیٹس کی شاعری تھی"[2]

ظاہر ہے کہ شمن نے درسی کتابوں کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن کی تہذیب اور فروغ کے لئے متفرق مضامین پر پڑھنے کے عمل کو بھی جاری رکھا۔

○ شادی

شمن فطرتاً باغی واقع ہوئی ہے، رسوم و قیود سے بیگانہ و بے نیاز۔ وہ شادی کی رسم کی بھی قائل معلوم نہیں ہوتی۔ گویا اُسے شادی کا بندھن ہی بے مقصد اور بے معنی سا لگتا ہے۔ نوری کی شادی کے موقع پر وہ وہاں جمع بڑی بوڑھیوں کا تمسخر اُڑاتی ہے اور زرِ مہر کی رسم کا بھی مذاق اُڑانے سے نہیں چوکتی۔ حالانکہ یہ رسم شادی کا بہت اہم جزو ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"اُسے نوری بالکل گائے بیل کی طرح لگ رہی تھی۔ اکیاون ہزار میں وہ اپنی جوانی کا سودا کر کے ایک مرد کے ساتھ جا رہی تھی، بے وقوفوں کی طرح نہیں پکا کاغذ لکھا کر کہ اگر وہ بعد میں تڑپے تو، اور پھندا اُس کے گلے میں تنگ ہوتا جائے۔ اور وہ چند بھی ڈھول تاشے سے اسے خرید کر لے جا رہا تھا۔ آخر فرق ہی کیا ہے اس سودے میں اور آئے دن جو چاوڑی میں خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے۔ وہ چھوٹا موٹا بیوپار ہے جیسے کچالو پکوڑیوں کی چاٹ اور یہ لمبا ٹھیکہ ہے جب تک ایک فریق خیانت نہ کرے بیوپار چلتا رہتا ہے ورنہ سودا الٹ ہے"[3]

---

[1] [2] [3] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۵۴

یہ شادی کے مقدس بندھن کا کھلا اور ننگا مذاق ہے۔ شمن شاید "فری لو" یا آزاد محبت کی قائل تھی ــــ شمن سے ایک بحث کے دوران افتخار جب اُسے بتاتا ہے کہ شادی ایک احمقانہ فعل ہے تو وہ اُس سے متفق ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

"آپ شادی نہیں کریں گے؟"

"شادی سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ کیا سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھنا اور ایک لڑکی کو پکا اسٹامپ لگا کر وصول کرنا، یہی شادی ہے تو کنوارا ہی بھلا۔ اور ویسے تو میں . . ." شمن کچھ جھینپ گئی۔

"تو اس میں کیا ہوا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "مرد ہونا کوئی عیب تو نہیں۔ گو ہم کہتے نہیں مگر ہماری ماں بہنیں خوب جانتی ہیں کہ ہم مرد ہیں، میں اسے گناہ نہیں سمجھتا۔"

"آپ شادی کے خلاف ہیں۔ میرا مطلب ہے نکاح کے۔"

"قطعی۔ نکاح ایک وعدہ ہے جو صرف اس لئے پختہ کیا جاتا ہے کہ کہیں وعدہ کرنے والا مکر نہ جائے۔ ذرا سوچئے تو سہی زندگی کے اتنے اہم معاملے کو کاغذی گواہ کس طرح مضبوط بنا سکتے ہیں۔ شادی ایک فعل ہے قول نہیں۔"

شمن کچھ نہ سمجھی۔

"تو پھر لوگ نکاح کیوں کرتے ہیں؟"

"گدھا پن کرتے ہیں۔"

"واہ۔" شمن لاجواب ہو کر ہنسی۔[1]

شمن، افتخار کے اس استدلال کے سامنے لاجواب ہو جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "فری سیکس" کی قائل ہے۔ یوں بھی دیکھا جائے تو شمن کا انجینئر، کامریڈ صمد، باغی شاعر اور پروفیسر سے بیک وقت معاشقہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ کیونکہ وہ آزاد محبت میں یقین رکھتی تھی، اپنی خالق عصمت کی طرح ـ یہاں یہ لکھنا بے جا نہ ہوگا کہ عصمت اپنی زندگی میں اسی راہ پر گامزن رہیں اور اپنے ادب میں بھی انھوں نے "فری لو" کی تبلیغ کی۔ ان کے افسانے "پنکچر" اور "بھول بھلیاں" اس بات کا ثبوت ہیں۔

○ محبت

محبت ایک اساسی جذبہ ہے جو قضا و قدر نے نوعِ انسانی کو ودیعت کیا ہے۔ کامران محبت جسم و جان کو

---

[1] عصمت چغتائی، "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۴۶ ـ ۴۷

سرسبز و شاداب کر دیتی ہے جبکہ نامراد محبت سے رُوح تک کمہلا جاتی ہے، چُرمرا جاتی ہے۔ محبت کی تشنگی رُوح کی تشنگی کی مظہر ہوتی ہے۔

شمن کی زندگی میں کئی لوگ آئے مگر اس کی تشنگی نہ مٹی۔ وہ محبت کی بھوکی پیاسی ہی رہی۔ کسی نے اُسے چھوڑ دیا تو کسی کو اس نے کنارے لگا دیا۔ محبت میں ناکام ہو کر اس نے رونا دھونا، سسکیاں اور آہیں بھرنا نہ سیکھا۔ اس نے محبت کو ایک کھیل کی طرح کھیلا اور کھیل کر آگے چل دی اور مُڑ کر نہ دیکھا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس کے قلب و جگر میں محبت کرنے اور محبت کئے جانے کے جذبات شدت سے موجود تھے ـــــ شمن رشید سے محبت کرتی ہے۔ دونوں کی محبت پروان چڑھتی ہے۔ مگر رشید نسیمہ کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر انگلینڈ چلا جاتا ہے۔ شمن آہ تک نہیں بھرتی۔ ـــــ اعجاز شمن سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر شمن اُسے ٹھکرا دیتی ہے ـــــ شمن کی سہیلی پریما کا بھائی نریندر اُسے اپنی جانب راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اسے نظر انداز کر دیتی ہے ـــــ شمن رائے صاحب سے اظہارِ محبت کرتی ہے مگر وہ اسے اثبات میں جواب نہیں دیتے اور شمن احساسِ گناہ دل میں لئے رہ جاتی ہے ـــــ وہ افتخار سے لوٹ کر محبت کرتی ہے۔ وہ بھی اُسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ مگر اس کی محبت محض ذہنی قربت تک ہی محدود رہتی ہے اور آگے نہیں بڑھتی۔ نہ جانے وہ کیسی محبت تھی ـــــ وہ کامریڈ صمد، باغی شاعر، انجینئر، پروفیسر سب سے بیک وقت محبت کرتی ہے مگر اُس کی پیاس نہیں مٹتی۔

"کتنے ہی سیب اور شربت کے گلاس ساتھ مل کر چار ہونٹوں نے چوسے مگر وہ پھر بھی پیاسی ہی رہی۔"[1]

اور وہ ادب کے بعد دیگرے ان سے چھٹکارا پا لیتی ہے ـــــ آخر میں وہ ٹیلر سے محبت ہی نہیں، شادی بھی کرتی ہے مگر جلد ہی طبعی اور نظریاتی تضاد کی وجہ سے ان کی زندگی دوزخ بن جاتی ہے اور ٹیلر دل شکستہ محاذِ جنگ پر چلا جاتا ہے۔

غور و فکر کے بعد، شواہد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نہ پارہ صفت شمن کو کسی نے دل کی گہرائیوں سے چاہا اور نہ ہی شمن نے کسی سے بے لوث اور پُر خلوص محبت کی۔ اس کی محبت سطحی اور فروعی ہی رہی۔ ترقی پسند پروفیسر کے بہت معقول اور نپے تلے الفاظ غور طلب ہیں۔

> "کم از کم اپنے ہوش و حواس میں تو تم جیسی غیر مستقل مزاج عورت سے سوائے وقتی دل چسپی کے کوئی گہرا تعلق قائم کرنے کی کوشش کروں گا نہیں۔ شادی تو بڑی چیز ہے۔ میں تمہارے پڑوس میں بھی نہیں رہ سکتا۔"[2]

---

[1]، [2] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۳۷۹، ۳۹۴

ہر بار شمن کی محبت کسی نہ کسی وجہ سے ناکامیاب رہی۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ غیر مستحکم اور غیر مستقل تھی مگر شمن کو اپنی پے در پے ناکامیوں پر کبھی افسوس نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ محبت کے معاملے میں وہ کبھی سنجیدہ نہ رہی۔ محبت کو اس نے محض "جسم" کا رشتہ جانا، "جسم و جان" کا نہیں ـــــ محبت کا تعلق جسم سے کہیں زیادہ رُوح سے ہوتا ہے۔ شمن اس حقیقت سے بے خبر رہی۔

○ مذہب سے بیگانگی

شمن کو اپنے مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ وہ نہ نماز اور روزے کی پابند ہے اور نہ نذر و نیاز میں یقین رکھتی ہے۔ اس نے اپنے اسکولی دَور میں دو سال ایک مشنری اسکول میں تعلیم حاصل کی تب اس کا رجحان مسیحی دھرم کی جانب ہوا مگر پیشتر اس کے کہ معاملہ سنجیدہ صورت اختیار کرتا، اُس کی والدہ کی مزاحمت اور ڈانٹ ڈپٹ نے اُسے اپنے ارادے سے باز رکھا۔

> "کئی دفعہ اُس کا ارادہ ہُوا کہ وہ بھی چپکے سے یسوع مسیح کی بھیڑ بن جائے مگر اماں کے ڈر سے ہمت نہ پڑی"[1]

اور پھر:

> "گھر آ کر اس نے اماں وغیرہ کو جب یسوع کی تعریف میں نعتیں سنائیں تو انھوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور اسے بہت ڈانٹا کہ کیا اب وہ عیسائی ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ لہٰذا مجبوراً اُسے واپس پرانی درسگاہ میں بھیج دیا گیا"[2]

صاف ظاہر ہے کہ شمن کا اپنے مذہب میں اعتقاد مستحکم نہ تھا۔ عیسائی اسکول میں اس کا رجحان اپنے آپ عیسائیت کی جانب ہو گیا اور وہ تبدیلیٔ مذہب کی بابت سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ اگر اماں کڑا رُخ نہ اپناتیں تو شمن پھسل گئی ہوتی۔

پھر جب شمن کو اپنی دوست پریما کی قربت ملی تو اس کا جھکاؤ ہندو دھرم کی جانب ہو گیا:

> "پریما کے ساتھ رہ کر اُسے ہندو دھرم بہت مقدس معلوم ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی وہ قُم قُم کی ٹیکی چھپ کر لگاتی"[3]

اور پھر جب وہ رائے صاحب کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو اپنا مذہب تک تبدیل کرنے پر آمادہ دکھاتی ہے:

> "رائے صاحب ۔ ۔ ۔ رائے صاحب میں ۔ ۔ ۔ میں آپ سے پریم کرتی ہُوں ۔۔۔ رائے صاحب میں اپنا دھرم بھی بدل دُوں گی"[4]

---

[1] [2] [3] [4] عصمت چغتائی: "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ ص ۷۴، ۷۵، ۱۹۰، ۲۰۲

گویا مذہب شمن کے نزدیک ایک مقدس عقیدہ نہیں بلکہ محض ایک لبادہ ہے جسے جب چاہا پہن لیا اور جب چاہا اتار پھینکا ——— نہ صرف یہ بلکہ شمن کا خدا میں اعتقاد بھی سطحی اور فروعی معلوم ہوتا ہے۔

"مجھے کسی چیز پر یقین نہیں رہا۔ اور خدا کے وجود پر ہنسنے کو جی چاہتا ہے ... خدا پر غصہ کہ وہ کیوں ہے۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ مانا کہ یہ دُنیا اس نے بنائی، تو ہم پر کیا احسان کیا۔ اسے سجدے کرانے کا اتنا شوق کیوں ہے؟ اور جو نہ کرو تو دوزخ میں جلانے کی دھمکی دیتا ہے۔ سچ بتاؤ یہ کبڑی بھینگی دُنیا تمھیں پسند ہے؟"[1]

ظاہر ہے کہ شمن کو نہ مذہب سے دلی لگاؤ تھا اور نہ خدا کی ہستی کے تئیں عقیدت۔ وہ ایک طرح سے دونوں سے بیگانہ و بے نیاز رہی۔

○ درون بینی، خود انتقادی

شمن میں دُرون بینی اور خود انتقادی کا مادہ موجود ہے۔ گو وہ ضدی اور ہٹیلی ہے مگر غور و فکر سے عاری نہیں۔ وہ اپنے اندر جھانک کر اپنے کردار کا محاسبہ کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ رائے صاحب کی مَوت پر بُرے طرح کفِ افسوس ملتی ہے اور اپنے آپ کو کوستی اور لعنت ملامت کرتی ہے۔ اسے اندر ہی اندر اس بات کا احساس کھائے جاتا ہے کہ اس سے ایک شدید گناہ مُرتکب ہُوا ہے کہ اس نے اپنی کج فہمی میں ایک نیک سیرت اور پاکیزہ رُوح انسان کو راہِ مستقیم سے بہکانے کی کوشش کی ——— اور اب جب وہ اپنے اندر جھانک کر دیکھتی ہے تو اسے ایک آوارہ، بداخلاق لڑکی کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ انسان سب کچھ سہہ گذرتا ہے مگر اپنے ضمیر کے تازیانے برداشت نہیں کرسکتا۔

"دوسرے دن لوگوں سے آنکھ ملاتے وحشت معلوم ہونے لگی۔ گو وہ کچھ نہ جانتے تھے۔ پھر بھی جیسے اُس کے منہ پر لمبی لمبی سطریں کھنچی اس کے گناہوں کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھیں۔ وہ کچھ چھپانا چاہتی اُن متجسس نظروں سے جو اس پر اچانک جا پڑتیں اور وہ جھجک کر دُور ہو جاتی ہے"[2]

جو شخص اپنے ضمیر سے آنکھ نہ ملا سکے وہ اوروں سے آنکھ چُراتا ہے۔ ضمیر کا تازیانہ بے آواز مگر بڑا پُر ہیبت دل فگار اور حوصلہ شکن ہوتا ہے ——— اور پھر:

"وہ تو بدمعاش تھی۔ پرلے درجے کی آوارہ۔ اس نے ایک مقدس انسان کی پاکدامنی

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز لکھنؤ۔ ص ۲۹۲، ۲۰۲۔

پر سیاہ دھبے ڈالنے چاہے مگر خدا نے اسے بچا لیا۔ یہ اُسے کیا ہوگیا تھا ـــــ یہ ٹوٹے ہوئے
ذرّے اب کیسے جڑیں گے؟ اب کیا ہوگا؟"[1]

اب کچھ نہ ہوگا۔ اوّل اوّل احساسِ گناہ دل و دماغ میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ مگر طوفان کے بعد فضا اپنے آپ پُرسکون ہو جاتی ہے۔ یہ احساس بڑا راحت افزا ہوتا ہے کہ اس سے سب آلائشیں دُھل جاتی ہیں اور رُوح صاف شفاف ہو جاتی ہے۔

ایسے ہی جب تک رونی ٹیلر اور شمن اکٹھے رہے ان کی زندگی ایک دوسرے کے ہاتھوں اجیرن رہی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ شمن نے اس کا قافیہ تنگ کئے رکھا۔ مگر جب وہ اس مسلسل کرب سے نجات حاصل کرنے کے لئے محاذِ جنگ پر چلا جاتا ہے تو شمن اپنے کردار پر نگاہ ڈالتی ہے اور کفِ افسوس ملتی رہ جاتی ہے۔ وہ شدّت سے محسوس کرنے لگتی ہے کہ اس نے رونی ٹیلر کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کسی طور وہ واپس آجائے تو وہ اپنی گھریلو زندگی استوار کرے اور جو کچھ ہُوا اسے ایک بُرے خواب کی طرح بھُول جائے۔ درُون بینی شمن کے کردار کے اس تاریک پہلو کو اُس پر یُوں وا کر دیتی ہے کہ وہ اسے دیکھ کر گھبرا جاتی ہے۔

"ذرا سی چنگاری کو پنکھا جھل جھل کر اس نے کتنا بڑا شعلہ بنا دیا کہ دَم بھر میں سب کچھ بھک سے اُڑ گیا۔ بس ٹیلر ایک بار واپس آجائے پھر؟ پھر یہ تاریخ کبھی نہ دہرائی جائے گی۔ وہ آجائے پھر تو۔۔۔ بن جائے گا۔ سب کچھ بن جائے گا۔ کھنڈر اتنے بوسیدہ نہیں ہو گئے کہ مرمّت نہ ہو سکے"[2]

مگر ٹیلر کو بُلانا گئے وقت کو بلانے والی بات تھی ـــــ اور شمن ہمیشہ رستے رہنے والا ناسور دل میں لئے رہ گئی۔ شمن کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا روشن، بڑا تاباں ہے۔

○ ترّقی پسند تحریک سے وابستگی

عصمت نے شمن کے تعلق سے ترّقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ ادبا اور شعرا کا ذکر بڑی بیباکی سے اور بڑے تیکھے انداز میں کیا ہے۔ کیونکہ وہ خود اس تحریک سے عمر بھر جڑی رہیں اس لئے ان کی معروضیت اور بے تعلق کا انداز قابلِ تعریف ہے ـــــ ترّقی پسند تحریک ایک آندھی کی طرح آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے طول و عرض میں چھا گئی۔ ترّقی پسندی ایک فیشن، ایک تمغہ بن گئی۔

"ہر وہ انسان ترّقی پسند بن گیا جس کے بال بے تُکے اور آنکھیں وحشت زدہ ہوں۔ لباس

---

[1][2] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۰۳، ۲۹۶

ذرا انوکھا اور ملگجا ہو۔ ہاتھ میں اٹیچی کیس جس میں پھڑکتی ہوئی نظمیں اور سسکتے ہوئے افسانے،
دہکتے ہوئے مضامین، لطیف فوٹو، معصوم یادگاریں اور شیریں خطوط ہوں۔ ۔ ۔ "[1]

شمن پر ترقی پسند والہانہ جوش و خروش کے ساتھ برس پڑے۔ جو لوگ اس کے رابطے میں آئے۔ ان میں نواب زادہ صمد (کامریڈ صمد) اور ایک انقلابی شاعر تھے جنھوں نے فرسودہ روش چھوڑ کر لیلیٰ مجنوں کی بجائے نرس، ڈاکٹرنی اور اسکول مسٹریس سے ناکام محبتیں کی تھیں اور ریل اور موٹر کی شان میں قصیدہ خوانی کی تھی۔ (انھیں ہم بآسانی شناخت کرسکتے ہیں) ـــــ تیسرے پروفیسر رحمان تھے جن کی تحریریں حکومتِ وقت نے مخربِ الاخلاق قرار دی تھیں ـــــ چوتھے ایک انجینئر تھے، جو سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے چھپ کر انقلاب لا رہے تھے ـــــ کامریڈ صمد کے منعقدہ جلسے میں زور شور سے انقلابی نظمیں پڑھی گئیں ـــــ "ترقی پسند انقلابی شاعر نشے میں دُھت، ذہانت اور فنکاری کا مجسمہ بنا چہکتا رہا" ـــــ "گھر واپس پہنچتے پہنچتے مس شمشاد کی ہونٹوں پر شمن بن گئی" "کامریڈ نے نو کئی مرتبہ اس طرح اس کے کان میں کچھ کہا کہ اُن کے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے کان کی لَو سے چھو گئے" ـــــ ترقی پسندوں کا جنگ کے تیزی سے بدلتے ہوئے رُخ پر بحث مباحثہ کرنا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے نزدیک رُوس کی شمولیت نے جنگ کی نوعیت کا نقشہ ہی بدل دیا اور ان کی تمام تر ہمدردی اتحادی ممالک کے ساتھ ہوگئی، جو جرمنی سے برسرپیکار تھے۔ ـــــ سبھی شمن پر پروانہ وار نثار تھے اور اس سے اس قدر بے تکلف تھے کہ بغیر اجازت اس کے کمرے میں گھس آتے۔ اس کے بستروں میں میمنوں کی طرح کلیلیں کرتے۔ ازراہِ مذاق اس کی ساڑیاں اوڑھتے اور اس کی چوڑیوں سے جُوا کھیلتے ـــــ کئی بار اُس نے اپنی کاکلیں تراش کر ان کے سینے کے تعویذوں کے لئے دے دیں۔ شمن کی چوڑی ٹوٹ جاتی تو وہ بطور تبرک بانٹ لی جاتی۔ شمن اُن سے اوندھے سیدھے کام لینے سے بھی نہ چوکتیں ـــــ شمن ہر ایک کو بقدر ظرف و شوق دانہ ڈالتی، جو کسی کو پیش کیا جاتا، اُسے اس پر قناعت کرنا ہوتی اور جو مقررہ حدود سے تجاوز کرنے کی جسارت کرتا اُسے باسی ہار کی طرح اُتار کر پھینک دیا جاتا۔

آخر شمن نے اوب کر ان سے گلوخلاصی کرانے کی ٹھان لی۔ کامریڈ صمد فوج میں بھرتی کرانے لگے۔ شاعر کو انھوں نے بہت بے آبرو کر کے نکال باہر کیا۔ پروفیسر رحمان بہت ذہین اور سخت جان تھے مگر طول طویل تو تو میں میں کے بعد انھیں بھی جانا ہی پڑا ـــــ شمن خالی ہاتھ رہ گئی

عصمت کیونکہ خود ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہیں اس لئے وہ "رازہائے درونِ خانہ" سے واقف تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسند ادیبوں کے غیر مستحسن پہلوؤں پر کمال تیقن کے ساتھ اُنگلی رکھ دی ہے۔

---

[1] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۳۵۶

ترقی پسندوں کے بڑھتے ہوئے ہجوم میں ایسے بہت سے لوگ آملے تھے جو اپنی ذات کی آزادی کے خواہاں تھے۔ اپنے نجی مفاد کے لئے کوشاں تھے۔ اُن سب کے اپنے اپنے سپنے تھے جن کی تعبیر وہ دیکھنا چاہتے تھے اور بس ــــ مثال کے طور پر:

"اسی طرح ایک شاعر تھے انور جو عشق میں ناکامیاب ہو چکے تھے۔ ان کی شاعری انقلابی ہوتی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس اب انقلاب آنے ہی والا ہے۔ یہ شاعر سماج میں طبقاتی رشتوں کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اور ایک ایسے سماج کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا جس میں اس کی محبوبہ اُسے مل سکتی۔ بس یہ اسی ایک مصرف کے لئے ترقی پسندی کے قائل تھے کہ جو جس سے چاہے شادی کرے۔"

اور جب ایسا نظام آئے گا تو بقول عصمت:

"اس وقت وہ اس لڑکی سے جی کھول کر محبت کرے گا اور اُس کی مشکیں چوٹی کو حسین راتوں کی خاموشیوں میں کھول کر فضا میں خوشبو پھیلا دے گا پھر کیا ہوگا؟ پھر پتہ نہیں کیا ہوگا۔"[1]

ترقی پسند لوگوں کے ساتھ ان کی داستانیں وابستہ تھیں۔ وہ بھی دل سے ترقی پسند تھے۔ یہ عصمت نے ان کے ساتھ رہ کر اور ان میں رچ بس کر جانا ــــ عصمت نے اس سلسلے میں کئی ہم عصروں کے خاکے اُڑائے ہیں، جن کو ہم بیک نظر پہچان سکتے ہیں ــــ عصمت اس بنیادی حقیقت سے خوب آگاہ تھیں کہ فن میں حقیقی زندگی کی پیش کش محض کتابی مطالعے پر ہی مبنی نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے زندگی کے تلخ و ترش حقائق، نشیب و فراز اور اسرار و رموز کا مطالعہ بھی لازم ہے۔

ایسے ترقی پسند ادبا اور شعرا کی جو تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ قطعاً متاثر نہیں کرتی۔ وہ اپنی اخلاقی کوتاہیوں اور خود غرضیوں کے سبب فرومایہ انسان معلوم ہوتے ہیں ــــ انھیں جو چیز ایک دوسرے سے وابستہ رکھے ہوئے تھی وہ ان کے اشتراکی نظریات تھے، جنھیں وہ اپنے اپنے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

○ اس ناول کے عنوان "ٹیڑھی لکیر" کے تعلق سے اُن عناصر کی نشاندہی کرنا ضروری ہے جنھوں نے اس کی مرکزی کردار شمن میں ٹیڑھا پن پیدا کر دیا ــــ بالعموم انسان کی شخصیت اپنے حالات اور ماحول کی زائیدہ ہوتی ہے۔ اور وہی اس کے کردار کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں۔ اور اُسے ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیتے ہیں، جو آہستہ آہستہ پختہ ہو کر بے لچک اور ناقابلِ تغیر ہو جاتا ہے ــــ بچپن ہی سے شمن اپنے والدین کی محبت و شفقت سے محروم

---

[1] عصمت چغتائی، "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۶۴

رہی جس نے اس کے دل ودماغ میں محبت کے لئے دائمی تشنگی کا احساس پیدا کر دیا اور وہ تمام عمر محبت کے لئے ترستی، بھٹکتی رہی۔ اس بارے میں ناول کا انتساب بڑا معنی خیز اور فکر انگیز ہے۔

"اُن یتیم بچّوں کے نام جن کے والدین بقیدِ حیات ہیں"[1]

یہ عصمت کا اپنے والدین پر بڑا تیکھا اور گہرا طنز ہے جنھوں نے انھیں پدرانہ اور مادرانہ محبت سے محروم رکھا اور جن کے ہوتے ہوئے بھی اُس نے اپنے آپ کو یتیم محسوس کیا۔ اس صورتِ حال کا شمن کے کردار میں "ٹیڑھا پن" پیدا کر دینا اغلب تھا ـــــ پھر شمن کے ساتھ جو بے رحمانہ اور سفاکانہ سلوک پہلے منجھو بی اور پھر آپا بی نے روا رکھا، اس نے شمن کے ٹیڑھے پن میں اضافہ کر دیا اور وہ کچھ زیادہ ہی ضدّی، غُصیل اور جارح ہو گئی۔ نہ صرف یہ ان کے سلوک نے شمن میں بدلہ لینے کے جذبات کی نمود بھی کی ـــــ اسکول میں شمن کا ہم جنسیت کی طرف مائل ہونا بھی ایک طرح سے ٹیڑھا پن ہی تھا ـــــ پھر وہ کئی نفسیاتی عوارض میں مبتلا تھی جنھوں نے اس کے کردار کو مزید ٹیڑھا بینڈا بنا دیا۔ مثلاً اس کا رات کو سوتے ہوئے چل کر مس چرن کے کمرے میں پہنچ جانا ظاہر کرتا ہے شاید اُسے SOMNAMBULISM کا مرض تھا۔ پھر اس کا نعمت خانے سے کھانا چُرا کر کھانا اور کبھی کبھی روپے پیسے بھی چُرانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اُسے KLEPTOMANIA کا عارضہ بھی تھا۔ ان نفسیاتی بیماریوں نے اس کی کج شخصیت کو اور زیادہ کج بنا دیا ـــــ اور جب اس کی زندگی میں یکے بعد دیگرے کئی مرد آئے اور پھر بھی اُسے جنسی آسودگی نہ ملی تو اس کا ٹیڑھا پن نہ صرف فزوں تر ہو گیا بلکہ بے لچک اور ناقابلِ تغیّر بھی ـــــ افتخار نے اُسے ایسا چرکہ دیا کہ بیخ وبُن سے ہلا کر رکھ دیا ـــــ ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ اس کے معاشقے کا انجام بھی بڑا دل شکن اور مایوس کُن رہا جس نے شمن کے قلب وذہن پر اپنی چھاپ مُرتسم کر دی۔ ـــــ رہی سہی کسر رونی ٹیلر کے ساتھ اس کی ناکامیاب شادی نے نکال دی اور وُہ دل شکستہ ہو کر ڈھہ گئی ـــــ یہ تھے وہ عناصر جنھوں نے شمن کے کردار میں کجی کو فروغ دیا ـــــ گویا شمن کی زندگی ٹیڑھے میڑھے، اُوبڑ کھابڑ راستوں پر، افتاں وخیزاں چلتے گذر گئی ـــــ کیونکہ اس میں خود احتسابی اور دروُن بینی کا مادہ تھا، شمن نے مُڑ کر اپنی زندگی پر نگاہ ڈالی:

> "دُور اپنے پیچھے اس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ لمبی چوڑی سڑک جس پر معلوم ہوتا تھا کسی اژدہے کے لہریے کھنچے ہوئے ہیں۔ اس کے پیچھے دوڑتی چلی آرہی تھی۔ دہشت زدہ ہو کر اس نے چاہا لوٹ جائے اور اس بھیانک نشان کو مٹا کر صاف ستھری سیدھی لکیر کھینچ دے۔ مگر یہ خم تو فولاد کے تار کی طرح ضدّی ہو چکے تھے۔ ایک ہی چوٹ میں بج جائیں گے! مُنہ پھیر کر اس نے ٹیڑھے میڑھے

---

[1] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۷

راستوں پر دوڑنا شروع کیا اور ناک کی سیدھ میں آنکھیں بند کئے بھاگتی چلی گئی[1]

شمن نے دیکھا کہ اس کی زندگی ایک اژدہے کے گھسٹنے کے ٹیڑھے میڑھے لہریئے سے مشابہ رہی ہے۔ اس نے چاہا کہ وہ لوٹ جائے اور اپنی زندگی کے سفر کا ازسرِ نو آغاز کرے اور اس ٹیڑھی میڑھی لکیر کو ایک صاف شفاف خطِ مستقیم میں بدل دے۔ مگر اسے فوراً احساس ہو جاتا ہے کہ "ایں خیال است و محال است و جنوں" کہ اب اس کی شخصیت کا ڈھانچہ اس قدر بے لچک اور ناقابلِ تغیر ہو چکا ہے کہ اسے بدلنے کی کوشش محض تضیعِ اوقات ہوگی۔ اور وہ بادلِ نخواستہ اسی پرانی ڈگر پر رواں دواں ہو جاتی ہے۔

مختصراً شمن کو اس کے ناخوشگوار گھریلو حالات، نفسیاتی عوارض اور زندگی کی پے در پے ناکامیوں نے ایک ابنارمل کردار بنا دیا اور بالآخر وہ اپنی ذات کے حصار میں سمٹ کر رہ گئی۔ اس ناول کا مرکزی کردار ہونے کے اعتبار سے شمن اس کی روحِ رواں ہے اور وہ پورے ناول پر پوری طرح چھائی ہوئی ہے ـــــ شمن وہ واحد کردار ہے جو از اوّل تا آخر سامنے رہتی ہے جبکہ باقی سب کردار بلا استثنیٰ اپنا اپنا رول ادا کر کے ناپید ہو جاتے ہیں۔

شمن ایک فارغ البال گھرانے کی اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہین اور فطین لڑکی ہے۔ وہ اونچے درجے کے علمی مباحث میں شدّ ومد سے حصہ لیتی ہے، جن سے اس کی وسیع النظری اور وسیع العلمی ٹپکتی ہے۔ وہ بہت دبنگ، نڈر اور صاف گو ہے اور نتائج سے بے پروا ہو کر اپنی سی کر گذرتی ہے۔ وہ وطن پرست ہے، مگر مذہب اور اس سے وابستہ رسُوم و قیُود سے اسے چنداں لگاؤ نہیں ـــــ بحیثیت مجموعی شمن کی جو تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ زیادہ متاثر نہیں کرتی، کہ اس کا کردار خاص طور پر محبت کے تعلق سے بڑا ٹیڑھا بینڈا ہے کہ اس میں استحکام اور استقلال نہیں پختگی اور خلوص نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس میں سطحیت اور سوقیانہ پن سا ہے۔ وہ اخلاقی اور رُوحانی اقدار سے بیگانہ اور بے نیاز معلوم ہوتی ہے۔ وہ اوصاف مثلاً سنجیدگی، متانت، تحمّل، بُردباری جو ایک باعلم، باشعور، باذوق انسان سے وابستہ کئے جاتے ہیں اس میں مفقود ہیں۔ اور وہ ایک لاابالی، غیر متوازن، باغیانہ طبع کی لڑکی دکھائی دیتی ہے ـــــ پھر اُس میں نامساعد حالات سے مصالحت کرنے کا مادہ بھی کمیاب ہے کہ وہ بے حد ضدّی اور غُصیل ہے اور تصادم اور ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرنے سے گریز نہیں کرتی۔ گویا اس میں عاقبت اندیشی سے دامن بچا کر، کنّی کاٹ کر نکل جانے کی صلاحیّت نہیں ـــــ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر انسانی رشتوں کو پاؤں تلے روندتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ ایک دُور اندیش انسان کچھ اہم رشتوں کی طنابیں مضبُوطی سے تھامے رکھتا ہے تاکہ زندگی کا سفر ذرا آسان ہو جائے۔ مگر شمن اپنے کردار سے انھیں جڑ بنیاد سے ہلا کر رکھ دیتی ہے اور اسے احساسِ زیاں تک نہیں ہوتا۔ وہ اپنی خود پسندی

---

[1] عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیر (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۳۹۹

میں اس قدر غرق ہے گویا اُسے دُنیا جہاں سے چنداں واسطہ نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رونی ٹیلر کے چلے جانے کے بعد وہ اس وسیع و عریض دُنیا میں تن تنہا رہ جاتی ہے۔ لق و دق صحرا میں ایک ٹنڈ منڈ شجر کی طرح — یہ زندگی تو کوئی زندگی نہ ہوئی جس پر کوئی نازاں ہو، شاداں ہو۔

کئی دفعہ احساس ہوتا ہے کہ بطور ایک موڈرن لڑکی کے شمن شاید اپنے وقت سے بہت آگے تھی۔ دھیان رہے کہ وہ آج سے نصف صدی پہلے کی لڑکی ہے کہ یہ ناول ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اب ہمارا معاشرہ اس حد تک گھُٹا ہوا، دَبا ہوا، سہما ہوا نہیں ہے جیسا کہ تب تھا۔ پُرانی اخلاقی اور رُوحانی اقدار اور نظر و فکر کے انداز یکسر بدل گئے ہیں اور معاشرے میں اس قدر کھُلا پن آ گیا ہے کہ اس کی شکل و صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ مگر شمن یقیناً آج کے دَور میں بھی اپنے کردار سے ایک موڈرن لڑکی ہی لگتی ہے یا شاید اس سے بھی دو چار قدم آگے، اپنی خالق عصمت چغتائی کی طرح۔

○ "ٹیڑھی لکیر" زبان کے تعلق سے

عصمت کی زبان اُن کے طبقے کی عورتوں کی مخصُوص زبان ہے جس پر اُنھیں الہامی قدرت حاصل ہے اور جس میں روزمرّہ، کہاوتیں، محاورے، فقرے، آوازے، پھبتیاں، گالیاں، دعائیں، طعنے، کوسنے یوں سموئے رہتے ہیں کہ قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا — پھر عصمت کی زبان میں بلا کی روانی ہے۔ ایک پہاڑی ندی کی سی برق رفتاری جو پتھروں کو چیرتی اپنا راستہ بناتی، شور مچاتی، بے تحاشا آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دمِ تحریر عصمت کے خیالات گھٹا بن کر اُمڈ گھمڈ کر آتے اور ان کا قلم برسنے لگتا۔ دوسرے یہ کہ انھیں زبان و بیان پر اس قدر غیر معمولی قدرت حاصل ہے کہ الفاظ اُن کے خیالات کا ساتھ دیتے ہیں۔ جب خیالات کی یورش اور الفاظ کی طغیانی باہم مل جاتے تو ان کا قلم سرپٹ دوڑنے لگتا۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنے کے معاملے میں عصمت شاید اپنے سب ہم عصروں سے زیادہ زُود نویس تھیں۔ ایسا نہ ہوتا تو منٹو کے مطابق وُہ سات آٹھ نشستوں میں ہی پانچ سو صفحات پر مشتمل یہ ناول "ٹیڑھی لکیر" نہ لکھ پاتیں۔ کرشن چندر عصمت کے فن کے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وُہ ہے گھوڑ دوڑ۔ یعنی رفتار، حرکت، سبک خرامی اور تیز گامی۔ نہ صرف افسانہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ فقرے، کنائے اور اشارے اور آوازیں اور جذبات اور احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔"[1]

منٹو اِس کیفیت کو اپنے مخصُوص انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

---

[1] کرشن چندر: "بلاخیزی" مجموعہ "چوٹیں"۔ روہتاس بکس لاہور۔ ص ۱۰۴

"عصمت کا قلم اور اُس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ لکھنا شروع کرے گی تو کئی مرتبہ اس کا دماغ آ ئے نکل جائے گا اور الفاظ بہت پیچھے ہانپتے رہ جائیں گے۔"[1]

مگر نہیں۔ الفاظ پیچھے ہانپتے کانپتے نہیں رہ جاتے ورنہ ان کا انتھک قلم بغیر رُکے تھمے یُوں اُڑانیں نہ بھرتا رہتا۔

○ پہلے ہم ذرا عصمت کے مکالموں کو لیں۔ ان کے ہم عصروں اور ناقدین نے بلا استثنیٰ ان کے مکالموں کی چستی، بیساختگی اور برجستگی کی تعریف کی ہے۔ عصمت نے زبان کے تعلق سے خاص طور پر مکالموں کی نسبت سے اپنے خاندان کے جن لوگوں سے استفادہ کیا ان میں ان کی ماموں زاد بہنیں اختر اور جمیلہ شامل تھیں۔ جب وہ بولتیں تو لوگ ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ عصمت ان کی بابت لکھتی ہیں:

"ٹوٹے ادھورے کٹے کٹے جملے مگر معنی سے بھرپور، ان کی زبان میں اپنی ننھیال کے ناتے دلی کی بیگمات کی میٹھی بولی کا عجیب لٹکا ہے۔ میری کہانیوں میں مکالمے ان ہی کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں۔"[2]

○ ایک مکالمہ بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

"ٹوٹی ہُوئی چوڑیوں کے نام" چھپ کر آ ہی گئی۔ مگر واقعات نے دوسری ہی کروٹ لے لی۔ شاعر فوراً کھٹک گیا۔ کچھ دن سے پروفیسر بڑے بے وقت مزوُری باتیں کرنے آنے لگے تھے۔ وہ غریب کوئی اور تحفہ نہیں دے سکتا تھا تو یہ گیتوں کی مالا ہی اپنی دیوی کے چرنوں پر چڑھا دی مگر بھی ایرے غیرے نتھو خیرے رُومانی بننے لگے تو یہ تو زیادتی ہے۔ بھنّاتا ہُوا آیا۔ تھوڑی دیر تو خاموش ضبط کئے بیٹھی رہی پھر جل اُٹھی۔

"مگر اس میں آپ کا کیا نقصان؟"

"نقصان تو نہیں مگر تم کو ہر ایک کو ایسے سر نہ چڑھانا چاہیئے۔ گویا گویا۔۔۔"

"کچھ نہیں گویا گویا۔ اونہہ جل گئے۔ آپ کی باریکئ خیال میں وہ آپ سے بہت آگے نکل گئے۔"

"ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام" — اوہ کتنا حسین تخیل!"

"شہ، بالکل نکما اور بے معنی، جی!"

"اونہہ، آپ خود نکمّے اور بے معنی جی!"

---

[1] سعادت حسن منٹو، "عصمت چغتائی" (مضمون) اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۶۔

[2] عصمت چغتائی "غبارِ کارواں" ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ نومبر ۱۹۷۰ء ص ۱۴-۱۳

"آپ کا یہ حسنِ ظن ہے میرے متعلق ... چوٹی کے شعرا میں میرا نام ہے ..."

"اُنہہ سب اُلّو ہیں چوٹی کے شاعر ..."

"مس شمشاد!"

"مسٹر شاعر!"

"آپ کو میری ہتک کرنے کا کوئی حق نہیں ..."

"اور آپ کو میرا بھیجا چاٹنے کا کوئی حق نہیں۔ دماغ پک گیا آپ کے اوندھے سیدھے شعر سُنتے سُنتے ..."

"میں ... میں ... آپ ..."

"کیا میں ... آپ ... کچھ نہیں ... کوئی بات بھی ہو ... اچھی عاشقی ٹھہری کہ گز گز بھر لمبی غزلیں سُنو ... سلام ایسی محبت کو ... ہم لنڈورے ہی بھلے!"

"میں آپ کو ادب پرست اور ..."

"جی۔ معاف کیجئے۔ میں کچھ ادب پرست نہیں۔ یونہی آپ کو اُلّو بنانے کے لئے سُن لیتی تھی ... تشریف لے جائیے اور آئندہ گرلز کالج کی چہار دیواری میں قدم رکھنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ شریفوں کی لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ کوئی چکلہ نہیں یہ ..."

"اور اب تک ..."

"اب تک میری مرضی!"

"میں نے ... میں نے خود اپنا گلا گھونٹ لیا"

"بہت اچھا کیا۔ آپ جائیے خود اپنے آپ کو دفن کر دیجئے ... جائیے"

"جا رہا ہوں ... مگر آپ کو اتنا انحطاط پسند نہیں سمجھتا تھا ... مگر ..."

"جائیے بھی، اور اس اگر مگر کو میری طرف سے گھوڑے پر ڈال دیجئے گا۔ جائیے اور دُنیا والوں سے کہہ دیجئے کہ میں بدمعاش اور آوارہ تھی ... اور آپ کی داشتہ رہی ... جائیے"[1]

معاف کیجئے گا مکالمہ ذرا طویل ہے مگر بے حد دلچسپ، جاذب اور حیران کُن حد تک چُست اور کٹار کی طرح دھار دار ہے۔ ہر سوال کے جواب میں طنز کی زہرناکی جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ثمن کے قلب و جگر

---

[1] عصمت چغتائی، "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۳۸۷ - ۳۸۶

میں نفرت اور حقارت کا ایک بحرِ بیکراں موجزن ہے جس کی تیز ابیّت اور نشتریت بھون کر رکھ دیتی ہے۔ غم و غصّے میں شمن شاعر کی ایک نہیں سنتی اور اُسے ردّی کاغذ کے ٹکڑے کی طرح مروڑ کر کے پھینک دیتی ہے ـــــ کوئی حسّاس، دیدہ ور قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عصمت کے ایسے مکالمے ذہن پر انمٹ چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ جو تیزی، طراری اور بیساختگی عصمت کی بول چال کا طرۂ امتیاز تھی، وُہی ان کے مکالموں میں رچی بسی ملتی ہے۔ عصمت کے مکالموں کی تب و تاب سے ان کا فن روشن ہے۔

○ زورِ بیان

عصمت کے ہاں "زورِ بیان" کے نمونے جا بجا بکھرے ملتے ہیں، جو ان کی تحریر کو جلا عطا کرتے ہیں۔ خیالات کے ریلے اور زبان کے پُرجوش بہاؤ میں قاری بے اختیار بہہ جاتا ہے۔ یہ عصمت کے فن کی کامرانی کی دلیل ہے ـــــ "زورِ بیان" کے لئے ضروری ہے کہ اُمڈتے ہوئے جذبات اور احساسات اور زبان و بیان میں ہم آہنگی ہو، تاکہ اظہارِ مطالب حُسن و خوبی ہو پائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ زورِ بیان میں قلم کی عنان ذرا کس کر رکھی جائے تاکہ وہ بےراہ نہ ہو۔ عصمت اس اعتبار سے بے بدل ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"انور کی شاعری پیش گوئی کرتی تھی کہ انقلاب آئے گا۔ جب یہ ساری پابندیاں ٹوٹ جائیں گی۔ سماج کو میٹ کر رکھ دیا جائے گا۔ شفق خون برسائے گی اور زمین و آسمان سُرخ ہو جائیں گے اور سُرخ آندھیاں چلیں گی۔ پھر اُسی سُرخی کے شعلوں میں ساری بلائیں بھسم ہو جائیں گی۔ آزادی کا قرمزی جھنڈا لہرائے گا۔ مزدور کا راج ہو گا ... اُس وقت وہ اس لڑکی سے جی کھول کر محبت کرے گا اور اس کی مشکیں چوٹی کو حسین راتوں کی خاموشیوں میں کھول کر فضا میں خوشبو پھیلا دے گا۔ پھر کیا ہو گا؟ پھر پتہ نہیں کیا ہو گا۔"[1]

مضمون کی حدُود کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک مختصر سے اقتباس پر ہی اکتفا کی گئی ہے مگر اس سے عصمت کے "زورِ بیان" کی جھلک واضح طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ "زورِ بیان" صرف الفاظ کے پُرزور ہونے کا نام نہیں بلکہ اُن سے مصنف کے حقیقی جذبات بھی منعکس ہونے چاہئیں، کچھ اس طرح کہ وہ بیساختہ قاری پر اثر انداز ہوں۔ عصمت اس کسوٹی پر پُوری اُترتی معلوم ہوتی ہیں۔

○ عصمت منظر نگاری میں بھی یکتا ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اکثر اوقات منظر کو چند جملوں میں سمو کر یوں چھوٹے سے چھوٹے پیش کرتی ہیں کہ وہ کاغذ پر جی اُٹھتا۔ اُن کا مشاہدہ باریک بینی اور دُور رسی چھوٹی سی چھوٹی جزئیات کو بھی اپنے

---

[1] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۶۴

دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور زبان پر اُن کی قدرت اسے صفحۂ قرطاس پر جوں کا توں منتقل کر دیتی ہے۔ اس نوع کی تصویر کشی یا منظر نگاری کی نہ جانے کتنی مثالیں اس ناول میں ملتی ہیں جو اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کا موجب ہوتی ہیں:

"بار بار وہ قلم کو ہونٹوں پر رگڑ کر کچھ نوچنے لگتا اور کتاب پر جھک جاتا۔ اس کی پھنسی ہوئی اسپورٹ شرٹ کھال کی طرح سینے اور شانوں پر منڈھی ہوئی تھی۔ مضبوط گردن ورزش کی وجہ سے آہنی سانچے میں ڈھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ بار بار پہلو بدلتا۔ اس کا کسرتی جسم بالکل اڈونس کے مجسّمے کی طرح کھنچا ہوا اور سڈول تھا۔ بھویں زیادہ گھنی اور تکونی آنکھیں از حد پھرتیلی اور گہری ہو رہی تھیں۔ جب وہ ہونٹ اپنے روٹھنے کے انداز میں سکیڑ لیتا تو بالکل ضدی بچّے کی سی شکل ہو جاتی۔"[1]

○ لطافتِ بیان

عصمت کی تحریر کا حسن اس کا کثیر الجہات ہونا ہے۔ وہ جس پہلو کو چھوتی ہیں وہ کھرے سونے کی طرح چمکنے لگتا ہے ــــ اس میں "لطافتِ بیان" کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ بات میں دلکشی، شیرینی اور ملائمت ہو تو وہ قلب و جگر کے تار پر مضراب کا کام کرتی ہے اور وہ بجنے لگتا ہے۔ اس سے قاری کو ذہنی حظ ملتا ہے، کچھ ویسا ہی تلطّف جو اچھے شعر کو پڑھ کر حاصل ہوتا ہے۔

"جب شمن ان کے کمرے میں پڑھتی تھی تو وہ ان کا ہلکے ہلکے گنگناتے جانا ایسے کہ شمن کو بجائے خلل کے ایک طرح سے مدد سی مل جاتی تھی، فضا کو کچھ اور چکنا اور ہموار سا کر جاتا۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ وہ کسی مشکل سوال پر اٹک گئی ہے کہ مس چرن کے گنگنانے کی چھوٹی چھوٹی لہریں اس کے سوال کی گتھی سے ٹکراتیں اور وہ ڈھیلی ہو کر کھل جاتی۔"[2]

یہ نثر نہیں نظم ہے۔ وہی لطافت، وہی حلاوت، وہی دل و دماغ کو چھو لینے والی کیفیت ــــ دوسری مثال:

"وہ الفاظ ڈھونڈنے کے لئے بالوں کو انگلیوں سے سلجھانے لگا" "مگر مس بوگا کی محبت ہی نہیں، نہ تو اس میں ماں کا سا معصوم پیار ہے اور نہ محبوبہ کی پُر جوش گرمی۔ وہ تو ایک بجھے ہوئے شعلے کی بے حقیقت گرمی بھی نہیں۔ برف کی طرح ٹھنڈی اور مٹی کی طرح بے جان ہے۔ کچھ بوسیدہ اور گھسی ہوئی سی وحشت ہے" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔"[3]

یہ بے جان حسن کی کتنی جاندار تصویر ہے اور وہ بھی صرف پانچ جملوں میں ــــ اور اب یہ آخری مثال:

---

[1] [2] [3] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۳۵، ۷۴-۷۳، ۲۹۴

○ "جی چاہتا ہے زندگی کی لمبان لامتناہی ہو جائے۔ یہی چیڑ کے لمبے درخت ہوں۔ اخروٹ کی چھاؤں ہو۔ وہ اور ٹیلر شیلی کی نظموں میں اُلجھ کر کھوئے رہیں۔ زندگی اتنی نرم و نازک بھی ہو سکتی ہے یہ اُسے معلوم نہ تھا۔ بے معنی قہقہے، گہری نیندیں، بڑھی ہوئی بھوک اور کیا چاہیئے تھا"[1]

اسے پڑھتے ہوئے "بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے" والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس نوع کے ٹکڑوں کو اگر ان کے مخصوص سیاق و سباق سے نوچ کر دیکھا جائے تو ان کا تاثر کچھ حد تک تحلیل ہو جاتا ہے۔ بایں ہمہ یہ اس صورت میں بھی متاثر کرتے ہیں۔ اور اپنی ملائمت، رنگینی اور شیرینی سے ذہن میں آسودگی کا احساس جگاتے ہیں۔

○ معنی خیز اور فکر انگیز جملے

عصمت کے ہاں معنی خیز اور فکر انگیز جملے بھی کثرت سے ملتے ہیں جو ان کے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ زندگی کے لمبے سفر میں اس کی کامرانیوں اور نامرادیوں سے گذرتے ہوئے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے اور وُہ جو نتائج اخذ کرتا ہے وہ اس کے لئے "کلیے" اور "موقف" بن جاتے ہیں۔ یا یُوں کہیئے کہ حیاتِ ارضی کا فلسفہ بن جاتے ہیں ـــــ قاری کو ایسے جملے ذہنی تلطّف تو مہیّا کرتے ہی ہیں غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں ـــــ دو ایک مثالیں پیش ہیں :

"افتخار نے اُسے ایک نایاب نسخہ سکھا دیا تھا۔ اگر شیر کو سدھانا ہو تو بھوکا رکھو۔ حکومت کرنا ہو تو بھوکا رکھو۔ یہ جو گنتی کے سفید کروڑوں کالوں پر راج کر رہے ہیں یہ سب بھُوک کی پالیسی کی بدولت۔ نتھنوں میں خوشبو آئے، رال ٹپک پڑے، زبان باہر نکل آئے مگر کھانا مت دو۔ پیٹ بھر جاتا ہے تو کھانے والا لقموں کا مزا دوبارہ تھوڑی یاد رکھتا۔ حلق سے اُترا سو گیا۔ بس ہونٹوں تک بات کرو، حلق سے دُور!"[2]

ایک مثال اور :

"محبت تو ـــــ غریبوں ہی سے زیادہ ہوتی ہے مگر۔۔"

"مگر؟"

"مگر شادی تو امیر ہی سے کرنا پڑتی ہے ۔۔۔ کیوں ہے نا بھئی؟"

"کیوں؟ یہ تو بالکل رنڈیوں جیسی بات ہوئی"

"ہشت۔ رنڈیوں جیسی کیوں ہوئی۔ اور اگر ہے بھی تو کیا مُوا شمن ایک ہی تو بات ہے"[3]

---

[1][2][3] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۴۴۹، ۳۷۹، ۲۱۷

○ اور اب یہ آخری مثال:

"اور اتنے دن جھک مارنے کے بعد پتہ چلا کہ عورت خواہ وہ کوئی ہو، کہیں ہو، اسے سمجھنے کی کوشش کرنا حماقت ہے۔ وہ سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ استعمال کے لئے ہے۔" (ص ۲۹۱)

ہر مثال کا تاثر قاری کو چونکا دیتا ہے گو اس کا ان کلیوں سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ مگر یہ غور و فکر کی دعوت ضرور دیتے ہیں۔

○ ایک اچھی تشبیہ کی وہی حیثیت ہے جو کسی حسینہ کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر کی تشبیہ سے جہاں تحریر چمک اٹھتی ہے وہیں وہ اظہار مطالب میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتی ہے ——— تشبیہ کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مناسب و موزوں ہو اور اپنے مخصوص سیاق و سباق میں ایسے فٹ بیٹھے جیسے انگشت میں انگشتانہ ——— چند ایک تشبیہیں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش ہیں:

○ "اماں تو نسل خانے میں چوتی ایسے چپ کر بیٹھتیں جیسے موٹی لگائی ہو۔" (ص ۲۴)

○ "اس کی باہر کو ابلی ہوئی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی اور بے رونق تھیں جیسے چپٹی تھالی میں دو مینڈک رکھے ہوں۔" (ص ۸۰)

○ "وہ پھن کچلے ہوئے سانپ کی طرح بھناجاتی۔" (ص ۸۱)

"بجمہ گرم اور نرم ایسی کہ ہاتھوں میں لے کر زور سے دباؤ تو ابلے ہوئے انڈے کی طرح پھسل جائے۔" (ص ۹۱)

○ "شمن بھئی مجھے گجرے نہیں اچھے لگتے۔ یہ پھول میں گھر سے لائی ہوں، اچھے ہیں نا، شمن کو معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کا ننگا تن ڈھانک دیا۔" (ص ۱۰۵)

○ "جوانی لہراتے پھنکارتے سانپ کی طرح پلک جھپکتے دوڑ گئی۔ کچھ یونہی دھندلی سی لکیر باقی تھی۔" (ص ۲۰۹)

○ "وہاں صرف ایک ملگجی سی سرخ تانی لٹکی ہوئی پھانسی لگے ملزم کی طرح جھول رہی تھی۔" (ص ۲۰۹)

یہ عصمت کی تشبیہوں کے مختلف رنگ اور انداز ہیں، جو اپنے اپنے مقام پر چمک اٹھتی ہیں۔ تشبیہات اور استعارے عصمت کی تحریر کا بہت اہم جزو ہیں اور وہ اس ناول میں ہر گام پر ملتے ہیں۔

○ عصمت کے ادب میں طنز و مزاح کی ہلکی ہلکی چاشنی گھلی ملی ملتی ہے۔ اس ناول میں بھی اس کے بڑے دلکش نمونے جا بجا دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور تحریر کا چہرہ مہرہ نکھر جاتا ہے۔ طنز دل سے زیادہ دماغ کو متاثر کرتا ہے اور مزاح دماغ سے زیادہ دل کو۔ گو دونوں میں بہت باریک سا فرق ہے کہ بالعموم مزاح میں بھی طنز کا رنگ ہوتا ہے۔

- "اماں نے عبّاس کو بھینچ کر گلے لگایا اور چچا کو سچ مچ دعا دی۔" (ص ۱۵۲)
- "چچا مرغ مسلّم کھاتے کھاتے اَدھ مرے ہو گئے۔" (ص ۱۵۴)
- "مہینہ میں ایک دفعہ باری باری سے سفید اُستانیاں کالے چرچ میں عبادت کر کے اُسے مقدّس بنانے ضرور چلی جاتیں۔" (ص ۱۷۳)
- "لڑکیوں کی تعداد قدرتی طور پر محدود تھی۔ لہٰذا ایک ایک لڑکی بطور تبرّک ہر گروپ میں بانٹ دی گئی۔" (ص ۲۲۴)
- "کہیے کیا حال ہے آپ کی بد مزاجی کا؟" وہ ہمیشہ اسی طرح اُن کی مزاج پُرسی کرتے۔" (ص ۲۸۴)
- "اسکول میں ہندو اور عیسائی لڑکیوں کی تعداد بڑھی مگر مسلمان لڑکیاں اور کم ہو گئیں۔ اسکول جب تک اسلامی نہ ہو اسلامی پانی کی طرح اس کی طہارت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔" (ص ۳۱۰)
- "گھنٹہ بھر سے وُہ اسُی ایک تصویر کو حفظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" (ص ۳۲۰)

طنز و مزاح تحریر کو تازگی اور شگفتگی عطا کرتے ہیں اور قاری کی توجہ کو باندھے رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ طنز و مزاح کا جوہر جبلّی ہوتا ہے کسبی نہیں۔ عصمت میں یہ جوہر بدرجہ اتم موجود ہے اور رہ رہ کر چھلکا پڑتا ہے۔

- زبان پر قدرت حاصل ہونا ایک بات ہے مگر اپنے کرداروں کی مخصوص زبان میں لکھنا الگ چیز ہے۔ اُونچا طبقہ جو زبان بولتا ہے، وہ متوسط طبقے کی زبان نہیں ہوتی۔ اور متوسط طبقہ جو زبان بولتا ہے وہ نچلے ناخواندہ طبقے کی زبان نہیں ہوتی۔ نہ صرف زبان بدل جاتی ہے بلکہ لب و لہجہ بھی بدل جاتا ہے۔ اپنے کرداروں کی مخصوص طبقے کی زبان استعمال کرنے سے تحریر میں نہ صرف حقیقت کا رنگ در آتا ہے بلکہ اس کی جاذبیت اور تاثر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ عصمت کا یہ خاصّہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے طبقے کی زبان ہی استعمال کرتی ہیں۔ اور اپنے طبقے کی عورتوں کی زبان پر تو انھیں ید طولیٰ حاصل ہے:

اپنے کرداروں کی

- "اری رسُولن، او، رسُولن کہاں مر گئی۔ مالزادی! جا علی بخش سے کہہ کہ سودا نہیں لائے۔ ہاں جلدی سے لائیں، مونگ کی دال اور ... اور بھُنی ہوئی گرم گرم مونگ پھلیاں، ہاں شمن بی کے لئے، اور شکر کی گولیاں بھی ... نائیں میرا چاند، میرا کلیجے کا ٹکڑا ہے۔"[1]
- "اے شمن عبّاس کے لئے گرم پانی بھجوا دیا ہوتا کہ دُھما بنی بیٹھی ہو۔" ماں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ بڑی کا مزاج بڑا تیز تھا۔[2]

---

[1] [2] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۵، ۱۵۲

"اے یہ لوگ یتیم بیوہ کا خون چوسنے سے بھی نہیں چوکتے - ارے بھئی لوگوں کو تو بہت مل جائیں گے - یتیم کو جُڑ جائے تو بہت جانو - قرآن پاک میں بھی یہی لکھا ہے کہ پہلے یتیم بیوہ کا حق -"[1]

مجنوں گورکھپوری عصمت کی زبان کی بابت لکھتے ہیں:

"اُن کی زبان کے متعلق تو کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں - ان کو ایک خاص جوار اور ایک خاص طبقہ کی روزمرہ زبان پر الہامی قدرت حاصل ہے - ایسی بے تکان زبان مشکل ہی سے کسی کو نصیب ہو سکتی ہے"[2]

یہی وہ گھریلو زبان ہے جس نے عصمت کے فن کو آب و تاب عطا کی ہے اور جس میں انھیں اپنے ہم عصر ادیبوں پر برتری حاصل ہے۔

عصمت کی زبان اور اسلوب کا حسن اُن کی تحریر کے مندرجہ بالا اجزائے ترکیبی کی بنا پر قائم ہے ——— خیال آتا ہے کہ اگر عصمت کا ادب تشبیہات، منظر نگاری، فکر انگیز جملوں اور طنز و مزاح وغیرہ کے عناصر سے عاری ہوتا تو بھی شاید ان کی سادہ زبان کا مجموعی تاثر ان کی تحریر کو چکا چوند عطا کرنے کے لئے کافی تھا۔ انھیں زبان پر اس قدر قدرت حاصل ہے اور ان کا اندازِ بیان اس قدر جاذب ہے کہ قاری مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی "گھریلو زبان"، بول چال کے بے حد رواں دواں انداز میں یوں صفحۂ قرطاس پر منتقل کئے جاتی ہیں کہ قاری اس کے بہاؤ میں کھو سا جاتا ہے ——— عصمت کے پاس الفاظ کا نا ختم خزانہ ہے اور ان کے پیرایۂ بیان کے بھی نہ معلوم کتنے رنگ ہیں۔ پھر ان کی تحریر کی سادگی میں بھی ایک باطنی شوخی اور چلبلاہٹ ہے، وہی جو اُن کی گفتگو میں ہے ——— زبان و بیان کے معاملے میں عصمت یکتا ہیں۔

اس ناول کے ابتدائی حصّے میں کوئی سو صفحات تک عصمت ناول کی جزئیات پر غیر معمولی گرفت، زبان و بیان پر کامل قدرت اور ایجازِ تحریر کے طفیل پے در پے ایسی چھوٹی بڑی تصویریں بناتی چلی جاتی ہیں کہ قاری اُن کے حسن اور تواتر پر دنگ رہ جاتا ہے۔ جزئیات ایک ریلے کی صورت میں اُمڈی چلی آتی ہیں اور کہیں رُکنے تھمنے کا نام نہیں لیتیں۔ اور لطف یہ کہ اُن میں ضبط اور ربط برقرار رہتا ہے۔ ہر جملہ تانت کی طرح کسا کسا تنا تنا ملتا ہے۔ اور تمام تصویریں عمدگی اور فنی صناعی سے تراشی گئی معلوم ہوتی ہیں۔ اور عصمت اس کام کو بڑی معروضیت

---

[1] عصمت چغتائی "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۱۵۶

[2] مجنوں گورکھپوری "نکاتِ مجنوں" کتابستان، الٰہ آباد ص ۳۲۲

سے انجام دیتی ہیں کہ وہ موجود ہوتے ہوئے بھی کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ اور ان کا "تخلیقی انہماک"، ہنر مندی اور چابکدستی قاری کے قلب و جگر کو چھو لیتی ہے ـــــ دو ایک مثالیں بطور نمونہ پیش ہیں:

○ "اور یہ پیٹ کی کھرچن، کالی پیلی دھنیا سی ناک، چیاں سی آنکھیں پر چیل سے زیادہ تیز۔ بڑی آپا اور منجھو دونوں نے کئی دفعہ اس کے چوہے کے بچے جیسے منہ کو مسکراتے ہوئے دیکھا گویا وہ انھیں چھیڑنے کو مسکرا رہی ہے۔"[1]

○ "سوائے مرغیوں کی کڑ کڑ کے بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنا کیا کرے۔ اتنے میں ایک بلی دیوار پر سے کودی، ڈربے میں مرغیاں چونکتی ہو کر کڑ کڑائیں، وہ اٹھ کر برآمدے میں واپس بھاگی۔ راستے میں اس کی نظر کیاریوں پر پڑی جہاں دھنیا اور ساگ بویا ہوا تھا۔ اندھیرے میں بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کالا کالا اون الجھا ہوا پڑا ہے۔ بڑی آپا کی کیاریاں ـــ آناً فاناً میں وہ بھو کی شیرنی کی طرح ہری بھری کیاریوں پر پل پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے کھسوٹنا شروع کیا، جیسے وہ اپنی کسی دشمن کی آنکھیں نکال رہی ہو اور مٹھیوں میں لے کر اس نے زمین پر رگڑ ڈالا۔ مرچوں کے پیڑ، لوکی کی بیل، چنبیلی اور موگرے کے پودے جس میں سے روز پھول توڑ کر آپا جوڑے میں لگایا کرتی تھیں، توڑ موڑ کر پیروں سے مسل ڈالے۔ اب اسے ہنسی آنے لگی جیسے کسی نے پچکاریوں سے تازہ تازہ خون اس کے جسم میں بھر دیا ہے۔"[2]

ایسی بھرپور، دلکش، منہ سے بولتی ہوئی تصویریں ہمیں قریب قریب ہر صفحے پر ملتی ہیں۔ مگر افسوس کہ پہلے سو صفحوں کے بعد طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور ناول کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد حسن عسکری کے الفاظ میں:

"اس ناول کے پہلے پچاس صفحے تو ایسے ہیں کہ ہمارا ادب ان کا جواب پیش نہیں کر سکتا۔"[3]

انھیں پڑھ کر بیدی کا ناول "ایک چادر میلی سی" بیساختہ ذہن میں آجاتا ہے۔ منٹو کے ایک دو افسانوں مثلاً "بو" میں بھی یہ کیفیت ملتی ہے۔ اگر عصمت اِس انہماک اور معروضیّت کے ٹیمپو کو آخر تک قائم رکھ پاتیں تو شاید اردو ادب کو ایک ایسا نادر اور فقید المثال ناول مل جاتا جس پر وہ ہمیشہ ناز کرتا۔

مگر جب ناول گھر آنگن کی تنگ دامانی سے نکل کر باہری دنیا کی وسعتوں سے ہمکنار ہوتا ہے تو اس پر عصمت کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ناول میں انتشار اور بکھراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب

---

[1] [2] عصمت چغتائی: "ٹیڑھی لکیر" (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۱۰، ۳۶

[3] محمد حسن عسکری: "عصمت چغتائی" (مضمون) اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر) دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۸۳

یہ ہے کہ عصمت بے حد تعجیل پسند تھیں۔ صبر و تحمل، بُردباری، غور و فکر، نظم و ضبط اور منصوبہ بندی جو ناول نگاری کے لئے درکار ہیں، ان میں ناپید تھے ـــــ شمیم حنفی کے الفاظ میں:

"ان کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ اپنے تخلیقی تموّج کو وہ دیر تک سنبھال نہیں سکتی تھیں۔ بڑے پیمانے پر کسی تجربے کی حصار بندی سے قاصر تھیں"[1]

اور عصمت کی یہی خامی نہ صرف "ٹیڑھی لکیر" بلکہ ان کے دیگر ناولوں کے بھی پست اور کوتاہ قد ہونے کا سبب ٹھہری۔

مگر ناول نگاری کے برعکس عصمت کی گرفت افسانہ نگاری پر اس کے مقابلتاً مختصر ہونے کے سبب، بہت مضبوط ہے، ان کے افسانوں میں ربط اور رچاؤ ملتا ہے اور چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بھی اُن کی باریک بین اور دُوررس نگاہوں سے بچ نہیں سکتیں، جبکہ ناول کو سمیٹنے کی کوشش میں وہ خود سمٹ سمٹا کر رہ جاتی ہیں۔

اس بات کو مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ناول نگاری کا فن افسانہ نگاری سے بالکل جُدا گانہ ہے ـ منٹو خسرو قلمِ افسانہ نگاری تھے مگر اپنی تعجیل پسندی کے سبب، سعیٔ بسیار کے باوصف، وہ ایک بھی ناول نہ لکھ پائے اور جو آدھا ادھورا ناول انھوں نے لکھا وُہ بھی "بغیر عنوان کے" ہی رہا۔ یہ بات عین مین عصمت کی ناول نگاری پر بھی عاید ہوتی ہے۔ گو انھوں نے کئی ناول لکھے مگر وہ سب کوتاہ قد ہی رہ گئے ـــــ منٹو نے لکھا ہے کہ عصمت نے "ٹیڑھی لکیر" محض سات آٹھ نشستوں میں ہی لکھ ڈالا۔ مگر یہ کوئی قابلِ تعریف بات نہیں اور نہ ہی ناول کے قدرِ اوّل کا ہونے کی دلیل۔ بلکہ یہ اُن کی تعجیل پسندی اور منصوبہ بندی کے فقدان کی توثیق کرتی ہے ـــ ظاہر ہے کہ جو توجہ، لگن، انہماک "ٹیڑھی لکیر" ایسے پانچ سو صفحات پر مشتمل ناول کے لئے درکار تھا عصمت اُسے جُٹا نہ پائیں۔ نتیجہ یہ کہ ناول بے حد موثر اُٹھان کے باوجود تشنہ رہ گیا۔ آیئے اس پر ذرا قریب سے نظر ڈالیں۔

ناول کے پلاٹ کا قابلِ اعتبار ہونا از بس ضروری ہے ورنہ پلاٹ کی یہ خامی ناول کے گلے کا طوق بن جاتی ہے اور قاری سر کھجاتا رہ جاتا ہے۔ یہ ناول کی اوّلین خصوصیت ہے کہ اس میں ربط و ضبط ہو اور کوئی رخنہ اور جھول نہ ہو۔ واقعات، حادثات اور سانحات کا عقلی اور منطقی جواز ہو۔ ناول کے موڑ اور اُتار چڑھاؤ اس کے سیاق و سباق اور وجود سے اُبھر کر سامنے آئیں۔ یہ سب عناصر ایک اچھے پلاٹ کے ضروری لوازم ہیں۔ اس ناول کے تعلق سے عصمت کی بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ اس کے پلاٹ کی تشکیل و تعمیر میں تغافل پسند اور سہل انگار واقع ہوئی ہیں۔ دمِ تحریر جہاں انھیں پیش رفت کے لئے راستہ نہیں ملتا، وہ کوئی ایسا جواز پیش

---

[1] شمیم حنفی۔ "عصمت کی ٹیڑھی لکیر" سہ ماہی "سوغات" بنگلور۔ ستمبر ۱۹۹۳ء، ص ۶۷

کر کے آگے بڑھ جاتی ہیں جو عقلِ سلیم پر گراں گذرتا ہے اور ناول فنّی لحاظ سے پست ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر شمن اسکول کی زندگی کی اُکتاہٹ آمیز یکسانیت سے تنگ آکر اور جنگ عظیم میں عالمی سطح پر ہونے والی قتل و غارت سے دل برداشتہ ہو کر کچھ دنوں کے لئے کہیں دُور چلی جانا چاہتی ہے تاکہ اس کی فطری بشاشت عود کر آئے:

"گھبرا کر اُس نے پندرہ دن کی چھٹی لی اور کہیں دُور جانے کا ارادہ کر لیا۔ کہاں؟ یہ اس نے اسٹیشن پر پہنچ کر بھی فیصلہ نہ کیا۔ سب سے پہلی ٹرین مدراس کلکتہ تھی، اُس نے وہی پکڑ لی۔

کہاں جا رہی ہے؟ کس کے پاس؟ یہ اُس نے سوچنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی۔ کیا ضرورت تھی کسی منزل کی۔ جب جانا ہی ٹھہرا تو پھر کیا حاجت ہے کسی مقرّرہ لکیر پر چلنے کی"[1]

یہ باور کرنا مشکل ہے کہ شمن جیسی ذہین، بیدار مغز، اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی، منزل کا تعین کئے بغیر گھر سے نکل کھڑی ہوگی اور جو اوّل گاڑی اُسے ملتی ہے اس میں آنکھیں بند کئے بیٹھ جائے گی اور وُہ جہاں لے چلے چلی جائے گی، کہ عام زندگی میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا ــــــ درحقیقت عصمت کو شمن کو اس کی دوست ایلما سے ملانا مقصود تھا مگر جب انھیں راستہ نہیں ملتا تو وہ اُسے پہلی گاڑی سے کسی نامعلوم منزل کو روانہ کر دیتی ہیں۔ اور پھر اُس کی ملاقات پلیٹ فارم پر ہی ایلما سے ہو جاتی ہے اور ٹھہری ٹھہری کہانی آگے سرکنے لگتی ہے ــــــ پلاٹ کا یہ رخنہ ایک باریک بین قاری کو کھٹکتا ہے اور ناول کی اعتباریت پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔

○ اسی نوع کی ایک مثال اور:

شمن پھر ایک دن بوریا بستر سمیٹ کر بغیر کسی معقول جواز کے شام کی گاڑی سے کسی نامعلوم منزل کو روانہ ہو جاتی ہے ــــــ اور اچانک آگرہ، لاہور، دہلی کی سیر و سیاحت کا ذکر شروع ہو جاتا ہے جس کا ناول کے پلاٹ سے کہانی کے سیاق و سباق سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ربط، ضبط نہیں مصنفہ کا واحد مقصد ان شہروں کے تعلق سے چند دلچسپ اور جاذب کوائف ایزاد کرنا ہے ــــــ عصمت وہاں سے شمن کو بنگلور بھیج دیتی ہیں تاکہ وہاں اس کی ملاقات روپی ٹیلر سے ہو اور وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں مُنسلک ہو جائیں ــــــ یہ عصمت کی ایک اور بڑی لغزش ہے۔ دھیان رہے کہ بادی النظر میں عصمت کا ہر اقدام با مقصد اور بامعنی دکھائی دیتا ہے۔ مگر فنّی لحاظ سے وہ دیدہ ور قاری کو قابلِ قبول نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی عقلی اور منطقی جواز نہیں ہوتا اور وہ ناول کے باطن سے نہیں اُبھرتا بلکہ اُوپر سے لادا گیا، تھوپا گیا معلوم ہوتا ہے ــــــ پلاٹ سازی کی یہ خامی ناول کو کم پایہ اور فرومایہ بنا دیتی ہے اور عصمت کی فنّی استعداد پر اُنگلی اُٹھ جاتی ہے۔

---

[1] عصمت چغتائی، 'ٹیڑھی لکیر' (ناول) نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۳۱۷

○ پلاٹ کے اس نوع کے سقائم سے قطع نظر ناول میں اور بھی کئی خامیاں ملتی ہیں جو بطور ایک فنکارہ کے عصمت کی تغافل پسندی اور سہل انگاری پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک بیدار مغز اور ہوشیار ناول نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ چوکنا رہے اور کوائف کو بغیر جانچے پرکھے قلم بند نہ کرے تاکہ کوئی سہو نہ ہو جائے۔ "ٹیڑھی لکیر" میں کئی مقامات پر ایسی لغزشیں ملتی ہیں جو ناول کو داغدار کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

○ افتخار شمن کو بتاتا ہے کہ اسے تپدق کا مرض لاحق ہے اور وہ علاج کے لئے بھوالی سینی ٹوریم میں داخل ہو رہا ہے اور "ہماری مہربان گورنمنٹ نے ہی بی۔ کلاس میں میرے لئے پلنگ دلوا دیا ہے۔ سارا خرچ یونیورسٹی اور حکومت کے ذمے ہے[1] ـــــ مگر افتخار کے بلاوے پر جب شمن اُسے سینی ٹوریم میں ملنے جاتی ہے تو دیکھتی ہے کہ "دو سو بہتر روپے کا بل اس کے پاس پڑا ہے" جو اگر ادا نہ ہُوا تو چوبیس گھنٹے کا نوٹس ہے[2] ـــــ اور شمن افتخار کے انکار کے باوجود بل ادا کر دیتی ہے ـــــ صاف ظاہر ہے کہ یہ لغزش عصمت کی بے توجہی کا نتیجہ ہے۔

○ پھر ٹیلر شمن کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہوئے کہتا ہے: "ایک بات، میں انگریز نہیں آئرش ہوں[3]" ـــــ پھر بغیر کسی معلوم سبب کے وہ امریکی بن جاتا ہے۔ "یہ بات یہیں تک نہ رہی بلکہ ڈاک کے پَروں پر اُڑتی ہوئی امریکہ میں ٹیلر کی بیوہ ماں تک پہنچ گئی[4]" ـــــ یہ عصمت کی بے توجہی کا ایک اور ثبوت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ناول کی بنت پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے ـــــ ناول میں نہ جانے اس طرح کے کتنے سقائم ہیں۔

○ ناول کے ارتقا کے ساتھ ساتھ عصمت کی تحریر میں ایک طرح کی مکتبیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ واقعات، سانحات اور کیفیات کا بیان محض ذہنی سطح پر کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ حسنِ زبان و بیان بھی اسے خشک اور بے آب ہونے سے بچا نہیں سکتے ـــــ دو ایک مثالیں پیش ہیں:

○ "یہ ہندوستان کی ہر چیز رینگنے کی کیوں عادی ہے۔ صدیاں چاہئیں ایک طرف سے دوسری طرف گردن پھیرنے کے لئے۔"

○ "اگر یہ سیکنڈ کی سوئی ذرا لپک کر چلے تو شاید دُنیا اُس کے ہلکوروں سے جاگ اُٹھے۔ یہ وقت اس قدر ہولے ہولے چوری چھپے نہ چلتا تو انسان اتنا کاہل کبھی نہ ہوتا۔"

○ "کاش اس کھنڈر کے کاہل باسیوں کو کوئی سانحہ گھسیٹ کر لق و دق صحرا میں لے جا پٹختا، جہاں اس گھر کی اندھیری پناہ سے آزاد ہو کر وہ خود اپنے ہاتھوں سے نئی پناہ گاہیں بنانے پر مجبور ہو جاتے۔ ہر چیز کو تخریب کی ضرورت تھی۔"

---

[1] [2] [3] [4] عصمت چغتائی۔ "ٹیڑھی لکیر"۔ نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ ص ۲۴۹، ۳۴۳، ۴۱۱، ۴۵۹

اس طرح مقولوں اور چست جملوں کے سہارے عصمت بلا تکلف کیفیتوں کا بیان محض ذہنی سطح پر کرتی ہیں۔ جو اوپری اور سطحی لگتا ہے کہ اس میں ان کی تحریر میں تصویر سازی کا اور ہر جذبے، احساس اور خیال کو چھونے اور چکھنے کا ایک تجسیمی زاویہ جو ذہنی تجربے کو طبعی تجربے میں منتقل کر دینے کی استعداد رکھتا تھا، "ٹیڑھی لکیر" کے بعد کے صفحات میں ناپید ہے[1] ــــ اس بات کو صاف اور سیدھے انداز میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ تخلیقیت کا عنصر جو ابتدائی صفحات میں اس قدر فراواں دکھائی دیتا ہے، بعد کے صفحات میں قریب قریب نابود ہو جاتا ہے۔

○ ایک اور نکتہ قابلِ غور ہے۔ شمن کے ترقی پسند ادیبوں اور روفی ٹیلر کے ساتھ جنگِ عظیم کے پس منظر میں بین الاقوامی سیاسیات پر طویل مباحث سے احساس ہوتا ہے کہ ایسے موضوعات پر عصمت کی گرفت ڈھیلی ہے اور وہ اُن سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے سے قاصر ہیں۔ کہنے کا حاصل یہ کہ ان مباحث میں عمومیت ہے اور وہ اپنی پست سطح سے اُٹھ نہیں پاتے۔ درحقیقت انٹلیکچول ازم عصمت کو راس نہیں آتا۔ نتیجہ یہ کہ گو مباحث بہت گرمجوشی سے ہوتے ہیں مگر بحیثیت مجموعی ذہنی سطح پر وہ قاری کو پھیکے اور بے آب و رنگ لگتے ہیں کہ ان میں بلند آہنگی ہے بلاغت نہیں۔ گرمی ہے روشنی نہیں۔ اور یہی وجہ وہ متاثر نہیں کرتے۔

○ یہ صحیح ہے کہ عصمت نے مذہب، سیاست، سرمایہ داری، ایشیا اور افریقہ کے پسماندہ ملکوں کا استحصال کرنے والی طاقتوں اور جھوٹی انسان دوستی اور جھوٹی ترقی پسندی پر بے محابا وار کیے ہیں مگر شمیم حنفی کے الفاظ میں:

"اس عمل میں ناول ناول نہیں رہ جاتا، کچے افکار اور فیشن ایبل نظریات کی پوٹ بنتا جاتا ہے"[2]

گو یا عصمت اِن موضوعات سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے سے قاصر رہیں کہ ان کے نظریات اور استدلال میں پختگی اور ژرف نگاہی نہ تھی۔

○ اس ناول کا قابلِ قدر پہلو یہ ہے کہ عصمت نے اتنے وسیع تناظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس ناول کی تخلیق کا بیڑا اُٹھایا اور اسے بحسن و خوبی انجام دینے کی بھرپور کوشش کی مگر اپنی فنی، ذہنی اور فطری کوتاہیوں کے سبب ناکام رہیں ــــ مگر ناول کے ابتدائی حصے نے یہ بات ثابت کر دی کہ اُن میں قدرِ اوّل کا ناول لکھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اگر وہ صبر و تحمل، توجہ اور انہماک سے کام لیتیں تو شاید اپنے فن کی معراج کو چھو لیتیں اور اُردو ناول نگاری اُن پر ناز کرتی۔

"ٹیڑھی لکیر" ایک اوسط درجے کا ناول ہے، جو اوّل درجے کا بنتے بنتے رہ گیا۔

---

[1] [2] شمیم حنفی: عصمت کی "ٹیڑھی لکیر" سہ ماہی "سوغات" بنگلور، ستمبر ۱۹۹۳ء، ص ۷۳، ۷۱

○ ناولٹ

دِل کی دُنیا

عصمت نے کئی ناول اور ناولٹ لکھے۔ مثلاً "ضدی"، "معصومہ"، "ٹیڑھی لکیر"، "دل کی دُنیا"، "سودائی"، "عجیب آدمی"، "تین اناڑی" اور "ایک قطرۂ خون"۔ ان میں سے ناقدین اور قارئین نے "ٹیڑھی لکیر" کو ان کا بہترین ناول تسلیم کیا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ناول بیشتر عصمت کی سوانح حیات پر مبنی ہے، جس کی وجہ سے یہ قارئین کی توجہ بے اختیار اپنی جانب مبذول کرتا ہے ——— ایک انٹرویو کے دوران جب عصمت سے سوال کیا گیا:

"ٹیڑھی لکیر" آپ کی پہلی کوشش کے ساتھ ہی آخری کوشش بھی ہے؟"

تو اُنھوں نے کہا: "مجھے اس سے زیادہ "دل کی دُنیا" پسند ہے۔"[1]

ایسے میں "دل کی دُنیا" کا تجزیاتی مُطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اسے عصمت کے نزدیک اُن کے دیگر ناولوں پر فوقیت حاصل ہے۔

"ٹیڑھی لکیر" اور "دل کی دُنیا" کے علاوہ عصمت کے جن ناولوں کو شرفِ قبولیت ملا وہ "ضدی" اور "معصومہ" ہیں۔ کیونکہ اس کتاب کی حُدود کو ملحوظ رکھتے ہُوئے یہاں اُن کا تجزیاتی مُطالعہ پیش کرنا ممکن نہیں، اس لئے ان کا خلاصہ دینے پر ہی اکتفا کی گئی ہے تاکہ قارئین کم از کم ان کے خدّ و خال سے ہی شناسا ہو جائیں۔

● پلاٹ:

جب دُور ترائی سے ایک پُراسرار آواز اُبھرتی: "کانیا توری مُرلی بیرن بھئی" تو بچے خوفزدہ ہو کر بھاگ کر کوٹھی کے اندر آ جاتے۔ کہتے ہیں کہ گھاگرا ندی میں کوئی بارات ڈوب گئی تھی۔ دُلہن بچ گئی اور اب وُہ بھٹنی بن کر

---

[1] عصمت چغتائی: "عصمت چغتائی سے انٹرویو"، از شمع افروز زیدی مجموعہ "کاغذی ہے پیرہن"۔ روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۳

ترائی میں بھٹک رہی تھی۔ یہ آواز اُسی کی تھی۔ جب بھی یہ آواز آتی قدُسیہ خالہ کو دل کا دورہ پڑ جاتا اور گھر ماتم کدہ بن جاتا ـــــ قدُسیہ خالہ کی شادی دس سال گذرے پندرہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ چھ ماہ بعد اُن کے شوہر ولایت چلے گئے اور واپسی پر ایک میم ساتھ لیتے آئے۔ اور قدُسیہ سے قطعِ تعلق کر لیا اور وُہ ایسے رُوٹھے کہ ان کی ہزار التجاؤں کے باوجود ٹس سے مس نہ ہوئے ـــــ جب کبھی عُرس پر قوالی ہوتی، دُور کوئی برہا کا دَرد بھرا گیت گاتا یا ترائی کی پہنائیوں سے پُراسرار آواز اُبھرتی قدُسیہ خالہ کو ضرور دورہ پڑ جاتا۔

ایک دن بچّوں نے دیکھا کہ وہ قبرستان میں شکستہ قبروں کے درمیان رُوٹھی سی بیٹھی کسی سے کہہ رہی تھیں۔ "چھوڑو میرا آنچل"۔ مگر وہاں تو کوئی بھی اُن کا آنچل پکڑے ہوئے نہ تھا ـــــ درگاہ کے شاہ صاحب کی نظروں میں وُہ پاگل تھیں ـــــ قدُسیہ خالہ کو اس کی درد بھری رسیلی آواز بہت اچھی لگتی تھی۔ انھوں نے ایک روز اماں سے اُسے بلوانے کے لئے کہا کہ گانا سُنیں مگر اُنھوں نے انکار کر دیا کہ موئی پاگل کو بلانے سے کیا حاصل۔

قدُسیہ کو گانا سُننے کا بے حد شوق تھا۔ جب بھی شبیر ماموں آتے تو وُہ انھیں نعتیں سُنانے کے لئے کہتیں اور جب وہ سُناتے تو قدسیہ خالہ جھوم جھوم جاتیں اور اُنھیں دَورہ پڑ جاتا اور شبیر ماموں کے ہاتھ لرزنے لگتے ـــــ شبیر ماموں رشتے میں قدسیہ خالہ کے دیور تھے۔ سب جانتے تھے کہ انھیں قدسیہ خالہ سے عشق ہے۔ مگر ان کا عشق مرگھلا اور پھُسپھُسا سا تھا اور ان کے دستِ شوق نے قدسیہ کے جسم کو چھُوا تک نہ تھا۔ شاید وہ دل ہی دل میں انھیں شجرِ ممنوعہ سمجھتے تھے۔

بُوا سے سب خوف کھاتے تھے اور اس بات پر حیران تھے کہ وہ اکیلی بن سنور کر، بے خوف و خطر جنگل میں گھومتی پھرتی تھیں۔ شاید اس لئے کہ اُنھیں بالے میاں (یا غازی میاں) کی رفاقت حاصل تھی۔ گو انھیں جامِ شہادت پئے صدیاں گذر چکی تھیں۔ مگر عشق میں صدیوں کا ہیر پھیر کیا معنی رکھتا ہے۔ غازی میاں کے مزار پر ہر سال بڑی دھوم دھام سے عُرس ہوتا۔ بالے میاں کی بارات تزک و احتشام سے چڑھتی۔ وہ سب کو واقعی گھوڑے پر بیٹھے دکھائی دیتے۔ پالکی میں سجی سنوری، شرمائی لجائی دُلہن بھی ہوتی ـــــ بارات دیکھتے ہی قدسیہ خالہ کھڑکی کی چوکھٹ پر سر رکھے زار زار روئے جاتیں۔ بارات جنازہ بن جاتی اور سارے گھر میں گہری اُداسی چھا جاتی۔

بُوا کی دیوانگی نے اُن کے دل سے عصمت و عفّت کے لُٹ جانے کے سب خوف مٹا دیئے تھے۔ اور جب ان کے نام کے ساتھ کچھ معجزے بھی وابستہ ہو گئے تو وُہ یقینِ محکم بن گئے اور بُوا کی دھاک جم گئی۔ کسی بدمعاش نے انھیں اکیلا پاکر دبوچنا چاہا تو غازی میاں نے اُسے اس زور سے تھپڑ مارا کہ اس کا مُنہ وہیں کا وہیں ٹیڑھا ہو گیا۔ ایک اور بدنصیب نے ان کی کلائی پکڑی تو اس کا وہ ہاتھ ہی سڑ گل کر گر گیا ـــــ مگر شرابی اور رنڈی باز مجھو چچا جو مُرتد سے تھے، ان معجزوں کے قائل نہ ہوئے۔

قدسیہ خالہ کو بُوا سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ ایک دن وُہ اچانک آگئیں اور نہایت بے تکلفی سے مسکرانے لگیں۔ پھر آپ ہی آپ ہنسیں اور چوکی پر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے قدسیہ خالہ کو گھورا اور گانے لگیں " دھنیا روئے روئے انکھیاں لال گال"۔ گانا قدسیہ خالہ کے حسبِ حال تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ انھیں چڑا رہی ہیں۔ پیشتر اس کے کہ انھیں دورہ پڑتا، بُوا جلدی سے اُٹھ کر چل دیں۔ سب پر رعب طاری ہوگیا کہ بُوا غیب دان ہیں، مگر حسبِ معمول مجھو چچا نہ مانے۔ ان کا خیال تھا کہ بُوا قدسیہ خالہ کی بابت کہیں سے سُن چکی ہوں گی۔

بُوا اب باقاعدہ آنے لگیں۔ قدسیہ خالہ انھیں بیٹھنے کو کہتیں تو وُہ جواب دیتیں کہ کوئی ان کی راہ تک رہا ہے۔ سب سمجھتے کہ بالے میاں فی الواقع کہیں اُن کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ یہ ایک عقیدہ سا بن گیا تھا کہ غازی میاں اپنی محبوبہ بُوا پر مہربان ہیں اور وُہ ان کے توسّط سے جو معجزہ چاہیں کرا دیں —— بُوا اب تک کنواری تھیں۔ اُنھوں نے دل ہی دل میں بالے میاں سے شادی رچائی تھی۔ لوگ بُوا کی مرضی کو بالے میاں اور خدا کی مرضی سمجھ کر ان کے سامنے سربسجود ہونے لگے۔ ہزاروں کی بھیڑ بھاڑ میں وہ میلوں اور عرسوں میں بیدھڑک گھومتی پھرتیں۔ جب اماں نے اُن سے کہا کہ ان کا یوں اکیلے گھومنا ٹھیک نہیں تو وُہ بولیں " کون ہم اکیلے گھومت ہیں؟ ارے ہم اکیلے نا ہیں۔ ہمرا ساتھ او جو رہت ہیں"۔ کسی میں دَم نہ تھا جو ان سے اُلجھتا صرف مجھو چچا تھے جنھوں نے یہ سُن کر کہا " سالی لفنگی ہے۔ پاگل واگل کچھ نہیں۔ سب کو اُلّو بناتی ہے "۔

بُوا پاگل نہ ہوتیں تو کھرا سونا تھیں۔ اماں نے اس بارے میں حکیم صاحب سے مشورہ کیا تو اُنھوں نے کہا کہ اُنھیں مسہل دیئے جائیں تو انشاء اللہ دماغ صحیح ہو جائے گا —— اماں نے بُوا سے حکیم صاحب سے علاج کرانے کی بات اُٹھائی تو اُنھوں نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔ اماں نے ان کی خاموشی کو "ہاں" سے تعبیر کیا اور املتاس اور دُوسری دوائیں رات بھر اونٹائیں —— اگلے روز صبح سویرے بُوا نے دوائی سے بھرا بادیہ بڑے اطمینان سے ہاتھ میں پکڑا، ایک گھونٹ منہ میں لیا اور نانی بیوی کی چھاتی پر کُلّی کر دی اور بادیہ موری میں پٹخ، نل پر کُلّیاں کرتے کرتے بے سدھ ہوگئیں۔ ہر کُلّی پر وہ حکیم صاحب کو موٹی سی گالی دیتیں —— جب اس حرکت پر اُنھیں ڈانٹا گیا تو اُنھوں نے بڑی بے پروائی سے کہا " اے ہم کہاں پھنکا۔ او ہاتھ مار دیتیں "۔ اور یوں اپنے کئے کا الزام بالے میاں کے سر مڑھ وہ سُرخرو ہوگئیں۔

اب اماں کی فرمائش پر حکیم صاحب نے بُوا کے لئے تین گولیاں دیں۔ مگر بُوا کو دو ہی خوراکوں نے نیم جان کر دیا اور اجابتوں کے مارے اُن کا بُرا حال ہوگیا۔ اور معدہ مستقل طور پر خراب رہنے لگا۔ ان کی فطری چلبلاہٹ اور شوخی کی جگہ سنجیدگی اور پژمردگی نے لے لی۔ اب وہ بالے میاں کا کبھی ذکر نہ کرتیں۔ بالے میاں کو تج کر بُوا لنڈمنڈ اور اُجاڑ ہوگئیں۔ سب شوخی و شرارت اور تڑک بھڑک ہَوا ہوگئی —— بُوا

بھری جوانی میں ہی بوڑھی ہوگئیں۔

اُدھر قدسیہ خالہ نے بھی کروٹ لی۔ اُنھوں نے اُداسی اور سہل انگاری کو جھٹک دیا اور ان کی زندگی میں حرکت اور حرارت لوٹ آئی۔ وُہ اپنے جسم اور لباس کی جانب پوُری توجہ دینے لگیں۔ شام کو وہ نہا دھوکر دھیمے رنگ کے کُرکُرے غرارے اور چکن کی قمیض پر چُنے ہوُئے دوپٹے اوڑھتیں اور خلا میں دیکھ کر یوُں مُسکراتیں جیسے بوُا کی طرح اُن کے بھی کوئی غازی میاں کھڑے، اُن سے چھیڑ خانی کر رہے ہوں۔ گھر کی بزرگ عورتوں ــــ امّاں، نانی بیوی اور دادی بیوی کو قدسیہ خالہ کے یہ بدلے ہوُئے طور ایک آنکھ نہ بھاتے۔ نانی بیوی کی دانست میں جس عورت کا خدائے مجازی رُوٹھ چکا ہو اُسے بھلا آرائش و زیبائش سے کیا کام۔ اُسے تو چاہیئے کہ صبر و شُکر کرے، رُوکھی سوُکھی کھائے، خدائے بزرگ و برتر کی عبادت کرے اور اپنی عاقبت سنوارے۔ دادی بیوی کی بھی یہی رائے تھی۔

شبیر ماموں پابندی سے آتے اور ذرا بے تعلّق سے ہو کر بیٹھ جاتے۔ قدسیہ خالہ بچّوں کے ذریعے اُن سے "سرکار مدینے والے" سُنانے کی فرمائش کرتیں تو وہ سُناتے۔ ساتھ ہی وہ نہ جانے ایک دُوسرے سے کیا سرگوشیاں کرتے کہ بچّوں کے پلّے کچھ نہ پڑتا۔ وہ ہر روز سینکڑوں کہی اور اَن کہی باتیں کرتے، کچھ ہونٹوں کے توسّط سے، تو کچھ آنکھوں ہی آنکھوں میں۔ شام ہو جاتی تو شبیر ماموں بادلِ نخواستہ اُٹھ کر چلے جاتے مگر قدسیہ خالہ کی آنکھوں میں شمعیں نہ جانے کب تک جھلملاتی رہتیں۔

ایک دن شبیر ماموں آئے تو قدسیہ خالہ نے اُن سے بڑے پیار بھرے انداز میں ذرا شوخی سے بات کی تو نانی بیوی کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں۔ اُن کے جانے کے بعد انھوں نے قدسیہ خالہ کو بہت لتاڑا، مگر خلافِ معمول وہ تنک کر اُٹھ کھڑی ہوئیں اور غم و غصّے سے مغلوب ہو کر اپنے شوہر کی شان میں بہت بُرا بھلا کہا، جس نے دس سال سے ان کی خیر و عافیت تک نہ پوُچھی تھی۔ اور بے حس زمانہ دُور کھڑا، تماشائی بنا دیکھتا رہا۔ نانی بیوی سے جواب نہ بن پڑا۔

نانی بیوی نے قدسیہ خالہ کے بدلے ہوُئے تیور دیکھ کر حکیم صاحب سے رجُوع کیا۔ اُنھوں نے وہی مسہل تجویز فرمائے جو بوُا کو دیئے گئے تھے۔ نانی بیوی نے رات بھر اونٹا کر تریاق تیار کیا۔ قدسیہ خالہ نے بڑے اطمینان سے بادیہ ہاتھ میں لیا اور اُسے موری میں ٹھیک اسی جگہ پھینکا جہاں بوُا نے پھینکا تھا۔ اس پر نانی بیوی نے انھیں بہت تیز و تند اور تلخ و ترش انداز میں پھٹکارا مگر قدسیہ خالہ خلافِ توقّع الف ہوگئیں۔ اب انھوں نے زنجیریں توڑ دینے کی ٹھان لی تھی۔ اُنھوں نے نانی بیوی کو دو ٹوک کہہ دیا کہ ان کا ارادہ دیدہ دانستہ اُنھیں یہ زہر دے کر مار ڈالنے کا ہے، مگر وہ ہرگز اسے نہ پئیں گی۔ پندرہ برس کی کم سنی میں ہی انھیں بھٹی میں جھونک دیا گیا اور دس سال سے وہ پڑی سڑ رہی ہیں۔ آخر کس تقصیر میں اُنھیں یہ سزا دی جا رہی ہے۔ نانی بیوی قدسیہ خالہ کی صورتِ حال کے لئے اللہ تعالیٰ کو

ذمہ دار گردانتی رہیں اور اپنے رُوٹھے ہوئے خدائے مجازی کے خلاف حرفِ شکایت زبان پر نہ لانے کی تلقین کرتی رہیں مگر وہ قدسیہ خالہ کا مُنہ نہ بند کرسکیں اور وہ انھیں تُرکی بہ تُرکی جواب دیتی رہیں۔ جب قدسیہ بڑھتی چلی گئیں، تو نانی بیوی نے آپے سے باہر ہوکر جوتی لی اور قدسیہ خالہ کے ہونٹ مسل ڈالے۔ قدسیہ خالہ پر آج بھوت سوار تھا اُنھوں نے نانی بیوی کی سینک سلائی جیسی کلائیاں مروڑ کر رکھ دیں ـــــ گھر میں کھلبلی مچ گئی اور سب نے انھیں گھیر لیا۔ سرتاپا لرزتے ہوئے، بے بسی کے عالم میں، انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ سِل پر دے مارے اور ان کی چوڑیاں چُور چُور ہوگئیں ـــــ انھوں نے سِل کا بٹہ سر سے اُوپر اُٹھا کر سب کو للکارا کہ خبردار جو کوئی آگے بڑھا۔ اتنے میں شبیر ماموں خاموشی سے وارد ہوئے اور اُنھوں نے اپنا ہاتھ بڑے اطمینان سے قدسیہ کے شانے پر رکھا۔ قدسیہ نے مُڑ کر شبیر ماموں کی آنکھوں میں دیکھا، جن میں محبت کا بحرِ بیکراں موجزن تھا۔ اور ان کے ہاتھ اپنے آپ نیچے گر گئے۔ آج دس سال کی مدتِ مدید کے بعد کسی مرد نے انھیں چھُوا تھا۔ آنکھیں موند کر وہ تیورا کر اُن کے سینے پر گر گئیں۔ ـــــ شبیر ماموں نے سب کے سامنے انھیں اتنی زور سے بھینچا کہ اُن کی پسلیاں کڑ کڑا گئیں۔ سب آنکھیں پھاڑے مُنہ کھولے انھیں دیکھتے رہے ـــــ شبیر ماموں نے دھان پان سی قدسیہ خالہ کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر پلنگ پر ڈال دیا اور بے تعلقی کے انداز میں ذرا ہٹ کر کھڑے ہوگئے ـــــ اس واقعہ کے بعد قدسیہ خالہ کی اہمیت بڑھ گئی۔ توہم پرست اماں سمجھ گئیں کہ وہ اکیلی نہیں۔ ان کے ساتھ جِن، بھوت، پریت بھی ہیں اور قدسیہ خالہ کی ناز برداریاں کچھ زیادہ ہی ہونے لگیں۔ صرف پھوپھو چچا تھے جو قدسیہ خالہ سے برملا کہتے کہ "بھئی تم بہت چنٹ ہو، جو تمام گھر والوں کو بیوقوف بنا رہی ہو۔"

پھوپھو چچا اکثر قدسیہ کے ساتھ بدذاتی پر اُتر آتے تھے ـــ اب کے جو آئے تو نہ جانے کس رُو میں بہہ کر اُنھوں نے قدسیہ کو کہہ ڈالا کہ تمھارے شبیر ماموں تو نخنچو ہیں۔ اگر اُس دن اُن کی جگہ ہم ہوتے تو تمھیں بھگا لے جاتے یہ سُنتے ہی قدسیہ خالہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بولیں کہ کمینے تم نے مجھے اپنی مشتری جان سمجھ رکھا ہے۔ پھوپھو چچا نے جواب دیا کہ ہر عورت میں کہیں نہ کہیں مُشتری جان چھپی ہوتی ہے ـــــ قدسیہ خالہ کے ہاتھ میں شربت کا گلاس تھا جو اُنھوں نے پھوپھو چچا کے مُنہ پر دے مارا۔ اُٹھیں اور چھوٹی سی سلیم شاہی جوتی لے کر اُن پر پل پڑیں اور چچا کی گت بنا ڈالی ـــــ یہ ایک طرح سے پھوپھو چچا کا قدسیہ خالہ سے صاف اور سیدھا اظہارِ محبت تھا۔ اور قدسیہ خالہ کی طرف سے برملا انکار بھی۔

بُوا اچانک ایک روز قبرستان میں اوندھی پڑی ملیں۔ ڈاکٹروں کو دکھایا گیا تو پتہ چلا کہ انھیں ڈبل نمونیہ ہے۔ دو دن حالتِ نزع میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وہ چل بسیں۔

ایک رات تہجّد کی نماز کے بعد نانی بیوی اُٹھیں تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئیں کہ قدسیہ خالہ اپنی پلنگڑی پر

نہیں۔ صدر دروازہ بھاڑ کی طرح کھلا تھا۔ نانی بیوی کی چیخیں نکل گئیں۔ گھر کے لوگ لالٹینیں لے کر قدُسیہ خالہ کو ڈھونڈنے نکل پڑے۔ قدسیہ کے ننگے پیروں کے نشان باوُلی مینڈ تک ملے اور پھر ختم ہو گئے۔ اسٹیشن کو جانے والی پگڈنڈی پر بھی قدسیہ خالہ کے ننھے ننھے پیروں کا ایک بھی نشان نہ تھا ــــ قدسیہ خالہ کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اُڑنے لگیں۔ مگر جب تک نانی بیوی زندہ رہیں کسی کو بولنے کی جُرأت نہ ہوئی۔ پھر قدسیہ سب کے ذہن سے اُتر گئیں۔

برسوں گذر گئے۔ ایک دن کسی لڑکی نے واحد متکلم کو فون پر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں رفیعہ حسن بول رہی ہوُں۔ اور آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتی ہوُں کہ کل صبح مجھے ہوائی جہاز سے لندن روانہ ہونا ہے ــــ ملاقات ہوُئی تو انھوں نے بتایا کہ آپ رشتہ میں میری بہن لگتی ہیں اور میری امیّ قدسیہ شبیر حسن آپ کی خالہ ہوتی ہیں۔ چشم زدن میں دونوں گھُل مل گئیں ــــ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ گھر سے بھاگتے وقت امیّ کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وُہ ابوّ سے اُلجھ پڑی تھیں کہ آپ مجھے گناہگار بنا رہے ہو۔ امیّ نے مستقیم (مجھو) چچا کو دیکھا تو ان کی رُوح فنا ہو گئی۔ وہ باوُلی میں ڈوب مرنے جا رہی تھیں۔ مگر مستقیم چچا نے اُن سے کہا کہ تم یہ جوُتے چھوڑ کر ننگے پیروں چلی آئیں۔ یہ تو پہنتی جاؤ کہ پیر گیلے ہو گئے تو زکام ہو جائے گا اور جیب سے جوُتیاں نکال کر اُنھیں دیں ــــ واحد متکلم نے پوچھا کہ قدسیہ خالہ کے قدموں کے نشان کیا ہوئے۔ وہ ہنس کر بولی کہ وہ کیسے ملتے۔ ابوّ نے امیّ کو اُٹھا لیا اور وہاں سے پیدل اسٹیشن گئے۔ وہاں سے رودولی گئے۔ ابوّ کے دوست ابرار چچا نے، جو وکیل تھے، بہت کوشش کی کہ کسی طرح امیّ کو اپنے شوہر سے طلاق مل جائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوُا۔ ایک پادری سے بھی تبدیلیٔ مذہب کے لئے رجوع کیا گیا مگر بات نہ بنی۔ مجھو چچا کو اس گڑبڑ کی خبر ملی تو وہ بہت سیخ پا ہوُئے۔ اُنھوں نے سب کو قتل کر کے قدُسیہ خالہ کو بھگا لے جانے کی دھمکی دی۔ شبیر ماموں کو بھی اُنھوں نے ڈرایا، دھمکایا۔ اور اُسی شام قاضی کو بلا کر اُن کا نکاح کر دیا ــــ جب شبیر ماموں کے دوست ابرار چچا نے مجھو چچا سے کہا کہ یہ تو قانون کی نظروں میں نکاح نہ ہوُا۔ تو اُنھوں نے اُنھیں بھی گردن توڑ دینے کی دھمکی دی۔ اور یوُں زور زبردستی سے سب کا مُنہ بند کر دیا اور اس طرح امیّ اور ابوّ نے چوروں کی طرح قانوُن کی نظروں سے چھُپتے چھُپاتے اور ایک دُوسرے کی باہوں میں جھوُلتے جھُلاتے زندگی گذار دی۔

بُوا، بالے میاں:

جب شام کے دھندلکے میں مسجد اور قبرستان سے دُور ترائی میں، کانیا توری مُرلی بیرن بھئی" کی پُر اسرار، درد بھری آواز اُبھرتی، لہراتی، پھیل جاتی تو بچے خوف زدہ ہو کر سرپٹ بھاگ

کھڑے ہوتے اور اپنی کوٹھی میں داخل ہونے پر ہی اُن کی جان میں جان آتی ——— لوگ کہتے تھے کہ گھاگرا ندی میں ایک بارات ڈوب گئی تھی۔ دُلہن تین دن نامعلوم کیسے تیرتی رہی۔ آج وہ بھٹنی بن کر ترائی میں بھٹک رہی ہے ——— ایک روز بچے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مسجد کے پچھواڑے سے پھر وہی آواز اُبھری۔ گاتے گاتے وہ یکلخت رُک گئی اور اپنی پُشت کی طرف مُڑ کر کسی کو ڈانٹنے لگی ——— "چھوڑو ہمارا آنچل"۔ مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا جو اس کا آنچل پکڑے ہو۔ وہ دامن جھٹک کر ہنسی تیز تیز بھاگی جیسے کوئی شرارت سے اُسے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور پیڑوں کے جھنڈ میں گم ہو گئی۔ دُور سے اُس کی آواز پھر لہرائی:

"میرٹھ میں ملیں گے دونوں جنے" ——— "تم سیاں کالے ہم گورے" ———
"آئینہ میں دیکھیں گے دونوں جنے" ——— "تم سیاں موٹے ہم دُبلے" ———
"کانٹے میں تُلیں گے دونوں جنے"[1]

یہ محض اتفاق تھا کہ قدسیہ خالہ، جو اِن گیتوں پر مرتی تھیں، کے شوہر بھی کالے تھے اور موٹے بھی۔ مگر میرٹھ میں اُن دونوں کے ملنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

"سیاں توری گودی پھول گیند ابن جاؤں گی ——— بلماں توری گودی"

نہ جانے اِن دو مختصر سی سطروں کے پیچھے کون سی دُنیا آباد تھی کہ اُدھر اس کے دل کی گہرائیوں سے درد میں ڈوبی یہ آواز نکلتی، اِدھر قدسیہ خالہ کے دل میں جاگزیں ہوتی ——— اور اِس طرح اُن میں آہستہ آہستہ ایک دُوسرے سے ملے اور جانے پہچانے بغیر، ایک غیر شعوری سا رشتہ قائم ہو گیا۔

جب قدسیہ خالہ نے پٹھانی بُوا سے اُسے بلانے کے لئے کہا تو اُس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اکیلی نہیں گھومتی۔ اس کے ساتھ اس کے محبوب بالے میاں بھی ہوتے ہیں ——— گو غازی میاں کو جامِ شہادت پئے صدیاں گذر گئیں مگر شاید عشق میں صدیوں کا ہیر پھیر کوئی معنی نہیں رکھتا ——— غازی میاں کے مزار پر ہر سال عُرس ہوتا۔ دُور دُور سے قوال اور گویے آتے۔ ہر مذہب و ملّت کے لوگ زیارت کے لئے حاضر ہوتے ——— عُرس کے موقع پر بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے بارات چڑھتی۔

○ بُوا کی دیوانگی نے دیگر خدشات کے ساتھ عصمت و عفّت لٹ جانے کا خوف بھی یکسر مٹا دیا۔ وہ جہاں جی چاہتا، اندھیرے اُجالے، بے خوف و خطر چلی جاتیں۔ نتیجہ یہ کہ دلوں میں ان کی دہشت سی بیٹھ گئی۔ اور جب اُن کے نام کے ساتھ دو ایک معجزے بھی وابستہ ہو گئے تو وہ یقینِ محکم بن گئے ——— سب جان گئے کہ وہ چڑیل یا بھتنی نہیں۔

---

[1] عصمت چغتائی۔ "دل کی دُنیا"۔ روہتاس بُکس، لاہور۔ ص ۷

بس ذرا سی پاگل ہیں تو ان کے دلوں سے اُن کا خوف بھی یکسر مٹ گیا۔

○ پھر ایک دن بچوں نے قدسیہ خالہ کا پیغام بُوا کو پہنچا دیا۔ اور کچھ دن بعد وہ اچانک آ پہنچیں۔ بڑی بے تکلفی سے پانی پینے کی مشکوں سے ایک کٹورا پانی پیا اور کمر پر ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگیں۔ ان کے کپڑے بہت عمدہ اور صاف ستھرے لگ رہے تھے۔ کلف دیا گلابی دوپٹہ ان کے کندھوں پر پڑا تھا۔ اور بیلے کی کلیوں کا گچھا آنچل میں بندھا کنپٹی پر جھول رہا تھا ــــــ پھر وہ گانے لگیں۔ یوں لگا جیسے وہ قدسیہ خالہ کو چڑا کر گا رہی ہوں۔

"دھنا روئے روئے انکھیاں لال گال
پان بچاسی کے بیڑا لگائے
ہمرے نٹھور پیا ابھو نہ آئے
دھنا روئے روئے ــــــ انکھیاں" [1]

اتفاق سے یہ گیت قدسیہ خالہ کے حسب حال تھا۔ وہ ہمیشہ بھری بڑی رہتی تھیں۔ ذرا سی ٹھوکر لگی تو چھلک پڑیں۔

○ اب بُوا معمول سے آنے جانے لگیں ــــــ قدسیہ خالہ انھیں خوشامد سے بیٹھنے کے لئے کہتیں تو وہ کہتیں کہ نہیں کوئی ہماری باٹ دیکھ رہا ہے۔ سب سمجھتے کہ غازی میاں فی الواقع کسی درخت کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں بُوا کا انتظار کر رہے ہیں ــــــ بعض اوقات یہ احساس ہوتا کہ وہ پاگل نہیں۔ ذہنی طور پر حیثیت درست ہیں۔ شریف گھرانے سے ہیں مگر نہ جانے ان کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ اُن کا اپنا مکان تھا، جس کا کچھ حصہ انھوں نے ایک چماری کو رہائش کے لئے دے رکھا تھا ــــــ ایک دفعہ مولوی صاحب نے انھیں سمجھایا کہ کسی سے نکاح کر لو کہ مرد کے بغیر عورت کی زندگی بیکار ہے۔ مگر وہ اُن کی جان کو آ گئیں کہ "اپنی ماں کا نکاح پڑھا دو کسی راہ چلتے سے۔ ہمرا مرد موجود ہے۔ تمرے باپ کا باپ۔ سن پہیے تو تمری ڈاڑھی ماں آگی لگائی دیے" ــــــ معلوم ہوتا تھا کہ بُوا دل و جان سے بالے میاں کے تئیں وقف تھیں۔

آہستہ آہستہ بُوا کے نام کے ساتھ کئی معجزے جڑ گئے، جس سے سب کے دلوں پر اُن کی دھاک جم گئی۔ ایک دفعہ کسی بدمعاش نے انھیں اکیلا پاکر دبوچنا چاہا تو غازی میاں نے اُسے ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کیا اور اس کا منہ وہیں کا وہیں ٹیڑھا ہو گیا ــــــ ایک اور بدبخت اُن سے اُلجھا تو کہتے ہیں کہ جس ہاتھ سے اُس نے اُن کی کلائی پکڑی تھی وہ سڑ گل گیا ــــــ لوگوں کی نظروں میں یہ سب خیالی اور ہوائی باتیں نہ تھیں، بلکہ ٹھوس حقیقت

---

[1] عصمت چغتائی "دل کی دُنیا"، روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۱۸

تھیں۔ ان کے نزدیک بُوا کی ڈور براہِ راست غازی میاں سے بندھی تھی اور غازی میاں سے ٹکر لینا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

"وہ میاں کی چہیتی محبوبہ تھیں، غازی میاں جو بانجھ کی گود میں پھول کھلاتے۔ کوڑھی کا کوڑھ مٹاتے۔ ایک پل میں فقیروں کو شاہ اور شاہوں کو کنگال بنا دیتے۔ کیا اپنی لاڈلی کا اتنا مان نہ کرتے ہوں گے"[1]

میاں ضدی اور ہٹیلے تو تھے ہی، رنگیلے، چھبیلے، شوخ اور چنچل بھی تھے۔ ہر وقت شرارتیں اور شوخیاں کرنا اُن کا معمول تھا۔ کبھی آنچل پکڑ رہے ہیں۔ کبھی چوڑیاں مُرکائے دیتے ہیں۔ شاید ان کی یہی ادائیں تھیں جن پر بُوا مرتی تھیں۔

توہمات پر جب ایمان لے آیا جائے تو وہ رفتہ رفتہ پختہ ہو کر مسلّمات بن جاتے ہیں۔ عقیدے اور نظریات بن جاتے ہیں اور ان کے سامنے عقل اور منطق اپنا جواز کھو دیتے ہیں۔ بُوا اور غازی میاں کی بے تکی، بھونڈی اور عقل و دانش سے عاری قصّے کہانیوں پر ضعیف الاعتقاد لوگ یوں یقین کر بیٹھے گویا وہ اللہ رسُول کا فرمان ہوں۔

بُوا نے بالے میاں کے ساتھ اپنے مراسم کو بڑی نفاست کے ساتھ ایک قابلِ قبول داستان کی شکل میں پیش کیا ہے ـــــ بالے میاں نے ماجھی کا رُوپ دھار کر اور ان کے والد کے پاؤں پکڑ کر، بُوا کا ہاتھ مانگا۔ مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اپنی بیٹی ایک ماجھی کو ہرگز نہ دیں گے۔ اور میاں کو دھتکار دیا اور ان کی شادی کسی دُوسری جگہ کر دی۔ رات کو جب بارات گھاگرا ندی پار کر رہی تھی تو میاں، جو ماجھی بنے اُس کشتی کو کھے رہے تھے، خود ہی زبردست طوفان لائے۔ انھوں نے سب کو چھوڑ کر بُوا کو بچانے کی کوشش کی۔ مگر براتیوں میں مچی افراتفری نے معاملہ بگاڑ دیا۔ غم و غصّے سے مغلوب ہو کر بالے میاں نے کشتی اُلٹ کر سب کو ڈبو دیا۔ صرف بُوا بچیں، جو تین دن دُلہن بنیں پھولوں کی سیج پر تیرتی کنواری اور اچھوتی رہیں ـــــ نہ جانے وہ کیسے کنارے لگ گئیں، اور جنگلوں اور بیابانوں میں ماری ماری پھرتی رہیں۔ ان کے ماں باپ کو پتہ چلا تو وہ بھاگم بھاگ پہنچے مگر تب تک بُوا اس مادی دُنیا سے نہ جانے کس سپنوں کی دُنیا میں پہنچ چکی تھیں ـــــ انھوں نے سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کرنے سے انکار کر دیا۔ اور رب ہی دل میں بالے میاں سے لَو لگائی اور انھیں اپنا دُولھا تصور کر کے قلب و جگر میں بسا لیا۔ لوگ بُوا کی مرضی کو بالے میاں کی مرضی اور بالے میاں کی مرضی کو خدائی فرمان سمجھ کر بے چون و چرا قبول کر لیتے ـــــ اب وہ بُوا کے توسط سے بالے میاں تک رسائی پانے کی سعی کرتے اور بُوا

---

[1] عصمت چغتائی۔ "دل کی دنیا"۔ روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۲۰

کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑتے اور ان کے کسی کام آنا عین سعادت سمجھتے ـــــ ان کے ماں باپ گذر گئے تو بُوا اکیلی رہ گئیں۔ ایک چمارن ان کے گھر کی دیکھ بھال کرتی ـــــ بُوا بالکل نڈر اور بے خوف وخطر تھیں اور ان کے چاہنے والے بھی کم نہ تھے۔ بایں وجہ وہ ایک ناتواں اور کمزور عورت ہوتے ہوئے بھی معذور اور بے دست و پا نہ تھیں کہ وہ ایک طرح سے مردوں کی طرح ہی مرد تھیں۔ ملاحظہ ہو :

"اے ہے بُوا زمانہ بڑا خراب ہے۔ میلے میں نہ جاؤ" اماں انھیں ٹوکتیں "اکیلی گھومتی ہو ڈر نہیں لگتا"

"کون ہم اکیلے گھومت ہیں؟ ارے ہم اکیلے نا ہیں۔ ہمرا ساتھ او جو رہت ہیں۔ یعنی ان کے "وہ"۔ مجال ہے کوئی کی جو ہم سے بولے"[1]

یہ جواب سب کو لاجواب کر دیتا۔ ایسے میں کون عاقبت نااندیش مُنہ کھولتا۔ اور اگر کوئی معجزہ ہو جاتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔

ایک دن اچانک بُوا آ گئیں۔ وہ بہت شاداں اور فرحاں دکھائی دیتی تھیں۔ گویا اپنے محبوب سے ملنے جا رہی ہوں یا مل کر آئی ہوں ـــــ ایکا ایکی انھوں نے پیچھے مُڑ کر نہ جانے کس سے کہا "اے لوٹ کے آوت ہیں"۔ پھر بگڑ کر بولیں۔ "ہم سے نکھرے نہ کرو ہاں۔ ہم کہے دیت ہیں" ـــــ پھر جیسے کوئی ناگوار بات سُنی اور ماتھے پر شکن ڈال کر بولیں "اچھا جاؤ نہ آویں گے"۔ دیکھت ہیں تم ہمرا کیا کر لیت ہو۔ ہمارا اعتبار نہیں کرت ہو ... ہمری بلا سے"[2] ـــــ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہوا سے لڑ رہی ہیں۔ اماں نے بُوا سے پُوچھا کہ "کیا ہوا"۔ بُوا بولیں "بھائی ہمارا کلیجہ کھائے گوا۔ ہم پر بھروسہ نہیں۔ کہت ہے ہمری آسنائی ہے! ہم نہیں لڑاوت ہیں"۔ بُوا چلّا چلّا کر بالے میاں سے شکایت کرنے لگیں "ارے ہم کا سمجھت ہے۔ ہم کوئی پتریا ہیں۔ کھانگی ہیں"[3] ـــــ وہ خیالوں ہی خیالوں میں اپنے محبُوب سے بڑے انہماک سے باتیں کئے جا رہی تھیں ـــــ بُوا کے محبُوب بالے میاں میں وہ تمام صفات موجود تھیں، جو ایک چھبیلے، طرحدار نوجوان میں ہونی چاہئیں۔ تمام گھر بُوا کی باتوں پر یقین کرتا تھا اور اگر انھیں بھی تصوّر میں بالے میاں دکھائی دیتے تھے تو اس میں چنداں تعجب کی بات نہ تھی۔

○ گھر کی سال خوردہ عورتوں کو بُوا کی بالے میاں سے شوخیاں اور شرارتیں، چہلیں اور چھیڑ چھاڑ بالکل نہ بھاتیں۔ انھیں جوانی کے سُلگتے ہوئے جذبات کا برملا اظہار سخت اکھرتا۔ انھیں اپنی طرح نیم جان، گھستی، ڈولتی زندگی

---

[1] [2] [3] عصمت چغتائی۔ "دل کی دُنیا" روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۳۲،۲۴

پسند تھی۔ اور وہ اندر ہی اندر اس بات کے درپے تھیں کہ حکیم صاحب سے ان کا علاج کرایا جائے تاکہ اُن کے شعلے کی لَو ماند پڑ جائے اور وہ ان کی طرح ناکارہ ہو کر رہ جائیں۔ امّاں نے حکیم صاحب سے مشورہ کے بعد اور بُوا کے دوا پینے سے انکار کے باوجود، رات بھر املتاس کے ساتھ اور نہ جانے کیا کیا دوائیں اونٹائیں، جو بُوا کو صبح نہار مُنہ پینی تھیں۔ سارا گھر یہ منظر دیکھنے کے لئے اکٹھا ہو گیا۔ بُوا نے زیرِ لب احتجاج کیا مگر ان کی وہاں کون سُنتا تھا — اُنھوں نے بڑے اہتمام سے ایک گھونٹ مُنہ میں لیا اور پھر تانی امّاں کی چھاتی پر کُلّی کردی۔ بادیہ موری کے پاس پٹخ دیا۔ اور غل سے کلّیاں کرتے کرتے بدحواس ہو گئیں۔ ہر کلّی پر حکیم صاحب کو ایک بھاری بھرکم گالی دیتیں — جب سب نے پھٹکارا کہ اُنھوں نے دوائی کیوں پھینک دی تو اُنھوں نے الزام بالے میاں کے سر منڈھتے ہوئے کہا "ارے ہم کہاں پھنکا۔ او ہانھ مار دیتیں"[1] پھر وہ بے تکلفی کے انداز میں اٹھلیں اور چل دیں۔

اب اماں کے اصرار پر حکیم صاحب نے بُوا کے لئے تین گولیاں تجویز فرمائیں۔ بُوا کے انکار کے باوجود اماں نے پہلی گولی جوں توں ان کے حلق سے اُتار دی۔ دُوسری گولی کسی نے اماں کی نظر بچا کر انھیں دے دی۔ ان گولیوں نے ایک طرح سے تباہی مچا دی۔ اجابتوں کے مارے بُوا کا بُرا حال ہو گیا۔ دو ہی خوراکوں نے بُوا کی رُوح قبض کر لی۔ ان کا معدہ مُستقل طور پر خراب رہنے لگا۔ دو چار گھونٹ شوربا بھی ہضم نہ ہوتا۔ ان کا گلا بیٹھ گیا اب وہ کبھی نیم کے پیڑ میں جھولا ڈال کر کجریاں نہ گا پائیں گی — بُوا کا رنگ رُوپ بگڑ گیا۔ جوانی پر بُڑھاپے کا سایہ لہرانے لگا۔ اور تو اور بالے میاں سے اُن کے عشق نے دَم توڑ دیا — بُوا کے دل میں جب تک بالے میاں کا پیار موجزن رہا، وہ چُست درست اور چونچال رہیں۔ جب بالے میاں کی محبت جڑ مرا گئی تو بُوا ٹھنڈ منڈ ہو کر رہ گئیں۔

ایک دن چھادن آئی۔ معلوم ہوا کہ بُوا کو تین چار روز سے بخار تھا۔ کل رات نہ جانے کب نکل کھڑی ہوئیں۔ صبح قبرستان میں اوندھی پڑی ملیں۔ ان کا سانس اُکھڑا ہُوا تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھا تو کہا کہ ڈبل نمونیہ ہے۔ تین دن ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بُوا چل بسیں — سارے گھر میں بُوا کی موت کی ہیبت بیٹھ گئی۔ سب ہی ہاتھوں پر ان کے معصوم خون کے دھبّے تھے۔ گھر کو آفتوں اور بلاؤں سے پاک رکھنے کے لئے فوراً دو مُلّا ڈیوڑھی پر بٹھا دیئے گئے، جو صبح شام ہل ہل کر سپارے پڑھتے اور بھر بھری روٹیاں ٹھونستے۔

بالے میاں ایک تصوّر، ایک خیال ہیں۔ ان کی کوئی ہستی، کوئی وجود نہیں۔ مگر سینکڑوں ہزاروں توہّم پرست

---

[1] عصمت چغتائی "دل کی دُنیا" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۳۲

لوگوں کا ان پر اعتماد اِس قدر گہرا ہے کہ اس نے انھیں وجودیت اور معنویت عطا کی ہے۔ ان کی ہستی کرشماتی اور معجزاتی ہے اور عوام کے نزدیک وہ لامحدود قوتوں کا ماخذ اور سرچشمہ ہیں۔ گویا انسانی زندگی کے تعلق سے وہ سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ضعیف الاعتقاد لوگ اُن کی نظرِ کرم کے لئے دست بدعا رہتے ہیں۔

بُوا نے اپنے ڈانڈے بالے میاں سے ملا کر سادہ لوح، توہم پرست، ناخواندہ عورتوں کا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ وہ فرطِ عقیدت سے ان کے سامنے بچھی جاتی ہیں۔ اور جی جان سے ان کی خاطر تواضع میں لگی رہتی ہیں اور ان کی ہر بات کو آسمان سے اُترا ہُوا حکم تصوّر کرتی ہیں ـــــ بُوا ڈھونگی اور پاکھنڈی ہیں۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کو بھرمانے کا گُر جانتی ہیں۔ وہ ان کے سامنے بالے میاں سے ڈرامائی انداز میں باتیں کرتی ہیں۔ کچھ یوُں کہ کم فہم، اجڈ، توہم پرست عورتیں انگشت بدنداں رہ جاتی ہیں ـــــ بُوا نے کچھ مقبولِ عام گیت بھی رٹ رکھے ہیں، جنھیں وہ موقع محل کی مناسبت سے گاتی ہیں۔ گلے میں نور ہے۔ ان کی آواز گونجتی، لہراتی ترائی کے علاقے میں دُور دُور تک پھیلتی چلی جاتی ہے تو ایک ماورائی، غیر ارضی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور سُننے والوں کو بے اختیار متاثر کرتی ہے۔ بُوا کی مقبولیت کا یہ بھی ایک راز ہے۔

بُوا کا کردار توہم پرستی پر بلیغ طنز ہے اور یہ مذہب پر بھی کاری چوٹ ہے۔ نہ جانے بُوا کا کردار دیکھ کر کرشن چندر کے "دادر پُل کے بچّے" کی یاد کیوں آجاتی ہے۔

بُوا اس ناولٹ کا بہت اہم کردار ہیں۔ ان کی بالے میاں سے عشق کی خیالی داستان، قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں کے حقیقی معاشقے کے متوازی چلتی ہے۔ اور بعض مقامات پر دونوں وقتی طور پر گھُل مل سی جاتی ہیں، جس سے ناولٹ اور زیادہ رنگین اور جاذب ہو جاتا ہے ـــــ فرق صرف اتنا ہے کہ جب بُوا مسہل سے نڈھال ہو کر کرب و عذاب کی حالت سے گذرتی ہیں تو ان کے محبوب بالے میاں سماوی رفعتوں سے اُتر کر انھیں سہارا نہیں دیتے اور وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی ہیں ـــــ جبکہ گرتی ہوئی قدسیہ خالہ کو شبیر ماموں بڑھ کر تھام لیتے ہیں اور زندگی ان دونوں کو اپنی نعمتوں اور مسرّتوں سے مالامال کر دیتی ہے۔

قدسیہ خالہ۔ شبیر ماموں:

کوئی دس سال ہوئے قدسیہ خالہ کی جب شادی ہُوئی تو وہ پندرہ برس کی تھیں۔ چھ ماہ بعد ہی ان کے شوہر تحصیلِ علم کے لئے ولایت چلے گئے ـــــ میاں لوٹے تو دستورِ زمانہ کے مطابق ایک عدد میم ساتھ لیتے آئے اور ایک طرح سے قدسیہ بیگم سے قطع تعلق کر لیا۔ انھوں نے انھیں منانے کے لئے بہت وظیفے پڑھے۔ چلّے کھینچے، منتیں مانیں مگر سب بے سود۔ میاں نے ایسا مُنہ موڑا کہ مُڑ کر نہ دیکھا۔ اور یہ صدمہ قدسیہ خالہ کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ گیا اور وہ بھری جوانی میں ہی زندہ درگور ہو گئیں۔

جب عرس پر کہیں قوالی ہوتی، شادی بیاہ پر گانا ہوتا، دُور کہیں برہا کے درد بھرے گیت میں رات کا سناٹا جاگ اُٹھتا، خاص طور پر جب برے ترائی سے رس میں ڈوبا قلب و جگر کے تاروں کو مضراب کی طرح جھنجھناتا گیت "کانیا توری مُرلی بیرن بھئی" فضا کو مُرتعش کر دیتا تو قدسیہ خالہ بے حال ہو جاتیں اور صبر و قرار کھو کر انگلیاں چٹخاتیں، آنچل مروڑتیں اور خود پر دورہ طاری کر لیتیں۔ ان کے دانت بھنچ جاتے، مُنہ سے جھاگ نکلتے اور گھر میں صفِ ماتم بچھ جاتی۔

قدسیہ خالہ کو شبیر ماموں سے دلی قربت تھی۔ وہ رشتہ میں اُن کے دیور تھے۔ مسکین طبع، پھُس پھُسے۔ بڑے دُبلے پتلے اور لانبے تھے۔ جب وہ قدسیہ خالہ کو نعتیں سُناتے "تم پہ قربان میری جان رسُولِ عربی" تو وہ آنچل میں ناک دبائے سسکیاں لیتیں، والہانہ انداز میں جھومتیں اور اُن پر دورہ پڑ جاتا۔ نانی بیوی دوڑ کر اُن پر آیتیں پڑھتیں اور شبیر ماموں دُور چوکی پر بیٹھے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں کو چھُپانے کی سعی کرتے۔ اور جب تک قدسیہ خالہ کو قرار نہ آتا وہ صدر دروازے کے پاس بیقرار ٹہلتے رہتے۔

شبیر ماموں قدسیہ پر فدا تھے مگر ان کا عشق بہت مرگھلا اور بے جان سا تھا۔ اُن کے دستِ شوق نے بڑھ کر قدسیہ خالہ کے جسم کو کبھی چھُوا نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ اسے پرائی امانت سمجھتے تھے ــــــ قدسیہ خالہ اپنے ہی غموں میں ڈوبی ہر وقت بھری بیٹھی رہتیں۔ ذرا ٹھوکر لگتی تو چھلک پڑتیں۔ بالے میاں کی بارات دیکھ کر کھڑکی کی چوکھٹ پر سر رکھے زار و قطار روئے جاتیں۔ گھر میں اُداسی اور پژمردگی چھا جاتی اور ان کے لئے بارات جنازہ بن جاتی۔

قدسیہ خالہ کو اب بھی اُمید تھی کہ شاید میم بانجھ ثابت ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کی سُن لے۔ خیال تھا کہ نانی بیوی کی منتوں، چلّوں اور وظیفوں نے میم کی کوکھ کو بنجر بنا دیا ہو گا مگر میم کے ہاں بیٹی ہوئی تو اُن کی سب اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ سب دعائیں رائیگاں گئیں اور اُن کی مایوسی اور گہری ہو گئی۔

بُوا نے قدسیہ خالہ کے بلاوے پر آنا شروع کیا تو جلد ہی گھر میں گھُل مل گئیں۔ وہ آتیں تو گھر کی فضا کھِل اُٹھتی اور ہر چیز مُسکرانے لگتی "ساون آئے گوا بھائی کا جھُولا نہ پڑے"۔ گھٹائیں گھِر گھِر آتیں، جوان دِلوں میں اُمنگیں، ترنگیں انگڑائیاں لینے لگتیں۔ قدسیہ خالہ کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی اور نہ جانے وہ کن خیالوں میں کھو جاتیں ــــــ بُوا کسی کے ہاں سے رسّی اُٹھا لاتیں۔ اور مزے سے جھُولتیں۔ تانیں اڑاتیں اور قدسیہ بھی ان کے ساتھ آواز ملا کر الاپتیں:

"جیا تم سے بدروا برسے
سکھی ری دن کیسے کٹیں گے بہار کے"۔ (ص ٦)

شبیر ماموں دُور بیٹھے، دل پکڑے، یہ سب دیکھتے سُنتے اور اپنے آپ کو قدسیہ خالہ کی زبوں حالی کے لئے ذمہ دار گردانتے۔

○ قدسیہ خالہ میں دیکھتے ہی دیکھتے حیرت انگیز تبدیلی رونما ہونے لگی۔ اُنھوں نے راشد الخیری کی کتابوں کو خیرباد کہہ دیا اور "مثنوی زہرِ عشق" پڑھنے لگیں۔ اُنھوں نے سب بناؤ سنگار اور آرائش و زیبائش مدّت ہوئی ترک کر دی تھی۔ اب وہ پھر سے اس کی جانب راغب ہوگئیں۔ زندگی کے معمولات میں ان کی دلچسپی لوٹ آئی۔ شام کو نہا دھو کر دھیمے رنگ کے کرکرے غرارے اور چکن کی قمیض پر چُنے ہوئے دوپٹے اوڑھتیں اور خلا میں دیکھ کر یوں مسکراتیں جیسے بُوا کی طرح ان کے غازی میاں پاس کھڑے اُن سے چھیڑ چھاڑ کر رہے ہوں۔

گھر کی عورتوں کو قدسیہ خالہ کے بدلے ہوئے طور طریقے دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا۔ ان کی دانست میں جس عورت کا خدائے مجازی اس سے روٹھ چکا ہو اُسے سولہ سنگار کرنا زیب نہیں دیتا۔ اُسے تو چاہیئے کہ صبر و شکر کرے۔ رُوکھی سوکھی کھائے اور یادِ الٰہی میں زندگی گذار دے تاکہ عاقبت سنورے ـــــ یہ اُن کرم خوردہ بڑی بوڑھیوں کے خیالات تھے جو اوروں سے پُرمسرت اور پُرسکون زندگی کا حق چھین لینا چاہتی تھیں انھیں حیرت تھی کہ یہ سوکھے ٹھونٹھ میں کونپلیں کیوں پھُوٹ رہی ہیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ قدسیہ خالہ ٹھونٹھ ہی رہیں۔ اور کبھی برگ و بار سے بہرہ ور نہ ہوں۔

شبیر ماموں پابندی سے آتے۔ قدسیہ خالہ اُن کے لئے چشم براہ رہتیں۔ وہ بے تعلقی کے انداز میں ذرا دُور ہو کر بیٹھ جاتے۔ قدسیہ بچّوں میں سے کسی کو اُکساتیں "شبیر ماموں سے کہو "سرکارِ مدینے والے" سُنائیں۔" بچّے خالہ کی خوشنودی کے لئے شبیر ماموں سے سُنانے کے لئے کہتے۔ اور وہ سُنانا شروع کرتے ـــ دونوں اشاروں کنایوں میں یُوں باتیں کرتے کہ بچّوں کے پلّے کچھ نہ پڑتا۔ ظاہر ہے کہ ان کا عشق تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا۔ انھیں ایک دُوسرے کی صحبت میں تسکینِ قلب ملتی تھی۔ رُوح کو بالیدگی ملتی تھی۔ زندگی جی اُٹھی تھی۔

شام ہو جاتی تو شبیر ماموں رخصت ہو جاتے مگر قدسیہ خالہ کی آنکھوں میں شمعیں جگمگاتی رہتیں۔ ہونٹ مُسکراتے رہتے۔ دل دھڑکتا رہتا ـــ اب وہ کھُلے بندوں شبیر ماموں سے میر کا کلام پڑھنے میں مدد لینے لگیں۔ گویا اُن کے درمیان جو کوئی حجاب تھا ابھی وُہ یکسر مٹ گیا۔

○ ایک روز شبیر ماموں آکر بیٹھے ہی تھے کہ قدسیہ خالہ نے گریبان کے بٹنوں سے کھیلتے ہوئے کہا:

"اللہ ذری املی توڑ دیجئے۔ چٹنی پسوائیں گے۔"

"کاہے سے توڑوں؟ کوئی بانس وانس!"

"اوئی! ماشا اللہ۔ آپ کیا کسی بانس سے کم ہیں۔ ذری ہاتھ بڑھا کر توڑ لیجئے۔" (ص ۴۵)

ایک پل کے لئے شبیر ماموں کی آنکھوں میں کوندا سا لپکا ... اور اگر کوئی پاس نہ ہوتا تو وہ یقیناً انھیں دبوچ لیتے۔ یہ انگیخت قدسیہ خالہ کی طرف سے ہوئی۔ جو شبیر ماموں کو مرگھلا اور بے عمل پاکر مشتعل ہو گئی ہوں گی۔ شبیر ماموں کے جانے کے بعد نانی بیوی نے انھیں ان کی شوخی پر پھٹکارا تو وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گئیں:

"تو کیا میں نے کوئی چھنالا کر لیا" وہ ایک دم پھنکار کے اُٹھ بیٹھیں۔

"ہے ہے نامراد لوگ کیا کہیں گے۔ مانا کہ شبیر بڑا شریف بچہ ہے۔ غیر نہیں، رشتہ میں دیور ہوتا ہے۔ مگر یہ دُنیا بڑی بھڑ دلی ہے بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی میری بانو"

"جوتی پہ واروں اس دُنیا کو۔ دس برس سے جوانا مرگ مجھے رُلا رہا ہے۔ اُسے دُنیا کچھ نہیں کہتی...؟"

"بیٹی وہ مرد ذات ہے اس کا کوئی بگاڑ کیا سکتا ہے۔ عورت کی عزت نازک آئینہ ہوتی ہے۔ ایک دفعہ بال پڑ گیا تو ساری عمر کو مُنہ ٹیڑھا دکھائی دے گا"

"اونہہ" قدسیہ خالہ لاجواب ہو کر اپنی قمیص سے پونچھ کر تی چوڑیاں ڈبّہ میں سے چھانٹ کر پہننے لگیں "میرے تو گردھر گوپال ... دوسرا نہ کوئی ..." وہ گنگنانے لگیں۔

"اب تو بیل پھیل گئی کیا کرے گا کوئی" ——— میرے تو ..."

"اے بیٹی تم سے کتنی دفعہ کہا کہ یہ موئے کافرانہ گیت نہ الاپا کرو۔ گناہ ہوتا ہے۔ ظہر کی نماز بھی کھا گئیں۔ کتنا کتنا جگایا مگر پڑی اینڈتی رہیں"[1]

قدسیہ خالہ خوب جانتی تھیں کہ نانی بیوی کے یہ پند و نصائح کھوکھلے اور بودے ہیں۔ دس برس لبوں پر مہرِ سکوت لگائے وہ دوزخ کی آگ میں جلتی رہیں مگر کسی نے ان سے ہمدردی اور دلجوئی کے دو میٹھے بول نہ بولے۔ کسی نے ان کی چارہ سازی اور غمگساری نہ کی۔ آج انھوں نے صبر و قرار کھو کر لب وا کئے تو انھیں ان پر ہی تاؤ آنے لگا۔ پند و نصائح کے دفتر کھول دیئے ——— مگر قدسیہ خالہ اب اس منزل پر پہنچ چکی تھیں جہاں انسان اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے کچھ بھی کر گذرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ قدسیہ خالہ سب شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر کھلی بغاوت پر تل گئیں۔ اب انہیں دبانے کی کوشش کرنا عبث تھا۔

ادھر نانی بیوی شبیر ماموں کے روز روز آنے اور قدسیہ خالہ کے ساتھ تخلیہ میں گھنٹوں باتیں کرنے پر پریشان تھیں۔ اور وہ چاہتی تھیں کہ ان کی آمد و رفت بند ہو جائے ——— ایک دن شبیر ماموں آئے تو نانی بیوی نے،

---

[1] عصمت چغتائی "دل کی دُنیا" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۵۵

جو پہلے ہی تاک میں بیٹھی تھیں انھیں دبوچ لیا اور انھیں بڑے سلیقے سے آئندہ آنے سے منع کر دیا۔ "تم تو اُسے بہن سمجھتے ہو میاں! مگر دُنیا بڑی ظالم ہے۔" شبیر ماموں ان کا مُدّعا پا گئے اور وہاں آنے سے گریز کرنے لگے۔

○ گھر کی معمّر عورتوں کے نزدیک قدسیہ خالہ کی طبیعت کی بڑھتی ہوئی شوخی اور چُلبلاہٹ کا تقاضا تھا کہ ان کے علاج کے لئے حکیم صاحب سے رجوع کیا جائے۔ اور حکیم صاحب نے حسبِ معمول وہی املتاس والا نسخہ، جو خون کی حدّت کا واحد علاج تھا، تجویز فرمایا۔ قدسیہ خالہ نے بارہا کہا کہ وہ اُسے نہ پئیں گی مگر نانی بیوی نے ان کی ایک نہ سُنی اور اپنے ہاتھ سے "تریاق" تیار کیا اور انھیں بادیہ تھما کر پیٹھ سہلاتے ہُوئے کہا۔ "بیٹی اللہ شافی اللہ کافی" کہہ کر پی جاؤ۔" —— قدسیہ خالہ نے بڑے اطمینان سے بادیہ موری میں ٹھیک اسی جگہ پھینکا جہاں ایک دن بُوا نے پھینکا تھا اور بہت آزردہ خاطر ہو کر کہا کہ اگر وہ اُن پر بوجھ بن گئی ہیں تو بہتر ہوگا کہ انھیں زندہ دفن کر دیا جائے مگر یوں گھُٹ گھُٹ کی مَوت نہ مارا جائے۔

○ نانی بیوی کے نزدیک قدسیہ خالہ کا شوہر ان سے قطع تعلّق کر کے بھی ان کا "خدائے مجازی" تھا۔ کیونکہ شرع کے مُطابق وہ چار نکاحوں کا مجاز تھا۔ اس لئے قدسیہ کا اُس کے کردار پر اُنگلی اُٹھانا ناروا تھا —— پھر مرد فطرتاً بیوفا ہوتا ہے اور عورت وفا شعار۔ اس لئے اُسے چاہیئے کہ اس پر جو آن پڑی ہے، وہ اسے مشیّتِ ایزدی سمجھ کر جھیلے —— اس استدلال کا جواب نہ تھا۔ قدسیہ لاجواب ہو کر خود کو کوسنے لگیں۔ اُنھوں نے خدا کے حضُور میں سربسجُود ہو کر دُعا مانگی کہ وہ یا تو انھیں مَوت کی نیند سُلا دے یا ان کے ناہنجار شوہر کو —— نانی بی نے قدسیہ کے یہ کوسنے سُنے تو کانپ اُٹھیں۔

"اری چڑیل یہ تو کسے کوس رہی ہے؟"

"باقر حسین تمھارے چہیتے داماد کو۔ حرامزادے کُتیا کے جنے کو۔ اُسے دوزخ کی آگ جلائے۔ قبر میں کیڑے پڑیں۔" وہ دوپٹہ پھیلا کر جھوم جھوم کر کوسنے لگیں۔

"تو کیا دُوسرا خصم کرے گی؟"

"ہاں کروں گی... کروں گی۔" نہیں یہ قدسیہ خالہ نہیں تھی۔ کوئی بھُتنی تھی۔

"تو جا کوٹھے پر کیوں نہیں بیٹھ جاتی؟"

"کوٹھے پر بھی بیٹھ جاؤں گی۔ دیکھتی ہوُں کوئی میرا کیا کر لیتا ہے۔"[1]

غصّہ میں بات سے بات نکلتی چلی گئی اور دیکھئے کہاں سے کہاں تک پہنچی —— درحقیقت یہ ایک باغی،

---

[1] عصمت چغتائی۔ "دل کی دُنیا"۔ روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۶۲

بیباک اور نڈر قدسیہ خالہ کی پکار تھی جنھوں نے کم فہم، کوتاہ بین معاشرے کے مروّجہ دستور سے برملا بغاوت کردی تھی۔ وہ آج دنیا بھر کو للکار رہی تھیں کہ جاؤ میرا جو کرنا ہے کرلو۔ تم نے میری دس سال تک نہ سنی۔ اب میں تمھاری ایک نہیں سنوں گی اور مجھے جو کرنا ہے کر گذروں گی۔

جس دن سے نانی بیوی کے منع کرنے پر شبیر ماموں نے ان کے ہاں آنا چھوڑ دیا تھا، ماں بیٹی میں آئے دن تُو تُو میں میں ہوتی رہتی تھی ـــــ ہوتے ہوتے بات قدسیہ کی سسرال تک جا پہنچی۔ ان کے سسر بہت برہم ہوئے اور انھوں نے صورتِ حال کے لئے نانی بیوی کو ذمّہ دار ٹھہرایا اور یہ خدشہ ظاہر کیا کہ کسی روز خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ قدسیہ خالہ کو ان کے ہاں بھیج دیا جائے تاکہ ان کا دماغ درست ہو جائے۔ ـــــ قدسیہ خالہ نے سنا تو آپے سے باہر ہوگئیں کہ نابکار اپنے بیٹے سے باز پُرس کرنے کی بجائے انھیں خواہ مخواہ کوسے جا رہا ہے۔ انھوں نے ان کی شان میں بہت برا بھلا کہہ ڈالا ـــــ ادھر نانی بیوی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ انھوں نے یہ سب کچھ سنا تو جوتی سنبھال قدسیہ خالہ کے ہونٹ کچل دیئے ـــــ اب قدسیہ خالہ پر بھی بھتنی سوار ہوگئی اور انھوں نے دانت کچکچا کر نانی بیوی کی سینک سلائی جیسی کلائیاں مروڑ کر رکھ دیں ـــــ نانی بیوی کا دل دھک سے رہ گیا کہ وہ ان کی عزیز از جان بیٹی قدسیہ نہ تھی کوئی زخم خوردہ شیرنی تھی۔ نانی بیوی لرز اٹھیں کہ انھیں قدسیہ سے یہ توقع نہ تھی ـــــ گھر کے لوگ وحشت زدہ ہو کر دوڑ پڑے۔ ان سب کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا کہ "ہائے تیرا ہاتھ نانی اماں پر کیسے اُٹھا۔" قدسیہ خالہ نے سب طرف سے محصور ہو کر اپنے آپ کو بے بس پایا اور وہ سراپا لرزنے لگیں ـــــ انھوں نے دونوں ہاتھ سِل پر دے مارے اور ان کی چوڑیاں چور چور ہوگئیں۔ ـــــ قدسیہ خالہ سِل کا بٹہ سر سے اونچا اٹھا کر چلائیں: "خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ بھی لگایا۔ قرآن پاک کی قسم سر پھاڑ دوں گی۔" سب کو جان عزیز تھی۔ کسی نے آگے بڑھنے کی جراٗت نہ کی۔ انھوں نے بٹّہ پھینک کر پیالے پیالے شیشہ توڑنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کہ ان کا ہاتھ ہونٹوں تک پہنچے شبیر ماموں وارد ہوئے اور انھوں نے بڑے اطمینان سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا ـــــ دس سال کے طویل عرصے تک قدسیہ خالہ کے جسم کو کسی مرد نے چھوا نہ تھا۔ ان کے ہاتھ بے بس ہو کر نیچے گر گئے۔ انھوں نے مڑ کر شبیر ماموں کی آنکھوں میں دیکھا اور تیورا کر ان کے سینے پر گر گئیں ـــــ لمحہ بھر کے لئے شبیر ماموں کے ہاتھ ٹھٹکے اور پھر انھوں نے سب کے سامنے قدسیہ کو اس قدر زور سے بھینچا کہ ان کی ہڈیاں چرمرا گئیں۔ سارا کنبہ بے حس و حرکت کھڑا دیکھتا رہا۔ نانی بیوی بے اختیار ڈھ گئیں ـــــ شبیر ماموں نے قدسیہ خالہ کا نحیف و نزار جسم اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر ہولے سے پلنگ پر ڈال دیا اور دور کھڑے ہو کر انھیں بے تعلقی کے انداز سے یوں دیکھنے لگے گویا کہہ رہے ہوں:

"لو بھئی یہ پڑی ہیں قدسیہ بانو! اس وقت بے ہوش ہیں۔ اچھا موقع ہے چپکے سے کوئی

آؤ اور گلا گھونٹ دو۔ رنجھا رنجھا کے نہ مارو ۔[1]

شبیر ماموں کا کردار بہت بلند آہنگ انداز میں کہہ رہا تھا کہ وہ اور قدسیہ یک جان و دو قالب ہیں۔ شبیر ماموں مرگھلے اور پھسپھسے ضرور تھے مگر کوتاہ نظر اور کم فہم نہ تھے۔ صورتِ حال کا ہر پہلو اُن پر روشن تھا۔ —— قدسیہ خالہ کے کردار میں شبیر ماموں کے تئیں مکمل خود سپردگی تھی۔ اُنھوں نے سب کے سامنے اپنا سب کچھ ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ یہ ایک خاموش پیمانِ وفا تھا۔

قدسیہ خالہ اب اوروں کی نظروں میں کچھ زیادہ اہم ہوگئیں کہ ان کی دانست میں اب وہ اکیلی نہ تھیں —— کئی جن، بھوت پریت یا پیر مرد بھی ان کی پُشت پر تھے۔ اماں تو روزِ اوّل سے ہی توہم پرست تھیں۔ وہ قدسیہ خالہ کی خاطر داری میں جُٹ گئیں۔ اُنھوں نے ان کے جن اُتروائے، بھوت پریت منانے، پیروں کی نیازیں بھی دلوائیں۔ اور وہ اس نئی قدسیہ خالہ سے خوفزدہ رہنے لگیں —— درحقیقت قدسیہ خالہ پر کسی بھوت پریت کا سایہ نہ تھا۔ وُہ تو دراصل ناآسودگیوں کی اُس دَلدل سے نکلنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہی تھیں جس میں وہ گلے گلے پھنسی ہوُئی تھیں اور اس دَلدل سے باہر کھینچنے کے لئے جس شخص کا ہاتھ انھیں اپنی طرف بڑھتا ہوُا نظر آرہا تھا۔ وہ تھے دُبلے پتلے مرگھلے شبیر ماموں، جو اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ دس سال تک وُہ سب کی خواہشات کا احترام کرتے ہوُئے اپنے فطری جذبات کا خون کرتی رہیں مگر اب انھیں صبر کا یارا نہ رہا۔ اور سب ذہنی محفوظات اور تکلّفات بالائے طاق رکھ کر وہ اپنے نام نہاد نگہبانوں سے دیوانہ وار ٹکرا گئیں۔ اور ایک ہی حملے میں انھیں پست کردیا۔ —— جب ایک دن قدسیہ خالہ سے مجھو چچا باتوں باتوں میں ہی شوخی اور شرارت میں تمام حُدود سے گذرتے نظر آنے لگے اور قدسیہ خالہ نے مشتعل ہوکر ان کی تاج پوشی کردی تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ انھیں صرف شبیر ماموں سے لگاؤ تھا اور اُن کے سوا وہ کسی اور کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں تھیں۔ قدسیہ خالہ کی محبّت بے لوث اور پُرخلوص تھی۔ بڑی ثابت قدم اور مستحکم تھی —— اور یہ محبّت دوطرفہ تھی۔

ایک رات نانی بیوی نے اچانک دیکھا کہ قدسیہ کی پلنگڑی خالی ہے۔ ان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اور چیخیں نکل گئیں۔ گھر کے سب لوگ افراتفری کے عالم میں لالٹینیں لے کر قدسیہ کو ڈھونڈنے نکل پڑے۔ قدسیہ کے چھوٹے چھوٹے ننگے پیروں کے نشان باولی مینڈ تک تو ملے پھر ختم ہوگئے —— اسٹیشن کو جانیوالی پگڈنڈی پر سینکڑوں مویشیوں اور انسانوں کے نقشِ قدم نظر آئے مگر اُن میں قدسیہ خالہ کے نازک نازک پیروں کا ایک بھی نشان نہ تھا —— جب تک نانی بیوی زندہ رہیں کسی کو قدسیہ خالہ کی بابت پُوچھ تاچھ کرنے کی جُرأت نہ

---

[1] عصمت چغتائی ۔ "دل کی دُنیا" روہتاس بُکس، لاہور۔ ص ۶۵

ہوئی اور ان کے انتقال کے بعد لوگ قدسیہ خالہ کو بھول گئے۔

قدسیہ خالہ اس ناولٹ کا مرکزی کردار ہیں۔ اس لئے ناولٹ کی دل چسپی، جاذبیت اور رنگینی انہی کے دَم سے ہے۔ ان کی شخصیت بڑی توانا اور زندگی سے بھرپور ہے۔ نوجوانی کی عمر میں ہی خاوند نے ان سے مُنہ موڑ لیا جس کے نتیجے میں شباب کی اُمنگیں اور ولولے دل میں لئے اندر ہی اندر لاوے کی طرح کھولتی رہیں اور جب آتش فشاں پھٹنا شروع ہُوا تو پھر انھوں نے نانی بی کی بھی ایک نہیں سُنی اور سرکشی پر کمر باندھ لی اور اپنی سی کر گذریں ــــــ اس ناولٹ کی کردار نُوا گویا خود قدسیہ خالہ کے کردار کا وہ ڈراؤنا سایہ ہے جسے قدسیہ خالہ دلیری کے ساتھ اپنے دامن سے جھٹک کر آزاد پنچھی کی طرح آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ شبیر ماموں کا کردار دراصل خود قدسیہ خالہ کی وہ اخلاقی جرأت ہے جو سماجی مظالم کے بھاری بوجھ تلے دبی پڑی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ اس بوجھ سے نکل کر باہر آتی ہے اور قدسیہ خالہ کی نجات کا سامان بنتی ہے۔ شبیر ماموں بظاہر جوانی کے ولولوں سے عاری دکھائی دیتے ہیں مگر قدسیہ خالہ سے ان کا عشق پیدا ماں ہے ــــ قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں دونوں مل کر ناولٹ کے مرکز و محور بن جاتے ہیں۔

● دادی امّاں۔ نانی امّاں:

دادی امّاں اور نانی امّاں گھر کی قابلِ تعظیم بڑی بوڑھیاں ہیں۔ دادی امّاں نہ صرف بہری ہیں بلکہ دیکھنے سے بھی معذور ہیں۔ یہ معذوریاں ان کے گلے کا طوق بن گئیں ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ بولتی رہتی ہیں۔ "اے بیویو کیا ہو رہا ہے" تاکہ وہ گھر کی صورتِ حال سے واقف رہیں ــــ اُدھر نانی بیوی عمر رسیدہ ہونے کے باوصف جسمانی اور ذہنی طور پر بہت چُست درست ہیں۔ اور گھر کے اہم معاملات کو نپٹانے اور سلجھانے میں اہل ہیں۔ اور ان کے فیصلوں پر سب صاد کرتے ہیں ــــ اعتقاد کے اعتبار سے دادی کٹر شیعہ ہیں اور نانی پکی سُنی۔ اور یہی متضاد مذہبی اعتقادات اُن کے درمیان بنائے مخاصمت بن گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ دونوں بات بے بات ایک دوسرے سے ٹکراتی رہیں، جس سے گھر کی فضا مکدّر ہو جاتی ہے ــــ امّاں، جو گھر کا محور ہیں، سُنّی ہیں اس لئے اُٹھتے بیٹھتے نانی اور امّاں اپنے نظریات کی تبلیغ کرتی رہتی ہیں، جو دادی امّاں کو کھٹکتی ہے۔

○ "اے بیویو کیا ہو رہا ہے"۔ دادی بولیں۔

نانی بولیں "کچھ نہیں بہن ہوتا کیا، تمھارا سر" نانی جملہ کا پہلا ٹکڑا زور سے اور آخری چُپکے سے ادا کرتیں ــــ اور دلوں کی کدورت نمایاں ہو جاتی ــــ "ہمیں کو بھی کوئی کچھ بتاوے ہی نہیں" دادی بسورتیں۔ انھیں شاید احساس تھا کہ انھیں مذِفضول سمجھ کر دیدہ دانستہ حالات سے بے خبر اور بے بہرہ رکھا جاتا ہے۔

○ جب دادی امّاں اور نانی امّاں کی پرخاش زوروں پر تھی، دادی امّاں نے نانی امّاں کو مجلس کی مٹھائی

شعلہ بداماں

ٹکراتی رہتی تھیں

بھجوائی۔ نانی کی رائے تھی کہ شیعہ کھانے کی چیزوں میں تھوک اور غلاظت ملا دیتے ہیں۔ اس لئے اُنھوں نے سب کی موجودگی میں نکتیوں کے لڈّو بطخوں کو ڈال دیئے۔ دادی امّاں اس اہانت سے تڑپ اُٹھی ہوں گی ــــ جب نانی بیوی نے سہارنپور سے آئی ہوئی پارسل میں سے انھیں لوکاٹ بھجوائے تو انھوں نے جوابی کارروائی کے طور پر فوراً مہترانی کو دے دیئے اور ساتھ ہی ہدایت کی "اری بہو، دھولیجیو" نانی بی یہ سُن کر جل کر کباب ہو گئی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ تعصبات اور تنگ دِلی نے گھر کی اچھی بھلی زندگی میں بِس گھول دیا تھا۔

○ جب قدسیہ خالہ نے غصّے سے مغلوب ہو کر نانی اماں کی کلائیاں مروڑ دیں اور گھر میں بھگدڑ سی مچ گئی، تو دادی اماں کی آواز لامحالہ اُبھری "اے ہے لوگو کیا ہو رہا ہے؟" ـــــ "اے ہے لڑکیو ذرا چراغ کی لَو تو اُکساؤ۔۔۔ کیا ہو رہا ہے" لالٹینیں جل رہی تھیں۔ چہار سُو روشنی ہو رہی تھی، مگر دادی اماں کا اندھیرا دُور کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی ـــ باہر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ مگر دادی اماں کو خاک سُنائی نہ دیتا تھا۔ پھر اس افراتفری میں اُن کی سُننے کی کسے فرصت تھی ـــــ دادی اماں کی آواز پھر اُبھری "کیا ہو رہا ہے لوگو!"۔۔۔ "یہ چپکا کیوں پڑ گیا"۔۔۔ "کیا سب نے نیّت باندھ لی کہ کوئی نہیں بولتا" ـــــ بڑھاپا دادی اماں کی بنیادی معذوری تھی۔ اس پر سماعت اور بینائی کا جواب دے جانا، ستم بالائے ستم تھا۔ دادی اماں دُوسروں کی محتاج ہو کر بے وقعت اور بے بضاعت ہو گئیں اور ان کا کوئی پُرسانِ حال نہ رہا۔

دادی اماں کوئی فعّال کردار نہیں۔ مگر اُن کی بے عملی بھی ایک عمل ہے جو ناولٹ کو دلچسپ اور جاذب بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ ان کا کردار گھر کے معاملات خصوصاً مذہبی اعتقادات پر مبنی تفرقات کو نمایاں کرتا ہے اور پھر دادی اماں کے تعلق سے نانی اماں کا کردار بھی روشن ہو جاتا ہے۔

○ نانی اماں کا کردار بہت اہم ہے۔ شاید قریب قریب اتنا ہی اہم جتنا کہ امّاں کا کردار ہے۔ وہ ناول کی مرکزی کردار قدسیہ خالہ کی والدہ ہیں، جن کا شوہر وفات پا چکا ہے۔ گھر کے مسائل کو دیکھتے ہوئے مرحوم کی غیر موجودگی کا احساس انھیں رہ رہ کر ستاتا رہتا ہے۔

نانی نے نہ جانے کتنے چلّے کھینچے اور وظیفے پڑھے کہ قدسیہ خالہ کی سوتن کی کوکھ بنجر رہے اور کسی طرح قدسیہ کے واپس اپنے شوہر کے پاس چلی جانے کی سبیل بن جائے۔ انھوں نے میاں کے مزار پر بھی منّت مان رکھی تھی کہ قدسیہ خالہ کے دن پھر گئے اور گود ہری ہوئی تو وہ چاندی کا پُتلا چڑھائیں گی ـــــ مگر ان کی سب دعائیں رائیگاں گئیں۔ سب سجدے بے معنی ہو گئے ـــــ نانی اماں کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ قدسیہ خالہ راہِ مستقیم پر چلتے زندگی گذار دیں۔ باقاعدگی سے نماز پڑھیں۔ زندگی کے آرام و آسائش ترک کر دیں۔ رُوکھی سُوکھی پر قناعت کریں۔ اور اپنی عاقبت سنواریں ـــــ یہ ایک توہم پرست اور قدامت پسند ماں کا کردار ہے، جو یوُں تو اپنی بیٹی پر جان

بھڑکتی ہیں مگر انسانی جذبات سے بیگانہ اور بے نیاز ہیں۔

○ جب قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں کا عشق پروان چڑھتا ہے تو نانی بیوی پیچ و تاب کھانے لگتی ہیں اور اُسے سمجھاتی ہیں کہ وہ ہوشیار رہے کہ دُنیا بڑی تنگ دل اور کوتاہ بیں ہے کہیں شبیر ماموں سے ان کی قربت سب کی رسوائی کا موجب نہ بن جائے ــــ قدسیہ خالہ کا کتابیں پڑھنا انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا کہ ان کی دانست میں اُلٹی سیدھی کتابیں پڑھنے سے فاسد خیالات بھڑکتے ہیں، شیطان ورغلاتا ہے اور انسان بے راہ ہوجاتا ہے ــــ اور اُنھوں نے ایک روز صبر و قرار کھو کر اماں سے شبیر ماموں کی شکایت کی کہ "شبیر مُوا جان کے پیچھے لگا ہے"۔ مگر جب وہ ان کی بات پر کان نہیں دھرتیں تو وہ چپکے سے شبیر ماموں کو بڑے سلیقہ سے آئندہ آنے سے منع کر دیتی ہیں ــــ یہ ایک شفیق، درد مند اور پُرخلوص ماں کا کردار ہے جو اپنی بدنصیب بیٹی پر جان چھڑکتی ہے اور جس کا نصب العین اس کی فلاح و بہبود ہے۔

نانی کے کردار کا دُوسرا رُخ یہ ہے کہ وہ توہم پرست اور قدامت پسند ہیں۔ انسانی جذبات و احساسات سے بے بہرہ ہیں۔ تغیر پذیر زمانے کی روش سے لاعلم ہیں۔ اور وُہ زور زبردستی سے قدسیہ خالہ کے فطری جذبات کو کچل دینا چاہتی ہیں ــــ حالانکہ قدسیہ خالہ شوہر کے ٹھکرا دینے پر دس سالوں سے اندر ہی اندر گھُلی جا رہی ہیں اور آئندہ بھی صُورتِ حال کے سُدھرنے کی امُید دکھائی نہیں دیتی، نانی اب بھی بضد ہیں کہ وہ اسے اپنا خدائے مجازی سمجھیں اور اُس کی بابت حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔ وہ قدسیہ خالہ کے جذبات سے بیگانہ، اس کے شوہر کے کردار کو جائز ٹھہراتی ہیں کہ شرع کی رُو سے اُسے چار نکاحوں کا ازلی حق حاصل ہے ــــ قدسیہ خالہ کی بھرپُور جوانی میں ہی وہ چاہتی ہیں کہ وہ ایک راہبہ کی زندگی بسر کریں اور اپنی عاقبت سنواریں ــــ اور جب قدسیہ خالہ سرکشی پر آمادہ دکھائی دیتی ہیں اور نانی بی کو ان کے تیور بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں تو وہ املتاس کے تیز و تند مسہل دے کر انھیں جسمانی طور پر نیم مُردہ کردینا چاہتی ہیں تاکہ ان کے ارمان ان کے سینے میں ہی دفن ہو کر رہ جائیں۔ یہ اسے زندہ درگور کرنے والی بات تھی۔ اور یہ یقیناً ایک مادرِ مہربان کا کردار نہ تھا ــــ اور آخر جب "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق قدسیہ خالہ نہ صرف اپنے شوہر کی بابت بہت تلخ و تُرش باتیں کہتی ہیں بلکہ نانی بی کو بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہیں، تو نانی جُوتی اُتار کر اُن کا مُنہ مسل دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ردِّ عمل کے طور پر قدسیہ خالہ کا ہاتھ بھی اضطراری طور پر اُٹھ جاتا ہے ــــ قدسیہ خالہ کو قصُور وار ٹھہرانے کا کوئی جواز نہیں کہ وہ ستم رسیدہ ہے۔ "سوزِ غم ہائے نہانی" نے اُسے نڈھال کر دیا ہے۔ اور شبیر ماموں کی آغوش میں ہی اُسے راہِ نجات دکھائی دیتی ہے ــــ بلاشبہ نانی کے سینہ میں ایک شفیق اور درد مند ماں کا دل دھڑکتا ہے مگر اُن کے نظریات اور اعتقادات ٹیڑھے ہیں۔ سوچ ٹیڑھی ہے۔ اور بہ ایں وجہ ان کا کردار بھی ٹیڑھا بینڈا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کے نتائج بھی ٹیڑھے نکلے۔ قدسیہ خالہ پر انھوں نے اپنے نظریات مسلط کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہیں اور کفِ تاسف ملتی رہ گئیں۔

نانی بیوی کا کردار بڑا فعال اور جاندار ہے۔ جو ناولٹ کو عمق عطا کرتا ہے۔ نانی بیوی کے کردار میں ہم ایک پرانے متوسط مسلم گھرانے کی، جو فرسودہ اور بوسیدہ روایات میں بری طرح جکڑا ہوا ہے، بڑی واضح اور روشن تصویر دیکھتے ہیں۔ نانی بیوی اسی پرانی لکیر کو پیٹتی چلی آ رہی ہیں جس کے بنیادی اسباب ان کی ناخواندگی اور بے لچک مذہبی کٹرپن ہے۔ نانی بیوی قدسیہ خالہ کے کردار کو بھی گہرائی اور استحکام عطا کرتی ہیں —— اور تو اور وہ اماں اور دادی کے کرداروں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔

● اماں ابا:

اماں ابا ایک خوش حال اور فارغ البال گھرانے کے سربراہ ہیں۔ ابا کماتے ہیں اور اماں گھر کی گاڑی بڑی خوش اسلوبی سے چلاتی ہیں۔ ابا گھر کے معاملات میں شاذ ہی دخل اندازی کرتے ہیں اور اماں کا فیصلہ ہی قطعی ہوتا ہے —— اماں ایک وفاشعار اور خدمت گذار بیوی اور اپنے بچوں پر جان چھڑکنے والی ماں ہیں۔ ادھر ابا کی ٹم ٹم کی گھنٹی سنائی دیتی ہے اماں سب کام چھوڑ کر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتی ہیں۔ ابا کچہری یا کلب سے لوٹ کر باہری زینہ سے اوپر چلے جاتے ہیں جہاں وہ گھر کی گہما گہمی اور شور و غل سے الگ تھلگ سکون سے اوپر کی منزل میں رہتے ہیں۔ ان کا انداز ایک میر کارواں کا سا ہے، جو وہ فی الواقع ہیں۔

اماں بچوں کے آداب اور اخلاق کی نگہبان اور پاسبان تھیں۔ اگر کوئی لڑکی کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوتی تو وہ فوراً برہم ہو جاتیں کہ ان کی دانست میں بوٗں' یا ہر والیوں' کے انداز میں کھڑے ہونا شریف زادیوں کے لئے معیوب تھا۔ مگر لڑکیاں سوچتیں کہ ایک عمر ایسی بھی ہوتی ہے، جب ہاتھ بلائے جان ہو جاتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ انھیں کہاں رکھا جائے۔ وہ سر پر ہاتھوں کی آلتی پالتی مار کر رکھ لیتی تو:

"اے ہے نگوڑی۔ سر کیوں پیٹ رہی ہو" تب اماں بُرا مانتیں۔

"پھر کہاں رکھیں؟" ہم عاجز آ جاتے۔

"چولھے میں" وہ اور جل جاتیں۔ "غارت ہو یہاں سے"

اور ہم وہاں سے غارت ہو جاتے۔[1]

یہ اماں کا لڑکیوں کو راہِ مستقیم پر ڈالنے کا اپنا مخصوص انداز ہے جس میں نرمی، ملائمت اور حلاوت

---

[1] عصمت چغتائی "دل کی دنیا" روہتاس بکس، لاہور۔ ص ۱۸-۱۷

کو چنداں دخل نہیں۔ جب دورانِ گفتگو اُن سے کوئی معقول جواب بن نہ پڑتا تو وہ ڈانٹ ڈپٹ کر، جھاڑ پھٹکار کر ان کا مُنہ بند کر دیتیں۔ یہ اُن کا ایک آزمودہ نسخہ تھا۔

○ اماں توہّم پرست اور قدامت پسند ہیں۔ وہ سماوی آفات اور بلائیات سے خوف زدہ رہتی ہیں۔ اور ان کے تدارک کے لئے خلوص اور لگن سے ہر ممکن کوشش کرتی ہیں ـــــ وہ مافوق الفطرت طاقتوں مثلاً بھوت، پریت اور جن سے اُلجھنا پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے انھیں لُبھانے رِجھانے میں لگی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے مذہبی عقائد کے برعکس ستیہ نارائن کی کتھا کراتے، پانچ ٹانگ کی گائے کو گھاس کھلانے اور سانپوں کو دُودھ پلانے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ نانی بی انھیں سمجھاتیں:

"بیٹی یہ کفر ہے۔ نذر و نیاز کی اور بات ہے۔ مگر یہ موئی کتھا میں اپنی عاقبت نہ بگاڑو بی[1]"

مگر اماں کو اپنا سہاگ اور اپنے بچے عاقبت سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔ اور ان کا تحفظ انھیں ہر بات پر مقدم ہے۔

چونکہ اماں کے اعتقادات میں استحکام اور استقلال نہ تھا۔ اس لئے مذہب کے معاملے میں وہ ہمیشہ ڈانواں ڈول رہیں۔ دیوی دیوتاؤں کو رِجھانا، لُبھانا، منانا اُن کی عبادت کا ایک اہم جُزو تھا۔ ان کا قول ہے کہ نہ جانے یہ دیوی دیوتا کب بگڑ کھڑے ہوں۔ انسان بھلا ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے ـــــ ایک دفعہ بچّے کسی مندر میں بھگوان کی شان میں گستاخی کر آئے۔ مہنت جی دُہائی دیتے ہوئے آئے۔ اماں نے فوراً کفّارے کے طور براہمنوں کو بُلا کر کھانا کھلا دیا تاکہ دیوتا خشمگیں ہو کر قہر نہ برپا کر دیں ـــــ مندر سے کبھی پرساد آتا تو سب بیویاں تھو تھو کر کے کہتیں "مرغیوں کو ڈالو نجس ہے" مگر اماں طاق میں رکھ دیتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ بچّے اُسے اپنے آپ ٹھکانے لگا دیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ "بھئی کیا پتہ پرساد میں برکت ہو" ـــــ اماں کو اس عمل سے قلبی سکون ملتا تھا۔

○ اماں کی رائے بالعموم بہت معقول اور سلجھی ہوئی ہوتی۔ وہ ہر بات کو انسانی نقطۂ نگاہ سے پرکھتیں تولتیں اور مدّمقابل کے ردِّعمل سے بے نیاز برملا اپنی بات کا اظہار کر دیتیں۔ جب نانی بیوی نے ان سے کہا کہ شبیر ماموں قدسیہ خالہ کے تعلّق سے جی کا جنجال ہو کر رہ گئے ہیں اور اس معاملے میں انھیں قدسیہ خالہ کی معاونت بھی حاصل ہے تو اماں کہتی ہیں کہ ان کا شبیر ماموں پر شک کرنا بے جا ہے اور پھر اگر اس سے قدسیہ کی دل بستگی ہوتی ہے تو حرج بھی کیا ہے کہ وہ دُکھوں کی ماری دو گھڑی کو جی خوش کر لیتی ہے۔ اور یوں اس بے سہارا کو جینے کا سہارا مل جاتا ہے ... اور پھر اگر یہ بات پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے تو بھی بُرا کیا ہے ـــــ یہ ایک بے لوث انسان کی پُرخلوص

---

[1] عصمت چغتائی۔ "دل کی دنیا"۔ روہتاس بکس، لاہور، ص ۷۶

رائے تھی۔

اماں گھر کی زندگی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ تمام کنبہ انھیں تعظیم دیتا ہے اور ان کا حکم بجالاتا ہے۔ اور وہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اپنے منصب و مقام پر کھری اترتی ہیں۔ ناولٹ میں ان کا بڑا اہم مقام ہے کہ وہ گھر کا مرکز و محور ہیں۔

● حکیم صاحب:

حکیم صاحب "نیم حکیم" ہیں اور وہ اپنے کردار سے بلاشبہ "خطرۂ جان" ہیں۔ بیماری کوئی بھی ہو ان کے پاس بفضلِ خدا ایک ہی تیر بہدف دوا ہے، املتاس کے جُلّاب۔ ان کا قول ہے کہ "جسم کی گرمی دماغ پر چڑھ جاتی ہے۔ پیٹ کی صفائی سے تمام فاسد مادّے خارج ہو جاتے ہیں۔" اور وہ مسہل کے فوائد بیان کرتے تو ہر کوئی قائل ہو جاتا ـــــ جب قدسیہ خالہ اپنے تحفظ میں گھر والوں کے سامنے تن کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور وہ حکیم صاحب سے رجوع کرتے ہیں تو وہ حسبِ معمول ان کی نبض دیکھ کر تشخیص کرتے ہیں:

"سر کو گرمی چڑھ گئی ہے۔ صاحبزادی کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ اللہ پاک کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔"

حکیم صاحب اس بات سے بے نیاز ہیں کہ دوا پینے کے بعد بدنصیب مریض پر کیا گذرتی ہے۔ کیونکہ ان کے پاس تمام بیماریوں کی وُہی ایک واحد دوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم صاحب کا سابقہ ان ناخواندہ، کم فہم اور اوہام پرست خواتین سے پڑا ہے جن کا واحد مقصد ہی تیز مسہل دے کر مریض کو نیم جان کرنا ہے تاکہ اس کی تمنائیں اور آرزوئیں دَم توڑ دیں اور زندگی میں اس کی دلچسپی نابید ہو جائے۔ حکیم صاحب ایک طرح سے ان عمر رسیدہ عورتوں کے آلۂ کار ہیں ـــــ ابا میاں نے ان کا صحیح علاج تجویز کیا ہے کہ ان کی جوتے کاری ہونی چاہیئے اور پھر بھی باز نہ آئیں تو انھیں ہتھکڑیاں ڈلوا دینی چاہئیں۔

ناول کا کوئی کردار بھلے ہی وہ کتنا بے بضاعت کیوں نہ ہو، بے مصرف اور بے مقصد نہیں ہوتا۔ حکیم صاحب، بُوا، قدسیہ خالہ اور مجھو چچا کو املتاس کے جُلّاب دے کر ایک ہم رول ادا کرتے ہیں، جس سے ناولٹ کے مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے اور رائے پیش رفت کرنے میں مدد ملتی ہے۔ درحقیقت وہ اماں اور نانی بیوی کو اپنا اپنا کردار ادا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور یوں ان کے کردار کو استحکام عطا کرتے ہیں۔

● مجھو چچا:

چچا میاں کا نام مستقیم ہے مگر پیار سے سب انھیں "مجھو" کہتے ہیں۔ مستقیم یعنی سیدھا۔ مگر چچا میاں کی کوئی کل سیدھی نہیں کہ وہ حد سے زیادہ ٹیڑھے میڑھے ہیں ـــــ وہ بلانوش ہیں اور شاہد باز بھی۔ انھوں نے اپنی تمام

جائیداد طوائفوں کے کوٹھوں پر برباد کر دی ہے اور خاندان کی سب لڑکیاں ان سے دامن بچا کر چلتی ہیں۔ پھر چچا مُرتد ہیں۔ وہ مافوق الفطرت باتوں کے قائل نہیں۔ معجزوں اور کراماتوں کو سرے سے نہیں مانتے۔ جو بات ان کی عقل کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی اُسے وہ بیک جنبشِ سر رَدّ کر دیتے ہیں ـــــ پھر وہ بڑے حوصلہ مند اور جی دار ہیں۔ اپنی سی کر گذرنے والے۔ بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے والے ـــــ سب سے اہم بات یہ کہ وہ انسانی زندگی میں پیار اور محبت کی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں اور اس کی قربان گاہ پر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے ـــــ گویا چچا میاں مجموعۂ اضداد ہیں۔ زشت و خوب کا دلکش امتزاج۔ اُن کا "زشت" بے حد سیاہ ہے اور "خوب" بے حد روشن۔ مگر سب نے اُن کی شخصیت کا ظاہرہ تاریک رُخ ہی دیکھا اور روشن پہلو سے صرفِ نظر کیا کیونکہ وہ ان کی نظروں سے ڈھکا چھُپا رہا۔ سب نے انھیں خاندان کی بلند پیشانی پر بدنما داغ سمجھا۔ اور اُن سے دُور دُور رہے۔ یہ چچا میاں کی زندگی کا المیہ رہا۔

چونکہ چچا کشف و کرامات کے قائل نہ تھے، اس لئے ان کی بات عقلی اور منطقی ہوتی۔ اور وہ اپنی بات پر مُستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے قائم رہتے۔ چنانچہ جب مشہور ہُوا کہ بدمعاش نے جس ہاتھ سے بُوا کی کلائی پکڑی تھی وہ گل سڑ گیا تو انھوں نے برملا کہا کہ درگاہ شریف میں ہر سال ہزاروں کوڑھی صحت یابی کی آرزو دلوں میں لئے آتے ہیں، اس لئے ہاتھ پیر گل سڑ کر گر جانا بعید از قیاس نہیں اور شرابی کو لقوہ مار جانا بھی غیر معمولی بات نہیں۔ ـــــ مگر کسی کو جرأت و جسارت نہ تھی کہ بُوا کی بات کی تردید کرتے ہُوئے، چچا میاں کی بات کی تائید کرتا ـــــ پھر چچا میاں نے جب سُنا کہ بُلاقی کا بیٹا سانپ کے ڈسنے کے بعد غازی میاں کی کرامات سے موت کے مُنہ سے بچ نکلا تو انھوں نے فوراً کہا کہ "پانی کا سانپ ہوگا۔ زہریلا نہیں ہوتا۔" مگر کسی نے ان کی نہ سُنی۔ کورانہ تقلید کے آگے عقل و دانش دھری رہ گئی ـــــ نہ صرف یہ، سب اس بات کے قائل تھے کہ بُوا کی ڈور براہِ راست غازی میاں سے بندھی ہے۔ مگر چچا میاں واحد شخص تھے جن کے گلے سے ایسی باتیں نہ اُترتی تھیں۔ "سالی لفنگی ہے۔ پاگل واگل کچھ نہیں۔ سب کو اُلّو بناتی ہے"[1] ـــــ ظاہر ہے کہ توہّم پرستوں کے جھُرمٹ میں چچا میاں واحد بیدار مغز اور آزاد خیال شخص تھے۔ وُہ خواہ مخواہ انسانی کردار کا ناتا ماورائی طاقتوں سے نہ جوڑتے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کا بہت روشن اور جاذب پہلو ہے۔

چچا میاں کا دوسرا رُخ ملاحظہ ہو ـــــ گھر میں ننھیال اور ددھیال سے مہمانوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ مہمان بالعموم دو حصّوں میں بٹ جاتے اور یہ ٹوہ رکھی جاتی کہ کون کس کی تر مال سے تواضع کر رہا ہے۔

---

[1] عصمت چغتائی "دل کی دُنیا" روہتاس بُکس۔ لاہور۔ ص ۲۵

امّاں چونکہ ننھیال سے تھیں اس لئے ان کی پارٹی بھاری پڑتی۔ چچا میاں ہمیشہ دونوں پارٹیوں میں جھگڑا کرنے کی غرض سے کوئی نہ کوئی شوشہ چھیڑے رکھتے اور جب بدمزگی پیدا ہوتی تو ناصح مشفق بن کر سامنے آجاتے اور اگر سوئے اتفاق سے وہ خود متنازعہ میں گھر جاتے تو کمال ہوشیاری سے دامن بچا لیتے۔ اِدھر اُدھر کی ہانکنے اور موضوع پر آنے سے گریز کرتے۔ یہ ان کی شخصیت کا قدرے ناگوار پہلو تھا۔

○ پھوپھا بلا کے کائیاں اور دقیقہ شناس تھے۔ اور بلا تکلّف معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ جب قدسیہ خالہ اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر اُٹھ کھڑی ہوئیں اور بے تحاشا نانی بیوی سے بھڑ گئیں تو سب کے دل دہل گئے اور گھر بھر میں ان کی ہیبت چھا گئی۔ سب کی نظروں میں اُن کا قد آپ ہی آپ اُونچا ہو گیا اور ان کی خوب خاطر مدارات ہونے لگی — پورے خاندان میں پھوپھا ہی واحد فرد تھے جو قدسیہ کی خاطر داریوں اور نازبرداریوں پر چیں بہ جبیں ہوتے اور کہتے " قدسیہ بانو بڑی چینٹ ہو۔ خوب سارے گھر کو اُلّو بنا رہی ہو" — مگر کیوں کہ وہ بے دین اور نابکار قسم کے آدمی تھے۔ کوئی ان کی بات پر کان نہ دھرتا۔

○ چچا عام طور پر قدسیہ خالہ سے گفتگو کے دوران بد مذاقی پر اتر آتے تھے۔ مگر اس دن تو نہ جانے کس رَو میں بہہ کر وہ سب حدود سے گذر گئے — قدسیہ خالہ نے شربت کا گلاس ہونٹوں سے لگایا مگر ابھی گھونٹ نہ بھرا تھا کہ چچا اُن سے مخاطب ہو کر بولے:

"عجب محنجو ہیں یہ تمہارے شبیر حسن! ہم ہوتے تو۔۔۔"
اُنھوں نے ہولے سے ایسے مُنہ ہی مُنہ میں کہا کہ نانی بیوی نہ سُن پائیں۔
"تم ہوتے تو؟" قدسیہ خالہ نے دانت پیسے۔
"لے کے بھاگ جاتے!" چچا میاں نے لمبی چوڑی انگڑائی کے ہاتھ پھیلائے۔
"کمینے مجھے بھی کیا اپنی مشتری جان سمجھا ہے" قدسیہ خالہ ننگی تلوار بن گئیں۔
"ہر عورت میں کہیں نہ کہیں مشتری جان چھپی ہوتی ہے اور موقع پا کر۔۔"
قدسیہ خالہ نے شربت کا بھرا گلاس چچا کے مُنہ پر کھینچ مارا۔ اور پیر سے ننھی سی سلیم شاہی جُوتی گھسیٹ اُن پر ٹوٹ پڑیں۔[1]

یہ وہ پہلی ڈھیلی ڈھالی، مرنجان مرنج قدسیہ خالہ نہ تھیں۔ یہ ایک نئے پیکر میں ڈھلی نڈر اور بے خوف قدسیہ خالہ تھیں جو اپنی عزت و ناموس کی خاطر بے تحاشا مدِّمقابل سے بھڑ جاتی تھیں۔ چچا کی گستاخی اور بدتمیزی جب

---

[1] عصمت چغتائی: "دل کی دُنیا"، روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۶۷ - ۶۸

حد سے تجاوز کر گئی، تو انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جوتی اُتار اُن پر پل پڑیں۔ اور حیرت اس بات پر ہے کہ لیم شحیم چچا بغیر کسی مزاحمت کے، سر جھکا کر، ہنستے ہنستے مار کھاتے رہے اور پٹ کر خاموشی سے صدر دروازے سے نکل گئے گویا اُنھوں نے کوئی مُہم سر کرلی ہو —— مجھو چچا دل ہی دل میں قدسیہ خالہ پر مرتے تھے۔ مگر ان کا عشق قطعاً یک طرفہ تھا کہ قدسیہ خالہ شبیر ماموں پر دل و جان سے فدا تھیں اور یہ احساس دو طرفہ تھا —— آج مجھو چچا نے واضح طور پر جان لیا کہ قدسیہ خالہ کے تعلق سے اُن کی دال کبھی نہیں گلے گی۔

○ مجھو چچا نے آبا و اجداد کی تمام جائیداد رنڈیوں کے کوٹھوں پر برباد کر دی تھی اور اب وہ تہی دست تھے۔ ان کی یہ کوشش رہتی کہ اِدھر اُدھر سے کسی حیلے بہانے پیسے بٹورتے رہیں تاکہ جوں توں گذر بسر ہوتی رہے۔ گھر کا شاید ہی کوئی فرد ہو جس کے آگے اُنھوں نے ہاتھ نہ پسارے ہوں۔ مگر کسی نے اُنھیں کبھی گھاس نہ ڈالی۔ مثلاً نانی بیوی سے وہ یوں گویا ہوئے "املیٹھی والے آموں کے باگ میرے نام جلد کر دو تو ابھی سنی ہو جاتا ہوں" —— "اُوئی وہ تو قدسیہ کے نام ہیں" —— "کوئی مضائقہ نہیں۔ قدسیہ کو بھی ہبہ کر دو۔ میں سب سے نمجھ لوں گا" —— "تیرے مُنہ میں خاک" نانی بیوی جوتی سنبھالتیں —— یہ بات قابلِ غور ہے کہ چچا نانی بیوی سے املیٹھی والے آموں کے باغات کے ساتھ، جو قدسیہ کے نام ہیں، خود قدسیہ کو بھی مانگ لیتے ہیں۔ ہنسی مذاق میں کہی گئی اس بات کی تہہ میں گہرا راز پنہاں ہے —— اور یہ جان لینے کے باوصف کہ قدسیہ ان کی دسترس سے باہر ہے وہ اب بھی ان پر نظر رکھے ہوئے ہیں —— پھر ان کا سنی ہونے کی پیش کش کرنا مضحکہ خیز تھا کہ وہ ایک بے دین، بدشعار اور ناقابلِ اعتبار شخص تھے، جن پر بھروسہ کرنا عبث تھا اور جن کا ننگِ انسانیت وجود کسی فرقے کے لئے بھی باعثِ فخر نہ تھا۔

مجھو چچا کے کردار کا سب سے نمایاں اور تابناک پہلو اس ناولٹ کے آخری دو ایک صفحات میں اس وقت آشکار ہوتا ہے، جب رفیعہ حسن، قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں کی بیٹی، واحد متکلّم سے ملتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ جب امّی اور ابّو گھر سے بھاگ نکلے تو چچا نے امّی سے کہا تم جوتی چھوڑ ننگے پاؤں چلی آئیں۔ جوتی پہن لو، ورنہ پیر بھیگ گئے تو زکام ہو جائے گا اور یہ کہہ کر انھوں نے جیب سے امّی کی جوتیاں نکال کر دے دیں[۸] —— جب واحد متکلّم نے سوال کیا کہ ان کے پیروں کے نشان کیوں نہ ملے تو اُس نے ہنس کر جواب دیا کہ وہ کیسے ملتے کہ ابّو نے امّی کو اُٹھا لیا اور پیدل چل کر اسٹیشن تک آئے۔ وہاں سے رودولی گئے، جہاں ابّو کے دوست ابرار چچا وکالت کرتے تھے۔ اُنھوں نے قدسیہ کے شوہر سے اُنھیں طلاق دلانے کی بہت کوشش کی مگر وُہ ٹس سے مس نہ ہُوا —— تبدیلیِ مذہب کے لئے ایک پادری سے بھی رجُوع کیا گیا مگر بات سرے نہ چڑھی۔ —— مجھو چچا کو اس جھنجھٹ کی بھنک پڑی تو وہ بہت برہم ہوئے اور انھوں نے سب کو قتل کر کے قدسیہ کو

لے بھاگنے کی دھمکی دی۔ اور اُسی شام قاضی کو بلا کر نکاح کر دیا۔ اس پر جب شبیر ماموں کے دوست ابرار چچا نے کہا کہ یہ تو نکاح نہ ہُوا تو مجھو چچا نے کہا کہ "ہُوا کیسے نہیں" اور وہ ان کی گردن توڑنے پر تُل گئے ـــــ نہ صرف یہ مجھو چچا نے یہ بھی کہا کہ اگر قدسیہ کے شوہر نے گڑ بڑ کی تو" وہ اس کا قصہ ہی پاک کر دیں گے" غرضیکہ ڈرا دھمکا کر اور زور زبردستی سے چچا نے سب کو خاموش کر دیا۔ اور قدسیہ اور شبیر ماموں نے قانون کی نظروں سے بچتے ہوئے مجرموں کی طرح چھپتے چھپاتے، ایک دُوسرے کی باہوں میں جھولتے، زندگی گذار دی۔

رفیعہ حسن کے اس انکشاف سے مجھو چچا ایک دَم ہماری نظروں میں قابلِ احترام ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے اپنی محبُوبہ کی خاطر، جس نے انھیں پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا، اس قدر جوکھم اُٹھائی اور خطرات مول لئے تاکہ وہ شبیر ماموں کے ساتھ پُرسکون اور اطمینان بخش زندگی گذار سکے۔ یہ ایک عام انسان کا کردار نہ تھا جو محبت میں نامرادی پر اپنی محبُوبہ کے تئیں غم و غصّے اور حسرت و یاس کے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور "رقیبِ رُو سیاہ" کے تئیں اس کے دل و دماغ میں نفرت اور حقارت کی آگ دہکنے لگتی ہے ـــــ مگر چچا میاں کی قدسیہ خالہ کے تئیں محبت اس قدر بے لوث، پُرخلوص اور سب آلائشوں سے پاک تھی کہ وہ اس کی زندگی کی ناؤ کو ہچکولے کھاتی دیکھ کر دل گرفتہ ہو جاتے ہیں اور تب تک چین کی سانس نہیں لیتے جب تک کہ قدسیہ اور شبیر ماموں "نکاح" کے بندھن میں بندھ نہیں جاتے ـــــ مجھو چچا کا یہ غیر معمولی کردار انھیں ہماری نظروں میں بلند قامت اور پُر وقار بنا دیتا ہے۔ اور ہم ان کی تمام کوتاہیوں کو بیک جنبشِ سر جھٹک دیتے ہیں ـــــ انسان کی شخصیت کس قدر پُر پیچ اور پُر تضاد ہے۔

رفیعہ حسن قدرے توقف سے بولی:

"امّی اور ابّو کی محبت کو دیکھ کر شادی بیاہ اور طلاق کی اہمیت پر ہنسی آنے لگتی ہے۔ ... میں سمجھتی ہوں کہ جو امّی اور ابّو نے کیا وہی کرنا چاہیئے تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان کی محبت کا پھل ہُوں"[1]

یہ ایک باغی اور سرکش لڑکی کی بلند آہنگ آواز ہے جو اپنے والدین کے نقشِ قدم پر چلتی ہوئی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے روایتی رسُوم و قیود سے آزاد ہے جو محبت کی تکمیل کے لئے شادی بیاہ کی گھسی پٹی راہ پر چلنا ضرُوری نہیں سمجھتی۔ اور جو طلاق کی ضرُورت اور اہمیت کی بھی قائل نہیں۔ گویا جو "فری لو"، "آزاد محبت" میں یقین رکھتی ہے ـــــ غرضیکہ اُس کی آواز خُود عصمت کی آواز کی بازگشت ہے جنھوں نے مروّجہ سماجی قیوُد سے

---

[1] عصمت چغتائی "دل کی دُنیا" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۸۷

بے نیاز کھلے عام بے جھجک محبت کی اور اس کا برملا اعتراف کیا۔ پھر ان کی دو مشہور کہانیاں "بھول بھلیاں" اور "پنکچر" ان کے اس موقف کی آئینہ دار ہیں۔

رفیعہ حسن نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

"کاش ہمیں بھی کوئی ایسی لگن سے چاہے جیسے ابّو نے امی کو چاہا . . . اور جیسے مجھو ماموں نے محبت نبھائی ہے"[1]

یہ مجھو چچا کو رفیعہ حسن کا ہی خراجِ تحسین نہیں بلکہ ہر اس انسان کا بھی ہے، جو محبت اور نرم و نازک انسانی رشتوں کی قدر و قیمت کو پہچانتا ہے۔

مجھو چچا کا کردار بہت اہم ہے کہ وہ ہمیں اپنی کثیر الجہات، پُر پیچ، پُر تضاد، رنگین اور پُر کشش شخصیت سے متاثر کرتا ہے —— درحقیقت عصمت نے انہی سے اس ناولٹ کو منسوب کیا ہے۔ "دل کی دُنیا" کی کوئی تھاہ نہیں۔ یہ ایک آتشیں جذبہ ہے جو نامُراد رہے تو جلا کر راکھ کر دے اور کامران رہے تو حاصلِ حیاتِ فانی بن جائے۔ اس الوہی جذبے کے بے انداز رنگ ہیں۔ لیکن محبت میں حقارت سے ٹھکرا دیئے جانے پر بھی محبُوبہ پر جان چھڑکنا اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ بھی کر گذرنے پر آمادہ ہو جانا بہت بڑی بات ہے —— رفیعہ کے انکشافات کے بعد یُوں محسوس ہوتا ہے کہ اس ناولٹ کا ایوانِ عالی شاید مجھو چچا کی بنیادوں پر ہی کھڑا ہے اور وہ ہی اس ناولٹ کے روحِ رواں ہیں۔—

عصمت کے جو قاری اُن کے مزاج اور کردار سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں انھیں مجھو چچا کے پردے میں خود عصمت چغتائی کارفرما نظر آسکتی ہیں وہ اپنی باغیانہ فطرت کی وجہ سے روایت پرستوں کے درمیان ہمیشہ معتوب رہیں۔ اور اپنے انقلابی رویّے سے سماج میں ایسی تبدیلیوں کے لئے کوشاں رہیں جو عورت سے متعلق ناانصافی اور دقیانوسی پن کو ختم کر سکیں۔ وہ بعضوں کی نظروں میں بظاہر ملعون ٹھہریں مگر بہ باطن وہ ظلم رسیدوں کی دوست اور ہمدرد تھیں۔ اس اعتبار سے مجھو چچا خود عصمت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

● زبان ("دل کی دُنیا" کے تعلّق سے)

عصمت کی کسی ادبی تحریر پر لکھتے ہوئے اُن کی زبان کا ذکر کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس ناولٹ میں عصمت نے بوا کے توسّط سے زبان کو جاذب اور رنگین بنانے کے لئے دو دو، چار چار سطروں پر مبنی مقبولِ عام لوک گیتوں کا استعمال کیا ہے جس سے نہ صرف بوا کا کردار کھل اُٹھتا ہے، بلکہ ان کی تحریر بھی بے حد نکھر جاتی ہے۔ پھر کیونکہ بُوا کے گلے میں نور ہے۔ جب اُن کی آواز ترائی کی پنہائیوں میں اُبھرتی، لہراتی دُور دور تک

---

[1] عصمت چغتائی "دل کی دُنیا"، روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص - ۸

پھیلتی چلی جاتی ہے تو ایک ماورائی، غیرارضی فضا پیدا ہو جاتی ہے، جس کے سحر میں قاری کھو سا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر:

"سیاں توری گوری بھوٹل گیندا بن جاؤں گی
بلماں توری گوری
تم سیاں کالے ہم گورے
تم سیاں موٹے ہم دُبلے
کانٹے میں تلیں گے دونوں جنے"

"دُھنیا روئے روئے انکھیاں لال گال
پان پچاسی کا بیڑا لگائے
ہمرے نحوٗر پیا اجھو نہ آئے
جُن جُن کلیاں سیجیں بچھائیں
دُھنیا روئے روئے انکھیاں لال گال"

"ساون آئے گوا بھائی کا جھولا نہ پڑے
جیا ترسے بدروا برسے
سکھی ری دن کیسے کٹیں گے بہار کے"

عصمت کی یہ جدّت طرازی قابلِ تحسین ہے کہ اس سے ناولٹ کا حُسن چمک اُٹھتا ہے۔

○ عصمت بالعموم اسی طبقے کی زبان استعمال کرتی ہیں جس سے ان کے کرداروں کا تعلق ہوتا ہے۔ اس سے تحریر میں حقیقت کا رنگ اُبھر آتا ہے اور وہ قاری کی توجہ کو باندھے رکھتی ہے۔ کسی ادبی تخلیق کو جو عناصر رنگ و بو عطا کرتے ہیں اُن میں یہ عنصر بھی شامل ہے۔ ملاحظہ ہو:

"اے موری متیا۔ ای دُلہا ہے کہ تمبا کو کیر پنڈا۔ اوپر سے بیت بھر کا یہ" اُنھوں نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ہاتھ کا بالشت بنا کر کھڑا کیا۔

"بھائی ایں جوڑی تنکو ٹھیک نہیں۔ دُلہا کوئی کام کا نہیں۔ کاہے بٹیا کا نصیبہ پھوڑت ہو۔ اِسے سمدھن کوئی اپنی شکل کی پری جات ڈھونڈ کرلا دُپوتے لئے۔ ہمری بٹیا کو بکسو۔" (ص ۲۹)

اس طرح کے مکالماتی ٹکڑے ناولٹ میں جا بجا بکھرے ملتے ہیں، جو اس کی ادبیت اور حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ اظہار کے تعلق سے نہ جانے عصمت کے ترکش میں کتنے تیر ہیں جو ان کی تحریر کے حسن، رنگینی اور گوناگونی کے ضامن اور امین بن جاتے ہیں۔ عصمت کو منظر کشی پر بے پناہ دسترس حاصل ہے۔ وہ چند ہلکے پھلکے بے تکلف جملوں میں منظر کو یوں بیان کر دیتی ہیں کہ اس کا ہر گوشہ تاباں ہو جاتا ہے اور قاری جذبۂ تحسین سے دیکھتا رہ جاتا ہے۔ دو ایک مثالیں پیش ہیں:

"سب کو معلوم تھا کہ شبیر ماموں کو قدسیہ خالہ سے اُنس تھا۔ مگر کیا مر گھلا او نگھتا ہوا عشق تھا گھر کی اور سیانی لڑکیوں کا بھی عشق تھا کیا دندناتا زقندیں مارتا۔ جب دیکھو دھینگا مشتی ہو رہی ہے، کونوں کھدروں میں دبوچا جا رہا ہے۔ اکیلا پایا اور بھبوڑ ڈالا۔ تاش کے بہانے چھین جھپٹ۔ پچیسی کی کوڑیاں چھینی جا رہی ہیں۔ گھر کے بڑے بوڑھے ڈانٹ رہے ہیں۔ جنم پر تھوک رہے ہیں۔ مگر چکنے گھڑے کھی کھی ہنسے جا رہے ہیں۔"[1]

اتنے کم لفظوں میں عنفوانِ شباب کے "زقندیں مارتے عشق" کی منظر کشی اتنے موثر انداز میں کم ہی فنکار کر سکنے کے اہل ہوں گے ــــ ایک اور نمونہ پیش ہے:

"ہونے والی سمدھن کے لئے نہایت لمبا چوڑا دستر خوان چُنا جا رہا تھا۔ بُوا بیلے کی کلیوں کا گچھا آنچل میں جُھلاتی کوئی نیا گیت مرمراتی حسب عادت اچانک آ گئیں۔ پہلے تو گھر کے سولہ سنگھار دیکھ کر ٹھٹکیں۔ پھر سمدھن کو دیکھ کر ایک دم الف ہو گئیں۔ ان کے بہت قریب جا کے آنکھیں بچھائیں۔ بھنویں سکیڑیں جیسے کوئی باریک سی جوں ڈھونڈ رہی ہیں۔ حالانکہ سمدھن واضح تھیں ٹھگنی تو ضرور تھیں مگر قد کی لمبائی کی کمی چوڑائی میں پوری ہو گئی تھی۔"[2]

چُنا جا رہا وسیع دستر خوان، گیت گنگناتی کلیوں کا گچھا آنچل میں جُھلاتی بُوا کی آمد، گھر کی زیبائش و آرائش دیکھ کر بُوا کا ٹھٹھک جانا اور سمدھن کو دیکھ کر ایکا ایکی الف ہو جانا، بُوا کا سمدھن کا یُوں باریک بینی سے معائنہ کرنا گویا خورد بین سے جراثیم ڈھونڈ رہی ہوں، تمام منظر کو درخشاں کر دیتا ہے۔ اور جیتا جاگتا نقشہ آنکھوں کے سامنے یُوں بھر جاتا ہے گویا کسی ماہر مصور نے کینوس پر تصویر کھینچ دی ہو ــــ اور اب یہ مثال:

"ایک لمحہ کو شبیر حسن کے ناکارہ ہاتھ ٹھٹکے۔ پھر اُنھوں نے سب کے سامنے خالہ کو اتنی زور سے بھینچا کہ ان کی پسلیاں کڑکڑا اٹھیں۔ سارے کُنبہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہم لوگ

---

[1] [2] عصمت چغتائی، "دل کی دُنیا"، روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۱۰، ۲۸

اکڑی ڈکڑی چھوڑ منہ پھاڑے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ ایک دَم فضانے دَم سادھ لیا۔ نانی بی
لوٹے چھپر کی طرح ڈھے گئیں[1]"

یہ ٹکڑا منظر نگاری کی معراج ہے۔ حد درجہ مختصر مگر حد درجہ جاندار۔ ہر جملہ نہ صرف ایک مخصوص کیفیت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ ارفع نثر کا نمونہ بھی ہے ـــــ تصویر کشی کرتے ہوئے عصمت کوزے میں دریا بند کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اختصار کے باوصف ان کی منظر کشی اتنی بھرپور اور جاندار و موثر ہوتی ہے۔

"بڑی اُداس شام تھی۔ آسمان پر باریک سی گرد و غبار کی چادر تنی ہوئی تھی۔ ابابیلیں قینچیوں کی طرح ہوا کو کترتی سپاٹے بھر رہی تھیں[2]"

اور:

"لمبے چوڑے شامیانے کی دن بھر مرمّت ہُوا کرتی۔ درگاہ تازہ قلعی کے بعد سفید بُراق ہوجاتی تھی جیسا کسی نے بہت سا سفید مارکین کھول کے اونچا نیچا ڈال دیا ہے[3]"

شام کی اُداسی دو ہی دو حرفی جملوں میں نمایاں ہوجاتی ہے اور قاری کو بھی اپنی لپیٹ میں لیتی معلوم ہوتی ہے۔ عصمت نے درگاہ کے سفید براق حسن کا نقشہ ایک تشبیہ میں نمایاں کر دیا ہے ـــــ عصمت اس اعتبار سے بے مثال ہیں کہ انھیں الفاظ میں MINIATURE PAINTINGS بنانے میں یدِطولیٰ حاصل ہے۔

اس ناولٹ میں معنی خیز اور فکر انگیز جملے، جو عصمت کے زندگی بھر کے غور و فکر، مطالعات، تجربات اور مشاہدات کا حاصل ہیں، جا بجا ملتے ہیں۔ قاری اکثر اوقات انھیں پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہے، ذرا رُک کے تھم کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایسی تحریر حساس اور باذوق قاری کے قلب و ذہن پر اپنی مستقل چھاپ چھوڑ جاتی ہے ـــــ پھر یہاں وہاں ان کی تحریر شعریت میں ڈوبی ہوئی ملتی ہے جو بہار دے جاتی ہے اور دل و دماغ معطر ہو جاتے ہیں۔ ہر دو انواع کے چند نمونے پیش ہیں:

- "بتیاں اُکسا کر لالٹینیں گھر کے کونے کونے میں پہنچا دی جاتیں اور اندھیروں میں کھوئے ہوئے در و دیوار پھر لوٹ آتے۔" (ص ۳)
- "پھر چوکیدار سیڑھی چڑھا کر صدر دروازے کی چوکور بتی جلا دیتا۔ پودے ایکدم جھجک کر تاریکی میں کھسک جاتے۔" (ص ۴)
- "دیوانے بھی اپنی دُنیا کے شہنشاہ ہوتے ہیں۔ معاذاللہ کیا غرور تھا بُوا کو اپنے تئیں۔ شاہوں کے

---

[1] [2] [3] عصمت چغتائی "دل کی دُنیا" روہتاس بکس۔ لاہور۔ ص ۲۸ ، ۷۰

شاہ اُن کے قدم لیتے تھے۔ ان کی ایک مسکراہٹ پر مٹے دھرے تھے۔ ایسے معرکے کا چاہنے والا مل جائے تو ہوش و خرد کی دُنیا کو کیوں نہ لات مار دے انسان؟" (ص ۳۴)

- "خالہ کا رنگ نکھر آتا اور پھولوں بھری بالیاں گالوں کو چومتیں۔ سب کو ہنستا دیکھ کر شبیر ماموں کی آنکھوں میں بھی موتی بھر جاتے۔ بے رونق ہونٹ جاگ پڑتے۔" (ص ۵)
- "وہ مجھاتے اور خالہ مجھتیں۔ دونوں کی آنکھیں جھکی رہتیں۔ چہرے اجنبی بنے رہتے۔ کبھی لمحہ بھر کو آنکھیں جُڑ جاتیں۔ تو ہمارے دلوں میں بے مجھے بوجھے ہل چل سی مچ جاتی۔ جیسے آسمان پر رنگ برنگی پتنگوں میں پیچ پڑ گئے ہوں۔" (ص ۵۳)
- "ہر عورت میں کہیں نہ کہیں منتری جان چھپی ہوتی ہے اور موقع پاکر۔۔۔" (ص ۶۸)
- "بھول جانے میں بڑے فائدے ہیں ضمیر ملامت نہیں کرتا۔" (ص ۷۶)
- "بچپن کسی کا ماتم نہیں کرتا۔ انھیں گھسٹتا چھوڑ کر ہم آگے بڑھ گئے۔" (ص ۴۶)
- "اتنا گھر جھاڑا لو پچھا گیا کہ ہم خود اپنے گھر میں مہمان سے لگنے لگے۔" (ص ۳۸)

اور ایسے نمونے تو جواہر ریزوں کی طرح جا بجا بکھرے ملتے ہیں۔

طنز و مزاح عصمت کے فن میں یوں رچا بسا ملتا ہے کہ وہ کسی شعوری کوشش کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتا — یہ سعادت خداداد ہے۔ اس لئے ان کے طنز و مزاح میں بیساختگی اور برجستگی ہے۔ آمد ہے۔ طنز کا تاثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے، جو قاری کے ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:

- "ایک طرح سے میاں نے میم سوتن لا کر اُن کی عزّت افزائی کی تھی۔ کوئی دھوبن یا چمارن بھی ڈال سکتے تھے۔" (ص ۶)
- "کوا بولتا تو دم نکل جاتا۔ اب آنے والا ہے کوئی مہمان۔ ہمارے گھر روز ہی کوا بولا کرتا۔ کبھی ددھیال والے چلے آ رہے ہیں۔ تو پلڑا برابر کرنے کے لئے ننھیال والے کیوں چوکتے۔" (ص ۴۱)
- "ابا کو پارٹی پالیٹکس میں پڑنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ کماتے تھے اماں خرچ کرتی تھیں۔ بالکل وہی پوزیشن تھی جو آج کل امریکہ کی ہے۔ اُن کے سب ہی مسکہ لگاتے تھے۔" (ص ۴۲)
- "کسی کی طرف اشارہ ہو تو خدا کی پھٹکار۔ ویسے اگر کہیں پانی مرتا ہو تو وہ کیا کریں۔" (ص ۵۴)
- "اگر قیس کو قبلہ حکیم صاحب کی تین خوراکیں دی جاتیں تو یقیناً وہ مجنوں نہ بن پاتا۔ نہ اس میں صحرا نوردی کا دم رہتا نہ لیلیٰ لیلیٰ پکارنے کی کلیجہ میں طاقت رہ جاتی۔ حضرت عشق چوکڑی بھول جاتے۔" (ص ۴۳)

آخر میں عصمت کی تشبیہات کا ذکر ضروری ہے کہ وہ ان کے فن کا اساسی جزو ہیں۔ ان کی تشبیہات عام طور پر پیش پا افتادہ ہوتی ہیں اور ان میں شعریت اور پروازِ تخیل کم ہی ملتی ہے۔ مگر ان کا حسن ان کی موزونیت اور معنویت میں ہے اور وہ اپنے موضوع میں ایسے فٹ بیٹھتی ہیں جیسے انگشت میں انگشتانہ یا دست میں دستانہ۔ اور اسی میں تشبیہ کے حسن کا راز مضمر ہوتا ہے۔

- "چچا میاں سرپٹ دروازے کی طرف ہنستے ہوئے جا رہے تھے جیسے انھیں جوتیاں نہیں بالوشاہیاں مل گئی ہوں۔" (ص ۶۹)
- "شکاری کتوں میں گھری ہوئی ہرنی کی طرح وہ سر بیرے لرزنے لگیں۔" (ص ۶۳)
- "وہ ان کی عزیز از جان بیٹی قدسیہ بانو نہیں تھی۔ چوٹ کھائی شیرنی تھی کہ پھن کچلی ناگن۔" (ص ۶۳)
- "اس لئے میم کے سامنے کتے کی طرح دم ہلاتے ہیں۔" (ص ۶۳)
- "نانی بیوی ان کی تاک میں ایسے بیٹھی تھیں جیسے چوہے کے لئے بلی۔" (ص ۵۸)

ان تشبیہات کی خصوصیت ان کی موزونیت ہے کہ یہ اپنے مخصوص سیاق و سباق میں چمکنے لگتی ہیں۔

یہ ایک طرح سے عصمت کی زبان کے کچھ اجزائے ترکیبی ہیں جنھوں نے اس ناولٹ کو ضیا بخشی ہے۔ ـــــ مگر اس سے ہٹ کر انھیں زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے جس کا ذکر ذرا تفصیل سے ان کے ناول "ٹیڑھی لکیر" کے تجزیاتی مطالعہ کے تحت کیا گیا ہے۔

● تھیم:

یہ ضروری نہیں کہ کسی ناولٹ کا ایک ہی تھیم یا مرکزی خیال ہو۔ اہمیت کے اعتبار سے خیالات ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور وہ سب مربوط ہو کر مجموعی طور پر ناولٹ کا تھیم بن سکتے ہیں یا ایک مرکزی تھیم کے ساتھ دیگر ضمنی تھیم ہو سکتے ہیں۔ مقیاس یہ ہے کہ ان کا تعین ان کی اہمیت کی نسبت سے ہو۔ اس ناولٹ کا اساسی تھیم اس کے عنوان "دل کی دنیا" کے تعلق سے "محبت" ہے یعنی مجھو چچا کی قدسیہ خالہ سے محبت، جس کا ذکر ناولٹ کے اختتامیہ حصہ میں رفیعہ حسن نے کیا ہے۔ مجھو چچا نے قدسیہ سے جی جان سے محبت کی اور ٹھکرائے جانے کے باوصف اسے ثابت قدمی اور پامردی سے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر آخری دم تک نبھایا ـــــ دوسرے، شادی بیاہ کی رسوم و قیود سے انحراف اور "فری لو" یا "آزاد محبت" کے نظریہ کی تبلیغ و ترویج، جس کی پیروی قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں نے کی اور جن کے نقشِ قدم پر ان کی بیٹی رفیعہ حسن چل نکلی ـــــ تیسرے، توہمات کی شکست و ریخت جس کا سرچشمہ بوا اور ربالے میاں ہیں اور جس کا شکار اماں، نانی بی اور دادی بی ہیں۔ یہ ناولٹ ان تین بنیادی خیالات یا نظریات پر مبنی ہے جن کا ذکر متعلقہ کرداروں کے تحت تفصیل سے کیا گیا ہے۔

خیالات لکھنے والے کے ذہن کی چھلنی سے چھن کر نوکِ قلم پر آتے ہیں اور صفحۂ قرطاس پر بکھر کر جی اُٹھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مصنّف کی شخصیت کی جھلک کم و بیش اُس کی تحریر کے آئینے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کی نمائندہ مثال عصمت کا یہ ناولٹ ہے جو اُن کے عقائد اور نظریات اور جذبات و احساسات کی بطریق احسن ترجمانی کرتا ہے۔ توہمات کی شکست ریخت اور "آزاد محبت" کے نظریے کی ترویج عصمت کی سائیکی کا حصہ ہیں ان کی نجی زندگی اور ادب پر ایک سرسری سی نظر بھی ڈالیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے ـــــ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک اس ناولٹ کو ان کے دیگر ناولوں پر فوقیت حاصل ہے۔

سماجی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے ہٹ کر مختصراً اس ناولٹ کی ادبی حیثیت پر نظر ڈالیں تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر دلچسپ اور جاذب ہونا اور از اوّل تا آخر قاری کی توجّہ کو باندھے رکھنے کی صلاحیت رکھنا ہی کسی ناولٹ کا بنیادی مقصد ہو تو یہ ناولٹ فی الواقع عصمت کے دیگر ناولوں سے بہتر اور برتر ہے۔ اُنھوں نے جو جزئیات، واقعات اور کیفیات پیش کی ہیں وہ بلاشبہ دلچسپ اور جاذب ہیں۔ بوا اور بالے میاں کی رنگین رفاقت اور اس سے متعلقہ واقعات نے ایک ماورائی اور غیر ارضی فضا پیدا کر دی ہے اور قاری اس کے سحر کی بھول بھلیوں میں کھو سا جاتا ہے ـــــ قدسیہ خالہ اور شبیر ماموں کا معاشقہ جس طرح خوشبوئیں بکھیرتا، دلوں کو اپنی نرم گرم آنچ سے گرماتا، احساسات پر دھار لگاتا آہستہ آہستہ پروان چڑھتا ہے وہ مسرت زا اور رُوح افزا ہے ـــــ پھوپھی جان کی کثیر الجہات، رنگین، پُر تضاد مگر دلچسپ شخصیت بے اختیار دل کو چھو لیتی ہے۔ اماں، دادی بیوی، نانی بیوی، تمام عمر رسیدہ عورتوں کے کردار اپنے اپنے مقام پر موزوں و مناسب ہیں۔ غرضیکہ ہر کردار کی اپنی اپنی خصوصی پہچان ہے اور ہم ان سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ اور پھر عصمت نے آخر میں جس خوبصورتی اور صفائی سے ناولٹ کے تانے بانے کو رقیعہ کے توسط سے سمیٹنے کی کوشش کی ہے وہ قابلِ داد ہے۔

عصمت کے تمام ناولوں میں شاید یہ واحد ناول ہے جس میں انھوں نے اس کے مُعیّنہ چوکھٹے سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ گویا اس میں کوئی چیز فالتو اور فاضل معلوم نہیں ہوتی۔ ہر واقعہ اور ہر جزو اپنے موضوع سے جڑے ملتے ہیں۔ گویا ناولٹ میں ان کے افسانوں کی طرح ربط، نظم اور ضبط ہے جو اس کے مجموعی تاثر اور ادبی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔

مگر اس اسّی صفحے کے مختصر سے ناولٹ میں بھی ان کے دیگر ناولوں کی طرح جھول اور رخنے موجود ہیں، جو ان کی تغافل پسندی اور عجلت پسندی کی دین ہیں اور جو باریک بین اور باشعور قاری کو ناگوار گذرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بوا کے تعلق سے وہ لکھتی ہیں:

"دوسری خوراک کے بعد ان کا گلا بیٹھ گیا۔ اللہ اب وہ کبھی نیم کے پیڑ میں جھولا ڈال کر ساون اور

بکریاں نہیں گائیں گی۔" (ص ۴۴۴)

مگر دو صفحے آگے چل کر ہم پڑھتے ہیں :

"بوّا ایک دم مری سی آواز میں گانے لگیں :

"ہو راجہ جی، سوتن کے لمبے لمبے کیس

اُلجھ مت رہنا۔ ہو راجہ جی۔" (ص ۴۴۶)

کیونکہ یہاں عصمت کو بوا کو گوانا مقصود تھا اس لئے گوا دیا۔ مگر ساتھ ہی مصلحتاً "مری سی آواز میں" کے الفاظ ایزاد کر دیئے —— یہ صریحاً ایک لغزش ہے۔

○ عصمت نے مجھو چچا کے تعلق سے ناولٹ کے آخری دو صفحات میں جن گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے وہ بخوبی نہیں سلجھیں۔ مثلاً یہ بات گلے سے نہیں اُترتی کہ قدسیہ رات کو گھر سے ننگے پیر نکل بھاگیں اور مجھو چچا ان کی جوتیاں جیب میں لئے لئے پھرے۔ یہ بے تکی سی بات لگتی ہے۔

○ یہ خیال آنا ناگزیر ہے کہ اتنے برس تک قدسیہ اور شبیر ماموں کے گھر والوں نے ان کی تلاش کیوں نہ کی۔ آخر کونسی مشکلات اُن کی راہ میں حائل تھیں۔ خاص طور پر جب مجھو چچا ان دونوں سے رابطہ بنائے ہوئے تھے۔ یہ بات بھی بعید از فہم لگتی ہے۔

○ ناولٹ کے اختتامیہ چند صفحات میں عصمت مصلحانہ اور مبلغانہ انداز اختیار کرلیتی ہیں۔ جس سے ناولٹ کی ادبی حیثیت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ رفیعہ حسن کی زبان سے ذرا اونچے سُروں میں کہلوایا ہے وہ دھیمے اور متین انداز میں ناولٹ کے وجود میں سے اُبھرنا چاہیئے تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عصمت نے اس فروگذاشت کی جانب توجہ نہیں دی۔

○ راقم السطور کی نظروں میں بوا اور رابے میاں کے کرداروں کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے جبکہ بوا محض ایک فاتر العقل مگر بکار خود ہوشیار قسم کی عورت ہیں اور رابے میاں فقط ایک خیالی ہستی مگر یہ دونوں ناولٹ کے پہلے نصف حصے پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ بات ذرا غیر متوازن سی لگتی ہے۔

سقائم اور بھی ہیں مگر اسی صفحات کے اس مختصر سے ناولٹ میں مندرجہ بالا خامیوں کا ہونا بھی ادبی اعتبار سے کچھ کم معیوب نہیں —— مگر اس ناولٹ کو جو عناصر قابلِ اعتنا اور قابلِ توجہ قرار دیتے ہیں وہ اس کی جاذبیت اور دلکشی ہے۔ بھرپور کردار نگاری ہے۔ پُرکشش اور موزوں جزئیات ہیں۔ زبان و بیان کا سحر ہے اور یہ سب مل کر قاری کی توجہ کو باندھے رکھتے ہیں اور اس کی کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔

اس ناولٹ کو عصمت کے آدھے درجن سے بھی زائد ناولوں میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

●

○ ناولٹ

ضدّی

"ضدّی" عصمت کا پہلا ناولٹ ہے جو انھوں نے ۱۹۴۰ - ۴۱ء میں لکھا۔ مختصر طور پر اس کا پلاٹ یہ ہے کہ پورن سنگھ اس کا مرکزی کردار، ایک امیر زمین دار کا نوجوان بیٹا ہے۔ اور آشا ایک غریب قبول صورت لڑکی، اُس کے ہاں گھر کے اُوپر کے کام کاج پر مامور ہے۔ پورن سنگھ اس سے محبّت کرنے لگتا ہے۔ اور آشا بھی خاموشی سے اُس کی محبّت کا جواب اثبات میں دیتی ہے —— پورن سنگھ کے ہاں ایک نوجوان لڑکی "چمکی" بھی کام کرتی ہے، جو دل ہی دل میں پورن سنگھ کو چاہتی ہے مگر وہ اس کی جانب ملتفت نہیں ہوتا۔ اور یوں "چمکی" رقابت کی آگ میں جلنے لگتی ہے —— ایک روز جب آشا پورن سنگھ کے کمرے کے گلدان میں اُس کے مَن پسند سُرخ رنگ کے پھول سجا کر کمرے کو مہکا دیتی ہے تو چمکی سب کی نظر بچا کر ان کو موری کے پاس پھینک دیتی ہے۔ پورن سنگھ انھیں وہاں پڑا دیکھتا ہے تو چپکے سے اُٹھا کر احتیاط سے اپنی میز کی دراز میں رکھ دیتا ہے۔ اور یہ پھول اب اس کی آشا سے محبّت کا سمبل یا نشانی بن جاتے ہیں —— پورن سنگھ کی محبت تیزی سے پروان چڑھتی ہے اور دونوں ایک دوسرے میں کھو جاتے ہیں —— ایک روز وہاں ہاٹ لگتا ہے تو آشا اُسے چمکی اور اپنے گاؤں کے ایک لڑکے رنجی کے ساتھ دیکھنے جاتی ہے۔ اتّفاق سے پورن سنگھ بھی گھوڑے پر سوار میلہ دیکھنے پہنچ جاتا ہے اور وہاں آشا کو رنجی کے ساتھ کھاتے پیتے، ہنستے بولتے دیکھتا ہے تو جذبۂ رقابت سے تلملاتا اور پیچ و تاب کھاتا آشا کو بہت بُرا بھلا کہتا ہے اور آشا سے برملا اعتراف محبّت کا تقاضہ کرتا ہے۔ آشا شرم و حیا کی ماری اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی محبّت کا اظہار کرتی ہے —— پورن سنگھ آشا سے شادی کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ مگر اس کے گھر والے سخت مزاحمت کرتے ہوئے آشا کی غریبی اور نیچ ذات کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر پورن سنگھ ان کی ایک نہیں سُنتا کہ وہ غریبی امیری اور ذات پات کی تفریق کا قائل نہیں۔ بہرحال وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ آشا کو پورن سنگھ کی بہن کملا کی سُسرال بھیج دیا جائے تاکہ وہ منظر سے دُور رہے اور پورن سنگھ اُسے بھول جائے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ باہمی صلاح مشورہ سے اس کی شادی کملا کی نند شانتا سے طے کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پورن سنگھ بہت بحث مباحثہ کے بعد اپنی ماں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے نیم دلی سے رضامند ہو جاتا ہے —— برات بڑی دھوم دھام سے چڑھتی

ہے۔ شادی کے شامیانے میں جہاں رسُوم ادا کی جارہی ہیں آشا اور پورن سنگھ ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں۔ سوئے اتفاق سے شامیانے کو آگ لگ جاتی ہے تو بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ سب اپنی اپنی جان بچا کر اِدھر اُدھر بھاگ نکلتے ہیں۔ پورن سنگھ آشا کو دیکھ کر شانتا کو چھوڑ، اُسے اپنی باہوں میں لے لیتا ہے۔ مگر تھوڑی دُور چل کر اُسے خیال آتا ہے کہ وہ ذرا اپنے گھر والوں کو بھی دیکھ لے کہ آیا وہ محفوظ ہیں۔ وہ آشا کو ایک جگہ چھوڑ کر اسے یہ کہہ کر چلا جاتا ہے کہ وہ انھیں مل کر دَم بھر میں لوٹ آئے گا۔ مگر اس کے جاتے ہی شام لال، جو کملا کے شوہر کے پاس منشی کے طور پر ملازم ہے، وہاں وارد ہوتا ہے۔ وہ آشا کو اپنی شیریں کلامی اور چرب زبانی سے اس بات پر رضامند کرلیتا ہے کہ وہ پورن سنگھ کی واپسی کا انتظار کئے بغیر اپنے گاؤں واپس چلی جائے اور پورن سنگھ کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نکل جائے تاکہ پورن سنگھ کو اپنی جائیداد سے محرُوم ہو کر در بدر کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں اور وہ شانتا کے ساتھ سُکھ چین کی ازدواجی زندگی بسر کرسکے۔ اس طرح دو خاندان تباہ و برباد ہونے سے بچ جائیں گے اور آشا خود بھی سماج کی نظروں میں بدکار اور فاحشہ ٹھہرائی جانے سے بچ جائے گی ـــــ آشا کو شام لال کی بات بھا جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے اپنے گاؤں روانہ ہو جاتی ہے ـــــ پُورن سنگھ واپس آتا ہے تو آشا کو وہاں نہ پاکر ہوش و حواس کھو دیتا ہے اور جب وہ ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتی تو دل شکستہ ہو کر بیمار پڑ جاتا ہے اور ضد میں اپنی بیاہتا شانتا سے جسمانی رشتہ قائم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ شانتا کے لئے یہ بڑی کرب و عذاب کی بات ہے اور وہ لمبے عرصہ تک انتظار کرنے کے بعد پُورن سنگھ کی بھابی کے بھائی مہیش کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے، جو ایک تنومند نوجوان ہے۔ وہ پُورن سنگھ کی موجودگی میں ہی آکر گھنٹوں شانتا کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ یہ بات اس کے گھر والوں کو سخت ناگوار گذرتی ہے کہ اس سے ان کی خاندانی عزّت اور وقار پر حرف آتا ہے۔ پُورن سنگھ کے بڑے بھائی جب اس کی توجّہ اس بات کی طرف دلاتے ہیں تو وہ بے ساختہ جواب دیتا ہے کہ شانتا اور مہیش اگر محبّت کرنا چاہتے ہیں تو بصد شوق کریں۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ مَیں شانتا سے محبّت کرنے سے قاصر ہُوں، کیونکہ میرے دل میں محبّت کے جذبات اور احساسات کبھی کے معدُوم ہو چکے ہیں اور اب تو مَیں محض مٹّی کا ایک ڈھیلہ ہُوں ـــــ پُورن سنگھ کی حالت بگڑتی چلی جاتی ہے اور اس کے گھر والے متفکّر ہو کر فیصلہ کرتے ہیں کہ آشا کو اس کے گاؤں سے بلا کر پورن سنگھ کی تیمارداری پر مامور کر دیا جائے تو شاید اسے قلبی تسکین ملے اور وہ رو بصحت ہو جائے۔ مگر یہ ایک ایسا قدم تھا جو اگر بر وقت اُٹھایا جاتا تو شاید کارگر ہو جاتا مگر اب تو بہت دیر ہو چکی تھی ـــــ آشا آتی ہے تو پُورن سنگھ کو اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑا حیران حیران نظروں سے اپنے جسم پر نظر ڈالتے دیکھتی ہے، جو اب ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گیا ہے۔ وہ لپک کر اُسے اپنی باہوں میں جکڑ لیتی ہے، اور پُورن سنگھ بھی اس سے فرطِ شوق میں لپٹ جاتا ہے۔ اب وہ دونوں بستر پر ہیں۔ آشا اُسے پُوری طاقت سے بھینچ لیتی ہے اور اس کے سینے میں سر دے کر حرارت ڈھونڈتی ہے۔ مگر اچانک ایک زبردست جھٹکے

کے ساتھ پورن سنگھ دَم توڑ دیتا ہے۔ آشا وحشت زدہ ہو کر میز پر رکھی سینے پر مالش کرنے کی دوا اپنے حلق میں اُنڈیل لیتی ہے اور لیمپ سے مٹی کا تیل لے کر بستر پر چھڑکتی ہے۔ میز کی دراز کھولتی ہے تو وہاں سُرخ رنگ کے پھول پڑے دیکھتی ہے جو عرصہ ہوا پُورن سنگھ نے اس کی محبت کی نشانی کے طور پر سنبھال کر رکھے تھے۔ انھیں وہ ایک ایک کر کے پُورن سنگھ کے مُردہ جسم پر چُن دیتی ہے اور اس کی آغوش میں لیٹ کر دیا سلائی سے آگ لگا دیتی ہے اور اس طرح دونوں محبت کی قربان گاہ پر اپنی جانوں کی بَلی چڑھا دیتے ہیں۔

●

○ناول

معصومہ

بیگم گردشِ ایّام کی ماری ہے۔ مُلک کے بٹوارے کے بعد اس کا شوہر سب قیمتی اثاثہ سمیٹ کر اپنے دو بڑے بیٹوں کے ساتھ پاکستان ہجرت کر جاتا ہے اور بیگم اور چار چھوٹے بچوں کو یہیں چھوڑ جاتا ہے۔ بیگم کو یقین تھا کہ کچھ عرصہ بعد وُہ آکر اُن سب کو پاکستان لے جائے گا۔ مگر یہ اُمید خوش فہمی ثابت ہوتی ہے کہ میاں اس کی خیروعافیت تک نہیں پوچھتا —— جب بیگم کے پاس بچا کھچا اثاثہ ختم ہونے لگتا ہے تو وُہ حیدرآباد سے بمبئی آجاتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں زندہ رہنے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کی کوئی سبیل نکل آئے گی اور زندگی اپنی ڈگر پر رواں ہو جائے گی —— بمبئی میں اس کا رابطہ احسان میاں سے ہوتا ہے، جس سے اُس کی پہلے سے جان پہچان تھی۔ وہ کچھ عرصہ تو روپے پیسے سے بیگم کی مدد کرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور بے سہارا بیگم سخت مالی بُحران کا شکار ہو جاتی ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا جاتا ہے —— احسان میاں ایک بدطینت، بدشعار انسان ہے، جو یُوں تو فلم پروڈیوسر ہے مگر ساتھ ساتھ رنڈیوں کی دلالی بھی کرتا ہے اور بیگم اس صُورتِ حال سے واقف نہیں۔ وہ بیگم کو بظاہر اُس کے بہی خواہ کے طور پر ترغیب دیتا ہے کہ تنگدستی سے مُستقل طور پر چھٹکارا پانے کے لئے وُہ اپنی سب سے بڑی بیٹی معصُومہ کو گناہ کی راہ پر ڈال دے۔ اُس پر بیگم کا فوری ردِّ عمل تلخ و تُرش ہوتا ہے مگر غور و فکر کے بعد اپنی زبوں حالی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے وہ حامی بھر لیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ احسان میاں بیگم کا رابطہ اپنے دوست اور مُربّی احمد بھائی سے کر دیتا ہے، جو ایک ادھیڑ عُمر معمولی وضع قطع کا رئیس ہے۔ اس کے کئی اسٹور ہیں اور وُہ فلمی دُنیا سے بھی وابستہ ہے۔ نتیجہ یہ کہ معاملہ طے ہو جاتا ہے —— احسان میاں اپنی کمیشن وضع کر کے بقیہ رقم بیگم کے حوالہ کر دیتا ہے۔

معصُومہ ابھی ایک معصُوم، نوخیز، الھڑ سی لڑکی ہے۔ اور وہ انسانی زندگی کے جنسی پہلو سے بے خبر سی ہے۔ جب تنہائی میں احمد بھائی اُس سے ملتا ہے تو وہ سخت مزاحمت کرتی ہے۔ احمد بھائی اُسے رام کرنے کے لئے زور زبردستی سے کام لیتا ہے تو معصُومہ مار مار کر اُس کا بھُرکس نکال دیتی ہے —— بیگم کو اِس بات کا سخت صدمہ ہوتا ہے کہ اس کے سب منصُوبے دھرے رہ جاتے ہیں اور پھر سے اُس کے مالی بُحران میں ڈوب جانے

کے آثار پیدا ہوجاتے ہیں۔ بہر حال بصد مشکل معاملہ سرے چڑھ جاتا ہے اور معصومہ اپنی معصومیت کھو کر نیلوفر بن جاتی ہے ـــــــ مگر احمد بھائی سے اُس کی پٹتی نہیں، گو وہ اسے لبھانے اور اپنی جانب راغب کرنے کیلئے بے دریغ روپیہ لٹاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو احمد بھائی ادھیڑ عمر، گھنا اور بد وضع آدمی ہے۔ پھر ان کی طبائع کا تضاد بھی ان کی قربت کی راہ میں حائل ہے۔ گویا ان میں ذہنی اور جسمانی موافقت نہیں۔ بہ ایں وجہ ان کے تعلقات ناخوشگوار رہتے ہیں۔

اِسی دوران نیلوفر کا معاشقہ اپنے ایک پڑوسی ہم عمر لڑکے منوہر سے چل نکلتا ہے۔ وہ ایک حیثیت درُست زندگی سے بھرپور لڑکا ہے۔ نیلوفر بیگم کی آنکھ بچا کر گاہے گاہے اُس کے ساتھ گھومنے نکل جاتی ہے۔ بیگم کی عقابی نگاہیں اس اُمنڈتے ہوئے خطرے کو بھانپ لیتی ہیں۔ وہ نیلوفر کی سرزنش کرتی ہے مگر وہ سخت مزاحمت کرتی ہے۔ آخر بیگم کے بہت سمجھانے بجھانے پر کنبے کے وسیع مفاد کے مدِّ نظر وہ راہ پر آجاتی ہے ـــــــ احمد بھائی آہستہ آہستہ نیلوفر سے اُوب جاتا ہے۔ اُدھر اس کی گھریلو زندگی میں بھی انتشار پیدا ہونے لگتا ہے۔ بیوی سے ناچاقی رہنے لگتی ہے۔ بچّے نافرمانبردار ہوجاتے ہیں۔ کاروبار میں گھاٹا پڑ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ گذارے کے لئے ہر ماہ کی مقررہ لگی بندھی رقم دینی بند کر دیتا ہے۔ اور نیلوفر سے اس کے تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں۔ احسان میاں شاطر اور موقع پرست ہے۔ وہ آؤ دیکھتا ہے نہ تاؤ، نیلوفر کا رابطہ سُورج مَل سے کرا دیتا ہے۔ اِس حکمتِ عملی سے ایک تو اس کی کمیشن کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور دُوسرے بیگم اُس کی احسان مند اور شکر گذار بنی رہتی ہے۔

احسان میاں بیگم کی بڑی بیٹی معصومہ کو گناہ کی راہ پر ڈالنے کے بعد بیگم کو اُن کی دُوسری بیٹی زبیدہ کو بھی اُسی راہ پر ڈالنے کی ترغیب دیتا ہے ـــــــ مگر قدرت اُسے بخشتی نہیں۔ اس کی فلمی بیوی ثمن اس کے معاشقے سے جل بھُن کر اس کے منہ بولے بھائی مظہر کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ اس کی پہلی بیوی بھی اُسے مُنہ نہیں لگاتی۔ اور یُوں وہ بیگم کے دستر خوان سے گرے پڑے ٹکڑوں پر گذر بسر کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ مگر اُس کی دُم روایتی طور پر اب بھی ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ اس میں لاف زنی اور کذب بیانی کی خُو بُو برقرار ہے مگر اُس کی باتوں پر کوئی کان نہیں دھرتا کہ وہ سب کا دھتکارا اور پھٹکارا ہُوا انسان ہے۔

سُورج مَل ایک تعلیم یافتہ، شادی شدہ، بال بچّوں والا، خاندانی رئیس ہے۔ مگر مُنہ کا مزا بدلنے کے لئے دو تین داشتائیں رکھنا بھی اُس کا معمول ہے۔ یہ عورتیں اس کے کاروبار میں بھی مُمد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ وہ ان کے نام سے کانٹریکٹ لیتا ہے، جس سے اُسے لاکھوں کی ٹیکس میں بچت ہوتی ہے ـــــــ سُورج مَل کچھ عرصہ تو نیلوفر پر فریفتہ رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ اُس کے تیور دیکھ کر وہ اُس سے اُوب جاتا ہے۔ وہ احسان میاں کو نیلوفر کے نام سے خاصی رقم فلم بنانے کے لئے دیتا ہے۔ نیلوفر کیونکہ پڑھی لکھی، ذہین اور ہوشیار ہے۔ وہ سمجھ جاتی ہے کہ

درحقیقت قانون کی نظروں میں وہی کمپنی کی مالکہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب فلم کے مہُورت پر سورج مل اپنی بیوی کے ساتھ پوُجا کرنے بیٹھتا ہے تو نیلوفر اصرار کرتی ہے کہ اس کی بیوی کی بجائے وہ اس کے ساتھ پوُجا پر بیٹھے گی۔ نیلوفر اپنی اس بے جا مداخلت سے رنگ میں بھنگ ڈال دیتی ہے۔ بالآخر احسان میاں موقع کی نزاکت کو بھانپ کر نیلوفر کو سختی سے چپ کرادیتا ہے ـــــ پھر نیلوفر انُسے ماہوار خرچ کے لئے دی گئی رقوم کی رسیدوں پر دستخط کرنے سے انکار کردیتی ہے تو سوُرج مل اسے اپنی تحقیر سمجھتا ہے۔ اس طرح سوُرج مل نیلوفر کی خودسری اور ہیکڑی سے برگشتہ ہوجاتا ہے ـــــ پھر وہ یوُں بھی نت نئی داشتاؤں کی ٹوہ میں رہتا ہے۔ پنجاب سے جب ایک نوخیز شگفتہ نام کی حسینہ آتی ہے تو سوُرج مل اُس پر فریفتہ ہوجاتا ہے۔ اور نیلوفر سے مُنہ موڑ لیتا ہے ـــــ چند روز کے وقفے کے بعد ایک رات جب نیلوفر اس کی جانب سے ناُمید ہوچکی تھی، سوُرج مل آتا ہے تو وہ بہت خوش دکھائی دیتا ہے۔ وہ نیلوفر کو زیورات سے لاددیتا ہے۔ خود پیتا ہے اور اُسے بھی پلاتا ہے اور اُس سے انجانے میں ایک دستاویز پر دستخط کرالیتا ہے اور یوُں جو کمپنی نیلوفر کے نام تھی وُہ اب اس کے نام پر منتقل ہوجاتی ہے ـــــ رات شراب کے نشے میں مخموُر نیلوفر سچ مچ کر سوُرج مل کے ساتھ گھر سے جاتی ہے مگر اگلی صبح وہ خود کو پوُنا کے ایک ہوٹل میں بیڈ پر مادرزاد ننگی پاتی ہے ـــــ وہ وحشت زدہ ہوجاتی ہے۔ ہوٹل کے منیجر اور بیرے سے پوُچھ تاچھ کرنے پر اُسے پتہ چلتا ہے کہ رات گئے اسے ایک ٹیکسی ڈرائیور مدہوشی کی حالت میں اُٹھا کر لایا تھا۔ وہ رات بھر اُس کے ساتھ رہا اور صبح سویرے کمرے کا کرایہ ادا کرکے چلا گیا۔ نیلوفر کے پاؤں تلے سے زمین کھسک جاتی ہے اور اُسے اپنی بے بسی اور سوُرج مل کی بدخصلتی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

نیلوفر اس ہوٹل کے مجہول سے منیجر کے پاس تین روز رہتی ہے اور شراب پی پی کر اس کی محبت جھیلتی ہے ـــــ جب راجہ صاحب، جو سوُرج مل اور نیلوفر کے کوائف سے واقف ہیں، وارد ہوتے ہیں تو نیلوفر منیجر کو وہاں سے بھاگ نکلنے کی ترغیب دیتی ہے۔ مگر وہ پست ہمّت پس وپیش میں پڑجاتا ہے۔ مگر جب راجہ صاحب اُسے ہوٹل سے دست بردار ہونے کے عوض دس ہزار روپے کی پیش کش کرتے ہیں تو وُہ گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور نیلوفر کو راجہ صاحب کی آغوش میں جانے کے سوا کوئی چارہ دکھائی نہیں دیتا۔

راجہ صاحب شراب و شاہد کے رَسیا ہیں۔ مشاعرے منعقد کرانا اور نام ونمود کے لئے رفاہِ عام کے کام کرتے رہنا ان کے مرغوب مشاغل ہیں۔ وہ ایک بڑے صنعت کار ہیں۔ روزِ اوّل ہی وہ نیلوفر پر واضح کردیتے ہیں کہ وہ اسے اپنے کاروبار کے فروغ کے لئے استعمال کریں گے ـــــ اس رات محفلِ ناؤنوش گرم ہے۔ خوب رونق ہے اور سب چہک مہک رہے ہیں۔ راجہ صاحب، خاص طور پر ایک کرنل صاحب کی جانب متوجہ ہیں اور ان کی خاطر تواضع میں لگے ہوُئے ہیں۔ موصُوف ایک ادھیڑ عمر، گنجے، بھدّی شکل وصورت کے شخص ہیں۔

وہ سرکاری ملازمت میں ایک اونچے عہدے سے سبکدوش ہو چکے ہیں مگر اقتدار کے حلقوں میں ان کا اثر و رسوخ اب بھی برقرار ہے ــــ چونکہ راجہ صاحب ایک بڑے صنعت کار ہیں وہ چھوٹے چھوٹے دست کاروں کو، جو ان کی صنعت کے فروغ کی راہ میں رکاوٹ ہیں، سبق سکھانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ان کی مصنوعات کوالٹی میں اچھی اور قیمت میں سستی ہیں، اس لئے راجہ صاحب کا کارخانہ گھاٹے میں جا رہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ گڑبڑ کی صورت میں اگر ان پر حرف آنے کا احتمال ہو تو کرنل صاحب ان کی پُشت پناہی کریں اور انھیں ضعف نہ پہنچنے دیں ــــ رات گئے تک بلانوشی جاری رہتی ہے اور صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو نیلوفر خود کو بستر پر کرنل صاحب کے پہلو میں پاتی ہے۔ رات وہ وہاں کب اور کیسے آئی، یہ بات ذہن پر زور دینے کے باوجود اس پر نہیں کھلتی۔

اپنے منصوبے کے مطابق ایک رات راجہ صاحب باہر سے غنڈے بلوا کر دست کاروں کی جھونپڑیوں اور دوکانوں کو نذرِ آتش کرا دیتے ہیں۔ بہت خون خرابہ اور اتلافِ جان بھی ہوتا ہے۔ راجہ صاحب اس فعل کے ارتکاب سے پہلے ہی جائے واردات سے روانہ ہو جاتے ہیں تاکہ وہ قانون کی گرفت میں نہ آئیں ــــ وہ نیلوفر سے اپنا یہ منصوبہ مخفی رکھتے ہیں مگر جب وہ اس واقعہ کی تفصیلات اخبار میں پڑھتی ہے تو بھڑک اٹھتی ہے اور غم و غصّے میں راجہ صاحب کو بہت بُرا بھلا کہہ ڈالتی ہے مگر راجہ صاحب غرّا کر گھرکی دیتے ہیں تو وہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ اسے فوراً احساس ہو جاتا ہے کہ عاقبت اندیشی اور مصلحت کوشی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لب وا نہ کرے۔

نیلوفر اپنی چھوٹی بہن زبیدہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے کرتی ہے اور اس موقعہ پر سب کا کہا سنا معاف کر دیتی ہے ــــ نیلوفر اپنے خاندان کی بدنامی اور رُوسیاہی کے لئے خود کو ذمّہ دار گردانتی ہے۔ لوگ اس کے بھائی سلیم کو "رنڈی کا بھائی" کہہ کر چڑاتے ہیں۔ زبیدہ کا شوہر اُسے نیلوفر کی بدکاریوں پر طعن و تشنیع کا نشانہ بناتا ہے۔ حلیمہ کی شادی نہ ہو سکنے کا الزام بھی نیلوفر کے سر ہی مڑھا جاتا ہے ــــ احمد بھائی، سورج مل اور راجہ صاحب اپنے اپنے مخصوص حلقوں میں عزّت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں کہ شرافت کا لبادہ اوڑھے وہ رفاہِ عام کے کاموں سے جُڑے ہوئے ہیں۔ مگر نیلوفر سماج کی بلند پیشانی پر بدنما داغ تصوّر کی جاتی ہے ــــ وہ کبھی کبھی شام کو غروبِ آفتاب کا منظر دیکھتے ہوئے دُور اُفق میں اپنے بچپن اور جوانی کو ڈھونڈتی دکھائی دیتی ہے مگر اسے سُراغ نہیں ملتا۔

کتابیات

افسانوں کے مجموعے

بُنیادی ماخذ:

شمار	نام کتاب	مُصنّف	ناشر	سن اشاعت
۱۔	چھوئی موئی سے	عصمت چغتائی	روہتاس بکس، لاہور	۱۹۹۲ء
۲۔	بڑی شرم کی بات	〃 〃	〃 〃 〃	〃
۳۔	ایک شوہر کی خاطر	〃 〃	〃 〃 〃	〃
۴۔	بدن کی خوشبو	〃 〃	〃 〃 〃	〃
۵۔	لحاف	〃 〃	〃 〃 〃	〃
۶۔	چوٹیں	〃 〃	〃 〃 〃	〃
۷۔	چڑی کی دکی	〃 〃	〃 〃 〃	〃
۸۔	دو ہاتھ	〃 〃	〃 〃 〃	〃
۹۔	ایک بات	〃 〃	〃 〃 〃	〃
۱۰۔	سوری ممّی	〃 〃	〃 〃 〃	
۱۱۔	آدھی عورت آدھا خواب	〃 〃	بیسویں صدی پبلی کیشنز، نئی دہلی	۱۹۸۶ء

ناول/ناولٹ

شمار	نام کتاب	مُصنّف	ناشر	سن اشاعت
۱۔	ضدّی	عصمت چغتائی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۱ء
۲۔	ٹیڑھی لکیر	〃 〃	نصرت پبلشرز، لکھنؤ	۱۹۹۰ء
۳۔	عجیب آدمی	〃 〃	روہتاس بکس، لاہور	۱۹۹۲ء
۴۔	معصومہ	〃 〃	〃 〃 〃	〃

شمار	نام کتاب	مصنّف	ناشر	سنِ اشاعت
۵۔	سودائی	عصمت چغتائی	روہتاس بکس، لاہور	۱۹۹۲ء
۶۔	جنگلی کبوتر	″ ″		
۷۔	دل کی دُنیا	″ ″	روہتاس بکس، لاہور	۱۹۹۲ء
۸۔	ایک قطرۂ خون	″ ″		
۹۔	باندی	″ ″		
۱۰۔	نقلی راجکمار (بچوں کا ناول)	″ ″		۱۹۹۲ء
۱۱۔	تین اناڑی (بچوں کا ناول)	″ ″	مکتبہ پیام تعلیم، نئی دہلی	

ڈرامے (مجموعہ)

شمار	نام کتاب	مصنّف	ناشر	سنِ اشاعت
۱۔	فسادی	عصمت چغتائی	روہتاس بکس، لاہور	۱۹۹۲ء

خاکے

شمار	نام کتاب	مصنّف	ناشر	سنِ اشاعت
۱۔	"دوزخی" (عظیم بیگ چغتائی)	عصمت چغتائی	اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی، دسمبر	۱۹۹۱ء
۲۔	"اسرار الحق مجاز"	″ ″	″ ″ ″ ″	″
۳۔	"میرا دوست میرا دشمن" (منٹو) (مجموعہ "منٹو شخصیت اور فن")		موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۸۰ء
۴۔	"کچھ میری یادیں" (پطرس) (مجموعہ "ایک شوہر کی خاطر")		روہتاس بکس، لاہور	۱۹۹۲ء

مضامین

شمار	نام کتاب	مصنّف	ناشر	سنِ اشاعت
۱۔	ترقی پسند ادب اور میں	عصمت چغتائی	ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی نومبر	۱۹۷۰ء
۲۔	"عصمت چغتائی کے وہ خط جو سپردِ ڈاک نہ ہو سکے"	″ ″ (خطوط)	روزنامہ "ہند سماچار" جالندھر (سنڈے ایڈیشن)	۵-۱۲-۱۹۹۳

خود نوشت سوانحی مضامین

شمار	نام کتاب	مصنّف	ناشر	سنِ اشاعت
۱۔	غبارِ کارواں	عصمت چغتائی	ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی نومبر	۱۹۷۰ء
۲۔	کاغذی ہے پیرہن	″ ″	″ ″ ″ مارچ	۱۹۷۹ء
۳۔	″ ″	″ ″	″ ″ ″ اپریل	۱۹۷۹ء
۴۔	″ ″ (تصادم)	″ ″	″ ″ ″ جون	۱۹۷۹ء

شمار	نام کتاب	مصنف	ناشر	سن اشاعت
۵۔	کاغذی ہے پیرہن (ادھوری عورت)	عصمت چغتائی	ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی	جولائی ۱۹۷۹ء
۶۔	〃 〃 〃 (پھر علی گڑھ چھوٹا)	〃	〃	اگست ۱۹۷۹ء
۷۔	〃 〃 〃 (لوہے کے چنے)	〃	〃	ستمبر ۱۹۷۹ء
۸۔	〃 〃 〃 (علی گڑھ)	〃	〃	اکتوبر ۱۹۷۹ء
۹۔	〃 〃 〃 (سوجت)	〃	〃	نومبر ۱۹۷۹ء
۱۰۔	〃 〃 〃 (اُگالدان)	〃	〃	دسمبر ۱۹۷۹ء
۱۱۔	〃 〃 〃 (اُلٹے بانس بریلی)	〃	〃	جنوری ۱۹۸۰ء
۱۲۔	〃 〃 〃 (تالے)	〃	〃	فروری ۱۹۸۰ء
۱۳۔	〃 〃 〃 (تعلیم نسواں۔ ایک وبال)	〃	〃	مارچ ۱۹۸۰ء
۱۴۔	〃 〃 〃 (جہنم)	〃	〃	اپریل ۱۹۸۰ء
۱۵۔	〃 〃 〃 (روشنی۔ روشنی۔ روشنی)	〃	〃	مئی ۱۹۸۰ء

خودنوشت

شمار	نام کتاب	مصنف	ناشر	سن اشاعت
۱۔	کاغذی ہے پیرہن	عصمت چغتائی	روہتاس بکس، لاہور	۱۹۹۲ء

رپورتاژ

شمار	نام کتاب	مصنف	ناشر	سن اشاعت
۱۔	یہاں سے وہاں تک (مجموعہ۔ بڑی شرم کی بات)	عصمت چغتائی	روہتاس بکس، لاہور	۱۹۹۲ء
۲۔	بمبئی سے بھوپال تک	عصمت چغتائی		

انٹرویوز

شمار	نام کتاب	مصنف	ناشر	سن اشاعت
۱۔	عصمت چغتائی سے گفتگو	یونس اگاسکر	اُردو ماہنامہ مکالمات دہلی	دسمبر ۱۹۹۱ء
۲۔	عصمت چغتائی سے ملاقات	جلیل باز یدپوری	〃 〃 〃	〃
۳۔	عصمت چغتائی۔ اکادمی کی ایک محفل میں	حکیم منظور۔ اشرف ساحل	ماہنامہ "شیرازہ" سری نگر جلد ۳۰ شمارہ ۱۰-۸/	
۴۔	عصمت چغتائی سے انٹرویو (مجموعہ کاغذی ہے پیرہن)	شمع افروز زیدی	روہتاس بکس، لاہور	۱۹۹۲ء

عصمت چغتائی پر مضامین

ثانوی ماخذ:

شمار	مصنف	عنوان	رسالہ	سن اشاعت
۱۔	فیض احمد فیض	عصمت چغتائی	اردو ماہنامہ "مکالمات" دہلی (عصمت چغتائی نمبر)	دسمبر ۱۹۹۱ء
۲۔	سعادت حسن منٹو	عصمت چغتائی	" " "	"
۳۔	محمد حسن عسکری	عصمت چغتائی	" " "	"
۴۔	سلمیٰ صدیقی	عصمت چغتائی کا جادو	" " "	"
۵۔	خواجہ احمد عباس	چوتھی کا جوڑا (تجزیہ)	" " "	"
۶۔	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	عصمت کے ناول اور افسانے	" " "	"
۷۔	ایس۔اے۔رحمان ثاقب	عصمت کی ناول نگاری	" " "	"
۸۔	کے۔کے کھلر	عصمت چغتائی، ٹکراؤ کی آواز	" " "	"
۹۔	ڈاکٹر سید رفیق حسین	عصمت چغتائی اور افسانوی تکنیک	" " "	"
۱۰۔	ڈاکٹر صادق	عصمت کی افسانہ نگاری	" " "	"
۱۱۔	مشرف عالم ذوقی	فن کی کسوٹی پر تجربہ کی پرکھ	" " "	"
۱۲۔	قرۃ العین حیدر	لیڈی چنگیز خاں	ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی	جنوری ۱۹۹۲ء
۱۳۔	اوپندر ناتھ اشک	"دوزخی" کی باتیں	" "	"
۱۴۔	محمد حسن	روشن خیال خاتون	" "	"
۱۵۔	شمس کنول	سماج کی محتسب	" "	"
۱۶۔	شمیم حنفی	عصمت کی معنویت	" "	"
۱۷۔	مظہر امام	عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری	" "	مئی ۱۹۸۱ء
۱۸۔	صلاح الدین احمد	مقدمہ "کلیاں" مجموعہ "فسادی"	روہتاس بکس، لاہور	۱۹۹۲ء
۱۹۔	پدما سچدیو	ذکر اس پری وش کا	سہ ماہی "سم کالین بھارتیہ ساہتیہ" نئی دہلی	اپریل۔جون ۱۹۹۵ء
۲۰۔	شمیم حنفی	عصمت کی ٹیڑھی لکیر	سہ ماہی "سوغات" بنگلور	ستمبر ۱۹۹۳ء
۲۱۔	کرشن چندر	بلا خیزی (مجموعہ "چوٹیں")	روہتاس بکس، لاہور	۱۹۹۲ء
۲۲۔		عصمت چغتائی کی وفات پر تاثرات اور متفرق مضامین	سالنامہ "بیسویں صدی" نئی دہلی	جنوری ۱۹۹۲ء
۲۳۔	م۔م۔راجندر	عصمت چغتائی سے ایک ملاقات	ماہنامہ "کتاب نما" نئی دہلی	جولائی ۱۹۹۵ء

شخصیّت

○ "اب جو باتیں کرنے پر آئیں تو دُنیا جہاں کے مسائل پر تبصرہ کر ڈالا۔ اور مَیں بیٹھا جی ہاں جی ہاں کرتا رہا۔ ان سے جتنی دفعہ بھی ملاقات ہُوئی اُن کی اور میری گفتگو کا نقشہ یہی رہا۔ لیکن اِس میں میری نیازمندی کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی۔ اوّل تو وہ باتیں ایسی ذہانت کے ساتھ کرتی ہیں کہ تعجّب ہوتا ہے۔ ایک عورت کو ایسا دماغ کیسے مل گیا۔ پھر وہ زبان ایسی اچھّی بولتی ہیں اور انداز اتنا معصُومانہ ہوتا ہے کہ چاہے وُہ بے معنی باتیں ہی کیوں نہ ہوں بیچ میں ٹوکنے کو جی نہیں چاہتا۔"

—— مُحمّد حسن عسکری

○ "پیار سے مجھے دیکھ کر کہتیں "پان کھاؤ گی"۔ اور پان بنا کر کبھی کبھی شرارت سے اس کی چونچ قوام والی شیشی سے چھُوا لیتیں۔ مَیں کہتی "آپا مَیں سردارنی ہُوں۔ گرُوجی ناراض ہو جائیں گے"۔ وُہ ہنس کر کہتیں "انھیں تمھاری نگرانی کے سوا بھلا اور کوئی کام ہے اس کے لئے اُنھوں نے ایک سردار چھوڑ رکھا ہے"۔ ایک بار قوام میں پان کی چونچ کافی بھیگ گئی۔ میری آنکھیں اُبل کر باہر آنے لگیں۔ مَیں باتھ روم میں پانی کے کُلّے کر کے آئی تو کہنے لگیں "تو براہمنوں کی اولاد کیا خاک قوام ہضم کرے گی۔ سردارنی ہوتی تو زیرے کی طرح چبا جاتی"۔

—— پدما سچدیو

فن

○ "ان افسانوں کو مُصنّفہ نے ایک عورت کے سے حُسنِ انتظام اور سلیقے سے سجایا ہے۔ سیدھی سادی زبان جو کم و بیش شمالی ہند کے ہر گھر میں سمجھی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نسوانی تشبیہیں اور محاورے اور استعارے، شوخیاں اور چُٹکیاں جو آپ ہی آپ اس لنگار خانے میں خوبصُورت گل بُوٹے بناتی جاتی ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر خوبصُورت معلوم ہوتی ہے اور پھر افسانے کے کُلّی تاثر میں بھی معتد بہ اضافہ کرتی ہے۔ اس کی زینت کو دوبالا کرتی ہے۔ اس کی آب و تاب کو جِلا دیتی ہے۔ اس طرح کہ ہر افسانہ ایک ترشے ترشائے ہیرے کی طرح درخشندہ نظر آتا ہے"۔

—— کرشن چندر

○ "عصمت کی شخصیّت اُردو ادب کے لئے باعثِ فخر ہے۔ اُنھوں نے بعض ایسی پُرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں کہ جب تک وہ کھڑی تھیں، کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اُردو ادب میں جو امتیاز عصمت چغتائی کو حاصل ہے، اس کا مُنکر ہونا کج بینی اور بُخل سے کم نہ ہوگا"۔

—— پطرس بُخاری